کلیات رشید احمد صدیقی

(خطبات)

جلد دوم

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

کلیات رشید احمد صدیقی

(خطبات)

جلد دوم

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

پہلی اشاعت	:	2009
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/331 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1336

Kulliyat-e-Rashid Ahmad Siddiqui, (Khutbat) Vol.-II

Compiled by

Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-81-7587-325-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلا سار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110053

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیش تر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کر لیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتدادِ وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔

مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کے بنیاد گذار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کو رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ایسا استحکام نہ بخشا ہوتا تو بعد کے زمانے میں مشتاق احمد یوسفی، مختار مسعود، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز و مزاح کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں میں ایسی رنگا رنگی نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ علی گڑھ اور دبستانِ علی گڑھ کو ایک روایت میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس طرح ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک شائستہ طرزِ زندگی کی علامت کی شکل میں پیش کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ، عرصۂ دراز تک اپنے علمی اور تہذیبی کارناموں کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات رشید احمد صدیقی کے پروجیکٹ میں ان کی کتابی شکل میں مطبوعہ تحریروں کے ساتھ رسائل کے صفحات میں منتشر تحریروں، ان کے خطوط اور غیر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلیات محض رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی دوبارہ اور یکجا اشاعت ہی نہیں، تحقیق و تلاش اور تدوین کا بھی عمدہ نمونہ بن کر قارئین کے سامنے آ رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کے اپنے تمام منصوبوں میں اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو باخبر کریں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کر لیا جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر

مقدمہ

رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے صف اوّل کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ چوں کہ ان کے مزاح میں طنز کا عنصر بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی حیثیت اردو کے لیے مثل طنز نگار کی بھی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رشید صاحب کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ لیکن اس سے اس پہلو کی نفی بالکل نہیں ہوتی کہ ان کی غیر مزاحیہ یا سنجیدہ تحریریں بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم کسی ادیب کے بنیادی اسلوب اور نمایاں رویے کی شہرت کو ادبی اسناد سازی کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ہم کسی ادیب کے ایک پہلو کو اتنا نمایاں کر دیتے ہیں کہ اس کے دوسرے امتیازات ثانوی سمجھے جانے لگتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رشید صاحب کی غیر مزاحیہ تحریریں چوں کہ ابتدا میں کم شائع ہوئیں اس لیے اس نوع کی سنجیدہ اور بردبار تحریروں کی جانب اہل ادب کی بہت کم توجہ مرکوز رہی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی سنجیدہ تحریروں میں ان کے خطبات کو اوّلیت حاصل ہے۔ ان خطبات کے موضوعات متنوع ہیں اور ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

''خطبات رشید احمد صدیقی'' میں کل 16 خطبات شامل ہیں جنھیں زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر خطبات کانفرنسوں کے لیے لکھے گئے تھے جن کی صدارت

رشید صاحب نے فرمائی تھی۔ ان خطبات میں بعض افتتاحی خطبے ہیں اور بعض وہ خطبے ہیں جو تقسیم اسناد کے جلسوں میں پڑھے جانے کے لیے لکھے گئے تھے۔ رشید صاحب نے بعض خطبات کے عنوانات بھی قائم کیے۔ مثلاً ''زبان اردو''، ''ہندستانی اور اردو مصطلحات اردو''، ''علی گڑھ۔ ماضی و حال''، ''اردو رسم الخط''، ''عزیزانِ علی گڑھ'' وغیرہ جن سے رشید صاحب کی ان موضوعات سے گہری دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔ زیرِتذکرہ مجموعہ میں شامل 16 خطبات میں ایک خطبہ ایسا بھی ہے جو دیا نہ جاسکا۔ لیکن یہ سرسید ہال میگزین (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں شائع ضرور ہو چکا ہے۔

زیرِتذکرہ مجموعۂ خطبات پچاس سال کے عرصے کو محیط ہے۔ اس کا پہلا خطبہ بہ عنوان زبان اردو ہے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ میں 26 دسمبر 1924ء کو دیا گیا اور آخری خطبہ ''عزیزانِ علی گڑھ'' ہے جو روزنامہ ''قومی آواز'' (لکھنؤ) میں 1975ء اور 1976ء کے دوران قسط وار شائع ہوا۔ یہ بے حد طویل خطبہ ہے جسے رشید صاحب نے 1967ء سے لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ''قومی آواز'' (لکھنؤ) میں چھپنے کے بعد بھی وہ اس پر اپنے انتقال (15 جنوری 1977ء) سے ایک دن پہلے تک نظرِثانی کرتے رہے تھے۔ زیرِتذکرہ مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل تمام خطبات زمانی اعتبار سے ترتیب دیے گئے ہیں تاکہ ان کے مطالعے سے ان کے ذہنی ارتقا کا اندازہ لگایا جاسکے اور ہر خطبہ جس روز اور جس مقام پر دیا گیا، اس تاریخ اور مقام کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے، اور اس ادارے اور جگہ کا نام بھی درج کر دیا ہے، جس کے پلیٹ فارم سے یہ خطبہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں جہاں یہ خطبہ چھپا اس اخبار یا رسالے کا نام بھی مع سنہ اشاعت دے دیا گیا ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ خطبہ صدارت ہے یا خطبہ افتتاحیہ اور کس موقع و محل پر یہ خطبہ دیا گیا۔

رشید احمد صدیقی کے یہ خطبات ادبی بصیرت کے علاوہ علمی فطانت اور دانش ورانہ شان بھی رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہمیں بعض ادبی، علمی، لسانی، نیز تہذیبی، قومی اور عصری مسائل سے ان کی گہری واقفیت کا پتا چلتا ہے۔ ان خطبات کو پڑھتے وقت ہمیں اس بات کا ہرگز احساس نہیں ہوتا کہ رشید احمد صدیقی اپنے بنیادی مزاج کے اعتبار سے ایک مزاح نگار ہیں بلکہ انھیں پڑھ کر ہمیں اس بات کا قائل ہو جانا پڑتا ہے کہ رشید صاحب اعلیٰ پائے کے مزاح نگار

ہونے کے علاوہ ایک دیدہ ور مفکر، سنجیدہ بے باک تجزیہ نگار نیز اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے ادارے (علی گڑھ) کے سچے بہی خواہ اور قوم وملت کے حقیقی غم خوار بھی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی ہر تحریر میں ان کے برسوں کا تجربہ اور ان کی گہری فکر جھلکتی ہے۔ ان کو قومی، لسانی اور ملی مسائل سے کتنی گہری وابستگی تھی اور انھوں نے عرصے تک ان کے مسائل پر کسی بصیرت افروز انداز میں غور وفکر کیا تھا۔ ان تمام باتوں کی جھلک ان کے خطبات میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان خطبات کا عمیق مطالعہ رشید صاحب کے ادبی قدر کے ساتھ دانش ورانہ قدر ومنزلت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے یہ خطبات بلاشبہ اردو کے غیر افسانوی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں جن کو مربوط انداز اور جدید طریقِ کار کے ساتھ پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔ رشید صاحب کی ذہنی افتاد، علمی تبحر اور دانش ورانہ فہم وفراست کو سمجھنے کے لیے ان خطبات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ابوالکلام قاسمی

فہرست مضامین

●●●

زبانِ اردو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

علی گڑھ

منعقدہ 26/لغایۃ 31/دسمبر 1924

جنابِ صدر، بزرگانِ محترم اور عزیزانِ یونیورسٹی!

جس مبحث پر مجھے اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا ہے وہ ''زبانِ اردو'' ہے۔ یہ موضوع جتنا وسیع اور وقیع ہے اس کا مجھے کامل احساس ہے، اگرچہ یہ محض رسمیات کی ایک فرسودہ سنت نہ تصور کی جائے تو میں عرض کروں گا کہ یہ فریضہ میری بساطِ فہم و فراست سے کہیں وسیع اور بسیط ہے۔ لیکن اگر میری پُرخلوص مساعی اور وائس چانسلر صاحب بالقابہ کا بزرگانہ فرمانِ ناطق میرے لیے سند جواز کی حیثیت رکھ سکتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں کوشش کروں گا کہ حتی الوسع آپ کی توقعات مایوس نہ ہوں۔ میں جانتا ہوں میرا یہ عرض کرنا میرے ''برخود غلط'' ہونے کی ایک تاریک مثال ہے، لیکن کیا کروں اظہارِ انکسار کی فرسودگی اس سے بھی زیادہ بے کیف ہوتی ہے اور میرا عقیدہ ہے۔ ہر اجتہاد یا انحراف خواہ وہ کتنا ہی بے محابا کیوں نہ ہو، اُن پامال رسمیات سے زیادہ دل کش ہوتا ہے جس کی سننے کا ایک ذہین مجمع پہلے سے متوقع ہوتا ہے، اور مقرر کے متعلق ایسی رائے قائم کر لیتا ہے جو اس کے لیے کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہو سکتی۔ ایک دوسری دقت میرے لیے یہ ہے کہ موجودہ وقت میں ملک و قوم کی جیسی کچھ حالت ہے اور آزاد افکار میں جیسا کچھ تصادم ہے، اس اعتبار سے مضمون زیرِ بحث کچھ زیادہ دلچسپ نہیں رہ جاتا۔ سیاسی شورشیں اور جماعتی نوک جھونک جس کا مقصد ''خوباں'' کے ''چھیڑنے'' سے ہو، گرمیٔ محفل کے لیے ضروری ہے۔ ہم میں بہت سے لوگ ''گرمیٔ بزم'' کے جویا ہوتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں وہ ''رقصِ شرر'' تک کیوں نہ ہو، لیکن محض اس خیال سے کہ آپ حضرات نے کانفرنس میں

شرکت فرمائی ہے۔ میں یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ ''زاہدِ شب بیدار'' کی نا قابلِ رشک حیثیت کو کچھ اور نہیں تو محض تبرّ کاً و تیمناً گوارا فرمانے کے لیے تیار ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد اور ہر تمہید صرف ایک دل کش اعترافِ شکست ہوتی ہے۔ میں نفسِ مضمون کی طرف مائل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں دورانِ تقریر میں اکثر ایسا ہی کرتا رہوں گا اور یہ محض اس لیے نہ ہوگا کہ آپ کے خیالات میں جو بہت ممکن ہے مضمون زیرِ بحث سے بالکل غیر متعلق ہوں، میں کسی طور پر مخل ہوں بلکہ یہ خود اپنے ہی خیالات کو مجتمع کرنے کا ایک آسان وسیلہ ہوگا!

حضرات! اردو کا سوال کسی نہ کسی صورت میں معرضِ بحث میں رہا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے ہر نقطۂ نگاہ سے اس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے حالات اور واقعات کچھ اس طور پر رونما ہوئے ہیں کہ ہم کو اب جلد سے جلد فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اس مسئلہ میں ہماری دیرینہ سعی و کاوش کا عملی پہلو کیا ہونا چاہیے۔ زبانِ اردو کی ابتدا اور ارتقا پر تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ اوّل تو میں اسے ایک خالص ادبی مبحث قرار دینا نہیں چاہتا کیوں کہ یہ مسئلہ عرصہ ہوا ان مراحل سے گزر چکا۔ دوسرے یہ کہ فی الحال اس کا کوئی موقع نہیں ہے گفت و شنید کا وقت ختم ہو چکا ہے، نقل و حرکت کو ختم کرنا چاہیے۔ اب حملہ اور مدافعت کا وقت ہے اور ہم کو اس کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ ہندوستان اس وقت جن مراحل سے گزر رہا ہے، اس کا آپ کو احساس ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے۔ بہت سے اصحاب ان نتائج کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں جو جلد یا بہ دیر پیش آنے والے ہیں۔ مسئلہ زیرِ بحث کا سب سے زیادہ دشوار پہلو تو یہ ہے کہ اردو محکوم قوم کی زبان ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مشکل یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اردو کی حریف صرف حکمراں ہی قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ وہ ان لوگوں کی معاندانہ تگ و تاز کی بھی آماجگاہ ہے جو ہماری طرح محکوم ہیں۔ سنتے ہیں مشترک مصیبت حریفوں کو بھی دم ساز بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ کلیّہ ہی کیا جو مستثنیات سے خالی ہو!

حضرات! جیسا آپ پر روشن ہے اردو شاید تمام دنیا کی زبانوں سے نو عمر ہے۔ اس کے آغاز اور ترقی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اردو دنیائے ادب کا ایک محیّر العقول کرشمہ ہے۔ زبانیں قرنوں میں بنتی ہیں۔ الفاظ کا سرمایہ صدیوں میں فراہم ہوتا ہے اور صدیوں تک اُن پر

سال وسنین کا انبار فراہم ہوتا ہے، اس وقت کہیں جا کر یہ منتشر ذرّات آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہو کر جواہر ریزے بنتے ہیں۔ ادبیات کی مثال حجریات کی ہے۔ خاک اور ریگ کے یہی حقیر اور منتشر ذرّات ہزاروں لاکھوں سال تک جذب وتجاذب کے فشار میں مبتلا رہتے ہیں اور آخر میں سنگلاخ بن جاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ نسبتاً نہایت قلیل عرصہ میں اردو اپنی پوری استعداد اور انتہائی رعنائی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہے، دوسری بوالعجبی بھی ملاحظہ ہو۔ اکثر زبانوں کا عروج اور ان کی ابتدا حکمرانوں کے قوتِ بازو یا اُن کی اعانت اور تصرف کی رہینِ منت رہی ہے۔ اردو نے آنکھ کھولی تو اس کے سرپرستوں کی سطوت جنازہ بردوش تھی، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اردو لشکری یا اس کے بعد درباری زبان رہی اور اس میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو ایسی زبانوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں اردو کی ابتدا اور ارتقا سے بحث نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جن حالات کے ماتحت اردو نے موجودہ شکل اختیار کی ہے، کیا وہ حیرت انگیز نہیں ہیں۔ یوں تو کہنے کے لیے اردو کی تاریخ ترکوں اور مغلوں ہی کے وقت سے نہیں، بلکہ اس سے کئی صدی پیش تر عربوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن ان تاریخی موشگافیوں سے قطع نظر کرلیا جائے تو یہ بیان واقعہ ہے کہ اردو کو موجودہ صورت اور حالت اختیار کیے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے۔ اردو کا وہ سرمایہ جسے بجا طور پر ادبی کہا جاسکتا ہے، زیادہ سے زیادہ سو سال کا ہے۔ غدر کے کچھ پہلے سے شروع ہو کر اب تک اس نے جتنے مدارج ترقی طے کیے ہیں، اس کا بہ مشکل اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ساٹھ، ستّر ہی سال کے اندر اندر اس کے سرپرستوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس حقیقت سے تصور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی صنفِ کلام ایسی نہیں ہے، جس کا بہتر نمونہ اردو میں نہ موجود ہو۔ کچھ لوگ اردو پر تہی مایہ ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کسی مخصوص زبان کی جامعیت کا یوں اندازہ لگانا کہ اس میں کس کس قسم کی اور کس تعداد میں تصانیف موجود ہیں، صحیح نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں استعداد قبولیت کہاں تک ہے۔ اردو کی استعداد اور ہمہ گیری پر حرف نہیں لایا جاسکتا، کمی انشا پردازوں کی ہے۔ زمانہ کی نامساعدت ہے، حکومت کی بے اعتنائی ہے، ہندستانیوں کا تعصب اور جہالت ہے اور ہماری بے توجہی ہے۔

حضرات! اردو کے متعلق تو کہا جاسکتا ہے ''کے آمدی و کے پیر شدی'' خود فارسی کو لے لیجیے، کب سے عالم وجود میں ہے، کیسی کیسی سرپرستیاں نصیب رہی ہیں، کہاں کہاں سے فیض حاصل کیا ہے۔ لیکن کس سرمایہ کی مالک ہے؟ یہاں بھی صرف شعروسخن ہی کا عنصر غالب نظر آئے گا۔ اردو پر بھی تو بعض حضرات یہی الزام دھرتے ہیں کہ یہاں شعروشاعری کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اس اعتراض کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو صورت حال میں کیا فرق آتا ہے۔ اردو کا اگر فارسی سے مقابلہ کیا جائے تو ادبی حیثیت سے ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔ اس میں شک نہیں فارسی شعرا شعروسخن میں عربوں کے علاوہ تمام دنیا کو دعوتِ جنگ دے سکتے ہیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی، فارسی کو فی الحال جیسی کچھ حیثیت حاصل ہے۔ اس میں اسلام اور عربوں کا تصرف غالب اور نمایاں ہے، برخلاف اس کے عربی شاعری خوشہ چینیوں سے بالکل پاک نظر آئے گی۔ ایام جاہلیت کی شاعری اس وقت تک کلاسکس میں شمار ہوتی ہے۔ عرب کا لق و دق ریگستان، شعلہ بار ہوائیں، خانماں بردوش بدوی، جن کا ضابطۂ انصاف صرف اُن کی تلواروں کی بُرّش، جن کا صحیفۂ اخلاق مہمان پرستی، جن کے محسوساتِ شعری اونٹ اور بکری، اور جن کا سارا سرمایۂ حیات فطرت کا مظہر خشن و خشونت تھا۔ شاعری کے میدان میں اس شعلہ نوائی سے کام لیتے تھے کہ قلوب کی انتہائی گہرائیاں بھی ملتہب ہو جاتی تھیں۔ وہ جاہل تھے لیکن دنیا کو گونگا جانتے تھے۔ خیال کرنے کی بات ہے، انھوں نے یہ دعویٰ اُس وقت کیا تھا جب دنیا کی دیگر زبانیں معراجِ کمال پر پہنچ چکی تھیں۔ پھر یہ ادعائے باطل نہ تھا۔ اُن کی جاہلیت کے کلام سے متمدن قوموں کے بہترین کلام کا مقابلہ کرلیجیے، اور مقابلے کیے گئے ہیں۔ میدان صرف نیم وحشیوں کے ہاتھ رہا ہے۔ یہ موقع عرب شاعری کی منقبت کا نہیں ہے، مقصود صرف یہ ہے کہ کسی زبان کی جامعیت کا مدار صرف اس حقیقت پر نہیں ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کیسی ہے۔ نظام تمدن میں کیا خوبیاں ہیں، ادبیات کا ذخیرہ کیا ہے، اگر یہ امور قابل پذیرائی ہوسکتے تو باوجود ان تمام خوبیوں کے سنسکرت مردہ زبان نہ تصور کی جاتی۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کس زبان میں کس حد تک جذب وتجاذب کی استعداد ہے، کون زبان زمانہ کی ضروریات کی کفیل ہوسکتی ہے اور کون سی زبان زمانہ کے فشار اور دست بُرد سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

حضرات! جہاں تک ادبِ متین کا تعلق ہے، سوائے چند اخلاقی تصانیف کے جن میں بیش تر ام الالسنہ سے خوشہ چینی کی گئی ہے یا چند تاریخی تذکروں کے جو زیادہ تر شعرا کے شاعرانہ حالاتِ زندگی پر مشتمل ہیں اور وہ بھی جامع و مانع نہیں۔ فارسی ادب صرف شعر و شاعری کا حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فارسی شعرا اس کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا ان میں اس کی استعداد نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بادشاہِ وقت حکمراں مطلق ہوگا، وہاں دربار کی رضا جوئی کے لیے ہر شخص کی طبیعت شعر و سخن کی طرف ملتفت ہوگی۔ جہاں قصیدہ گوئی ہی آزوقۂ حیات اور نام و نمود کے لیے ضروری ہو، وہاں کوئی شخص کسی دوسری طرف کیوں کر مائل ہوسکتا ہے۔ اس کی بہترین مثال خود ہماری زبان اردو ہے۔ جب تک دہلی لکھنؤ یا دیگر درباروں سے شعرا کی پُرسش ہوتی رہی، قصیدہ گوئی یا ہزل سرائی کا بازار گرم رہا۔ اب بھی جہاں کہیں یا کسی ریاست میں درباری شعرا کا انسٹی ٹیوشن ہے، وہاں سوائے قصائد یا غزلیات کے آپ کچھ اور نہ پائیں گے۔ ریاستیں دربارِ شاہی کے چھوٹے نمونے ہیں۔ قاآنی ایسا جامع الصفات شاعر بھی محض درباری شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنا پورا زورِ قلم صرف قصائد پر صَرف کرتا ہے، حالاں کہ یہ وہ شاعر ہے جو نیچرل شاعری میں یگانۂ روزگار ہوسکتا تھا۔ اب بھی جہاں کہیں اس نے نیچرل رنگ اختیار کیا ہے، یکتائے عصر ہوگیا ہے۔ بہر حال دہلی اور لکھنؤ کی محفلوں کا درہم برہم ہونا تھا کہ شعرا نے اپنی سعی و کاوش کو دوسری طرف مائل کیا۔ اردو ایک حد تک 1857ء کے فتنۂ آشوب تک مکمل ہوچکی تھی۔ اس کے بعد زمانہ نے ایک نئی بساط بچھائی، قصائد مرثیے میں بدل گئے۔ غزلیں نوحہ خوانی میں تبدیل ہوگئیں۔ ذوقِ شعری نے ادبی اور سنجیدہ رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ غور کرنے کا مقام ہے، یہ رنگ کب نمایاں ہوتا ہے؟ جب ''بادۂ شبانہ کی سرمستیاں'' ختم ہوچکی تھیں، اور ''لذتِ خوابِ سحر'' کافور ہوچکی تھی!

حضرات! زبانیں جس طور پر ترقی کرتی ہیں زمانہ کا اُن پر اور ان کا زمانہ پر جیسا کچھ اثر پڑتا ہے۔ اس سے آپ کم و بیش واقف ہیں! اردو کا گہوارہ شیراز ہند برج کا مرغزار تھا۔ ہر نئی آنے والی نسل کا جولاں گاہ شمالی ہند رہا ہے اور جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے برج کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا اقتضا تھا کہ جتنی قومیں ہندوستان میں وارد ہوئیں، فطرت کے اس حسن کدہ پر

ضرور حاضر ہوئیں، اور یہی وجہ ہے کہ دیگر علاقوں سے سوا یہاں کی زبان پر ان کا اثر پڑا اور اس کا دامن مختلف زبانوں کا مینا بازار بن گیا۔ فاتحین آتے رہے، قومیں بنتی بگڑتی رہیں، زمانہ لیل ونہار کی کروٹیں لیتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں نے دنیائے آب وگل میں آنکھ کھولی اور اردو بھاشا نے اردوئے معلّٰی کا خلعت پہن لیا۔ میں نے اردو کی ابتدائی ارتقائی منازل کو بہ ضرورت نظر انداز کیا ہے اور اس وقت بھی میں الفاظ، اشعار، بیان اور معانی کی مثالیں آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا۔ اس پر کافی بحث ہو چکی ہے اور جن اصحاب کو اردو سے مناسبت اور دلچسپی رہی ہے، وہ اس کے ابتدائی منازل سے کم وبیش واقف ہیں۔

میں فی الحال ان واقعات سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو ہم میں سے بہت سے اصحاب کے مشاہدہ میں آئے ہوں گے۔ ہم میں ابھی وہ نفوس قدسیہ بھی موجود ہیں جنہوں نے غدر کا ہنگامۂ رستخیز اور ساتھ ہی ساتھ غالبؔ، داغؔ، سرسیدؔ، محسنؔ الملک، سجادؔ حسین، آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اور اکبرؔ کی اعجاز بیانی اور شگفتہ نگاری کا زمانہ دیکھا ہے۔ یہ شمعیں غدر کے بعد گل ہوئی ہیں۔ زمانہ کا انقلاب، نظم ونثر کے آئینہ میں دیکھنا ہو تو ان کے کلام کا مطالعہ کیجیے۔ میں اس مثال کے واضح کرنے کے لیے صرف تین ہستیوں کو پیش کروں گا۔ سب سے اوّل غالبؔ کا نام لیتا ہوں، کچھ لوگ غالبؔ کے کلام کو ویدِ مقدس کا پایہ دیتے ہیں، دوسرے ان کو مہمل گو تصور کرتے ہیں۔ کسی کلام کے الہامی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسے مہمل کہا جائے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے، پھر بھی غالبؔ کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے میں کلام نہیں ہے اور اس میں شک نہیں کہ غالبؔ اور انیسؔ ان بلندیوں پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں تک بہ مشکل کسی اور اردو شاعر کی رسائی ہو سکتی ہے، لیکن میری ذاتی رائے ہے جس میں شامل ہونے کی میں کسی کو دعوت نہیں دیتا کہ غالبؔ کی بلند پائیگی کا تمام تر سرمایہ ان کی غزلیں ہیں، اور وہ غزلیں جو غالبؔ کے بقیہ اردو کلام سے بے نیاز تھیں اور جن کو اب شائع کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو نوازی کے اس سے بہتر طریقے بھی ممکنات سے تھے۔ بہر حال یہ محض ایک جملہ معترضہ تھا۔ غالبؔ ایسے جید شاعر کے کلام میں سب کچھ ہے جس کا تذکرہ مرحوم ڈاکٹر بجنوری نے کیا ہے۔ لیکن کوئی مخصوص پیغام (Message) نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو ساز اختیار کیا تھا، وہ

اس صنف کلام کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اور یہی نہیں بلکہ ایسا کرنے سے سارا ساز بے آہنگ ہوجاتا۔ اس میں شک نہیں مثنوی کے بعد شاعر کے زورِ قلم کا پتہ صرف غزل میں چلتا ہے۔ غزل ایک ایسا مختلف النوع خوان ہے جس پر ہر قسم کی نعمتیں چُنی ہوتی ہیں۔ یہ لَے صرف سوز و ساز کے لیے مخصوص ہوتی ہے، لیکن اگر تصوف کا رنگ حذف کردیا جائے تو پھر سوز و ساز ہی صرف ایسی چیزیں نہیں ہیں جن پر قوم کی فلاح اور نجات کا مدار ہو۔ غالبؔ کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے وہو اور نائے و نوش کی ترجمان ہے۔ اس میں شک نہیں غالبؔ کا مشہور قطعہ ۔

''اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زِنہار گر تمھیں ہوس نائے و نوش ہے''

اردو میں عدیم المثال ہونے کے علاوہ خیامؔ کی عبرت نوائیوں کے ہم پلّہ ہے، لیکن ایسی خال خال مثالوں سے کوئی کلیہ استنباط نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری حقیقت جس کا اظہار کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ہے کہ غالبؔ کی شاعری ان کے زمانہ کا آئینہ نہیں ہے۔ زبان کی صفائی اور پاکیزگی سے قطع نظر کرکے، ان کا پورا کلام آج سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد تک پیش کیا جاسکتا تھا، اور کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جذباتِ انسانی کی صحیح اور سچی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ لسان القلب تھے، لیکن لسان العصر ہونا ایک دوسری ہستی کے لیے قسمت ہوچکا تھا۔

حضرات! غالبؔ کے متعلق میں نے جو اظہار خیال کیا ہے، اس کی وضاحت حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کی مثالوں سے کرنا چاہتا ہوں۔ حالیؔ کے پورے کلام کا آپ سطحی نظر سے بھی مطالعہ کرجائیں تو آپ کو معلوم ہوگا، ایک خالص رنگ (مرثیہ) ان کے کلامِ تمام میں جاری اور ساری ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد زمانہ کا یہی اقتضا تھا کہ قوم میں حالیؔ پیدا ہوتے۔ ہر سانحہ، یا حادثہ کا پہلا اثر انسانی قلب پر دردانگیز اور افسردہ کن پڑتا ہے۔ دنیا تاریک نظر آتی ہے، زار نالی کے سوا قلب کو تسکین دینے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، زخم تازہ ہوتا ہے، گزری ہوئی حالتوں کی یاد جراحت کو اور زیادہ شگفتہ بناتی ہے۔ وہ زمانہ یاد آتا ہے جب حرماں نصیبی کو خواب و خیال میں بھی بار حاصل نہ تھا۔ یہی حالت غدر کے بعد مسلمانوں کی تھی۔ وہ تمام چیزیں جو کبھی

صرف ہمارے لیے تھیں، اب صرف ہماری آرزوؤں کا مدفن بن جاتی ہیں۔ ہمارا ذہن خود بخود، سمرقند، اصفہان اور دمشق کی فضا جیحوں اور دجلہ کی روانی، یثرب و بطحا و صفا و ذر بید و نہرواں کی کشش، بصرہ و طائف کے نارستان وخرماستان مرو اور شیراز کے چمن اور گلستاں، نہر رکنی اور گلگشتِ مصلّٰی کا سماں، سمرقندی اور شیرازی دعوتیں، ترکمانی صولت، مغلی جلاوت، کردی عزم اور بدوی حمیّت، ہاشمی آداب، عباسی فضائل، نطقِ اعرابی، عدنانی فصاحت، ضرب کراری، حرب خالدی، سطوتِ حمزی، جلالتِ فاروقی، اخلاقِ احمدیؐ، اخوتِ اسلامی، جولاں گاہِ تا تاروز بخیار کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اُن کی مایوس یاد سے تلملا اُٹھتا ہے تو کہتا ہے ؎

چھین لی سب ہم سے یاں شانِ عرب آنِ عجم

تو نے اے غارت گر اقوام و اکـال الاُمـم

لیکن فوراً ردِّعمل شروع ہوتا ہے۔ افسردگی اور یاس غالب آتی ہے تو یوں گویا ہوتا ہے ؎

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گزری بہت

اُٹھ رہا ہے گُل سے شمعِ بزم کی اب تک دھواں

ایسی حالت میں لوگ پند و نصیحت کرتے ہیں۔ زارنالی سے باز رہنے اور سانحہ کو بھلا دینے کی صلاح دیتے ہیں تو وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگتا ہے ؎

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی، مگر کیوں کر کوئی

بھول جائے صبح ہوتے رات کا سارا سماں

اور آخر میں بددعا پر اپنی تان توڑ دیتا ہے ؎

آگ سے رہتا ہے جیسے دُور دُور آتش پرست

حکمراں تیرے یوں نہیں تجھ سے رہیں گے برکراں

کیا ایک مجروح قلب اور اُجڑے ہوئے دل کے واردات کی اس سے زیادہ صحیح تصویر کھینچی جاسکتی ہے؟

ان چند مثالوں کو پیش کر کے میں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حالیؔ نے اپنے زمانہ کی صحیح مصوری کی ہے اور ان معنوں میں ان کا شمار حقیقی شعرا میں ہوسکتا ہے۔ چوں کہ ان کی ہر تان ماضی پر ٹوٹتی ہے، اس لیے حالی کو بجا طور پر ماضی کا شاعر کہنا چاہیے۔

حضرات! زمانہ سے بڑھ کر مندمل کرنے والی شے دوسری نہیں ہے، کوئی زخم ایسا نہیں ہے جو سال وسنین کے بار سے دب نہ جائے۔ کوئی جراحت ایسی نہیں ہے جس کا بہترین اور مؤثر ترین مرہم مرورِ ایام نہ ہو۔ مراثی کا دور ختم ہوتا ہے، قلب پر صبر وسکون کا تسلط ہوتا ہے۔ زخم مندمل ہو چکا ہے، لیکن داغ باقی ہیں۔ بازوؤں میں سکت نہیں، لیکن اغیار کی دراز دستی، اقربا کی سادہ لوحی اور غلط روی، برادرانِ یوسف کی بے اعتنائی اور سرد مہری، مذہب وملت کی کسم پرسی، حکومت کا استیلا ایسی چیزیں ہیں جن کا نہ تو ماتم کیا جاسکتا ہے، اور نہ مقابلہ۔ قلب پر چوٹ لگتی ہے تو سینہ سے آہ اُٹھتی ہے، لیکن زبان پر واہ کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ زارنالی بے ہنگام، مدافعت اور مقابلہ بے سود نظر آتا ہے تو اُن کے درمیان کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے، اور ہجو، مذمت، تنقیص، تعریض، شطحیات، استہزائیات، مطائبات، ہزلیات اور مضحکات کا دور آتا ہے۔ شاعر ہنسا ہنسا کر رُلاتا ہے اور کھلا کھلا کر مارتا ہے۔ تلخ حقائق کو شربت کا گھونٹ بنا دیتا ہے۔ روتا ہے تو ایسی صورت بنا کر کہ لوگ ہنستے ہنستے رو پڑیں۔ ہنستا ہے تو اس انداز سے کہ لوگوں کا گریہ گلوگیر ہو جائے۔ عریاں ہوتا ہے تو اس پیرایہ سے کہ سنجیدگی قربان ہونے لگتی ہے۔ لسان العصر کے متعلق اقبالؔ کا فیصلہ سُنیے۔

سرِ ذروهٔ طورِ معنی کلیمے به بت خانہ دورِ حاضر خلیلے
گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے

حجازی تمدن اور مشرقی معاشرت کو مغربی دست برد میں دیکھ کر لسان العصر (اکبر مرحوم) اپنا پیغامِ رسالت یوں پہنچاتے ہیں۔

ہمارا مشرقی دل نزع میں ہے، وقتِ آخر ہے نہیں مغرب کو غم، اس کی نظر میں مرگ کافر ہے
غرور اتنا نہ کر قوت پر اپنی اے بُتِ ترسا ہمارے ہوش غائب ہیں، مگر اللہ حاضر ہے

....

بتوں کی بات سے دل مائلِ فریاد ہوتا ہے مگر کہنا ہی پڑتا ہے "بجا ارشاد ہوتا ہے"
مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

....

ہم کوئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں   باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزل   گر ہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں

موجودہ دورِ حکومت پر کیسی کیسی تلخ نوائیوں سے کام لیا گیا ہے اور حاکم و محکوم کے جیسے کچھ تعلقات ہیں۔ ان پر کن مختلف نوعیتوں سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے، روشن ہیں۔ لیکن لسان العصر کے یہاں یہ نقوش کس طور پر نمایاں کیے گئے ہیں۔

اکبر سے میں نے پوچھا، اے واعظِ طریقت   دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق؟
اُس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو   انگریز کو ہے نیٹو سے جس قدر تعلق
اس شرط پر ہم سے فلک سے صلح آخر ہوگئی   قبریں مہیا وہ کرے تزئین ان کی ہم کریں

آخری شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبالؔ کی وہ نظم بھی ملحوظ رکھیے جو نام نہاد ''جمعیت الاقوام'' پر لکھی گئی ہے۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن   دردمندانِ جہاں طرحِ نوانداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن وزدے چند   بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

موجودہ دورِ تہذیب کا اس سے زیادہ بدیع نقشہ کھینچا جا سکتا ہے۔

کعبہ سے جو بُت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بُت بھی ہم سے چھٹے، قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا
کیا گزری جو اک پردے کے عدو، رورو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بی بی بھی گئی اور زر بھی گیا

....

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بدّھو اکڑ رہے ہیں، ''صاحب نے یہ کہا ہے''

....

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے ''کیا تو مسلماں ہے؟''
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے

کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوف قہر یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خان ساماں ہے

موجودہ زمانہ میں تعلیم نسواں اور پردہ کے متعلق جن عریانیات سے کام لیا گیا ہے اور جن تلخ یا شیریں واقعات سے بحث کی گئی ہے۔ ظاہر ہے لسان العصر کا آئینہ خانہ بھی ملاحظہ ہو۔

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہے وہ لیزی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

....

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

آج کل کی مروّجہ تعلیم و تربیت کو یوں پیش کیا ہے۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

....

کالج سے جنہیں امیدیں ہیں مذہب کو بھلا کیا مانیں گے
مغرب کو تو پہچانا ہی نہیں قبلے کو وہ کیا پہچانیں گے

....

نزولِ وحی مغرب نوجوانوں پر ہے اے اکبؔر
زبانیں کالجوں کی کھل گئیں اب آپ چپ رہیے

....

ماسٹر کی بحث اگر مانیں نتیجہ ہے یہی
اب ہیں اچھے جانور، پہلے بُرے انسان تھے

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی
نہ وہ وضعِ ملت نہ قرآن خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی

ہر اک شاخ میں پاس یہ اے ہوا ہے
مرا لال کالج کا کالا توا ہے

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

تعلیم جو دی جاتی ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

بحث طویل ہوتی جاتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کا عزیز وقت ابھی سے رائیگاں ہونے لگے، لیکن مجبوری ہے۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است۔

چند اور اشعار بھی آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ آپ خود اندازہ فرماسکیں گے کہ موجودہ حالتوں کی ان میں کس صنعت کارانہ طریقہ سے مصوری کی گئی ہے۔

افعی سے کہا میں نے "مجھے تو نے ڈسا کیوں؟"
بولا کہ "بلا لاٹھی کے تو بن میں بسا کیوں؟"

شاگرد ڈارون تو خدا ہی نے کر دیا
اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

کالج کے مفتیوں سے کل کہہ رہے تھے اکبر
بسکٹ سے باز آنا رہبانیت نہیں ہے

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں، پر ایک اکھاڑہ قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

....

خوب یہ بات کہی اس نے پکارو اس کو
بد دعا سانپ کو کیا دیتے ہو مارو اس کو

حضرات! لسان العصر کے جو ملہمات اس وقت آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، ان سے آپ کو کافی اندازہ ہو سکا ہوگا۔ یہ ہماری موجودہ حالت کی کہاں تک ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے، ورنہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ لسان العصر کے کلام کو آپ کے سامنے پیش کرتا۔ بات میں بات نکلتی آتی ہے اور مجھے یہ خیال ہے کہ کہیں آپ اس سارے طوفان تکلم سے

گھبرانے نہ لگیں، کیوں کہ:

رات تھوڑی ہے اور سانگ بہت!

میں نے علاحدہ ایک کتاب[1] میں طنزیات (ہجو) کی تاریخ سے بحث کی ہے اور اس میں لسان العصر کے کلام پر مفصل بحث کی ہے۔ جہاں تک میری تحقیق اور تدقیق نے میری رفاقت کی ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ طنزیات یا مضحکات میں لسان العصر کا جو پایہ ہے، وہ آج تک دنیا کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا ہے۔ میں نے دعوے اور دلیل سے قبل ہی نتیجہ آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس لیے ممکن ہے آپ میرے خیال سے اتفاق کرنے میں تامل فرمائیں، اس لیے قبل اس کے کہ میری اس بے محل جرأت پر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور فرمانا شروع فرمائیں، اور طنزیات کے سلسلہ میں آپ کا سنجیدہ ہو جانا میں اپنی آئندہ توقعات کے لیے نیک فال نہیں تصور کرتا۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ کو کسی دوسری مبارک ساعت کے لیے ملتوی فرمائیں۔ جو کچھ میں نے لسان العصر کے متعلق اب تک عرض کیا ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ جائز طور پر ''حال'' کے شاعر کہے جا سکتے ہیں۔

حضرات! اسی سلسلہ کی آخری کڑی بھی ملاحظہ ہو: شور و شیون ختم ہو چکا، طعن و تشنیع کا زمانہ بھی اتمام کو پہنچتا ہے۔ قوم اور ملک میں بیداری کے آثار شروع ہوتے ہیں، زمانہ ایک دوسری بساط بچھاتا ہے۔ نظروں میں وسعت اور قلوب میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ مذہب اور ملت کے تودہ خاکستر میں کچھ دبی ہوئی چنگاریوں کو پتہ چلتا ہے۔ ''ایام گل'' کے آثار بھی ہویدا ہیں، ''اشارہ'' بھی ہونے والا ہے۔ صرف ''جیب چاک'' کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فضائے ایثر میں تموج پیدا ہوتا ہے اور تمام موجودات ؂

من صدائے شاعرِ فرداستم

پر صدائے لبیک بلند کرنے کے لیے بیدار ہو جاتی ہیں۔

---

[1] طنزیات و مضحکات کا پہلا ایڈیشن ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا تھا مگر اس پر سنِ اشاعت نہیں ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن آئینہ ادب لاہور نے 1966ء میں شائع کیا۔ ملاحظہ فرمائیے، صفحات 134 تا 153۔ ''حضرت اکبر حسین اکبر الہ آبادی''

حضرات! ماضی اور حال کی داستانوں کی ترجمانی ہو چکی ہے۔ ادب اردو اب مستقبل کے شاعر کے لیے چشم براہ ہے کہ یہ پیغام بھی انھیں فضاؤں کو چیرتا ہوا ہماری کانوں تک پہنچتا ہے جہاں سے گذشتہ قومیں اپنے پیغامات لے کر نازل ہوئی تھیں، اور جو رفتہ رفتہ جذبِ عناصر ہو گئے، اور جو کسی نہ کسی نوعیت سے ہمارے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی تار و پود میں نمایاں ہیں۔ اُنیسویں صدی کے آخری دور میں بیسویں صدی کا بھی کچھ حصہ شامل کر لینا چاہیے۔ ہندی مسلمانوں کے انتہائی پستی اور نکبت کا زمانہ رہا ہے، ہر وہ جمود جو کسی قوم پر اس کی تباہی کے بعد مستول ہوتا ہے، کئی حیثیتوں سے المناک ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا اتنا روح فرسا نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے، جتنا اس سانحہ کا فقدان احساس۔ ''متاعِ کارواں'' کے جانے کا غم اتنا دل شکن نہیں ہوتا جتنا ''احساسِ زیاں'' کے جانے کا واقعہ جاں گسل ہوتا ہے۔ ادبار، نکبت، پستی اور انحطاط جب اپنے انتہائی تاریکیوں کو پہنچ جاتے ہیں، اس وقت فطرت اپنے ان کرشموں کو دفعتاً برافگندہ نقاب کرتی ہے جو انسانی توقعات سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کی وضاحت کے لیے تاریخ کا بے پایاں ذخیرہ موجود ہے، ہر برگزیدہ ہستی کی تاریخ پر نظر ڈالیے، آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ اس کا زمانۂ رسالت ہمیشہ ان حدود سے شروع ہوتا ہے جو کسی قوم اور ملک کی پستیوں کا آخری نشانِ منزل تھا۔ ابنائے مرسلین ہمیشہ ایسے ہی زمانہ میں مبعوث بہ رسالت ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے شعرا جن کے نغموں سے ذرّہ ذرّہ مرتعش ہو گیا ہے۔ انہی حالتوں میں منصۂ وجود پر جلوہ گر ہوئے۔ حافظؔ اور گوئٹے کے دورِ حیات پر نظر ڈالیے، ایک تاتاری سیلاب کی موجوں سے ہم آویز ہوا۔ دوسرا انقلابِ فرانس کی ہیئت زائیوں سے دوچار۔

اقبالؔ کا پورا سرمایۂ شاعری اُس نیابت الٰہی کا ترجمان ہے جس کا تذکرہ آج ہی صاحب زادہ صاحب کے عالمانہ خطبۂ صدارت میں آپ سُن چکے ہیں۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش ست | بر عناصر حکمراں بودن خوش ست
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم ست | ہستی او ظلِ اسمِ اعظم ست
خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند | ایں بساطِ کہنہ را بر ہم زند

مدّعائے علم الاسما ستے — سرِّ سبحان الذی اسرا ستے
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم ست — از جلالِ او نجاتِ عالم ست

....

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرّۂ تعمیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر — تختۂ تعلیم اربابِ نظر
نائبِ حق در جہاں آدم شود — بر عناصر حکمِ او محکم شود
تابش از خورشیدِ عالم تاب گیر — برق طاق افروز از سیلاب گیر
چشم خود بکشاؤ در اشیا نگر — نشہ زیرِ پردۂ صہبا نگر
تو کہ مقصودِ خطابِ اُنظری — پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری
آں کہ بر اشیا کمند انداخت ست — مرکب از برق و حرارت ساخت ست
علمِ اسما اعتبارِ آدم ست — حکمتِ اشیا حصارِ آدم ست

اس نائبِ الٰہی کی پذیرائی کن الفاظ میں کی جاتی ہے:

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشت گوش کن
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلے — کاروانِ زندگی را منزلے

اغیار کی غلبہ زائیوں کے متعلق اقبال کا پیغام ہیجان کیا ہے:

فارغ از اندیشۂ اغیار شو — قوت خوابیدۂ بیدار شو
سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد — شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد
راست می گویم عدو ہم یارِ تست — ہستی او رونقِ بازارِ تست
گر فنا خواہی زخود آزاد شو — گر بقا خواہی بہ خود آباد شو

اسی خیال کا اعادہ اقبال نے پیامِ مشرق میں یوں کیا ہے:

رفیقش گفت اے یارِ خردمند — اگر خواہی حیات اندر خطرزی

دما دم خویشتن را برفساں زن — زتیغِ پاک گوہر تیز تری
خطر تاب و تواں را امتحان ست — عیارِ ممکناتِ جسم و جان ست

ہندی مسلمانوں کے لیے وطن پرستی اور قومیت کا مسئلہ نہایت معرکتہ الآرا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کو سخت لغزش ہوئی ہے۔ جنھوں نے ''ہندستانی'' ہونے کو ''مسلمان ہونے پر'' ترجیح دی ہے۔ اقبالؔ کا رنگ بھی ملاحظہ ہو۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد — برا ساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا زِ بخشش ہائے آں سلطانِ دیں — مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں
ہر کہ از قیدِ حیات آزاد شد — چوں ملک در شش جہت آباد شد
مسلم ستی دل بہ اقلیمے بند — گم مشواندر جہانِ چون و چند
می نہ گنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دل او یا وہ گرد و شام و روم

آج اسلام جن ہلاکت زائیوں سے گزر رہا ہے اس کو کچھ وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جو اب تک اسلام کو اپنی حیات کا تار و پود سمجھتے رہے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اب اسلام اور مسلمان دونوں حیات کی آخری ساعتوں سے ہم آویز ہیں، لیکن ایک ہندی نژاد شاعر جس کی فضائے تخیل اسلام کی تابنا کیوں سے لبریز ہے، جس کی چشمِ تصور اسلام کی زندہ تاریخ سے بیدار اور جس کا قلب ان صداقتوں سے آشنا ہو چکا ہے۔ جس کا مظہر عین اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس طور پر رجز خوانی کرتا ہے۔

اُمتِ مسلم ز آیاتِ خدا ست — اصلش از ہنگامۂ قالو بلیٰ ست
از اجل ایں قومِ بے پرواستے — استوار از نحنُ نزّلنا ستے
تا خدا ان یطفئو فرمودہ است — از فسردن ایں چراغ آسودہ است
ما کہ توحید خدا را حجتیم — حافظِ رمزِ کتاب و حکمتیم
آسماں با ما سرپیکار داشت — در بغل یک فتنۂ تا تار داشت
سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید — دید بغداد آں چہ روما ہم نہ دید

تو مگر از چرخِ کج رفتار پُرس — زاں نو آئین کہن پندار پُرس
آتشِ تاتاریاں گلزار کیست؟ — شعلہ ہاے او گل دستار کیست؟
از تہِ آتش براندازیم گل — نار ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہاے انقلاب روزگار — چوں بباغ ما رسد، گرد و بہار
رومیاں را گرمِ بازاری نماند — آں جہاں گیری جہاں واری نماند
شیشۂ ساسانیاں درخوں نشست — رونقِ خم خانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخوانِ او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بودست وہست — ملّت اسلامیاں بودست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم ست — امتزاج سالماتِ عالم ست
عشق از سوزِ دل ما زندہ است — از شرارِ لا اِلہ تابندہ است

گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

کشاکشِ حیات کے متعلق اقبالؔ کی تعلیم کتنی حرارت انگیز ہے! تنازع للبقا سے عہدہ برآ ہونے کی تعلیم کس آتش نوائی سے کی گئی ہے۔

سنگ شداے ہمچو گل نازک بدن — تا شدی بنیادِ دیوارِ چمن
از گلِ خود آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن
گر بنا سازی نہ دیوار و درے — خشت از خاکِ تو بند و دیگرے
درعمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذّتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — بامزاج او بساز د روزگار
گر نہ سازد بامزاج او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیب تو ذرّات را

گردشِ ایام را برہم زند	چرخ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار	روزگارِ نو کہ باشد سازگار
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم	زورِ خود را از مہمات عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش ست	چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش ست
ممکناتِ قوتِ مردانِ کار	گردد از مشکل پسندی آشکار
اے ز آداب امانت بے خبر	از دو عالم خویش را بہتر شمر!

حضرات! اقبال کے متعلق میں نے ضرورت سے زیادہ طوالت سے کام لیا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ مجھ پر یہ الزام عائد فرمائیں کہ میں نے مضمون زیر بحث سے ناروا طور پر انحراف کیا ہے، لیکن ''نیت شب بخیر'' اس طویل انحراف سے کچھ اور مقصود نہ تھا۔ میرا مدعا یہ تھا کہ اقبال نے جو رنگ اختیار کیا ہے، وہ مسلمانوں کے مذہبی اور اخلاقی حالات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے، کیسا ہی کچھ نہ تصور کیا جائے۔ ان کا کلام خود زبانِ اردو کے لیے ایک جدید پیغام ہے۔ یہ زندہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے، یہ وہ شاعری ہے جس کو ملحوظ رکھ کر کارلائل نے شعرا کو پیغمبروں کی صف میں لانے کی کوشش کی ہے، اور جائز کوشش کی ہے۔ اقبال کو ایک خالص اسلامی شاعر تصور کرنا چاہیے۔ ان کا پیغام تعلیمِ اسلامی کی زندہ تفسیر ہے۔ اقبال نے شاعری کی ایک نئی جولاں گاہ پیش کی ہے جس میں قدم رکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، اور میں یہ عرض کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ اکبر اور اقبال دونوں اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ اقبال نے اکبر کے رنگ میں بھی طبع آزمائی کی کوشش کی ہے، لیکن دونوں کے خدوخال میں جو بیّن فرق نظر آتا ہے، وہ اصحابِ ذوق و بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔ بہر حال یہ بحث یہاں پر بے موقع ہوگی۔ میں ابھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ اقبال نے اردو شاعری میں ایک جدید بنیاد قائم کی ہے اور اب ادبِ اردو کا سنجیدہ طبقہ اسی طرف مائل ہے۔ اقبال جو منزلیں طے کر چکے ہیں، اب تک وہاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں اردو شاعری کا رُخ اب بالکل بدل چکا ہے۔ ابھی ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو زبان اور فنِ شاعری کے اعتبار سے اقبال کو وہ درجہ نہیں دیتے ہیں جس کو خود اقبال نہیں تو ان کے پُر جوش حامی ان کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ

اقبالؔ اب اُن حدود سے گزر چکے ہیں جہاں پہنچ کر مخالفین ان کے دامن کو ہاتھ لگا سکتے تھے۔ اقبالؔ ناظم نہ سہی، ان کا شاعر ہونا تو مسلمات میں سے ہے!

حضرات! آج کل کے جدید دورِ شاعری کا آپ نے مطالعہ کیا ہوگا۔ آپ خود اندازہ لگا سکے ہوں گے کہ آج کل کی قومی اور نیچرل شاعری کس کی تقلید کر رہی ہے، اور رنگ و بو کے لیے کس گلستاں کی متلاشی ہے۔ غزل سرائی اور قصیدہ گوئی کا زمانہ اب گزر چکا ہے۔ اس میں شک نہیں، ان کو پھر بیداری نصیب ہوگی، لیکن یہ اُس وقت ہوگا جب ایک دوسرے اقبالؔ کی ضرورت زمانہ کو محسوس ہونے لگے گی۔ حقیقت یہ ہے ایک طور پر غزل قصائد اور مثنوی (بزمیہ) کا وجود بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ ہر صنفِ کلام کی ابتدا اور عروج کا زمانہ ہوتا ہے اور ہر کلام میں زمانہ کے میلانات اور افکار کے نقوش کم و بیش نمایاں ہوتے ہیں۔ غزل کی زمین اس کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں ہوتی ہے، لیکن یہاں بھی اقبالؔ کا رنگ غالب ہے۔ اقبالؔ کے لب و لہجہ کا اندازہ کرتے ہوئے بہ مشکل کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ غزل کے رنگ میں بھی کامیاب ہو سکتے تھے۔ میں خود اس خیال کا موید تھا، لیکن ''پیامِ مشرق'' کے شائع ہو جانے کے بعد ان خیالات کی بالکل تردید ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ''لالۂ طور'' کے تحت میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ محض ''اسرار'' اور ''رموز'' کی تفسیر ہے اور لوگ ''اسرار خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' سے مسحور ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک ''لالۂ طور'' کی اہمیت کچھ زیادہ وقیع نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کر دوں گا کہ فی الحقیقت اقبالؔ نے اپنا پیغام ''اسرار'' اور ''رموز'' سے پہلے ''شمع و شاعر'' ہی میں پیش کر دیا تھا۔ فرق صرف ناموں کا ہے۔ شاعری اور فلسفہ یا دل اور دماغ میں جو فرق ہے وہی امتیاز ''شمع اور شاعر'' اور ''اسرار و رموز'' میں ہے۔ ''پیامِ مشرق'' میں جو حصہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے، وہ ''انکار'' اور ''مئے باقی'' ہیں۔ ان کے متعلق کچھ عرض کرنا بے سود ہوگا۔ یہاں اقبالؔ اپنی پوری شاعرانہ بیداریوں کے ساتھ نمایاں ہیں، بالخصوص ''میلادِ آدم'' اور ''انکار ابلیس'' وہ الماس ریزے ہیں جن کا جواب دنیائے شاعری میں اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف ڈانٹےؔ اور ملٹنؔ کی سحر کاریوں میں میسّر آ سکتا ہے۔ آپ ہی انصاف فرمائیں۔

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذرا‌ے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

یا

من زِتنک مایگاں گدیہ نہ کردم سجود
قاہرِ بے دو زخم، داورِ بے محشرم

یا ''مے باقی'' کے اس ہیجان آور پیغام:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!

کا کیا جواب ہے!

حضرات! میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ ''پیامِ مشرق'' میں مے باقی'' کے تحت میں اقبالؔ کا جو کلام (غزل) شائع ہوا ہے وہ کئی صورتوں سے قابلِ توجہ ہے۔ اوّل تو یہ کہ اقبالؔ کے کمالِ شاعری میں یہ ایک مزید انکشاف ہے، دوسرے یہ کہ اقبالؔ نے غزل میں بھی وہی آب ورنگ پیدا کر دیا ہے جو اُن کی دیگر معرکتہ الآرا نظموں میں نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

بہ نوریاں زمنِ پایہ گل پیامے گوے — حذر زمشتِ غبارے کہ خویشتن نگرست!
بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی ست — سفر بکعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است
زخاکِ خویش بہ تعمیر آدمے برخیز — کہ فرصتِ تو بقدرِ تبسم شرر است

....

رمز حیات جوئی؟ بجز در تپش نیابی — در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را
شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی — درماں نیا فریدی آزارِ جستجو را
پا زِ خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم — با نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز
اگرت خارِ گل تازہ رسی ساختہ اند — پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز

....

تا کجا در تہِ بالِ دگراں می باشی
در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

خود غزل کو اقبالؔ نے ''پیغام رسانی'' کا ذریعہ بنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

بہ ایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد میرا ذہن فی الفور نظیریؔ نیشاپوری کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ نظیریؔ کے مانند اقبالؔ نے بھی غزلیات میں مسلسل مضامین کا التزام رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبالؔ کی تمام غزلوں کا تیور یکساں ہے لیکن ممکن ہے۔ اس سے آپ یہ نتیجہ نکالیں کہ اقبالؔ کے ہاں تغزل کا رنگ ہی مفقود ہے۔ اگر میرا یہ اندیشہ صحیح ہے تو میں آپ کے سامنے اقبالؔ کا وہ کلام پیش کروں گا جسے سن کر مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی فرمائیں گے۔

بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آں جا
حدیث دل بزبان نگاہ می گویم

....

بہ رہِ تو نا تمام، زِ تغافلِ تو خام
من و جانِ نیم سوزی، تو و چشمِ نیم بازے

....

فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بُت خانہ — ایں جلوتِ جانانہ، آں خلوتِ جانانہ
از بزم جہاں خوش تر، از حور و جناں خوش تر — یک ہمدم فرزانہ وز بادہ دو پیمانہ
ہر کس نگہے دارد، ہر کس سخنے دارد — در بزمِ تو می خیزد افسانہ زِ افسانہ

....

اے جانِ گرفتارم دیدی کہ محبت چیست؟ — در سینہ نیا سائی از دیدہ بروں آئی
عشق است و ہزار افسوں، حسن است و ہزار آئیں — نے من بہ شمار آیم نے تو بہ شمار آئی
ہم با خود و ہم با او ہجراں کہ وصال است ایں؟ — اے عقل چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی

حضرات! آپ خیال فرماتے ہوں گے، اقبالؔ کے متعلق یہ طوالت پذیری بے محل اور ناروا ہے۔ لیکن آپ یقین فرمائیں، اقبالؔ کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے سے

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ دورِ حاضر میں یہی نغمہ جرسِ کارواں ثابت ہوگا۔ زمانہ کی فطرت اسی کی متقاضی ہے اور اس سے سرتابی کرنی قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اردو کا دامن ان گراں باریوں کا متحمل نہیں ہوسکتا، اور اس میں سنجیدہ مضامینِ نظم و نثر کی گنجائش نہیں ہے۔ میرے بعض کرم فرماؤں کو یہ خیال بھی ہوگا کہ ادبِ اردو کے موضوع پر اقبالؔ کے فارسی کلام کو معرضِ بحث میں لانا بے موقع اور غیر متعلق ہے، یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن میں نے اقبالؔ کا فارسی کلام پیش کیا ہے۔ ان کے فارسی آب و رنگ پر کہیں زور نہیں دیا، یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ اقبالؔ اپنے تمام شاعرانہ کمال کے ساتھ فارسی شعرا کے صف میں داخل ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ اقبالؔ کو شاعری کے وہ مدارج حاصل ہو چکے ہیں کہ ان کا ہندی یا فارسی ہونا اب ایک لاطائل بحث سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ آپ خود غور فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اب غزل اور قصیدہ گوئی دونوں انحطاط پذیر ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب غزل اور قصائد میں وہ خوبیاں باقی نہیں رہیں جو اس سے قبل تھیں۔ میرے کہنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ اب سنجیدہ طبائع اس ساز سے کچھ بے اعتنا ہو رہی ہیں۔ پنجاب خصوصیت کے ساتھ اقبالؔ کا رنگ اختیار کرتا جاتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ اس کی ابتدا لکھنؤ اور دلّی میں بھی ہو جائے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ باوجود اس کے دہلی اور لکھنؤ اہل زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور حق بجانب بھی ہیں، لیکن زمانہ کی طرف سے بالکل مستغنی ہو گئے ہیں۔ اگر آپ آزردہ نہ ہوں اور مجھے اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ اگر زمانہ کی یہی رفتار رہی اور شعرا اور اہلِ زبان کا یہی عالم رہا تو کچھ دور نہیں ہے کہ دلّی کو اس صف سے علاحدہ ہونا پڑے۔ دلّی کی اردو اب بجائے ٹکسالی ہونے کے بازاری اور تجارتی ہوتی جاتی ہے۔ مولانا حسن نظامیؔ، حکیم ناصر نذیر فراقؔ، علامہ راشد الخیریؔ اور ایسے ہی دو چار اور بزرگ باقی ہیں جن کے دم سے اردو کا چراغ اب تک ٹمٹما رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ حضرات اپنے صحیح اور سچے جانشین بھی چھوڑ سکیں گے یا نہیں۔ لکھنؤ پھر بھی غنیمت ہے، ابھی وہاں کی آب و ہوا شعر و شاعری اور زبان کے لیے مساعد ہے، اور اس حیثیت سے میں اس وقت لکھنؤ کو دلّی پر ترجیح بھی دیتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے وہ دن دور نہیں ہے کہ کچھ دنوں میں

اردو کا کوئی اسکول باقی نہ رہ جائے گا، اور یہی اخباری زبان جو اس وقت اس کثرت کے ساتھ ملک کے مختلف حصص سے پیدا ہو رہی ہے، لے دے کر ادبِ اردو کا سرمایہ رہ جائے گی۔

حضرات! اس سلسلہ میں مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میری یہ صاف گوئی مجھے اور زیادہ پیچیدہ مراحل سے گزرنے پر مجبور نہ کر دے، اور اس طور پر کچھ اصحاب اس جلسہ سے اُٹھیں تو ان کے ذہن میں چند باتیں محفوظ بھی رہ جائیں۔ کیوں کہ دلّی اور لکھنؤ کے مسئلہ کو چھیڑنا اپنی شامت اور دوسروں کی بدمذاقی کو دعوتِ جنگ دینا ہے۔ میں بدمذاقی سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا آپ حضرات اس کانفرنس کو مدعو کرنے سے گھبراتے ہیں۔ بہر حال اس مسئلہ کو فی الحال ملتوی رکھیے اور مجھے اب اجازت دیجیے کہ میں موضوعِ زیرِ بحث کے دیگر پہلوؤں کو بھی آپ کے سامنے پیش کروں جن کو میں نے ابتدا میں اس خیال سے نہیں پیش کیا کہ شاید آپ اس کے پہلے ہی سے متوقع رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص جس کی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ وہ ایک سمجھدار اور ذہین مجمع کو اپنا مخاطب بنائے۔ اس سے بہت گھبراتا ہے کہ لوگ اس کا مافی الضمیر پہلے ہی سمجھ لیں۔ گو اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اسی حقیقت کو محسوس کر کے پہلے ہی سے اور وہ بھی انتقاماً فنِ تقریر کے اس اُصول کو ذہن نشین کر لیتا ہے اور دورانِ تقریر میں اس کی مزاولت بھی رکھتا ہے۔ جس کی رو سے بتایا گیا ہے کہ مجمع کو اپنے سے زیادہ قابل نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں نے اُس اصول کو عبارتِ سلبیہ کی صورت میں پیش کیا ہے، لیکن اصل میں وہ ایجاب کے نہایت پُر زور اور عریاں الفاظ اور مفہوم میں ادا کیا گیا ہے۔

حضرات! یہ حقیقت آپ پر روشن ہو گی کہ غدر کے بعد مسلمانوں کی حمایت میں جو شخص سب سے پہلے سینہ سپر ہوا وہ سرسید تھے۔ میں ان کی خدمات کے صرف اس پہلو کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو اردو سے متعلق ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ کالج، تہذیب الاخلاق اور ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ سرسید، محسن الملک، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی، مولانا حالی ایسے ایسے یگانۂ روزگار جو ایک جا اور ایک زمانہ میں بہ مشکل جمع اور پیدا ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کو اپنے پورے جارحانہ اور مدافعانہ طاقتوں کا محاذ بناتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان بزرگانِ قوم کی زبان اور قلم ایک عالم سے برسرِ پیکار تھا۔ سرسید، ڈاکٹر نذیر احمد اور

محسن الملک کی تحریر اور تقریر، مولانا چراغ علی اور مولانا آزاد کی تصانیف، علامہ شبلی اور مولانا حالی کی نظمیں، غرض ایک سیلاب تھا۔ جو ہر مخالفت و مقاومت کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا، اور اردو کے لیے ایسی شاہ راہیں کھول گیا جس پر ہم آج آنکھ بند کر کے آتے جاتے ہیں۔ یہ زمانہ جائز طور پر اردو کا نشاۃ الثانیہ[1] کہا جاسکتا ہے۔ اردو کی ترقی اور توسیع کا یہی عالم تھا کہ اس پر اغیار کی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں اور سر انٹونی میکڈانل کے زمانہ میں ابنائے ملک نے اس پر سب سے پہلا وار کیا۔ لیکن محسن الملک کی آتش نوائیوں نے اسے کچھ عرصہ کے لیے فرو کردیا۔ یہ پہلا واقعہ تھا جب اردو حکومت کے نظروں میں کھٹکی اور یہ مسئلہ ہماری توجہ کو جذب کرنے لگا۔

حضرات! یہ ایک مختصر روئداد تھی، غدر کے بعد اردو کے ابتدائی مدارج کی، وہ زمانہ گزر گیا، وہ سرفروشیاں نذرِ نسیاں ہوئیں، وہ ہم نہ رہے، وہ دل نہ رہا۔ اب ذرا موجودہ دور کے تلخ حقائق سے بھی آشنا ہونے کے لیے تیار ہو جایئے۔ آپ تعجب فرمائیں گے کہ میں موجودہ حالات اور واقعات کو تلخ حقائق پر کیوں محمول کرتا ہوں۔ اس کے میرے پاس وجوہ ہیں۔ میں نہایت ادب سے التماس کروں گا کہ باوجود اس کے کہ اردو کی توسیع اور ترویج کے لیے اتنی کوشش کی جارہی ہے، باوجود اس کے کہ کثیر التعداد اردو اخبار اور رسائل نکل رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرات فرماں روائے دکن نے عثمانیہ یونیورسٹی قائم کردی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں اردو لازمی مضمون قرار دے دیا گیا ہے۔ مختلف گراں پایہ انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔ بایں ہمہ اردو داں طبقہ میں بہ مشکل پانچ فیصدی ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو بے تکلف صحیح اور ستھری اردو بول یا لکھ سکتے ہیں۔ مجھے توقع ہے آپ میرے اس خیال سے آزردہ نہ ہوں گے۔ آپ خیال فرماتے ہوں گے جب ہم جہد سے لحد تک اردو ہی سے وابستہ رہتے ہیں اور جب اردو کے نشر و تعمیم کے ایسے ذرائع اور وسائل موجود ہیں، پھر اردو سے بے بہرہ رہنے کے کیا معنی! حضرات میں پھر عرض کروں گا کہ یہ سب صحیح ہے، لیکن میرا خیال بھی غلط نہیں ہے۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے اور میں جس حقیقت پر پہنچا ہوں، وہ عرصہ کی غور و فکر، تلاش اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں اس وقت مختلف اور متعدد رسائل، اخبارات، کتابیں شائع ہو رہی ہیں درس گاہوں کی کمی نہیں ہے۔

---

[1] نشاۃ الثانیہ Renaissaance۔

انجمنیں کثیر تعداد میں ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ تو نہیں اخذ کیا جاسکتا کہ اردو خاطر خواہ ترقی بھی کر رہی ہے۔ آپ نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور فرمایا ہے کہ محض معدودے چند اخبارات، رسائل اور کتابوں کے علاوہ جتنی اور مطبوعات ہیں، ان سب کی زندگی اور موت ساتھ ہی ساتھ شروع ہوتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری تمام کوششیں غلط راستہ پر ہیں۔ کثرت کے معنی نفع کے تو نہیں ہوسکتے۔ سب سے بڑی فروگزاشت جو ہم سے سرزد ہوچکی ہے اور جس کی اب تک تلافی نہیں ہوسکی ہے۔ یہ ہے کہ اس وقت تک ''اردو'' کا کوئی اسکول قائم نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے پہلے دتی اور لکھنؤ دو ایسے مقامات تھے جہاں اردو کی ٹکسال تھی۔ زبان کی خوبی یا خرابی کا معیار یہیں تلاش کیا جاتا تھا اور یہاں کے فیصلے ناطق ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں نہ کوئی خاص انجمن اس کے لیے قائم تھی، نہ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے تھے، نہ کانفرنس ہوتی تھی اور نہ چندہ جمع ہوتا تھا۔ صرف چند نفوس قدسیہ ایسے تھے جن کی فضیلت کا سکہ معیار امتحان ہوتا تھا۔ اس وقت جس طور پر اردو (Exploit) کی جارہی ہے (ناجائز فائدہ اُٹھایا جارہا ہے) اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ نہیں عرض کرتا کہ اردو کی ایسی جکڑ بند کی جائے کہ اس میں نشر و تعمیم کی گنجائش ہی نہ رہ جائے اور اردو داں طبقہ میں صرف چند ایسے نفوس ہوں جن کو اردو سے عہدہ برآ ہونے کا منصب حاصل ہو۔ یہ اصول ناممکن ہے، غیر مناسب اور بے محل ہوگا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ایک ایسی انجمن یا اکاڈمی قائم کی جائے جس کے فیصلے جہاں تک زبان کی صحت اور سلاست کا تعلق ہے، ناطق تسلیم کیے جائیں۔ اس کے اراکین مشہور، مقتدر اور مسلمہ قابلیت کے اہلِ زبان ہوں۔ اب تک اردو کا کوئی جامع لغت مدون نہیں ہوسکا ہے۔ کوئی معقول گرامر بھی مرتب نہیں ہوسکی ہے، گو اس سلسلہ میں، ہمارے بزرگ محترم مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے سکریٹری، انجمن ترقی اردو کی مساعی ہماری انتہائی شکرگزاریوں کے مستحق ہیں۔ ممدوح نے جس پایہ کی قواعدِ اردو مرتب کی ہے، وہ اپنی آپ نظیر ہے، اور ایک اردو لغت کی تدوین کرنے میں جس سرگرمی اور خلوص کا اظہار کیا ہے، وہ بہرنوع اُمید افزا ہے۔ خدا ان کے عزائم میں برکت دے۔ اسی سلسلہ میں دارالمصنفین کی گراں بہا خدمات کا بھی تذکرہ کرنا لازمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دو ہی رسالے ایسے شائع ہو رہے ہیں جو ایک بڑی حد تک میرے اس

نصب العین کے مطابق ہیں جن کا میں ابھی بھی تذکرہ کر چکا ہوں۔ یعنی معارف اور اردو، خدا ان کو نظر بد سے محفوظ رکھے، اور ان کو آپس کی عریفانہ چشمک کا آماجگاہ نہ بنائے۔

حضرات! اب میں اپنی تقریر کے اس حصہ کی طرف مائل ہونے کی آپ سے درخواست کروں گا جس پر میرے نزدیک اس تمام داستان کی بنیاد ہے۔ میں یہ نہیں عرض کر سکتا کہ ہمارے یہاں ماہرانِ اردو کی کمی ہے، یا خود اردو میں استعداد ترقی نہیں ہے۔ میں صرف یہ نہیں عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اردو کی پرسش نہیں ہے۔ اگر آج فرماں روایانِ دکن اور بھوپال اردو کی سرپرستی سے کنارہ کش ہو جائیں تو جتنی مؤقر انجمنیں آج موجود ہیں اور جتنی گراں قدر خدمات وہ بجالا رہی ہیں، ان سب کا شیرازہ بکھر جائے۔ بہ ظاہر یہ حقیقت نہایت تلخ معلوم ہوتی ہے کہ کسی زبان کی فلاح و نجات کا مدار ایسی بنیادوں پر ہو، لیکن آپ یقین فرمائیں اس کی ضرورت ہر زبان کو ہمیشہ رہی ہے۔ اردو کیوں نظر انداز کی جاتی ہے اور انگریزی کو لوگ کیوں سینوں سے لگائے رہتے ہیں۔ آپ یقین فرمائیں، یہ فیشن یا مغالطہ کی بنا پر نہیں ہے۔ میں اس کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ اس کا اقتصادی پہلو یہ ہے کہ اردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ اردو لکھنے پڑھنے اور سیکھنے میں لوگ تامّل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ آذوقۂ حیات میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ آپ خیال فرمائیں گے، بہت سے فرائض ایسے ہیں، جن کی بجا آوری ہر معاوضہ سے بے نیاز ہے۔ لیکن اس کے لیے لوگ سرفروشیاں کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ مثلاً وطن پرستی، حمایتِ دین وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات بالکل صحیح ہے، صرف یہ مسئلہ زیر بحث کے تحت میں نہیں آتا۔ اردو کا مسئلہ مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ بعض حضرات یہ بھی پیش کر سکتے ہیں کہ یہ قومی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن جیسا میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں، اردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے، اور حصولِ معاش میں اس سے کوئی معتدبہ نفع نہیں ہوتا اور یہی سبب ہے کہ لوگ خلوص، شوق یا ضرورت کی بنا پر اس کی طرف بالکل نہیں متوجہ ہوتے۔ جب تک اردو کی قدر و قیمت روٹیوں میں تحویل نہ کی جا سکے۔ لوگوں کی توجہ اس طرف بہ مشکل منعطف کرائی جا سکتی ہے۔ ہم تمام عمر انگریزی زبان سیکھنے میں صَرف کر دیتے ہیں اور ٹکسالی انگریزی لکھنے پر قادر نہیں ہوتے، لیکن یہ وقت ہمت شکن نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ حصولِ معاش یا ملازمت میں یہ بوجوہ معلوم معین ہوتی ہے۔

اردو داں دونوں حالتوں میں محروم رہتا ہے۔ یہاں نہ ڈگری کی پُرسش ہے اور نہ ذاتی قابلیت کی کوئی قیمت! پھر آپ ہی بتلائیں اردو سیکھنے کی دردسری سے فائدہ؟ ہر قابلیت کے لیے کوئی مخصوص معاوضہ ہے۔ معاوضہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، تاجر، سپاہی غرض کہ سب کے لیے ہندوستان اور دیگر ممالک میں کم و بیش ایسی جگہیں مل سکتی ہیں، جہاں وہ قابلیت کا معاوضہ حاصل کرسکتا ہے۔ پھر آپ ہی فرمائیں اردو میں تبحر حاصل کر کے کسی کو نفع کی کیا توقع ہوسکتی ہے، کتنے اسکول یا کالج ہیں جہاں ان کے لیے جگہ نکل سکتی ہے؟ کتنے دفاتر یا محکمہ جات ہیں جو ان کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہیں؟ کتنے اخبارات یا رسائل ہیں جہاں ان کی پُرسش ہوسکتی ہے۔ آپ گھر بیٹھ کر تصنیف اور تالیف ہی کی ابتدا کیوں کر کرسکتے ہیں، جب ان کے پڑھنے والے ہی معدوم ہیں، اور آپ کی تصنیف یا تالیف کی طلب ہی نہیں ہے۔ رہا یہ کہ کسی فن پر کامل دسترس رکھنا ہی ایک معاوضہ ہے۔ اس کے متعلق صرف یہ گزارش ہے کہ زندگی کی بعض ضرورتیں اتنی شدید اور ناگزیر ہوتی ہیں کہ انسان کو اس کلیہ سے منحرف ہونا ہی پڑتا ہے۔

حضرات! دوسری دقت جس کا ہم کو سامنا ہے، وہ ہماری تمدن اور معاشرت سے متعلق ہے، اور اس سلسلہ کی آخری کڑیاں (یادش بخیر) فضائے مغرب سے منسلک ہیں۔ اس عالم گیر میلانِ ذہنی کا کیا علاج جس نے مشرقی معاشرت اور تمدن کے مقابلہ میں سرابِ مغرب کو باصرہ فریب بنا رکھا ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ کو آپ پیشِ نظر رکھ کر اندازہ فرمائیں، آپ محسوس کریں گے کہ ہمارے خیال و افکار پر مغرب اور مغربیت کا رنگ کس درجہ غالب ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ایک عرصہ سے مسلمان اپنے مذہبی معتقدات اساسی کو فراموش کر چکے تھے، اور ان کی بجائے ان میں باطل پرستی (وسیع معنوں میں) سرایت کر چکی تھی۔ میں اس وقت ان تمام واقعات اور حقائق کو آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جو اسلام اور اسلامیوں پر گزر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک زندہ حکمراں قوم کے لیے ہندوستان کی سرزمین سب سے زیادہ مہلک ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا آخری دورِ حکومت اور اگر اجازت دیں تو اس میں مغلوں کا پورا عہدِ حکومت شامل کرلوں، جہاں تک نفسِ اسلام اور معاشرت اسلامی کا تعلق ہے، کچھ زیادہ خوش آئند نہ تھا۔ ملک میں کچھ اس طور پر امن و تسلط قائم رہا، اور بیرونی

حملوں کا احتمال اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کا وہ مذہب جو ہر کربلا کے بعد زندہ ہوتا تھا اور جس کے جوہر کشاکش حیات میں نمایاں ہوتے تھے، عافیت اور سکون کا خوگر ہو گیا۔ مسلمانوں کا مذہب ان مذاہب سے بالکل مختلف ہے جن کا مدار صرف معتقدات پر ہو، وہ کشاکش حیات سے مقابلہ کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، نہ کہ سکونِ حیات سے بہرہ انداز ہونے کے لیے۔ وہ مذہب جو دنیا کی علائق اور پیچیدگیوں کو نظر انداز کر کے محض حیات بعد الممات کو پیش نظر رکھتا ہو، یا جس کا مدار صرف رسمیات عبادت گزاری پر ہو، دنیا میں کامیاب نہیں رہ سکتا۔ شاہانِ مغلیہ کے دورِ حکومت کو آپ کئی حیثیتوں سے عہدِ زرّیں کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک ملک کے نظم ونسق یا امن وتسلط کا تعلق ہے، آپ جس طرح چاہیں اس دور کی تعریف فرمالیں، لیکن اگر آپ اس حقیقتِ حال کا اسلامی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ حالات اور واقعات کچھ بہت زیادہ امید افزا نہ تھے اور اس کا بہترین ثبوت، محی الملت اورنگ زیب عالم گیر کا دورِ حکومت تھا۔ اورنگ زیب کی حکمرانی فی الحقیقت شریعتِ اسلامی کی ترجمان تھی۔ رہا یہ امر کہ یہ دور کامیاب بھی رہا یا نہیں، ایک بڑی حد تک متنازعہ فیہ ہے۔ بہر حال اگر ہم مخالفین ہی کے دعوے کو تسلیم کرلیں تو اس سے میرے نظریہ کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کی ناکامیابی ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے پیش رووں نے شریعتِ اسلامی کی علم برداری کماحقہٗ نہیں کی تھی، اور درحقیقت عالم گیر کا طرزِ حکومت اس غیر اسلامی طرزِ حکومت کا ردّ عمل تھا، جس کے ذمہ دار اس کے پیش رو تھے۔ اس کے بعد جو مراحل پیش آئے اس میں مسلمانوں کو سخت سے سخت ہزیمتیں اُٹھانی پڑیں۔ اب بجائے اس کے کہ کافی غور وفکر کے بعد ایک صحیح راستہ اختیار کیا جاتا، لوگوں نے یہ تصور کرلیا کہ واقعات جو رنگ اختیار کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ ایشیا کا صحیفۂ اخلاق پرزہ پرزہ ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ اپنی استعدادِ حیات ہی زائل کر چکا تھا، یا اس میں فی نفسہٖ کچھ ایسی کمزوریاں تھیں جو سیلابِ مغرب کی تاب نہیں لاسکتی تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود ایشیا اپنا دیرینہ سبق بھلا چکا تھا اور اسی وجہ سے اپنی استعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔ لوگ غلط راستہ پر چلے اور خسارہ میں رہے، لیکن سمجھتے یہ رہے کہ اس خسارہ کا باعث اصلی ان کی اسلاف کی وہ تعلیم تھی جس کے سمجھنے میں ان سے ابتدا ہی میں غلطی سرزد ہو چکی تھی۔

حضرات! طبائع کا یہ حال تھا کہ علم وفن کے ظاہری کمالات اُفقِ مغرب پر چمک اُٹھے۔ ایشیا ٹھوکر کھا چکا تھا، اور بجائے اس کے کہ وہ خود اپنی قوتوں سے سنبھلتا یا گر کر اُبھرتا، مغرب نے اسے سہارا دے دیا اور وہ بھی اس طور پہ کہ ایشیا اپنے اعضا و جوارح کی استعداد ہی کو فراموش کر بیٹھا۔ اس کے لیے مغرب نے خیالات وضع کیے، مطمحِ نظر قائم کیا، قلب و دماغ ایجاد کیے اور کیا کیا نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنی صلاح و فلاح کا خالقِ اکبر مغرب کو قرار دے دیا۔ اس کے جو نتائج ظاہر ہوئے یا ہونے والے ہیں، ان کا تذکرہ بے سود ہے۔ میں نے یہ تذکرہ محض اس خیال سے چھیڑا تھا کہ اس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ہمارے قلب و دماغ اس وقت کن تاثرات کے حامل ہیں۔

حضرات! میں نے جو روئداد اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کی ہے، وہ ایک حد تک مہمل اور غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں نے اس کا تذکرہ یوں ضروری سمجھا کہ اس سے آپ ہماری اس روحانی انجماد اور مہلک غفلتوں کا اندازہ کر سکیں گے جو ہمارے موجودہ دورِ حیات پر محیط ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اردو کی طرف سے لوگ بے اعتنا ہونے لگے ہیں۔ اس کے متعلق چند وجوہ بھی پیش کیے تھے۔ لیکن اس سلسلہ کی آخری بحث جو ابھی ابھی ختم ہوئی ہے، آپ کی توجہ کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا، میں نے وہ تمام اسباب پیش کر دیے جو ہماری بے توجہی کے موجب ہیں۔ یہ واقعات اور حقائق ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ مسئلہ زیرِ بحث کو اس صورت میں پیش کرنے کی اجازت دیجیے کہ کیا ان حالات کے ماتحت اردو کی خدمت ہم پر لازم آتی ہے؟ لیکن اس سوال پر اظہارِ خیال سے قبل میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کو سب سے پہلے ان نوعیتوں کو متعین کر لینا چاہیے جن کے ماتحت یہ مسئلہ بحث میں لایا جا سکتا ہے۔

حضرات! سب سے پہلے تو ہم کو اس کا تاریخی پہلو لینا چاہیے۔ اردو کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس زبان کی بنیاد مسلمانوں کے ہاتھوں سے پڑی ہے۔ اس میں شک نہیں، اس زبان کو مسلمان فاتحین اپنے ساتھ نہیں لائے۔ اس میں بھی شک نہیں، اس کی اصل وہ پراکرتیں تھیں جو مختلف زمانوں میں مختلف طور پر نو واردوں کی گفت و شنید سے ممزوج ہوتی رہیں، اور

بالآخر شاہ جہاں کے دور میں بحیثیت مجموعی اردو کے نام سے موسوم ہوئیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف اس زبان کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی تمام تدریجی اور ارتقائی منازل میں انھیں کا ذہن ودماغ کارفرما رہا، اس لیے اس کے تحفظ اور تعمیم کی ذمہ داری بھی انھیں کے شانوں پر رکھی جائے گی۔ اردو کا موجودہ ادبی درجہ کیسا ہی کچھ ہو جس کے متعلق، میں اس سے قبل اظہار خیال کر چکا ہوں۔ اس میں شک نہیں وہ مسلمانوں کی تمدن و معاشرت، ان کے ذہنی اور دماغی ترقی کی تنہا حامل ہے۔ لوگ اس حقیقت کو بہت کم سمجھ سکے ہیں کہ کسی قوم کی زبان اس کی قومی حیثیت کی علم بردار ہوتی ہے۔ کسی قوم کے اوّلین آثارِ انحطاط کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کے لٹریچر پر نظر ڈالیے۔ آپ پر یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو جائے گی کہ قومی زوال کی ابتدا ہمیشہ زبان کے زوال سے ہوئی ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس کے اثر سے تشخصاتِ ملّی تک فنا ہو گئے ہیں۔ میں بہ خوفِ طوالت اس وقت تاریخی مثالیں آپ کے سامنے نہیں پیش کرنا چاہتا۔ آپ کسی قوم اور ملک کو نظر میں رکھ کر اس کلیّہ کا جائزہ لیجیے۔ آپ ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

حضرات! اس کا دوسرا پہلو ادبی ہے۔ اس کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، اس کا میں نے ابتدا ہی میں اشارہ کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں بہت لوگ ایسے ملیں گے جن کو عربی اور فارسی پر کامل عبور ہو! میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ آج کل ان لوگوں کی بھی تعداد خال خال نظر آئے گی جن کو ان زبانوں میں مذاقِ سلیم حاصل ہو۔ اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کا میں اعادہ کر چکا ہوں یعنی مغربیت کا غلبہ، دوسرے یہ کہ عربی اور فارسی کے بہت سے جواہر ریزے خود اردو میں منتقل ہو چکے ہیں، اور اب ضرورت کے وقت لوگ فوراً اردو ہی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عربی اور فارسی سے بے خبر رہنے کے باعث مسلمانوں پر جو زوال نازل ہونے والا تھا، اور جو ایک حد تک نازل بھی ہو چکا ہے، اس کا تدارک اور سدّ باب اردو نے کر دیا۔ اس طور پر اردو ایک حیثیت سے مسلمانوں کی قومی زبان ہو چکی ہے اور اسے وہ ادبی منزلت حاصل ہو چکی ہے جس کی ہم کو ضرورت تھی۔ اس کی تیسری حیثیت معاشری ہے۔ آج کل ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کے کم و بیش سات کروڑ نفوسِ قدسی دادِ زیست دے رہے ہیں، اور چوبیس کروڑ دیگر مذاہب کے نام لیوا ہیں۔ اردو کم و بیش ہر جگہ بولی نہیں تو

سمجھی ضرور جاتی ہے۔ اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان ایسی نہیں جو ہندوستان میں اس کثرت اور سہولت کے ساتھ بولی یا سمجھی جاتی ہو۔ یورپ میں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں، جن کے بولنے اور سمجھنے والے نسبتاً بہت کم تعداد میں پائے جائیں گے۔ تاہم ان زبانوں کی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ جو حیثیت فرنچ کو یورپ میں حاصل ہے، وہ اردو کو ہندوستان میں نصیب ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یورپ فرنچ کا گہوارہ ہے۔ ہندوستان صرف اردو کی لحدِ تاریک۔

حضرات! اردو کی مختلف نوعیتیں آپ کے سامنے پیش کی جا چکیں۔ آپ اس کی اہمیت سے بھی آشنا ہو چکے۔ اب میں آپ کے سامنے چند ایسے واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا پر آپ کو اردو کی حمایت میں حصہ لینا چاہیے۔ دشواریاں ضرور زیادہ ہیں، لیکن دشواریاں اسی وقت تک دشواریاں رہتی ہیں جب تک ان سے عہدہ برآ ہونے کا عزم نہ کر لیا جائے۔ طلبِ صادق اور عزمِ محکم سے بسا اوقات تقدیریں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ اسی قسم کی دقتیں عرفیؔ کے سامنے تھیں، جن کا اس نے ہمیشہ کے لیے یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا تھا۔

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چوں محمل را گراں بینی

حضرات! اردو ہماری گذشتہ عروجِ عظمت کی تنہا یادگار یا سوگوار ہے۔ یہ حقیقت اس کا دامن ہماری ذات کے ساتھ وابستہ ہے، یا اس کے تکوین و وجود کے دوسرے ذمہ دار ہیں۔ اس واقعہ سے آشکار ہو جاتی ہے کہ ہم اس کے عالمِ وجود میں لانے کی ذمہ دار نہ بھی ہوں، اغیار اسی بنا پر اس کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں۔ پھر یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ہماری یا ہم اس کے نہیں ہیں۔ اگر اس مسئلہ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ اردو کے ساتھ اغیار کو جو مخالفت ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اردو کو عربی اور فارسی سے وابستگی ہے۔ اس نے مسلمانوں کے آغوش میں آنکھ کھولی اور مسلمانوں نے اس کے تحفظ، نشر و تعمیم میں اپنے بہترین سرمایۂ ذہنی اور دماغی سے دریغ نہیں کیا۔ اس حقیقت سے مجھے خود انکار نہیں ہے بلکہ میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ وہ عربی اور فارسی الماس ریزوں کی آئینہ دار ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کا

دامن دوسری زبانوں کے جواہر ریزوں کے لیے کبھی تنگ رہا ہے۔ جہاں تک اس کی وسیع دامانی اور سیر چشمی کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ میں نے بہ خوفِ طوالت اس کی ابتدا سے تاریخ کہیں نہیں پیش کی ہے، اور نہ اب اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ترکی، اسپینی، پرتگالی، انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت اور بھاشا وغیرہ سے کس طور پر ممزوج کی گئی ہے اور ان زبانوں کے الفاظ کس طور پر اور کس حد تک اس میں موجود ہیں۔

حضرات! اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی قومی زبان ام لالسنہ عربی ہے۔ اس کا حاصل کرنا ان کا قومی شعار ہونا چاہیے، لیکن مسلمانوں کی موجودہ نسل میں کم لوگ ایسے ملیں گے جو اسلامی تہذیب اور معاشرت کے اُن ادبی لطائف اور حکیمانہ معارف سے براہِ راست آشنا ہوسکتے ہیں، جن کی عربی اور فارسی ادبیات حامل ہیں۔ ہم میں کم لوگ ایسے مل سکتے ہیں جو فارسی یا عربی زبان پر کامل عبور رکھتے ہیں، اور ان سے براہِ راست صحیح طور پر کچھ بھی اخذ یا اقتباس کرسکتے ہیں اور بعض اوقات اسی بنا پر نہایت فاش غلطیاں سرزد ہوچکی ہیں۔ ان علوم سے جن سے کچھ ہم نا آشنا ہیں، اس کی کمی صرف اردو سے پوری ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ تقریباً تمام مشہور اور ضروری عربی فارسی کتابیں اردو کا جامہ اختیار کرچکی ہیں۔ اس میں شک نہیں اس سلسلہ میں ترقی کی بے حد گنجائش اور ضرورت ہے، لیکن اگر ہم اس ضرورت کو ایمان داری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنی قوتِ عمل کو برسرکار نہ لائیں۔

حضرات! دوسرا امر جو میں اس سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ اردو کے لنگوا فرنیکا (جگت بھاشا) ہونے کا ہے۔ یہ ایک نہایت معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جس پر مخالفین اور موافقین دونوں اپنی پوری قوت صَرف کررہے ہیں، اور چوں کہ یوماً فیوماً یہ نہایت اندیشہ ناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ میں محض اس خیال سے کہ آپ شاید ایک صحیح نقطۂ خیال پر آسانی کے ساتھ پہنچ سکیں، اسے کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حضرات! جو مسئلہ اس وقت اس درجہ اہم اور وقیع نظر آرہا ہے، اس کی ابتدا آج سے تقریباً ساٹھ سال پیش تر ہوچکی تھی۔ 1863ء میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا

مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعے سے قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ اسی سوسائٹی سے 1866ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن عالمِ وجود میں آئی جس نے دوسرے ہی سال وائسرائے کی خدمت میں چند معروضات پیش کیں، جن کا ایک مختصر خاکہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

1۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔

2۔ دیسی زبانوں میں انہیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب طلبۂ کلکتہ یونیورسٹی انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

3۔ یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔

یہ تجویز گورنمنٹ نے ایک حد تک پسند کر لی تھی، لیکن 1882ء میں جب دیسی زبان کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوا تو واقعات نے دوسرا پہلو اختیار کیا، اور یہ تجویز بارآور ہوتے ہوتے رہ گئی۔ 1917ء میں یہ مسئلہ پھر حکومت کے سامنے آیا۔ اس موقع پر ہزاکسلنسی وائسرائے نے اپنے خیالات کا جس طور پر اظہار فرمایا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''اگرچہ مجھے ان اصحاب کے ساتھ دلی ہمدردی ہے جو دیسی زبانوں سے بے پروائی کیے جانے کے شاکی ہیں۔ لیکن اب انگریزی کا درجہ دیسی زبانوں کو دیا جانا عملی پالیٹکس سے باہر ہے۔ اس مسئلہ میں سب سے بڑی دقت مختلف دیسی زبانوں کا وجود ہے جس کا کوئی قابلِ اطمینان علاج اب تک نہیں پیش کیا گیا۔''

ہزاکسلنسی کے ان خیالات پر اگر آپ غور فرمائیں تو جہاں اور بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان میں ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور یہ ضرورت صرف آج نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ یہ مسئلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے زیرِ بحث رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مَیں آپ کے سامنے کمپنی مذکور کے ایک فاضل رکن مسٹر کریو کے خیالات پیش کرتا ہوں۔ وھوھذا:

''اردو کی اس وقت یہاں حالت بجنسہٖ فرنچ کی سی ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس ایک اردو کے جان لینے سے ایک حصہ ملک سے دوسرے حصہ ملک تک بے تکلف آؤ جاؤ، کسی معاون اور ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اردو، عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور فارسی خط میں (بہ نسبت دیوناگری کے) اس کا لکھا جانا زیادہ آسان اور بامعنی ہوتا ہے۔''

حضرات! اردو کی یہ حالت اس وقت تھی جب وہ آج سے بہ قدر سوا سو سال نوعمر تھی! یہ اردو کے اسی استعداد اور ہمہ گیری کا تصرف تھا کہ آخر 1835ء میں یہ سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی۔ اس مدت دراز میں یہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ایک واقعہ ہے جس کی تفصیل کی مجھے ضرورت نہیں معلوم ہوتی، یہ وہ زمانہ تھا جب اردو نے قلعۂ معلٰی سے ہجرت کر کے فورٹ ولیم میں پناہ لی تھی، اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم میں اردو کالج قائم ہوا تھا۔ سرکاری سرپرستی اور کلکتہ کی آب و ہوا دونوں راس آئیں، اور تقریباً نصف صدی تک اردو وہیں پھلتی پھولتی رہی۔ لیکن آخرکار یادِ وطن غالب آئی اور 1840ء میں ڈاکٹر اسپرنگر کی نگرانی میں دتی میں ایک اردو سوسائٹی قائم ہوئی، جو غدر تک نہایت کامیابی کے ساتھ ترقی کے ابتدائی مراحل طے کرتی رہی۔ اس کے بعد علی گڑھ اور سائنٹفک سوسائٹی کا دور آتا ہے جس کا ایک مجمل تذکرہ آپ اس سے قبل سن چکے ہیں۔

حضرات! اس مختصر سرگزشت کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ابتدائے عہدِ انگریزی سے ہی ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ ابتدا ہی میں یہ حقیقت تسلیم کرلی گئی تھی کہ ہندوستان میں اگر کسی زبان میں جگت بھاشا ہونے کی صلاحیت تھی تو وہ اردو تھی۔ جس حد تک اس بحث پر گفتگو ہو چکی ہے اور جن واقعات کا میں تذکرہ کر چکا ہوں، کیا اس کی بنا پر یہ عرض نہیں کرسکتا کہ صرف اردو ہی ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے۔ اردو اور ہندی کا جو لوگ سوال اٹھاتے ہیں وہ حقیقتاً زبان کے فلسفہ سے ناآشنا ہیں۔ اردو کی ساری داستان آپ کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی پر غور

کرنے سے صاف ظاہر ہوگا کہ اس میں ہندو مسلم اتحاد کے عناصر پورے طور پر ممزوج ہو چکے ہیں، اور اب صرف جہالت اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا بہترین مظہر خود اردو ہے!

حضرات! زبان تین چیزوں سے مرکب ہے۔ اسما، افعال اور حروف۔ زبان کی اصل افعال اور حروف پر ہے۔ اسما دوسری زبانوں سے منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ مٹتے رہتے ہیں اور بدلتے جاتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اور وسائل آمد و رفت میں ترقی ہوتی جائے گی، اسما کا ہر زبان میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ خود عربی اس سے بری نہیں ہے۔ سینکڑوں اسما اور الفاظ دوسری زبانوں کے آ کر مخلوط اور ممزوج ہو گئے ہیں۔ فارسی میں بے شمار الفاظ عربی کے آ کر مل گئے ہیں۔ انگریزی میں بے شمار یونانی اور لاطینی الفاظ ہیں۔ بایں ہمہ آپ ان کو عربی، انگریزی یا فارسی ہی کہتے رہتے ہیں۔ اسی طور پر اگر غریب اردو میں عربی فارسی اسما مل گئے ہیں تو اس سے اس کے ہندستانی ہونے میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کے تمام تر افعال، تمام تر حروف اور نصف اسما بھاشا یا ہندی ہیں۔ اس میں شک نہیں ہندو اور مسلمانوں کے اور مذہبی ضرورتوں کے لحاظ سے جو کبھی نہیں مٹ سکتیں، اس کا خزانہ عاریت باختلاف، قومیت عربی فارسی اور سنسکرت ہی رہے گا، اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ ''مصر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی زبان عربی ہے، لیکن عیسائیوں کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قبطی ہیں۔'' (مقتبس)

حضرات! دوسرا اعتراض اردو پر رسم الخط اور اس کی پیچیدگیوں کا ہوتا ہے۔ یہ اعتراض نہایت معرکتہ الآرا ہے، اور میں اسے کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اردو اور اردو کا رسم الخط دونوں ہندو مسلمانوں کا ایک پُر خلوص تاریخی مفاہمہ ہے، جن پر دونوں ایک عرصہ تک کاربند رہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر عربی، فارسی اور ترکی کو پسِ پشت ڈالا اور اپنے ملکی بھائیوں کی زبان کو سر آنکھوں پر لے لیا اور اس طور پر انتہائے ایثار کا ثبوت دیا۔ ہندوؤں نے اس کا یہ معاوضہ دیا کہ انھوں نے اپنے نو وارد مہمانوں کے وہ حروف اختیار کر لیے جو سامی عہد کے یادگار تھے۔ اس طرح پر گویا رشتۂ زنار میں تسبیح کے دانے

پرو دیئے گئے! بہر حال اگر اب یہ مفاہمہ نظر انداز کرنے کے قابل ہو گیا ہے اور یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اردو رسم الخط فی نفسہٖ ناقص ہے، تو آپ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ فی الحقیقت یہ ''حروف نہ صرف مختصر نویسی کا ایک اعلیٰ نمونہ اور فنِ تحریر کے ارتقا کی جامع اور مختصر تاریخ اور پٹ مین کے معلم اور ہادی ہی نہ تھے، بلکہ تاریخ زبانِ اردو کے وہ بے مثل مفسّر اور شارح بھی تھے کہ بہ یک نظر ان کل الفاظ کو مع ان کی پوری شکل وشمائل اور صحیح آواز و معنی اور چست و درست لب و لہجہ کے عیاں و ظاہر کرسکیں، جن کے آمیزش سے یہ زبان صدیوں کی کدوکاوش کے بعد آج شرفا و نجبا کے منہ تک آنے کے قابل اور لائق بنی، اور اپنے گذشتہ کارناموں کو آپ بتا رہی ہے۔'' رسم الخط کے متعلق آج کل ایک نہایت مفید بحث چھڑی ہوئی ہے اور رسالہ اردو میں چند نہایت سنجیدہ اور جامع مضامین اس مبحث پر شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن جہاں تک میری رائے ہے، یہ نقص اتنا سنگین نہیں ہے کہ اردو من حیث الکل موردِ لعن وطعن قرار دے دی جائے یا جس کی بنا پر بہی خواہانِ اردو کو مایوس اور بددل ہونا چاہیے۔ دنیا کا کوئی رسم الخط ایسا نہیں ہے جس میں دوسری زبانوں کے وہ الفاظ جو صحیح مخارج سے ادا کیے جائیں، ظاہر ہوسکیں۔ تلفظ کا اظہار کسی رسم الخط سے نہیں ہوسکتا، اس کے لیے صرف سامعہ اور ناطقہ کی ضرورت ہے۔ انگریزی کے بعض الفاظ کو لے لیجیے، جہاں تک الفاظ میں حروف کی نشست و دروبست کا تعلق ہے، کوئی شخص نہیں کہہ سکتا، بشرطیکہ اس نے ان کا صحیح تلفظ کہیں سنا نہ ہو کہ ان کا صحیح تلفظ کیا ہوگا۔ پھر اس کا کیا علاج ہے کسی زبان کے مخصوص لب ولہجہ کو دوسری زبان والا ٹھیک طور پر ادا بھی نہیں کرسکتا۔ اس بنا پر اس زبان کے رسم الخط پر حرف نہیں آتا۔ تلفظ کا مدار اس میں شک نہیں ایک بڑی حد تک رسم الخط، اعراب اور حرکات پر ہوتا ہے، لیکن یہ فرض کر لینا کہ اس کا مدار صرف اسی پر ہے، بالکل ناروا ہوگا۔ دنیا میں ایسی زبانیں بھی کبھی رائج رہی ہیں جن کے الفاظ اور حروف کچھ اور ہوتے تھے اور ان کا تلفظ کچھ اور ہوتا تھا۔ اس کی بہترین مثال 'پہلوی' ہے، پھر دور کیوں جائیے۔ انگریزی میں بھی ایسے الفاظ ملیں گے جن کے حروف اور ان کی دروبست سے ان کے تلفظ کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ رسم الخط کے سیکھنے میں نہایت دقّت اور طوالت ہوتی ہے۔ اس کے متعلق میں اکبر کے وقت کا طریقۂ تعلیم آپ کے

سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا تذکرہ بابو نرندر ناتھ نے ''ترقیِ علوم'' میں کیا ہے۔ وھوھذا:

''بچوں کو پہلے فارسی حروف تہجی سکھائے جاتے۔ اس میں آٹھ دن سے زیادہ نہ لگتے۔ املا سکھانے اور پڑھانے میں دوسرے آٹھ روز صَرف ہوتے۔ پھر جملے اور اخلاقی فقرات بتائے جاتے، اور ایک ماہ کے اندر اندر (اس غیر زبان کو) لڑکا خود سب پڑھ لیتا۔''

حضرات! اس بیان میں بالکل مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہندی املا اس سے سہل ہے، اور اس میں املا کی غلطیوں کا کم احتمال ہے۔ لیکن زودنگاری اور مختصر نویسی کی مثال صرف اردو رسم الخط میں مل سکے گی۔ اب رہا یہ امر کہ عربی اور فارسی الفاظ کا املا نسبتاً مشکل ہے اور اس میں غلطیوں کی گنجائش ہے۔ اس کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ عربی اور فارسی کے وہ الفاظ جن کا املا مشکل ہوتا ہے۔ بالعموم ایسے وقت استعمال میں لائے جاتے ہیں، جب طالب علم تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرتا ہے، اور اسے فارسی عربی میں کسی قدر دست گاہ حاصل ہو جاتی، پھر ایسی حالت میں اسے املا کی کوئی دقت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ معمولی نوشت خواند کا طالب علم ہر زبان کے املا میں غلطی کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ بہر حال اگر اردو کا مقابلہ ہندی سے ہے تو اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندی خط سے زیادہ آسانی کے ساتھ اردو خط پڑھا جا سکتا ہے، اور اسی حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا ہے:

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو	بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بس کہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں	کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

حضرات! اصل یہ ہے کہ جو لوگ یا جو قوتیں ہندو مسلم اتحاد کو کسی خاص غرض کی بنا پر غیر مفید سمجھتی ہیں، وہی اردو ہندی کے مناقشہ کو مہمیز کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کے خلوصِ نیت پر حرف نہیں لایا جا سکتا، تو میں عرض کروں گا کہ فی الحال آپ رسم الخط کے مسئلہ کو مختلف حصصِ ہندوستان کے رواج پر کیوں نہ چھوڑ دیں۔ رفتہ رفتہ یہ اختلافات خود مٹ جائیں گے۔ ہم کو اس وقت اکبر مرحوم کے اس خیال کو ذہن میں رکھ کر عبرت

حاصل کرنی چاہیے۔

ہم اردو کو عربی کیوں نہ کریں، اردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
جھگڑے کے لیے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں پر ایک اکھاڑا قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

حضرات! اردو پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ اس کثرت سے آتے ہیں کہ ان کا سمجھنا، یا یاد رکھنا سیکھنا دشوار ہوتا ہے۔ اس اعتراض پر کچھ اور عرض کرنے سے قبل میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سی زبان ہے جس کا سمجھنا، لکھنا، پڑھنا یا سیکھنا دشوار نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہے۔ انگریزی سے زیادہ غیر مانوس زبان تو ایک ہندستانی کے لیے بہ مشکل کوئی اور ہو سکتی ہے، لیکن ابتداءً آپ کو مدراس یا کلکتہ نواحِ فورٹ ولیم میں بہت سے ایسے جاہل محض مل سکتے تھے اور اب بھی مل سکتے ہیں۔ جو دیگر زبانوں سے ناآشنائے محض تھے، لیکن اپنا مافی الضمیر آسانی کے ساتھ انگریزی میں ادا کر سکتے تھے۔ بہت سے ہندوستانی سپاہی جو جنگِ یورپ میں شریک تھے، ایسے ملیں گے جو باوجود اس کے کہ نہایت قلیل عرصہ تک یورپ کی سرزمین پر رہے۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ہندستانی جس کے خمیر میں ہندوستان کی آب و گل موجود ہے اور جس کے ہوش و حواس اور ذہن و دماغ یہاں کے لب و لہجہ سے آشنا ہیں۔ اردو نہ سیکھ سکے یا اس میں نہایت آسانی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ جہالت، تعصب اور تنگ نظری کو خیر باد کہہ دیا جائے تو ہمارے ابنائے وطن اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ اردو ہی ایسی زبان ہے جو نہایت آسانی کے ساتھ مقبول انام بنائی جا سکتی ہے۔ اگر کسی خاص امر کی بنا پر وہ کوئی دوسری زبان اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کم از کم یہی محسوس کر لینا چاہیے کہ اردو اس سلسلہ میں دوسری زبانوں سے زیادہ قطع مسافت کر چکی ہے۔ وہ ہندوستانی زبان جس کا خاکہ ہندوستان کے سب سے بڑے مقتدر فرد نے پیش کیا ہے، وہ کسی حیثیت سے علمی یا ادبی زبان نہیں بن سکتی۔ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ اسے علمی یا ادبی ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے تو میں عرض کروں گا کہ آخر اس میں کیا قباحت ہے۔

اگر ہم ایک ایسی زبان کو ترقی دیں جس میں دونوں صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، آخر ہندستانی کا مفہوم کیا ہے۔ شاید اس کے یہی معنی ہوں کہ اس زبان کے تمام الفاظ ایسے ہوں جو کسی بیرونی زبان سے مستعار لیے گئے ہوں یا ان میں دیگر زبانوں کے الفاظ کی آمیزش نہ ہو، میں نہیں سمجھ سکتا۔ دنیا میں کوئی زندہ زبان بیسویں صدی میں ایسی بھی دریافت کی جا سکی ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کم و بیش نہ پائے جاتے ہوں۔ ہندستانی زبان کا عملی مفہوم میرے نزدیک یہ ہے جسے عام لوگ آسانی کے ساتھ سمجھ لیں یا جس میں سہولت کے ساتھ اظہار خیال کر سکیں۔ اگر یہ مفہوم صحیح ہے تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، کیا اردو بہمہ وجوہ ان صفات سے متصف نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان خواہ وہ کیسی ہی صاف سلیس اور شستہ کیوں نہ ہو، ادنیٰ طبقہ کے لب ولہجہ میں جب ادا کی جائے گی، اس کی مخصوص لطافتیں بالکل مفقود ہو جائیں گی۔ وہ ہندستانی جس کا خاکہ مہاتما گاندھی نے پیش کیا ہے، ہمارے سامنے ہے۔ میرا خیال ہے پنڈت مالوی بھی اسی علم برداری کا دم بھرتے ہیں۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، کیا وہ زبان جسے پنڈت موصوف بولتے ہیں۔ ایک دہقانی یا ادنیٰ طبقہ کی زبان پر آنے کے بعد اپنی مخصوص لطافتیں (اگر کوئی ہوں) قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر جب اصل ہی بے حقیقت اور رکیک ہو تو اس کا ان لوگوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوگا۔ کم سے کم میرے حیطۂ تخیل میں تو بالکل نہیں آ سکتا۔ اس سلسلہ میں مَیں انگریزی کی مثال بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ باوجود اس کے کہ یہ ایک مکمل اور مبسوط زبان تسلیم کی گئی ہے، لیکن آپ نے کبھی اسے کسی گورے سپاہی کی زبان سے بھی سُنا ہے۔ ایسی حالت میں اگر آپ شیکسپیئر، ملٹن، گولڈ اسمتھ یا ٹینیسن یا خود انگریزی زبان کو موردِ لعن وطعن بنائیں تو کہاں تک حق بجانب ہوں گے؟ اسی طور پر اگر کوئی نرا دیہاتی شستہ اردو بول یا سمجھ نہیں سکتا تو عربی اور فارسی کیوں موردِ عتاب ہو۔ اس سے بھی قطع نظر کیجیے، پوربی زبان کا شمالی ہند کی دیگر زبانوں سے مقابلہ کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خود بھاشا جو اردو کا ماخذ بتائی جاتی ہے اور جو پورب کی زبان سے، ہر اعتبار سے قریب تر ہے، عوام کی سمجھ سے بلند ہے۔ میرا تعلق خود پورب سے ہے اس لیے ممکن ہے آپ میرے اس نظریہ سے اتفاق نہ کریں۔ میں خود جب تک پورب میں رہا اکثر یہ خیال کرتا رہا کہ پورب کی زبان کچھ

زیادہ قابلِ رشک نہیں ہے، لیکن اب جب کہ مجھے پچھّم کے اضلاع میں رہنے کا اتفاق ہوا اور یہاں کے عوام کے لب ولہجہ سے آشنا ہوا، مجھے یقین ہوگیا کہ پورب کی زبان کئی اعتبار سے قابل ترجیح ہے۔ الفاظ کے ذخیرہ سے مجھے بحث نہیں ہے، اس میں پورب کو بہرنوع تفوق حاصل ہے۔ جہاں تک کسی زبان کے سہل ورواں ہونے کا تعلق ہے، مشرق کو مغرب پر ترجیح حاصل ہے۔ آپ معاف فرمائیں، اس اظہارِ خیال سے میری نیت کسی پر حملہ کرنے کی نہیں ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ جس زبان کو ہندستانی کہا جاتا ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو زبان کے مسئلہ پر آخری لفظ ہو۔

حضرات! اردو کے متعلق جو اعتراضات ہیں وہ کم وبیش آپ کے سامنے پیش کردیے گئے۔ میری فہم واستعداد اور آپ کے صبر وتحمل نے جہاں تک مساعدت کی، ان کے جوابات بھی عرض کردیے گئے۔ مجھے ایک امر کے متعلق اور عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اردو پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ وہ مشکل اور دقیق ہے، وہ اردو کی مختلف اقسام کی تحریروں پر کیوں نہیں نظر ڈالتے۔ وہ لوگ جو عربی، فارسی جرِثقیل اور خطابت کے دل دادہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی تحریریں پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔ جو لوگ سنجیدہ، متین اور علمی طرزِ تحریر کے دل دادہ ہیں، وہ مولانا عبدالماجد صاحب بی۔اے اور اربابِ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے طرزِ انشا سے سبق حاصل کریں، جو لوگ شستہ، سلیس اور آسان اردو پر سرد ُھنتے ہیں ان کو مولانا عبدالحق صاحب بی۔اے سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جو لوگ رنگینی، لطافت، لوچ اور انشائے جمیل کے طلب گار ہیں، ان کو مولانا نیاز فتح پوری کا اتباع کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ حُزن اور حسرت وغم کی مصوری پسند کرتے ہیں۔ ان کو مولانا راشد الخیری (مصورِ غم) کی پیروی کرنی چاہیے۔ مضحکات اور طنزیات کا رنگ مطلوب ہو تو ڈاکٹر نذیر احمد، سجاد حسین اور سید محفوظ علی صاحب کا (خدا ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے) رنگ اختیار کیجیے۔ ٹیگوریت پسند خاطر ہو تو شبابِ اردو کی صفحہ گردانی کیجیے۔ چٹکیاں اور گدگدیاں منظور ہوں تو خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت کیجیے۔ بہرحال کوئی رنگ اور کوئی درجہ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی شخص کے لیے موزوں نہ ہو۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اربابِ وطن اردو کو کیوں اس درجہ قابلِ عتاب تصور

فرماتے ہیں۔ یہاں غالباً میرا یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اردو کو مشکل بتاتے ہیں، اس واقعہ سے بے خبر نہ ہوں گے کہ کعبۂ ہندوستان، بنارس سے خود ایک ہندی کا روزنامہ اخبار شائع ہوتا ہے جس کی عبارت خاص طور پر مشکل رکھی جاتی ہے، اور اسی باعث سے اس کی اشاعت بھی کچھ بہت زیادہ اُمید افزا نہیں ہے۔ مالک اخبار سے اس حقیقت کا بار بار اظہار کیا گیا، اور اس نے متعدد بار یہی جواب دیا کہ مالی مشکلات کی طرف سے کارکنانِ مطبع کو بے فکر رہنا چاہیے۔ وہ بہر نوع اس کا کفیل رہے گا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام مشکل ہندی سمجھنے اور لکھنے کے عادی بنائے جائیں!

حضرات! بایں ہمہ ابھی اردو میں اصلاحات کی گنجائش ہی نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ میں اس سلسلہ میں فی الحال دو امور خاص طور پر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل تو یہ کہ اردو کی تعلیم کیوں کر دینی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اردو لکھنے میں کن کن پابندیوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے اور اپنی اس ہزیمت کی ندامت ہے کہ جس چیز کو میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور قابلِ پرہیز سمجھتا تھا، وہ آج مجھ کو لامحالہ کرنی پڑتی ہے۔ یعنی کسی موضوع بحث کا تجزیہ اور اس کی تقسیم اور ترتیب (بالفاظِ دیگر Classification) تقسیم اور ترتیب فی نفسہٖ معقول چیز ہے اور ناظرین سامعین کو مرعوب کرنے کا اس سے بہتر اور موثر کوئی طریقہ نہیں ہے، لیکن ذوقِ شعری اور لطفِ ادب کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنا جو ایک ماہر علم افعال الحیات یا علم نباتات کسی نقیب بر شکال یا حسین شگوفہ کے ساتھ جائز رکھتا ہے۔ کہاں تک ہماری سخن فہمی اور ادب نوازی کی دلیل ہے۔ ایک سوال ہے جس کا جواب بطیبِ خاطر نہیں تو کم سے کم بہ نظرِ تالیف قلوب آپ میرے موافق ہی دیں گے۔

حضرات! اس تقسیم اور ترتیب سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ تعلیم اردو کے لیے ہر معلم کو سب سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ زبان کی تعلیم دیگر علوم اور فنون کی تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ زبان کے علاوہ بیش تر علوم ایسے ہیں، جن کو آپ ایک حد تک متشکل کر کے ہر طالب علم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم آپ مختلف اقسام کی تصاویر، نقشوں اور خود مخصوص مناظر فطرت یا مقاماتِ متعلقہ کو پیشِ نظر کر کے دے سکتے ہیں، اور

وہ بھی اس طور پر کہ وہ تمام عمر فراموش نہیں کیے جاسکتے۔ سائنس کی تعلیم آپ اس طور پر دے سکتے ہیں، گویا ہر طالب علم کے سامنے نوامیسِ فطرت خود بے نقاب ہو رہے ہیں۔ صنعت اور دست کاریوں کے نمونے آپ خود پیش کر سکتے ہیں اور ہر طالب علم ان کو دیکھ کر اور چھو کر بسا اوقات جلد سے جلد ایک دست کار اور صنعت گر بن سکتا ہے۔ ایک شخص جلد سے جلد اسلحات کے استعمال سے واقف اور قواعد پریڈ سے آشنا ہو کر سپاہی بن سکتا ہے۔ لیکن علم اور ادب کے میدان میں اعضا و جوارح کام نہیں دیتے۔ یہاں ذہن و دماغ کی کارفرمائی کی ضرورت ہوتی ہے، اور ذہن و دماغ ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو مارشل لا یا ماسٹر صاحب کا خوف ہو۔ ان پر دسترس حاصل کرنے کے لیے ذہن و دماغ ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک شخص جلد سے جلد شاعر بنایا جاسکتا ہے، بلکہ بسا اوقات وہ شاعر پیدا ہی ہوتا ہے۔ لیکن کوئی شخص جلد سے جلد ادیب نہیں بنایا جاسکتا۔ ہر وہ چیز جو فطری ہے سہل ہے، لیکن جہاں ترتیب کی ضرورت ہوتی ہے یا تحصیل و اکتساب کا سوال آتا ہے، وہاں ایسی دقتیں پیش آتی ہیں، جن پر آپ سہولت کے ساتھ عبور نہیں حاصل کر سکتے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ تعلیم زبان کے مسئلہ کو بالکل ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے جس امر کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ متعلم نہیں، بلکہ معلم سے متعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک خود معلم صاحبِ ذوق، ہمدرد اور ذہین نہ ہوگا وہ طلبا کو اپنے موضوعِ تعلیم کا شائق نہیں بنا سکتا۔ آپ اس کلیّہ کو ایک ادنیٰ حقیقت پر محمول کریں گے، لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ادبیات کی تعلیم کے لیے ان صفات کی موجودگی لازمی ہے۔ بہر حال اب میں ان صفات کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو ایک اردو معلم کے لیے میرے نزدیک ضروری ہیں:

1۔ معلم کو زبانِ فارسی پر کامل دست گاہ اور عربی پر وقوف حاصل ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں بھاشا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
2۔ اردو کے مشہور مصنفین کی تصانیف اور ان کا طرزِ انشا اس کی نظر میں ہو۔
3۔ مروّجہ اردو کے ہر پہلو سے اسے آشنا ہونا چاہیے۔
4۔ وہ خود صاحبِ ذوق ہو اور طبیعت پر کسی قدر اجتہاد کا رنگ غالب ہو۔

حضرات! میں نے تعلیم اردو کے لیے فارسی کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس کے خاص وجوہ ہیں۔ اردو کے عناصر ترکیبی کچھ ہی کیوں نہ ہوں، اس حقیقت سے بہ مشکل انکار کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اردو زبان سے فارسی آب ورنگ حذف کر دیا جائے تو پھر گلستاں کے بجائے صرف ایک فریب رنگ و بورہ جاتا ہے۔ میرے بہت سے کرم فرما اردو اور فارسی کو میرے ایک ہی سانس میں ادا کرنے سے شاید پہلو بدلنے لگیں۔

لیکن میں ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ فارسی آب ورنگ اور فارسیت میں فرق ہے۔ بے شک ایسی اردو جس پر بے ربط فارسی کا اطلاق ہو یا جو غیر مانوس عربی الفاظ سے مرکب ہو، قابلِ پذیرائی نہیں ہے۔ اردو کی تعمیر میں عربی اور فارسی کو جیسا کچھ دخل رہا ہے، اس سے آپ کم و بیش واقف ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اردو کو موجودہ حالت میں لانے کی جس حد تک یہ دونوں زبانیں ذمہ دار ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کی آمیزش اب بھی اسی نسبت سے ہونی چاہیے۔ کیوں کہ اردو اپنے ابتدائی مراحل طے کر چکی ہے۔ اب ان اسباب اور ذرائع پر ضرورت سے زیادہ زور دینا روا نہیں ہے جن پر کاربند ہونا ابتدا میں ضروری اور لازمی تھا۔ میرا مقصد صرف ایک کلیّہ پیش کرنے کا ہے، یعنی اردو کے مصحفِ حسن میں فارسی خدوخال لازمی ہیں۔ یہاں خدوخال، محض حسن کی اضافی حیثیات نہیں ہیں اور اس کلیّہ کو محض شاعرانہ حسنِ بیاں پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ پاکیزہ اردو جسے میں بلاخوف تردید ہندوستان میں وہی حیثیت دینا چاہتا ہوں جو فرنچ کو مغرب اور فارسی کو مشرق میں حاصل ہے۔ فارسی کے بغیر اردو ایک جسدِ بے روح ہے۔ نظر برآں اگر معلم فارسی سے بالکل بے بہرہ ہے یا زبان سے آشنا ہے، لیکن اس کی لطافتوں سے بیگانہ ہے یا اسے یہ ملکہ حاصل نہیں ہے کہ وہ کس طور پر فارسی کو اردو کے مطابق بنا سکتا ہے۔ وہ طلبا کو یا تو صحیح راستہ پر نہیں ڈال سکتا یا ان کے ادبی ذوق کا معین نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص اس وقت تک اردو کا اچھا معلم نہیں بن سکتا، جب تک نہ صرف اسے فارسی پر عبور ہو بلکہ اردو پر بھی کامل دسترس رکھتا ہو۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ ملیں گے جن کی فارسی قابلیت مسلّم ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اچھی اردو بھی لکھ سکتے ہوں۔ بلکہ بعض مثالیں تو ایسی ملیں گی جہاں فارسی کا عالمِ شجر اردو کے میدان میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس سے میرا

مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک فارسی عالم اچھا اردوداں نہیں ہوسکتا۔ میرا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ جب تک کوئی اردو نویس اس حقیقت کو فراموش نہ کردے کہ اسے فارسی یا اردو کے جرثقیل پر پورا عبور ہے، اس وقت تک وہ سلیس اور پاکیزہ اردو لکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ ایک تہمتنِ وقت سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے قوت اور صلابت کو برسرِ کار لاکر راستہ میں بڑی بڑی مشکل چٹانیں یا تناور درختوں کو لاکر ڈال دے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اس کی دشواریوں کو ایسا دور کرتا جائے کہ دوسروں کو چلنے میں آسانی ہو یا اس راستہ کو اختیار کرنے کی لوگوں میں جرأت پیدا ہو۔ اس لیے ہر معلم کا فرض ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اسے اتنا سہل گزار بنادے کہ اس کے پیروؤں کو چلنے میں سہولت اور آسانی ہو۔ اچھے اردو نویس کم ایسے دیکھے گئے ہیں جن کو فارسی پر کم وبیش عبور نہ ہو، اردوداں حضرات کو ابھی نہیں معلوم ہے کہ ادبیات کی کتنی شاہ راہیں ہیں، اور ان سے کس طور پر عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔ علمائے فارسی ان تمام مراحل سے گزر چکے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ کس سفر اور کس راستہ میں کس قسم کی زادِراہ یا اسباب کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس میں شک نہیں بہت سے علوم ایسے ہیں جہاں اردو کی رسائی فی الحال ناممکن ہے، لیکن اگر آپ اردو استعداد جذب اور قوتِ اکتساب پر غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ یہ دشواری ایسی نہیں ہے جہاں صبر وشکر کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں عربی کے متعلق بھی اظہار خیال ضروری ہے۔ عربی مشتقات اور مصادر اگر کام میں نہ لائے جائیں تو پھر اردو ایک بے مایہ زبان رہ جاتی ہے۔ عربی ترکیبیں بعض اوقات اردو کی بہت سی مشکلات دور کردیتی ہیں۔ بالخصوص تراجم میں عربی کی کارفرمائی ناگزیر ہوجاتی ہے۔ اردو میں جدید اصطلاحیں وضع کرنے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جن کو اس فریضہ سے آج کل عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں بعض اوقات ہندی الفاظ بھی نہایت سہولت کے ساتھ کھپ جاتے ہیں، لیکن ان میں خرابی یہ آن پڑتی ہے کہ تصریفی سہولتیں تقریباً ناممکن ہوجاتی ہیں۔ عربی میں اس کی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے اسما اور کبھی کبھی افعال جب اردو میں منتقل ہوتے ہیں، اس وقت ہم کو اکثر عربی سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اس طور پر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا دامن ان تمام چیزوں کے لیے وسیع اور

موزوں ترین ہے جن پر عربی اور فارسی کا عمل ہو چکا ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معمولی معمولی الفاظ بھی عربی اور فارسی کی زد میں ثقیل اور گراں بنا دیے جائیں۔ اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ مختلف آوازوں کو ایک ہی ساز سے ہو کر گزرنا چاہیے، تاکہ موسیقی مکمل اور مرتب ہو اور سامع کو لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکے۔ رہی بھاشا، اس کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس میں علمی زبان ہونے کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ البتہ انشائیے لطیف میں اس کا تصرف بعض اوقات نہایت سحر کارانہ ہو جاتا ہے، لیکن ایسی حالت میں جس صنعت کارانہ اندازِ بیاں کی ضرورت ہوگی وہ آپ پر ظاہر ہے۔

حضرات! دوسری صفت جو میں نے معلم کے لیے لازمی قرار دی ہے، اس کا اردو مطالعہ ہے۔ یعنی اردو کے مشہور مصنفین اور انشاپردازوں کی تصانیف اس کے مطالعہ سے گزری ہوں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر معلم پر صرف فارسیت غالب ہے تو وہ طلبائے اردو کے لیے ایک بہتر معلم نہیں بن سکتا۔ ایک اردو معلم کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ اردو کے مدوجزر، اس کے سوم وصبا، اس کی زیر و بم سے بھی واقف ہو۔ اسے یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اردو فارسی کا محض ایک ضمنی حصہ نہیں ہے، بلکہ اس سے بالکل علاحدہ اور متمائز حیثیت رکھتی ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ فارسی نغمے اردو ساز سے کس طور پر نکالے جاسکتے ہیں، اردو اور فارسی میں جو تناسب اور تعلق ہونا چاہیے اسے میں شاعر کی زبان میں یوں ادا کروں گا۔

با من آویزشِ او الفتِ موج است و کنار
دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

حضرات! تیسری صفت میں نے یہ پیش کی تھی کہ مروّجہ اردو کے ہر پہلو پر اس کی نظر ہونی چاہیے۔ اس شرط پر میں اس لیے زور دیتا ہوں کہ اس وقت وسائل آمد و رفت میں ترقی ہو رہی ہے۔ مختلف خیالات متصادم ہو رہے ہیں۔ مختلف زبانیں مخلوط ہو رہی ہیں۔ اس کسر وانکسار سے اردو بے نیاز نہیں رہ سکتی، اسے اس کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ موسم کس قسم کے برگ وثمر کا ہے۔ آج کل جس اردو کی ضرورت ہے، وہ ہم پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اس وقت اگر کسی نے طلسم ہوش ربا یا فسانۂ عجائب کی داستان چھیڑی تو وہ یقیناً بے محل ثابت ہوگی۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ

معلم کو مرغِ بادنما بن جانا چاہیے کہ جدھر ہوا کا رُخ ہو، وہ پھر جایا کرے، بلکہ اسے اس امر کا اندازہ لگاتے رہنا چاہیے کہ کون سے اصول اس وقت برسرِکار ہیں، وہ کہاں تک مفید یا غیر مفید ہیں اور ان سے کس طور پر عہد برآ ہونا چاہیے۔

حضرات! چوتھی صفت یہ تھی کہ معلم کی طبیعت پر کسی قدر اجتہاد کا رنگ غالب ہونا چاہیے۔ تیسری اور چوتھی صفتیں ایک حد تک لازم و ملزوم ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی محرومی جو آج کل ہمارے نوخیزوں میں نمایاں ہے، وہ فقدانِ اجتہاد ہے۔ میرے تعجب اور صدمہ کی انتہا نہیں رہتی، جب میں ہمیشہ اپنے طلبا کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہی فرسودہ لکیریں پیٹتے چلے جاتے ہیں جواب اس قابل بھی نہیں رہیں کہ کوئی صاحبِ ذوق و بصیرت ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھے۔ میں اپنے لیکچر کے اس حصہ کو خاص طور پر اپنے عزیزانِ گرامی طلبائے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے غور و توجہ کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرے دوسرے بزرگ اور کرم فرما بھی اس پر توجہ فرمائیں گے۔ مضمون طویل ہوتا جاتا ہے، داستان ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی ۔

شب آخر گشتہ وَ افسانہ از افسانہ می خیزد

حضرات! آپ کسی اردو مضمون کا مطالعہ فرمائیں جو آج کل کثرت کے ساتھ معمولی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کو بہت جلد محسوس ہونے لگے گا کہ ہر مضمون نگار کا طرزِ انشا تقریباً یکساں ہے۔ الفاظ اور جملوں کی دروبست ایک ہے۔ ابتدا اور انتہا میں بھی وہی دیرینہ فرسودگی چلی آتی ہے۔ حسنِ مذاق اور جودت کے معنی صرف ضلع جگت یا پامال تشبیہات اور استعارہ کے رہ گئے ہیں۔ میں بذات جس چیز کو انتہائی بدمذاقی تصور کرتا ہوں، وہ ضلع جگت اور رعایت لفظی ہے۔ اس افتادِ طبع نے ہمارے مذاق کو پھیکا اور ہمارے تحریر و تقریر کو بالکل سطحی اور عامیانہ بنا رکھا ہے۔ عرصہ ہوا، ہمارے چند صاحبِ ذوق احباب نے علی گڑھ میگزین میں ایک ایکٹ شائع کیا تھا، جو سنجیدہ ظرافت کا بہترین نمونہ تھا۔ ضلع جگت سوقیانہ پھکڑ بازی، مصنوعی ناز و انداز، فرسودہ اشعار یا ضرب الامثال کو بے وضع، بے موقع استعمال کرنا، ان تمام لغویتوں کے خلاف ایک ایکٹ تعزیرات پاس کیا گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ نسبتاً بہت کم لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا، لیکن جن لوگوں کی نظروں سے یہ ایکٹ گزر چکا ہے، وہ اس

کے زد سے محفوظ رہنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور بعض حلقوں میں تو اس ایکٹ کو کلاسکس کی حیثیت حاصل ہے۔ انتہائی جزئی فروگزاشت بھی اس کی گرفت میں آجاتی تھی۔ ضلع جگت اور رعایت لفظی کو خاص طور پر قابلِ گرفت بتایا گیا تھا۔ اس ایکٹ کا نام ''جھانپلزم'' تھا، اور ان جرائم کے مرتکب کو جو اس ایکٹ کی تحت میں آتے تھے، ''جھانپل'' کہا جاتا تھا۔ اس کی دو ایک مثالیں پیش کرنا ضروری ہیں۔ مثلاً:

ایک صاحب فرماتے ہیں: ''خدا سے آس ہے کہ آپ پاس ہو جائیں، ہال میں پاس پاس بیٹھیے اور آس پاس کی خبر لیتے رہیے۔ یاس کو پاس نہ پھٹکنے دیجیے اور ہر حال میں خدا کا سپاس ادا کیجیے۔''

دوسرے صاحب فرمانے لگے: ''یہ شیر برنج نہیں شیر بے رنج ہے۔ آپس میں شیر و شکر ہو جایئے تو شر کا شیر پاس نہ آئے گا۔''

تیسرے صاحب یوں گل فشانی کرتے ہیں: ''زنجبار میں بار بار اد بار کو بار نہ دیجیے!''

ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا ہے: ''کمندی نے کنڈی نہیں کھولی، اس کی کندی کیجیے۔''

ایک صاحب حاذق سے ملتے ہیں، فرماتے ہیں: ''آپ نے خوب ترکیب سوچی، آخر حاذق ہی ٹھیرے۔''

ایک صاحب نے فرمایا: ''بھئی لوٹا نہیں ملتا۔'' دوسرے نے جواب دیا: ''کہیں لوٹا ہوگا۔'' پہلے صاحب نے پھریری لے کر فرمایا: ''بھئی لُوٹا گیا ہوگا۔'' تو دوسرے صاحب نے ارشاد کیا: ''کیا لَوٹا نہیں دیا گیا'' اور اس کامیابی پر قہقہہ لگا کر لوٹ گئے۔ (معاف کیجیے!)

اس قسم کی مثالیں نہایت کثرت کے ساتھ آپ نہایت مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی پائیں گے۔ اگر سچ پوچھئے تو یہ بدمذاقی اور سطحیت کی نہایت رکیک مثال ہے۔ آج کل لوگوں نے اس کو برجستہ گوئی حاضر جوابی اور ظرافت میں شمار کرنا شروع کر دیا ہے۔ بعض لوگ جو رنگین یا ظریفانہ طرزِ انشا کے پیچھے بُرے طور پر پڑے رہتے ہیں، اس قسم کی تحریروں کو اپنی جودت اور فطانت پر آخری لفظ تصور کرتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم اس قسم کی باتیں مہذب اور باسلیقہ لوگوں کے نزدیک کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ ''جھانپلزم ایکٹ'' کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ کسی ''پُر مذاق''

جملہ کو جسے سن کر ایک دفعہ لوگ محظوظ ہو چکے ہیں، بار بار دُہرانا اور پھر لوگوں سے پذیرائی کی توقع رکھنا بھی ''جھانپلزم'' ہے۔ اس ایکٹ کی زد میں وہ مصنف بھی آ جاتا ہے جو یہ دیکھ کر کہ اس کا کوئی مضمون یا کوئی تصنیف بے حد مقبول ہو چکی ہے۔ اسی قسم کی دوسری تصنیف پبلک میں پیش کرتا ہے، اور شرفِ قبولیت کی توقع رکھتا ہے۔ مثلاً ملٹن کا پیراڈائز لاسٹ لکھنے کے بعد پیراڈائز ریگینڈ کا لکھنا صریحی ''جھانپلزم'' تھا۔ کسی ایک ہی موضوع کو بار بار معرضِ بحث میں لانا یا اپنے ہی قول کو بار بار پیش کرنا اور وہ بھی انتہائی شدمد کے ساتھ، کسی طرزِ انشا کی اس طور پر نقل کرنا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ خواہ مخواہ کے سلسلہ میں ہے۔ فرسودہ اور پامال شعر یا ضرب المثل کو کسی نہ کسی طور پر دورانِ تحریر یا تقریر میں پیش کرنا، یہ سب ''جھانپلزم'' میں داخل ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے بار بار ایک بزرگ یاد آتے ہیں، جنھوں نے ایک ضرب المثل کچھ اس بے ساختگی کے ساتھ استعمال کی کہ میں ان کے حسنِ مذاق کا اب تک معترف ہوں۔ یہ صاحب کچھ ایسے تیز گفتار تھے کہ کوئی شخص ان کی گفتگو بہ مشکل سمجھ سکتا تھا۔ اپنا ایک واقعہ یوں بیان فرمانے لگے:

> ''صاحب، مجھے آگرہ سے علی گڑھ آنا تھا۔ نہایت ضروری کام در پیش تھا۔ بارش ہو رہی تھی، اور میرے پاس اسباب ضرورت سے زیادہ تھا۔ کیا بتاؤں کس دقت سے آگرہ سے سوار ہوا۔ ٹونڈلہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ علی گڑھ جانے والی گاڑی چھوٹ گئی ہے کالانسان مرکب من الخطا او نسیان ناچار رات وہیں رہ گیا۔''

تیز گفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ ٹونڈلہ پہنچ گئے تھے اور میں ان کے 'اسباب' کے ساتھ آگرہ ہی میں تھا۔ اس ضرب المثل کا پیش کرنا تھا کہ میرے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ مرض متعدّی تھا، میں نے بھی کہہ دیا، 'از خورداں خطا واز بزرگاں عطا۔'

حضرات! آپ یقین فرمائیں، میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ بے کم و کاست صحیح ہے۔ آج کل جتنے مضامین شائع ہوتے ہیں، ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو معقول کہے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں چند عنوانات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور آپ ہی کو منصف قرار دیتا ہوں۔ کیا یہاں ان چند فرسودہ، دور از کار، مہمل اور مبتذل خیالات کے علاوہ

کچھ اور مل سکتا ہے؟ ''باغ و بہار'' پر مضمون لکھنا ہوا تو غنچے کا مسکرانا، پتیوں کا تالیاں بجانا، نرگس کی نظر بازی، سوسن کی زبان درازی، سنبل کی زلفِ چوٹی، بلبل کی غزل خوانی، گویا باغ نہ ہوا کسی بازاری عورت کا بالا خانہ ہوا۔ اس کے بعد باغباں بے رحمی سرو کا چلنا، سبزہ کا مخمل ہونا، ہوا کا سائیں سائیں کرنا، فوّارے کا آٹھ آٹھ آنسو رونا وغیرہ آتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو تین اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ مثلاً:

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

....

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

....

اجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں اپنا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

اس کے بعد صیاد کا دام نظر آتا ہے، کبھی بلبل کے ساتھ رونا پیٹنا شروع کیا جاتا ہے اور یہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

پھر کسی کنج میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں محبوب کا کوئی پرزہ نکال کر پڑھا جاتا ہے۔ انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ خط کو بوسہ دے کر سینہ میں رکھ لیا جاتا ہے، اور اس کے بعد خودکشی کر لی جاتی ہے۔

موسم اور مناظرِ فطرت کو کبھی اس طور پر بھی ''باندھیں گے۔''

''آسماں ماتمی لباس پہنے ہوئے ہے۔ شفق خوں رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے۔ پانی برسا ہے تو فرماتے ہیں:

یہ کہہ دو ابرِ باراں سے اگر برسے تو یوں برسے
کہ جیسے مینھ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

روم جھوم، چھم چھم، دھڑ دھڑ، کہیں طاؤس ناچتا ہے، کوئل کوکتی ہے، پپیہا پی کہاں کہتا ہے۔ جوانانِ چمن کا غسل ہوتا ہے، کالی رات کالی بلا ہے۔ ستارے ٹمٹماتے ہیں (اگر ٹیگوریت طاری ہوئی تو وہ ایک آسمانی نغمے بھی ان سے سُن لیے) چاند محبوب کا چہرہ ہے۔ کبھی بادلوں کی چادر ڈال لیتا ہے، کبھی ہوا گستاخ بادلوں کو تھپیڑے دے دے کر ہٹا دیتی ہے، اور کبھی حضرتِ عاشق یا شاعر خود اس کی زد میں آجاتے ہیں!

محبوب کا سراپا کھینچیں گے تو آنکھیں تیر و سناں و خنجر برسانے لگیں گی، کبھی ساغر لنڈھائیں گی۔ رخسار ہیں کہ سیب کشمیری، منہ غنچہ، گردن صراحی دار، دیکھتے ہی، ہائے، وائے، آہ، اُوہ، اُف، ظالم، کافر کہہ کر بے ہوش ہو جائیں گے۔ بہت خوش قسمت ہوئے تو آنکھ کھولنے پر اپنا سر زانوئے یار پر پائیں گے اور آخر میں لکھ دیں گے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا!

بعض حضرات جن کی طبیعت کسی قدر اعتدال پسند ہوتی ہے جب کبھی قلم اٹھائیں گے تو کوئی نہ کوئی پامال شعر ضرور لکھیں گے۔ فرض کیجیے 'اتفاق' پر مضمون لکھنا ہوا تو سب سے پہلے لکھیں گے:

1۔ دو دل یک شود بشکند کوہ را پراگندگی آرد ابنوہ را

2۔ بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گل دستہ گردد

3۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا

اس کے بعد کہیں نہ کہیں اس قصہ کو لکھیں گے جو ایک قریب المرگ باپ اور اس کے نصف درجن یا اس سے زیادہ لڑکوں سے متعلق ہے۔ باپ کا رسّی کے مختلف ٹکڑوں کا دینا اور ان کو ملا کر توڑنے کی فرمائش کرنا، اس کا نہ ٹوٹنا اور علاحدہ علاحدہ ان کا ٹوٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔

ہماری بد مذاقیاں یہیں نہیں ختم ہو جاتیں۔ شادی اور غمی میں بھی ہم انھیں فرسودگیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ کوئی رقعۂ دعوت آپ ان اشعار یا جملوں سے خالی نہ پائیں گے۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست — آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

رواقِ منظرِ چشم من آشیانہ تست — کرم نما و فرود آں کہ خانہ خانہ تست

گر قبول افتد زہے عز و شرف

تعزیت اور ماتم پرسی کے لیے بھی چند ہی اشعار اور جملے مخصوص ہیں۔ مثلاً:

موت سے کس کو رُست گاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے

صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیھا فان

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

''دنیا فانی ہے''، ''صبر و شکر کے سوا کیا چارہ ہے''، ''مرحوم کو جوارِ رحمت اور پسماندگان کو صبرِ جمیل''، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک وہ طبقہ ہے جس نے ٹیگور کا رنگ اختیار کیا ہے۔ ان کو کس طرح بتایا جائے کہ یہ چیزیں کبھی کبھی بطور تفریح اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ مستقل مضامین کا اسی پیرایہ میں پیش کرنا، اردو پر صریحی ظلم ہے اور ذوقِ ادب کو مجروح کرنا ہے۔ مثلاً:

وہ........ باغ........ پھول........ آہ تم مسکرائے........ ندی کے کنارے پانی کا گھڑا........ آسمانی نغمہ........ تاروں کا راگ!

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو گھوم پھر کر کسی ایسے مضمون کو اختیار کریں گے جس میں غلامِ امام شہید کا رنگ کھپ جائے، اور وہ بھی ایسا جو ''روضۂ تاج گنج'' کے نمونہ کا ہو۔ بعض حضرات، جو ہندوستان کی موجودہ پالیٹکس پر اظہار خیال فرمانے کے شائق ہوتے ہیں، نفسِ مضمون کے اعتبار سے محض چند مخصوص الفاظ اور ترکیبوں کے پابند ہوتے ہیں۔ مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو، عبارت میں زور ہو یا نہ ہو، خیالات کیسے ہی ہوں موقع ہو یا نہ ہو، اس سے کوئی ربط یا تسلسل پیدا ہوتا ہو یا نہیں، چند الفاظ اور ترکیبیں کہیں نہ کہیں کھپا دینا ضروری ہیں۔ مثلاً: مادرِ ہند، طوقِ غلامی یا لعنت، شیطنیت، ہندوستان کے سپوت فرزند وغیرہ وغیرہ۔

آخری طرزِ انشا کے متعلق، میں نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اس سے ممکن ہے بعض حضرات میری خلوص نیت کو مشکوک سمجھنے لگیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ مجھے جس سے نفرت ہے وہ

کورانہ تقلید ہے۔ یہ مضمون میں محض آب ورنگ پیدا کرنے کے لیے چند ایسی ترکیبوں، جملوں کو معرضِ تحریر میں لانا جو بجائے خود نہایت سنگین اور گراں ہوں، اور چمن کے لیے انتہائے حزم و احتیاط لازمی ہے، بالکل بے محل ہوتا ہے۔ میں بذات ہر ایسے مضمون کو مہمل اور بے سود سمجھتا ہوں جس کے پڑھنے سے لوگوں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہو، یا نفسِ مضمون سے لوگوں کے قلب و دل مسرور یا متاثر نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں مَیں اپنے عزیزانِ مسلم یونیورسٹی کو خاص طور پر مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ کل انھیں کے جنبشِ قلم پر قوم اور ملک کی نظریں لگی ہوں گی۔ علم و فضل کا سرمایہ انھیں کے کاوش دماغ اور مذاق سلیم کا محتاج ہوگا، اور رزم و بزم انھیں کے آداب و اطوار کا آئینہ ہوگی۔

عزیزانِ گرامی! کیا تم کو کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ تمہاری اس قسم کی تحریروں سے جن کا خاکہ میں ابھی ابھی کھینچ چکا ہوں۔ تمہارے اجتہادِ فکر اور مذاقِ سلیم کی رسوائی ہوتی ہے۔ تم نے اپنی استعداد اور قابلیت کا معیار اتنا پست کیوں کر دیا ہے جو لوگ تم سے قبل گزر چکے ہیں، ان سے تم اپنے آپ کو اگر قابل تر نہیں ثابت کر سکتے تو کیا تم میں ان کی سچے جانشین بننے کی بھی اہلیت نہیں ہے۔ کیا فطرت کا بکھرا اس سرمایہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ کیا تمہاری فکر نئے فضائے تخیل میں پرواز کرنے سے عاری ہے۔ کیا کائنات کا ذرّہ ذرّہ تم کو دعوتِ دید نہیں دیتا، اور کیا تمہاری جودت ان سے آمیز ہو کر تمہارے لیے نئی نئی دنیائیں نہیں پیدا کر سکتی۔ کیا تم خود کیف و حس سے محروم ہو، اور کیا تم ان کو اس طریقہ سے نہیں بیان کر سکتے۔ جیسا تم خود ان کو محسوس کرتے ہو۔ کیا تم یہی پسند کرتے ہو کہ تمہارے جذبات، تمہارے خیالات، تمہاری فکر سب مستعار ہو۔ تم مجھے بتاؤ تمہارا کسی باغ میں گزر ہوتا ہے تو تم وہی محسوس کرتے ہو جس کا نمونہ میں ابھی ابھی پیش کر چکا ہوں۔ مجھے بتاؤ تم ان فرسودہ طریقوں کو اختیار کر کے اپنے جذبہ کی حقیقی ترجمانی کرتے ہو۔ عزیزو! یاد رکھو ہر انسان ہر چیز سے مختلف طور پر لذت اندوز ہو سکتا ہے، اور اپنے جذبات کی ترجمانی بالکل اچھوتے انداز سے کر سکتا ہے۔ پھر ان باتوں کو کیوں نہیں لکھتے جو خود تمہارے دل پر گزرتی ہیں۔ وہ باتیں کیوں لکھتے ہو جو شاید ان لوگوں کے دلوں پر بھی نہیں گزرتیں جن کی تم نقل کرتے ہو۔ کیا تم اپنے دوستوں، بزرگوں یا عزیزوں کو اپنے خیالات سے یوں ہی آشنا

کراتے ہو۔ پھر مجھے بتاؤ ایسا کیوں لکھتے ہو یا تو لکھنے سے قطعاً گریز کر دیا۔ وہی لکھو جسے تم خود محسوس کرتے ہو۔ تم کو کوئی بات کبھی نہیں لکھنی چاہیے، اگر تم ایمان داری کے ساتھ محسوس کرتے ہو کہ دوسرے تم سے اچھا لکھ چکے ہیں، تم کو اپنا ایک مخصوص انداز قائم کرنا چاہیے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہر انسان ایک مخصوص رنگ کا مالک بن سکتا ہے۔ تم اپنے عزیزوں، دوستوں یا بزرگوں کو خط لکھتے ہو۔ تمہارے مخاطب اس خط کو پا کر یا سن کر باغ باغ ہو جاتے ہیں، یہ کیوں؟ محض اس لیے کہ اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک جملہ طرزِ بیان، ترتیب و تہذیب غرض کہ ہر وہ چیز جس پر تمہاری وہ تحریر مشتمل ہوتی ہے۔ تمہاری ذات، تمہارے جذبات، تمہارے انداز اور تمہارے احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہی کیفیت تمہاری ہر تحریر کی ہونی چاہیے۔ یہ بالکل مشکل نہیں ہے، صرف مشق درکار ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ کرو، اپنے معلم خود بنو، کوئی دوسرا شخص تمہاری گفتگو اور تمہاری تحریر کا تم سے بہتر جج نہیں ہو سکتا۔ انشا پردازی کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تمہاری تحریر تمہارے خیالات کی بے کم و کاست ترجمانی کرتی ہو۔ پہلے سوچو اس کے بعد لکھو۔ ایک انشا پرداز کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ غور و فکر کرنے سے قبل الفاظ اور جملے اپنے ذہن میں ترتیب دے لے۔ الفاظ، جملوں یا مخصوص ترکیب اور بندشوں کے ترجمان نہ بنو، بلکہ اپنے حسیّات اور جذبات کی صحیح اور سچی ترجمانی کرو۔ کبھی ایسی کتابوں کا مطالعہ نہ کرو جن سے ادب اردو کا خون ہوتا ہو۔ سستے اور اخلاق کو پامال کرنے والے ناول کبھی نہ پڑھو، اس سے تمہارا ادبی ذوق مجروح ہوگا۔ تم سمجھتے ہوگے کہ میں محض فرسودہ پند اور موعظت پر آ گیا ہوں اور ایک ایسے واعظ کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں جو خود نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے، میں خود ان منازل سے گزر چکا ہوں اور اس کی تلخیوں سے آشنا ہوں۔ ایک بڑے زبردست حکیم کا قول ہے کہ اگر تم بڑا بننا چاہتے ہو تو چھوٹی باتوں سے گریز کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مقولہ کم سے کم تمہارے ادبی زندگی کا خضرِ راہ ہو۔ آج جس لکیر کو تم پیٹ رہے ہو، اس کی تنہا وجہ ہے کہ تمہارے قلب و دماغ تاریک ہو رہے ہیں۔ اردو رسائل میں اس وقت معارف، اردو نگار اور اسی پایہ کے دوسرے رسائل کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان مطبوعات کو اس نیت سے کبھی نہ پڑھو کہ تم کو ان کی طرزِ انشا کی نقل کرنی ہے۔ ان کا مطالعہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ تمہارا ذہن و دماغ

ان سے ترتیب اور تہذیب حاصل کرے۔ جو کچھ پڑھو اسے اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کرو۔ ان کے طرزِ تحریر سے تمہارا ذہن و دماغ سلجھے گا۔ اس کے بعد جو کچھ تم لکھوگے وہ روشن، مربوط اور دل نشیں ہوگا۔ جن انشا پردازوں کے متعلق میں اس سے قبل اظہار خیال کر چکا ہوں، ان میں دو بزرگ ایسے ہیں جن کی تقلید نہایت مشکل اور خطرناک ہے۔ ان امور میں شاید یوں بھی مستحسن نہیں ہے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا طرزِ انشا لائڈ جارج کی کولیشن وزارت ہے۔ جس طرح صرف لائڈ جارج ہی کی ذات ایسی تھی جو کولیشن کی کشتی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکی۔ اسی طرح مولانا آزاد اور خواجہ صاحب کا طرز کچھ انھیں حضرات سے نبھ سکتا ہے۔

حضرات! اردو زبان اور موجودہ دور کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کم و بیش عرض کر چکا۔ اب میں اپنے فرض کے اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے بڑھ کر آسان دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ یعنی صلاح اور مشورہ! قبل اس کے کہ میں کچھ اور عرض کروں، اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت دہلی اور لکھنؤ دونوں اردو کی طرف سے انتہائی استغنا برت رہے ہیں۔ حالاں کہ ان دونوں مقامات پر یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں، اور ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن مجھے افسوس ہے یہ خانقاہ ہیں۔ صرف اپنے گذشتہ سجادہ نشینوں کی سوگوار ہیں۔ کنعان اور مصر دونوں ویران ہیں اور متاعِ یوسفی کے لیے آنکھیں بے قرار ہونے لگی ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں ہے، جب ہماری مایوس نگاہیں صرف حیدرآباد کی فضا کو اپنا نشیمن بنائیں۔ جنوبی ہند کے اردو پر جو کچھ احسانات رہے ہیں، ان سے آپ واقف ہیں۔ کیا تعجب زمانہ کا انقلاب انھیں لیل و نہار کو پھر ہمارے سامنے کردے، جن کی کروٹیں کبھی اردو کی گہوارۂ جنبانی کر چکی تھیں۔

حضرات! اس سلسلہ میں مَیں خود علی گڑھ کی ذمہ داریوں کا بھی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اردو کا رینائسنس علی گڑھ ہی میں طلوع ہوا، اور دشمنانِ اردو کا مقابلہ بھی ہمیشہ اسی محاذ سے کیا گیا۔ دلّی اور لکھنؤ کے بعد اردو پرستش کدہ علی گڑھ ہی رہا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ہم اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو بھول چکے ہیں۔ جو سرسید، محسن الملک، نذیر احمد، شبلی، حالی اور آزاد سے

منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ موجودہ حالات کچھ اس درجہ متناقص اور ہماری قوتِ عمل اس درجہ ناممکل ہے کہ ہم کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ آپ حضرات نے مہمات جیسن میں وہ قصہ تو ملاحظہ فرمایا ہی ہوگا، جہاں جیسن کے جہاز کو دو ایسی چٹانوں سے گزرنا پڑا تھا جن کے درمیان سے کوئی چیز گزرتی تو وہ یک لخت ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور اسے پُرزہ پُرزہ کرکے پھر علاحدہ ہو جاتیں۔ اس طور پر کوئی چیز ان دونوں کی زد سے محفوظ رہ کر نہیں نکل سکتی تھی۔ ایک حد تک یہی حالت ہمارے انسٹی ٹیوشن کی ہے۔ ہماری کشتی اس وقت آکسفورڈ اور غرناطہ کے درمیان میں ہے، دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے۔

حضرات! اس وقت اس مسئلہ کا چھیڑنا مصلحت نہیں ہے کہ علی گڑھ کو کیمرج اور آکسفورڈ بنایا جائے یا قرطبہ اور غرناطہ۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث مباحثہ کے ساتھ آکسفورڈ یا غرناطہ کا سا کچھ کام بھی ہوتا رہے۔ اردو کی حیثیت کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو، وہ ہماری توجہ کی محتاج ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اسی پر صرف کر دینی چاہیے۔ استدعا صرف اتنی ہے کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اس کے خلاف نہیں برسر کار لانا چاہیے۔ خدا مسلمانوں کو قائم رکھے، ابھی بہت سے مواقع ایسے آئیں گے جہاں وہ 'تماشا' کو 'کامیاب' اور 'تمنا' کو بے قرار رکھ سکیں گے۔

حضرات! سب سے بڑی ضرورت جس سے ہم کو عہدہ برآ ہونا ہے، اردو کی ایک جامع لائبریری کا قیام ہے۔ یوں تو یہ ضرورت بظاہر نہایت خفیف اور معمولی نظر آتی ہے، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کام میں ہم کو انتہا سے زیادہ سعی و کوشش سے کام لینا پڑے گا۔ اس وقت کم و بیش اردو کی آٹھ ہزار مطبوعات ہیں، اور ہر نسخہ کی قیمت کا اوسط ایک روپیہ رکھ لیا جائے تو آٹھ ہزار روپے تو صرف کتابوں کی قیمت ہوں گے۔ اس وقت ہندوستان میں اردو کتابوں کا کوئی مکمل کتب خانہ نہیں ہے اور یہ ایک ایسا افسوس ناک واقعہ ہے جس کا ہم کو احساس ہونا چاہیے۔ کتب خانہ کی اہمیت پر اظہار خیال کرنا میرے نزدیک تحصیل حاصل ہے۔ رہا یہ امر کہ کتب خانہ اسی پیمانہ کا ہونا چاہیے یا نہیں جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ اس کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اس کی ضرورت اگر علی گڑھ کو نہ ہوگی یا اس ضرورت کو علی گڑھ نے پورا نہ کیا تو پھر کس

سے توقع رکھی جائے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک اردو کی ایک مکمل اور جامع لائبریری نہ ہوگی، ہماری مساعی کا شیرازہ کبھی استوار نہ ہو سکے گا۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ علی گڑھ میں ایک اردو انجمن قائم کی جائے، جس کے اراکین وہ لوگ ہوں جن کو اردو سے شغف ہے یا جو اردو کی ترویج اور ترقی کو اپنا مشن خیال فرماتے ہیں۔ اس انجمن میں ہفتہ وار یا ماہ وار اردو کے معرکتہ الآرا مسائل پر عالمانہ مضامین پڑھے جایا کریں، اور ان پر سنجیدگی اور فرزانگی کے ساتھ تبادلۂ آرا کیا جائے۔ اس انجمن کی کامیابی اربابِ یونیورسٹی اور اراکینِ انجمن کی پُر خلوص مساعی پر ہے۔ انجمن کا ایک ادبی رسالہ ہونا چاہیے، جس میں ان مضامین کو شائع کیا جائے اور وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے رسائل شائع ہوتے رہیں جن کا مبحث اردو سے متعلق ہو۔ مثلاً اردو کیوں کر مقبولِ انام بنائی جاسکتی ہے۔ رسم الخط، اردو صحیح لکھنے اور بولنے کے فوائد اور قواعد، تعلیم اردو، اردو انشا پردازی، اردو ترجمے اور تالیفات، مشہور شعرائے اردو اور فارسی کے منتخب کلام مع مقدمہ، فرہنگ اور حاشیہ، مشاہیر ملک و قوم کے سوانحِ زندگی جو بچوں اور کم لکھے پڑھے لوگوں کے لیے مفید ہوں۔ خوش نویسی اور اس کا فن خطاطی، قومی اور نیچرل نظمیں وغیرہ وغیرہ اس رسالہ میں مشہور مطبوعات پر فاضلانہ نقد اور تبصرے ہوں تاکہ لوگوں میں تنقید صحیح کا ملکہ پیدا ہو، اور وہ مشہور مطبوعات سے آشنا ہو سکیں۔ فی الحال میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ انجمن اردوئے معلّٰی کا احیا کیا جائے، اور رسالہ کا نام اردوئے معلّٰی رکھا جائے۔ اس کی ترتیب اور تہذیب معارف اور اردو کے نمونے پر ہو، اور سال میں چار بار شائع ہوا کرے۔

تیسری ضرورت جس کی نوعیت ایک حد تک 'نیم سرکاری' ہوگی، یہ ہے کہ ہر سال ان معلمینِ اردو کی ایک کانفرنس منعقد ہوا کرے جن کا تعلق مختلف یونیورسٹیوں سے ہو، مثلاً علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی، بنارس، حیدرآباد، پنجاب، بمبئی۔ وہ لوگ جو ان یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو سے تعلق رکھتے ہیں، ہر سال مجتمع ہو کر ان تدابیر اور اسباب پر غور کیا کریں اور حتی الوسع ان کو عمل میں لانے کی کوشش کریں جو کانفرنس کے نزدیک ضروری اور قابلِ عمل ہوں۔ اس کانفرنس کی نوعیت دیگر اس قسم کی جماعتوں کی نوعیت سے بالکل مختلف ہوگی۔ اس کے اراکین وہ ہوں گے جن کا

براہِ راست اردو کی تعلیم اور نشر و تعمیم سے تعلق ہوگا، اور یہ لوگ اپنے اپنے مخصوص مقامی ضروریات کو مدّ نظر رکھ کر مناسب تدابیر عمل میں لائیں گے، جہاں تک براہِ راست اردو کی درس و تدریس کا تعلق ہے، معلمین کی یہ کانفرنس بے حد ضروری ہے، اور اگر یہ کامیابی کے ساتھ چلائی جاسکے تو میرا خیال ہے اس سے نہایت عمیق اور دوررس نتائج مرتب ہوں گے۔

چوتھی ضرورت جس کا میں اس سے قبل اعادہ کر چکا ہوں، ایک اکاڈمی کی ہے۔ اس وقت اردو کا کوئی اسکول نہیں ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اس وقت صرف ایک ایسی وراثت کے دعوے دار ہیں جو مدت ہوئی ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مقامات کی وہ فضا ہی نہیں رہی جہاں ذوقِ شعری تربیت پاتا۔ جہاں طبیعتیں سلجھتی تھیں، زبان کو صیقل ہوتا تھا۔ نظر میں وسعت اور قلب میں سوز و ساز پیدا ہوتا تھا۔ لکھنؤ اب بھی غنیمت ہے، لیکن یہ چھاؤں بھی ثاقب اور صفی کے دم سے قائم ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اس وقت ایک حد تک دلی نثر کی اور لکھنؤ نظم کی علم برداری کر رہا ہے۔ دارالمصنفین پر زبان کا نہیں بلکہ علمیت کا رنگ غالب ہے۔ حیدرآباد سے سرمایہ فراہم کرنے کی توقع ہے۔ اعظم گڑھ اور حیدرآباد کا مقابلہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ اوّل الذکر کی مثال متلاشیانِ آثار قدیمہ کی ہے جو خزائن اور دفینوں کی تلاش میں ہے۔ اسلاف کے کارناموں کو روشن اور ان سے موجودہ نسل کو آشنا کرنا دارالمصنفین کا کام ہے۔ ان کی جولاں گاہ مصر، ہرکولنیم اور پامپیائی ہے۔ حیدرآباد خام پیداوار کا مالک ہے اور یہ بمنزلہ ہندوستان کے ہے۔ آپ اگر معاف فرمائیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ دنیا میں بدمذاقوں کی کمی نہیں ہے۔ ممکن ہے لفظ 'خام' سے کچھ لوگ دورانِ تنفّس میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لیے میں جلد سے جلد یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ لفظ 'خام' سے یہاں 'ناقص' مراد نہیں ہے بلکہ یہ (Raw Product) راپروڈکٹ کا مرادف ہے۔ اس سلسلہ میں علی گڑھ کو کیا حیثیت دی جائے، میں اب تک طے نہیں کر سکا ہوں اور اسے آپ ہی کے حسن تخیل پر چھوڑتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ ستم ظریفی کو دخل دینے سے اجتناب فرمائیں۔ یہاں یہ بحث اٹھائی جاسکتی ہے کہ اس اکاڈمی کا مقصد کیا ہوگا اور اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اس وقت اردو کو صحیح راستہ پر ڈالنے والی کوئی ایجنسی نہیں ہے۔ رفتار زمانہ کے مطابق نئی نئی قوتیں

برسرِ کار ہیں اور ہر روز نئی نئی ضرورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی خاص مجلس یا ایجنسی ایسی نہ ہوئی جو ان ضروریات کا تجزیہ کرتی رہے یا مناسب تدابیر پیش کرے تو جیسا کہ آج عام طور پر نظر آرہا ہے۔ اردو کی حیثیت صرف نیوز پیپر، لٹریچر (اخباری زبان) کی ہو جائے گی، اور اس قسم کا لٹریچر جیسا کہ ظاہر ہے، کبھی کلاسکس کے زمرہ میں نہیں آسکتا۔ اردو کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ دوسری زبانوں میں نئے الفاظ کے آمیزش کی بہت کم گنجائش ہے۔ اردو کا دامن اس کے لیے نہایت وسیع ہے۔ اسما اور افعال کی آمیزش کچھ بہت زیادہ اہم نہیں ہے، یعنی زبان اور محاورہ کے مسئلہ میں ہم کو انتہائی احتیاط برتنی پڑے گی۔ ہندوستان کی حیثیت ایک برِّ اعظم کی ہے۔ اس میں سیکڑوں قومیں بستی ہیں اور سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر اردو کی کوئی ٹکسال مقرر کی گئی تو کچھ دنوں میں اس کی صورت کے کچھ اس طور پر مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے کہ آپ کھرے کھوٹے کا بھی پتا نہ لگا سکیں گے۔ الفاظ، جملوں، طرزِ انشا، زبان، لب ولہجہ، محاورہ وروزمرہ میں ایسی تفریق نظر آنے لگے گی کہ شاید پھر آپ اردو کا کوئی محاذ ہی نہ متعین کر سکیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کے مسلم الثبوت شعرا اور انشا پردازوں کی ایک اکاڈمی قائم کی جائے جو ادب اردو کا معیار قائم کرے، اور دوسرے لوگ اس سے مستفید ہوں۔ میری اگر رائے نہیں تو تمنا ضرور ہے کہ یہ اکاڈمی علی گڑھ میں قائم کی جائے۔ لیکن براہِ راست اسے مسلم یونیورسٹی سے تعلق نہ ہو۔ ورنہ انتظامی دقتوں کے علاوہ ممکن ہے ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اس کی کامیابی کے لیے مستعد نہ ہوں۔

اس سلسلہ میں مَیں اردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک زمانہ میں معارفؔ نے اس کی تحریک کی تھی، اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس تحریک کی ناکامیابی کا ماتم کیا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ تحریک اس زمانے میں ایک حد تک قبل از وقت تھی۔ کسی زبان کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا ایک خاص وقت اور موقع ہوتا ہے۔ ابھی بہت سے ابتدائی مراحل طے کرنے ہیں، اور چوں کہ یہ مدارج ابھی ناتمام ہیں، اس لیے انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل کی دشواریاں اور زیادہ سنگین ہوتی جارہی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جامع اور مکمل ہو، اس کے بعد کام کرنے والوں کا سوال آتا ہے۔ کام کرنے والوں کا مسئلہ کچھ

بہت زیادہ دشوار نہیں ہے، لیکن تحقیق اور تفحص کے اسباب اور وسائل ابھی ناپید ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس وقت ایک مکمل اور جامع اردو لغت کی ہے۔ اب تک جتنی لغات مدوّن ہوئی ہیں وہ بہمہ وجوہ مکمل اور مستند نہیں ہیں۔ یہ اسکیم انسائیکلو پیڈیا کی اسکیم سے مختصر اور آسان تر ہے، اور اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد انسائیکلو پیڈیا کی تدوین میں کافی سہولت پیدا ہونے کی توقع ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ مختلف شعبہ جات علوم اور فنون پر مستند اور مکمل تصنیفات کی ضرورت ہے۔ میں اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں کہ دوسری زبانوں کی کتب کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بعض اوقات وضع اصطلاحات کا مسئلہ اپنی انتہائی پیچیدگیوں کے ساتھ رونما ہوگا اور اس وقت ہم کو ایسے مترادفات کی ضرورت پیش آئے گی جو جامع اور مانع ہونے کے علاوہ ایک حد تک عام فہم اور سہل و رواں بھی ہوں۔ اس معاملہ میں حیدر آباد یونیورسٹی کی کوششیں ہر طور پر قابلِ ستائش ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک ایسا کام اُٹھایا ہے جس کی کامیابی یا ناکامیابی پر اردو کا مستقبل منحصر ہے۔

پانچویں ضرورت جس کی طرف خود ہماری ایجوکیشنل کانفرنس کو متوجہ ہونا چاہیے، اردو مکاتب کا قیام ہے۔ اس سلسلہ میں آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کانفرنس کے نظامِ عمل کی طرف (جہاں تک اردو کا تعلق ہے) آپ کی توجہ مبذول کراؤں۔ کانفرنس کو اپنے مساعی میں جب کبھی ناکامیابی ہوئی ہے، اس کا اصلی زاویہ یہ ہے کہ اس نے اپنا نظامِ عمل ہمیشہ نہایت وسیع پیمانے پر مرتب کیا۔ ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اس کی مختلف تعلیمی ضروریات ایک مرکز سے تمام کو نہیں پہنچ سکتیں۔ کانفرنس کو جزئیات پر نہیں جانا چاہیے، اس سے سوائے طوالت اور پریشانی کے کچھ اور حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں اب پراونشل کانفرنسیں بھی قائم کی گئی ہیں، لیکن میرے نزدیک اس میں بھی اختصار کی ضرورت ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر ضلع میں مسلمانوں کی ایک مجلسِ تعلیمی ہونا چاہیے، جس کے اراکین اور عہدہ دار اسی ضلع کے باشندہ ہوں اور تمام تعلیمی مصارف کا بار خود اسی ضلع پر ہو۔ اس معاملہ میں گورنمنٹ بھی کافی اعانت کرنے پر آمادہ ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو مکتب کمیٹیاں قائم ہیں، ان کو سب سے بڑی دقت یہ پیش آ رہی ہے کہ جن لوگوں کے لیے سب کچھ کیا گیا ہے، وہ خود اس کی طرف سے بے اعتنا ہیں۔ میری تجویز یہ

ہے کہ کانفرنس کے مقتدر حضرات خود تکلیف فرما کر یا قوم کے دیگر باا ثر بزرگوں کے توسل سے، ہر ضلع کا دورہ فرمائیں اور وہاں کے مقامی حالات کو مدّ نظر رکھ کر اس ضلع کے با اثر اور ہمدرد افراد کی حمایت حاصل کریں، اور اندرونی انتظامات کی عنان بالکل ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر لوگ دل سوزی اور محنت سے کام کریں تو ہر ضلع کے مکاتب اپنی ضروریات کے خود کفیل ہو سکتے ہیں۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ لوگ دل سوزی یا محنت سے کام کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے لیے بالعموم غلط اشخاص کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں کے مسلمان فرقہ بندی کی سعادت سے محروم ہوں اور اپنی ذاتی خصومتوں پر قوم و ملک کے بہترین اغراض و مقاصد کو قربان کر دینے کے لیے تیار نہ ہو جاتے ہوں۔ لیکن اگر کوشش کی جائے تو کوئی دقت ایسی نہیں ہے جس پر عبور حاصل نہ ہو سکے، اور میرا خیال ہے کہ اگر کانفرنس پوری تندہی کے ساتھ کام کرے تو ممکن نہیں ہے کہ یہ معاملات بروقت نہ سلجھ جایا کریں۔

حضرات! اس وقت اردو کی اعلیٰ تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ابتدائی تعلیم کی۔ جب تک عوام تعلیم یافتہ نہ ہوں گے، ہماری آئندہ نسل میں تعلیم کا ذوق فطری اور قومی نہ ہوگا۔ اب ہم کو علمی نہیں بلکہ تعلیمی فضا کی ضرورت ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص کم سے کم ابتدائی تعلیم کو اتنا ہی ضروری سمجھے، جتنا ہمارے گریجویٹ ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کانفرنس کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان مکاتب کا نصاب مقرر کرے، ان کا امتحان لے، اور بہترین طریقۂ تعلیم کو عمل پذیر بنائے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ان مکاتب کی تعلیم بالکل مفت ہو، اور محض اتنی ہو کہ ہر طالب علم معمولی اردو لکھ پڑھ لے۔ ان مکاتب میں یہ انتظام بھی ہونا چاہیے کہ ہفتہ میں دو ایک بار رات کے وقت بھی کلاس ہوا کرے، تاکہ وہ لوگ (اس میں لڑکوں کی تخصیص نہیں ہے) جو کاروبار کی وجہ سے دن میں تعلیم کا شغل نہ رکھ سکیں۔ شب میں نوشت و خواند کر لیا کریں۔ استادوں کے انتخاب میں یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی شعائر کے پابند ہوں اور ضروری مسائل دینی سے واقف ہوں۔ ہفتہ یا مہینہ میں ایک بار اپنے اپنے قصبہ یا قریہ میں لوگوں کو جمع کر کے تعلیم، اسلام اور حفظانِ صحت پر لکچر دیا کرے۔

ایک اور مسئلہ جس کی طرف میں آپ کی توجہ مائل کرانا چاہتا ہوں۔ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، اردوداں حضرات جب بھی کسی اردوداں شخص یا پبلک سے مخاطب ہوں، اردو ہی میں گفتگو فرمائیں۔ آپ خود ان حضرات سے واقف ہوں گے جن کی پوری اردو تقریر میں اردو الفاظ کا تناسب صرف 15 یا 20 فی صدی کا ہوتا ہے۔ یہی حالت خط و کتابت میں بھی نظر آتی ہے۔ بہت کم ایسے انگریزی داں حضرات دیکھے گئے ہیں جو اردو میں خط وخطابت رکھتے ہیں۔ اس کے جواز میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس طور پر اظہار خیال میں سہولت ہوتی ہے۔ لیکن میں ان سے سوال کروں گا کہ وہ جب کبھی کسی ایسے شخص کو اپنا مخاطب بناتے ہیں جو انگریزی سے قطعاً نابلد ہوتا ہے۔ کیا وہ انگریزی کے الفاظ استعمال میں لاتے ہیں، اور اگر نہیں لاتے تو کیا اظہارِ مطالب میں کوئی نقص یا سُقم رہ جاتا ہے۔ یہ صفت اکثر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو یا تو انگریزی کے تمام مدارج طے کیے ہوتے ہیں، یا محض ابجد خواں ہوتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ لوگ جب کبھی اپنے دوستوں یا ڈاکٹروں سے اپنے اعزا کا عموماً اور بیوی کا خصوصاً تذکرہ کرتے ہیں، تو بجائے اس کے کہ (بیوی) یا کچھ اور کہیں ہمیشہ وائف یا سسٹر یا مدر کہیں گے۔ مجھے خود نہیں معلوم اگر بیوی یا ہمشیرہ یا والدہ کہنے سے شرم آتی ہے تو ان الفاظ کے انگریزی جامہ پہن لینے سے شرم وحیا کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ امراض کا نام لینے میں بھی اردو کے بجائے انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اخفائے حال یا عریانی خیال مدنظر ہوتی ہے تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، اس سے کہاں تک مقصد برآری ہوتی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں بے اختیار ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں ہسپتال میں بیٹھا ہوا تھا، ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کی ساری تقریر اردو میں تھی، صرف جہاں کہیں بیوی کا نام آجاتا تھا، برابر 'وائف' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا۔ ''کیوں جناب، گستاخی معاف، آپ کی ساری تقریر تو نہایت برہنہ قسم کی اردو میں تھی۔ بیوی کو بجائے بیوی کہنے کے آپ 'وائف' کیوں فرماتے رہے؟'' میرے اس سوال پر انھوں نے کسی قدر تامل کے بعد فرمایا۔ ''بات یہ ہے کہ ان کو کچھ فیمیل کمپلینٹس (نسوانی شکایات) ہیں۔'' میں نے بے اختیار ہوکر دریافت کیا، ''اور کیوں حضرت فیمیل کمپلینٹس کیا؟'' اس کا جواب

انھوں نے صرف اس طور پر دیا کہ ڈاکٹر صاحب سے نہایت درجہ مخاطب ہوکر جلد جلد کچھ غیر متعلق باتیں کرنے لگے اور ہمارا سوال اور ان کے فیمیل کمپلینٹس دونوں یہیں ختم ہوگئے۔

چھٹی ضرورت جو آج ہمارے سامنے ہے، وہ ترجمہ اور تالیف کی ہے۔ اس وقت اردو کو ایسی زبانوں سے مقابلہ کرنا ہے جو شاہ راہِ ترقی پر اردو سے بہت آگے پہنچ چکی ہیں۔ اسی سلسلہ میں وضعِ اصطلاحات کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اس کام کو نہایت تندہی اور سرعت کے ساتھ پورا کررہی ہے۔ گو وہاں جن کتابوں کے تراجم اب تک ہوچکے ہیں، ان میں بیش تر کتب درسی ہیں۔ اس میں شک نہیں یہ بھی ہمارے انتہائی تشکر و امتنان کا موجب ہے، اور اس میں شک نہیں ایک طور پر یہ کوشش بھی مستحسن ہے۔ کیوں کہ ہندسہ ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، لیکن ضرورت یہ ہے کہ مشہور اور مقتدر انشا پردازوں کی سرپرستی اور نگرانی میں ایک دارالترجمہ قائم ہو، جس میں نہ صرف انگریزی بلکہ دیگر زبانوں کے بھی اردو تراجم مرتب کیے جائیں۔ اس سے زبان کا ذخیرہ نہایت وسیع ہوجائے گا، اور وہ لوگ جو صرف اردو سے آشنا ہیں اور اس میں کمال حاصل کرچکے ہیں۔ دیگر زبانوں کے محاسن اور معائب پر وقوف حاصل کرسکیں گے اور اس طور پر علاوہ اس کے کہ خود اردو زبان وسیع ہوگی۔ اس کے ہمہ گیر ہونے کا امکان اور زیادہ ترقی کرجائے گا۔ اس مسئلۂ خاص میں انجمن ترقی اردو کی مساعی بہرنوع قابلِ ستائش ہیں۔ لیکن جس پر یہ فرض اپنی انتہائی سختیوں کے ساتھ لازم آتا ہے، وہ مسلم یونیورسٹی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہاں کے اردو داں اسٹاف پر فرداً فرداً یہ ذمہ داری عائد کردی جائے کہ وہ یونیورسٹی کی نگرانی میں اپنے مضمونِ خاص کی کسی مقتدر تصنیف کو اردو کے قالب میں لائیں تو شاید بے موقع نہ ہوگا۔

ساتویں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے وہ دوست اور کرم فرما جن کو اردو ادب کا ذوقِ صحیح ہے، اور ان کی انشا پردازی ہر حیثیت سے مسلم ہے۔ اپنی توجہ کو مختصر افسانہ نویسی اور ناول نگاری کی طرف مائل فرمائیں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت جب کہ ملک میں ادب متین کی طرف سے انتہائی استغنا برتا جارہا ہے، اور معقول یا غیر معقول اسباب کی بنا پر اردو ہماری توجہ کو جذب نہیں کررہی ہے۔ ہمارے انشا پردازوں کو ایسی چیز پیش کرنی چاہیے جو عوام کے لمحاتِ فرصت کو

دلچسپ اور ایک حد تک کار آمد بھی بنا سکے۔ اس وقت ہمارا ادبی ذوق جس حد تک پست ہو چکا ہے اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ اردو میں سستے اور متبذل ناول کثرت سے پھیل چکے ہیں، اور معمولی لکھا پڑھا آدمی ہمیشہ ان کی طرف مائل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی ابتدائی نقوش اس کے علمی اور عملی زندگی دونوں کو ہمیشہ کے لیے برباد کر دیتے ہیں۔ جس قسم کی افسانہ نگاری کا میں نے تذکرہ کیا ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ مشرقی معتقدات، مشرقی شعائر، مشرقی تہذیب و تمدن اس صنفِ انشا کے لیے ہر طور پر راس آسکتے ہیں اور یہی نہیں، بلکہ مشرقی آب و رنگ اس کے لیے بغایت موزوں ہیں۔ لیکن افسانہ نگاری کا فن بجائے خود نہایت مشکل ہے اور اس کے اصول و قواعد کو عمل میں لانا آسان نہیں ہے۔ ان افسانوں اور ناولوں میں مقامی رنگ کا ہونا لازمی ہے ورنہ یہ ہمارے جذبات سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں گے۔ غرض کہ اس سلسلہ میں ہم کو نئی بنیاد تعمیر کرنی پڑے گی۔ جس کے لیے ہمارے ماہرانِ ادب کو تیار ہو جانا چاہیے۔

حضرات! مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کر چکا۔ آپ نے جس 'صبر و شکر' کے ساتھ میرے خیالات کی پذیرائی فرمائی ہے، اس کا شکر گزار ہوں، اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اب کوئی ایسا موقع نہ آئے جہاں میری جسارت اور آپ کے ضبط و تحمل کو یوں معرضِ امتحان میں لایا جائے۔ صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کا میں نے عمداً کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے، اور وہ یہ کہ کہنا سننا تو ہمیشہ رہا ہے۔ اس سے حاصل ہی کیا:

"کچھ کیجیے بھی"

جس اندیشہ سے میں نے اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیا وہ آپ پر روشن ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

●●●

(مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، 1342ھ/1924)

ہندوستانی اور اردو دونوں ایک ہیں!

خطبۂ صدارت

اردو کانفرنس، منعقدہ بریلی

خواتین و حضرات!

ایک بات میں نہایت ادب سے عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ابتدا تو میں خواتین و حضرات دونوں سے کرتا ہوں، لیکن آگے چل کر اگر صرف ''حضرات'' میری زبان سے نکلے تو خواتین بُرا نہ مانیں اور حضرات خوش نہ ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کہتے وقت حضرات تو زیادہ سے زیادہ میری آنکھوں کے سامنے ہوں گے، خواتین یقیناً دل میں ہوں گی۔

حضرات! معاف کیجیے، میں نے تو بڑی کوشش کی کہ مجھ سے آپ کا سابقہ نہ پڑے اس لیے کہ غائبانہ تعارف میں فریقین بالعموم فائدہ میں رہتے ہیں۔ سامنا اور سابقہ ہونے پر بہت کم ایسا ہوا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں اچھی رائے قائم کرتے ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں یا آپ کے بارے میں مجھے خلاف توقع کوئی رائے قائم کرنی پڑی۔ بات یہ ہے کہ اردو ہندی کی بحث چھڑ جاتی ہے تو لوگ یہ سمجھ کر کہ ''جو گناہ کیجیے ثواب ہے آج'' ایسی ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جن سے لڑائی کے زمانہ اور آموں کی فصل میں دور ہی رہنا بہتر ہے۔

حضرات! آپ کو معلوم کہ مجھ کو آپ پر اور آپ کو مجھ پر مسلط کرنے میں کن کن بزرگوں نے کیا کیا حصہ لیا ہے۔ میں صدارت کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو مقالہ پڑھنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ مقالہ سے معذوری ظاہر کی تو دونوں کی فرمائش کی گئی۔ میں نے یہ عذر پیش کیا کہ میں اتنا بڑا آدمی ہونا پسند نہیں کرتا کہ خطبۂ صدارت دینے پر اُتر آؤں، اور نہ اتنی قابلیت یا ہمت کہ

مقالہ تیار کر سکوں۔ بہر حال آپ کے سامنے جو کچھ پیش کیا جائے گا اس سے آپ خود بخود اندازہ لگالیں گے کہ جو شخص خطبۂ صدارت اور مقالہ دونوں سے بچنا چاہے اس کا انجام کیا ہونا چاہیے، یا پھر اچھا خاصا معقول آدمی صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر حلیہ اور خیالات دونوں اعتبار سے کتنا مضحکہ انگیز یا قابلِ رحم بن جاتا ہے! بایں ہمہ آپ نے جس لطف و مرحمت سے میری توقیر بڑھائی ہے، اس کا میں دل سے احسان مند ہوں۔

حضرات! میرے دیار اور میرے بچپن میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا پیشہ تو محلّہ والوں کے ہاں پانی بھرنا تھا، لیکن مشغلہ یہ تھا کہ جس چیز کے کھانے کا اس کا دل چاہتا تھا اسے خرید کر یا پکا کر اسی چیز کے سرپرست پیر کا مجھ سے فاتحہ دلواتی تھی، اور تھوڑا سا تبرک مجھے حوالہ کر کے بقیہ سارے کا سارا خود کھا لیتی تھی۔ بڑھیا کی اس کمزوری سے سارا محلّہ واقف تھا، اور میری کمزوری سے صرف بڑھیا۔ مجھے اس وقت کیا معلوم تھا کہ فاتحہ خوانی کی رسم اتنی عام ہو جائے گی اور میں خاص طور پر پکڑا جاؤں گا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ یہی بات نہایت وسیع اور منظّم پیمانہ پر ہماری پبلک زندگی میں سرایت کر چکی ہے۔ جب کسی شخص یا جماعت کا دل چاہا اس نے اپنی پسند کے مطابق ایک محفل فاتحہ خوانی قائم کر دی۔ کسی فاتحہ خواں کو بلا لیا، کھایا پیا شور مچایا یا کھلایا پلایا رخصت کر دیا۔ رزولیوشنوں کا تبرک زیادہ تر تو دفتر ہی میں رکھ لیا گیا یا ایک آدھ کہیں شائع کرا دیا۔ ما بخیر شما بسلامت! مجھے یقین نہیں ہے کہ آج کی محفل میں بھی یہی ہونے والا ہے، لیکن ایسا ہوا تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ نہ ہوا تو سب کچھ ہو گیا!

حضرات! اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں بعض ایسے مفروضات کا کچھ تذکرہ کر دوں جن کو ذہن میں رکھ کر میں آپ سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں:

(1) اوّل تو یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ آج کی محفل پڑھے لکھوں کی محفل ہے یا کم سے کم ایسے لوگوں کی جو لکھنا پڑھنا بُرا نہیں سمجھتے اور نہ پڑھے لکھے لوگوں کو رُسوا کرنا اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لیے مجھے توقع ہے کہ دورانِ تقریر یا مباحثہ میں آپ خواہ مخواہ نہ بگڑیں گے، نہ شور مچائیں گے، اس کے لیے بھی مواقع ملیں گے اور ملتے رہتے ہیں۔ گو اس کے لیے ضروری ہے کہ کم سے کم مجھے آپ پہلے سے اطلاع دے دیں۔

(2) دوسرے یہ کہ جب آپ نے مجھے بلایا ہے تو آپ اپنی ذمہ داری بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ یعنی جو کچھ میں اپنے نقطۂ نظر سے مناسب اور ضروری سمجھوں گا، کہوں گا، اس کا خیال نہ کروں گا کہ آپ کو وہ پسند ہے یا نہیں۔ یا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔

(3) تیسرے یہ کہ میں اس درس گاہ کا ساختہ پرداختہ ہوں جو فرقہ پرستی کی لعنت سے ہمیشہ پاک رہا۔ جہاں ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، پارسی، معقول، نامعقول، چھوٹے بڑے، امیر غریب سب ساتھ رہتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کھانے پینے، ہنسنے بولنے اور مرنے جینے میں کبھی کسی کے ذہن میں نہیں آتا کہ کون کیا ہے اور کیا نہیں۔ میں اس محفل میں بھی اسی عزم و اعتماد کے ساتھ حاضر ہوا ہوں، جس عزم و اعتماد سے علی گڑھ میں رہتا سہتا اور فخر کرتا ہوں، اس لیے میں وہی کہوں گا جو میرے دل کی بات ہوگی اور جس کو میں بہتر سمجھتا ہوں نہ وہ جو کسی اور کے دل کی بات ہو یا جس کو کوئی اور بہتر سمجھتا ہو۔

(4) چوتھے یہ کہ پیش تر یہ نوجوانوں کا مجمع ہے جو سب کچھ ہوتے ہیں۔ مایوس الحال اور تنگ نظر نہیں ہوتے، غلطی جلد کرتے ہیں، لیکن اس سے کہیں جلد غلطی معاف کر دیتے ہیں۔

(5) پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ میں اپنے لیے مسلمان ہونا سب سے بڑی فخر کی بات سمجھتا ہوں، لیکن اردو کی حمایت مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اس بنا پر کہ ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول اور ترقی پذیر زبان ہے اور ہمارے آپ کے بزرگوں کی بڑی مبارک نشانی اور محترم میراث ہے۔ جس کو بچانا، قائم رکھنا اور ترقی دینا ہر محب وطن کا فرض ہے۔ پھر اس بات کو بھی یاد رکھیے کہ مسلمانوں کا ایک شیوہ یہ بھی ہے کہ وہ حق کی حمایت، حمایتیوں کے بھروسہ پر نہیں، بلکہ صرف حق کے لیے کرتے اور کر سکتے ہیں ،لیکن انھیں کامل یقین ہے اور وہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ اردو کی حمایت میں آج بھی ان کے ساتھ بڑے بڑے غیر مسلم اہل قلم اور محب وطن ہیں اور یہ وطن دوستوں کی بڑی ہمت افزائی کا موجب ہے۔

صاحبو! اردو، ہندی، ہندستانی ایک ہی زبان کے مختلف نام ہوں یا نہ ہوں اس بدنصیب ملک کے خوش نصیب لیڈروں کے لڑنے جھگڑنے کے مختلف بہانے ضرور ہیں۔ اب

ہماری حالت یہ ہے کہ اردو، ہندی کا نام آتے ہی فوراً کان کھڑے کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو شبہ اور عداوت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ گویا یہ دو نام ایسے ہیں جن کے لیتے ہی ہندو مسلمانوں میں جو باتیں نہایت خراب وخطرناک ہیں وہ سب ہمارے سامنے آجاتی ہیں، اور ہمارے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہیں رہتا کہ ہم ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہندی سے بدکنے والا میرے نزدیک مضحکہ انگیز نہیں تو قابلِ رحم ضرور ہے اور اردو سے بھڑکنے والا بے خبر اور بے بصر۔

صاحبو! اردو کی تاریخ اس ملک کی دو بڑی قوموں، ہندو اور مسلمان کے بڑے پرانے، بڑے گہرے اور بڑے اچھے تعلقات کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب ہندوستان کو پہلے پہل ہمسایہ اور دوسری اقوام سے سابقہ پڑا۔ دو اجنبیوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سمجھنے ہی کی نہیں بلکہ دونوں نے ایک دوسرے سے نباہ کرنے میں اپنا اپنا فائدہ بھی دیکھا۔ یہ بات کہ ہم تمہاری سنیں اور سمجھیں اور تم ہماری سنو اور سمجھو اور ایک دوسرے کی رفاقت کرو، کسی کے رعب، دباؤ، رشوت یا عیاری سے نہیں حاصل ہوئی، ورنہ آج جب ان سب کی گرم بازاری ہے ہم آپ کیوں ایک دوسرے کی نہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کا منھ دیکھنا گوارا کرتے ہیں؟۔

حضرات! اردو کچھ اس طور سے نازل ہوئی نہیں جیسے آسمان سے تارے ٹوٹ کر گرتے ہیں یا میدانِ جنگ میں ہوائی چھتریوں سے فوجیں اتاری جاتی ہیں۔ یہ تو ہمارے آپ کے صدیوں کے باہمی اختلاط کے بعد پیدا ہوئی۔ اس دوران میں ہم آپ زندگی کے اوراق پر حرف ومعنی کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ رہے، مسلمان حاکم رہے، اس میں شک نہیں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کی حکومت کبھی ایسی نہیں رہی کہ ہم کسی کے سامنے کسی طرح بھی شرمندہ ہوں اور یہ وہ امتیاز ہے جس کی دعوے دار آج بھی شاید ہی کوئی اور قوم یا حکومت ہو۔

زبان کے معاملہ میں مسلمانوں کی پوزیشن بالکل واضح ہے وہ اس کے موجد نہیں، اس کے مؤید ہیں۔ بہ حیثیت حکمراں انھوں نے اردو کو اس وقت تک منھ نہیں لگایا جب تک وہ اس کے قائل نہیں ہو گئے کہ یہ زبان رعایا کی سب سے زیادہ مقبول اور ترقی پذیر زبان تھی۔ اگر وہ ایسا

نہ کرتے تو ان پر بڑا سنگین جرم عائد ہوتا کہ انھوں نے اپنی رعایا کی مقبول و مستند زبان کی توقیر نہ کی۔ جس زمانہ میں اردو قلعۂ معلیٰ میں داخل ہوئی اس زمانہ میں قلعہ سے باہر اردو کے بعض چوٹی کے شعراء بڑی مشکل زبان میں شعر کہتے تھے، لیکن خود بادشاہ، شاہ زادے، متوسلین و مقربین سہل اور سادہ اردو کلام میں لاتے تھے۔ ایک طرف بہادر شاہ اور مرزا فخرو اور دوسری طرف غالبؔ اور مومنؔ کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ یہی نہیں بلکہ غالبؔ جیسے ادق گو شاعر بھی قلعۂ معلیٰ میں داخل ہو کر سہل اور سادہ زبان پر اتر آتے ہیں۔

دوسری بات جس کو مسلمان تسلیم کرتے آئے ہیں وہ یہ ہے کہ اردو ہندی ہی سے برآمد ہوئی ہے اور اس کا ڈھانچہ ہندی ہی کی تیلیوں پر قائم ہے۔ البتہ عربی اور فارسی نے اس ڈھانچہ کو قوت ہی نہیں پہنچائی، بلکہ اس طور پر سدھارا اور سنوارا بھی ہے کہ وہ دوسری مستند زبانوں سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ترقی اور قبول عام میں انگریزی ادب اور دیگر ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اسالیب بیاں نے بھی بڑی مدد پہنچائی ہے۔ اگر یہ باتیں ہندی کے حامیوں کو ناگوار ہیں تو یہ ان کی ناسمجھی ہے۔ موجودہ ہندی بھی جسے اردو کا حریف قرار دیا گیا ہے اس بات پر مجبور ہوئی کہ وہ سنسکرت سے استفادہ کرے۔ سنسکرت کی عظمت سے انکار نہیں۔ سوال اس کے صحیح مصرف کا ہے۔ سنسکرت سے بوجھل ہندی عوام پر نازل کی جاسکتی ہے، ان سے منوائی نہیں جاسکتی۔ میں ہندی پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ اس کے کام کرنے والوں کے اصول و طریقہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے اس مسئلہ پر بحث کرنے کا مجھے حق بھی ہے اور میں اس کا اہل بھی ہوں۔ اس لیے کہ میں ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول زبان کی ترقی و توسیع کا کام بھی کرتا ہوں اور ہندوستان کو اپنا وطن بھی سمجھتا ہوں۔ اردو کا ہندی سے بڑا گہرا اور بڑا معنوی تعلق ہے۔ اس لیے ہندی کی نبض پر ہاتھ رکھے رہنا میرا فرض ہے۔ ہندی کے بے راہ ہونے کا اثر براہ راست اردو پر پڑے گا۔ جس کو ایک اچھا محب وطن کبھی گوارا نہ کرے گا۔

صاحبو! میں ہندی کے کام کرنے والوں کو یہ نکتہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہندی کو مقبول عام بنانے کی صرف ایک صورت ہے۔ یعنی اسے ایک نئی اردو کے قالب میں ڈھالا جائے۔ میرے

اس بیان سے آپ گھبرائیں نہیں اور ہنسیں بھی نہیں، گو ہنسا گھبرانے سے بدرجہا بہتر ہے۔ نئی اردو سے میری مراد وہ زبان ہے جو ہمارے اردو کے اصول پر معرض وجود میں آئے۔ یعنی وہ ضرورت، وہ عالی ظرفی، وہ ایثار واخلاص، وہ قوت ترک واخذ، اور تصرف وتوازن کی وہ صلاحیت جس کے ماتحت اردو عالم وجود میں آئی۔ ان سب کا بہم ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد کوئی زبان وجود میں آسکتی ہے اور ترقی کرسکتی ہے ورنہ ظاہر ہے زبان بنائی جاسکتی ہے پیدا نہیں کی جاسکتی، مسلط کی جاسکتی ہے مقبول نہیں بنائی جاسکتی۔ اردو جن راستوں سے گزری ہے اور جن جن زبانوں یا راستوں سے مستند ہوئی ہے۔ انہیں سے ہندی کو بھی سابقہ پڑے گا اگر وہ ان کسوٹیوں پر آزمائے جانے کے لیے آمادہ نہیں ہے تو مجھے اس کے مستقبل کی طرف سے بہت اندیشہ ہے، مجھے یہ کہہ دینے میں بھی تامل نہیں ہے کہ ہندی ان راستوں سے گزرے گی تو لامحالہ اردو کی شکل میں نمودار ہوگی اور ان راستوں سے گزرنے نہیں دی جائے گی تو اس کا انجام کچھ اور ہو تو وہ ہرگز نہ ہوگا جس کی اس کے علم بردار توقع رکھتے ہیں! نئی ہندی کے نئے دوستوں کو چاہیے کہ اسے سنسکرت سے بوجھل اور مضمحل کرنے کی بجائے اس میں ہندوستان کی موجودہ زبانوں کے الفاظ واسباب منتقل کرنے کی کوشش کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ عربی فارسی سے لاگ ہے تو اسے نظر انداز کردیں۔ اس کے بجائے بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تلگو، کنڑی یعنی ہندوستان کی زندہ عام زبانوں سے کام لیں۔ چوں کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے اس لیے ہندی کا پروپیگنڈا تو کامیاب ہو رہا ہے، خود ہندی کی عاقبت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ہندی میں سنسکرت کی اندھادھند آمیزش اور سنسکرت دونوں کے ساتھ بڑی ناسمجھی کا سلوک ہے۔

ہندی کا موجودہ چلن یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ سموئے جارہے ہیں اور عربی، فارسی کے الفاظ جو زبان میں گھل مل گئے ہیں چن چن کر نکالے جارہے ہیں یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اس قسم کی غلطی مذہبی یا سیاسی جنوں کے باعث ہوسکتی ہے یا پھر اس کا مرتکب وہ ہوگا جو زبانوں کی تاریخ اس کے بولنے والوں کی ضرورتوں اور معمولی باتوں کے لیے غیر معمولی محنت سے بچنے کی فطری خواہش سے ناواقف ہوگا۔ یہ زبان اور اس کے بولنے والوں کے ساتھ سخت ظلم ہے۔

صاحبو! جیسا کہ ابھی کہا جاچکا ہے اردو کی پیدائش اور ترقی میں ہندی اور ہندوؤں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اردو ان دونوں کی احسان مند ہے۔ اس لیے اردو کی ترقی کے مسائل پر جب آپ غور کریں تو ان دونوں کو پیش پیش رکھیں گو مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ نئی ہندی کے نئے پیرو کار جن راستوں سے جن طریقوں سے اور جس منزل مقصود کی طرف جارہے ہیں وہ قومی اعتبار اور زبان کے نقطۂ نظر سے بالکل مناسب نہیں ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب اردو زبان بنی اور پھلی پھولی، اس وقت بھی ہندو مسلمان موجود تھے اور شاید آج کل کے ہندو مسلمانوں سے زیادہ پکے عقیدہ کے ہندو مسلمان تھے۔ وہ مذہب کے اعتبار سے کتنے ہی دور کیوں نہ رہے ہوں انسانیت کے اعتبار سے بہت قریب تھے۔ وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کی فکر میں رہے ہوں یا نہیں ہندوستان کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کی فکر میں ہرگز نہ تھے۔ وہ اردو، ہندی، ہندستانی کے مفہوم سے واقف تھے وہ زبان کو ترقی دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ نئی زبان ایجاد کرنے کا انہیں کوئی خیال نہ تھا۔

ہندوؤں نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ اس زبان کے بڑے مستند شاعر اور ادیب رہے ہیں۔ آج بھی ہم میں بلند پایہ ہندو شعرا اور ادیبوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اردو کی حمایت میں بہت سے مسلمانوں سے آگے ہیں، لیکن اس رجحان کا کیا چارہ جو تنگ دل لیڈروں نے عوام میں پیدا کر کے ملک کی فضا کو اس قابل نہ رکھا کہ اس میں راحت و عافیت کے ساتھ کوئی بھلا مانس سانس لے سکے۔ بعض بڑے سربرآوردہ صاحبان علم و منصب کا خیال ہے اور انگریزی اخبارات نے حسبِ دستور اس کی بڑی شدّ و مد سے اشاعت کی ہے کہ ''اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کے اقتدار و تسلط کی یادگار ہے'' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تو بتایئے کہ مسلمانوں کے اقتدار و تسلط کی یادگار قابلِ نفرت کیوں ہو؟ اقتدار و تسلط سے جبر و تشدد کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے، لیکن تاریخ یا زبان کا کوئی طالب علم بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان کے سلسلے میں مسلمان سلاطین نے کوئی ایسی بات بھی کی جن سے جبر و تشدد کا اظہار ہوتا ہو؟

صاحبو! تسلط و اقتدار کے ساتھ ساتھ احسان و برکت کے مفہوم پر بھی غور کیجیے جسے آپ تسلط و اقتدار سمجھتے ہیں، اسی کو آپ احسان و برکت کے معنی بھی تو پہنا سکتے ہیں۔ سوال نقطۂ

نظر کا ہے۔ الفاظ، جذبات، اسالیب، خلوص اور صناعت کاری کے اس تاج محل کو جسے اردو کہتے ہیں، آپ مسمار کردینا چاہتے ہیں تو پھر اینٹ پتھر، جسم و روح، تصورات و معتقدات، علم و فن، فیض و برکت کے ان تمام تاج محلوں کو بھی مٹادیں جس سے یہ سرزمین بھری پڑی ہے۔ پھر زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس پر مسلمانوں نے اپنے برکات کے نقوش نہیں چھوڑے ہیں، اور یہ کچھ ہندوستان ہی پر موقوف نہیں ہے۔ متمدن دنیا کا کون سا حصہ ہے جس پر مسلمانوں کے دست و بازو یا ذہن وفکر کا نقش نہ قائم ہو۔ یہ نقوش کون مٹا سکتا ہے۔ ان کو مٹانا بھی نہ چاہیے۔ یہ نقوش ہر نقش میں خود بخود نمایاں ہوں گے۔ اگر نمایاں نہ ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ جس متن پر یہ نقوش نمایاں نہیں ہیں، وہ متن بجائے خود نقش برآب ہے۔

علوم وفنون، تہذیب واخلاق، شہامت وصداقت کی یادگاروں کو مٹانے والے کو آپ جانتے ہیں۔ دنیا کن ناموں سے یاد کرتی آئی ہے: عزمِ صمیم، کارِ عظیم اور لطف عمیم ایسی چیزیں نہیں ہیں جنھیں کوئی مٹا سکے۔

صاحبو! اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھئے کہ ''الگ تھلگ رہنے اور رکھنے کے اصول نے اس ملک کو بڑے نقصانات پہنچائے ہیں۔ اسی دیرینہ تفریق کا نتیجہ ہے کہ وہ لوگ جو اب تک تہذیب وتمدن کی برکتوں سے محروم رکھے گئے، اب منت سماجت کے باوجود آپ کے گروہ میں شامل نہیں ہوتے۔ وہ زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ پاکستان کی تحریک اسی ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل سے وجود میں آئی۔ میں پاکستان کا قائل نہیں ہوں، لیکن میں نے ان واقعات و میلانات کا مطالعہ کیا ہے جو لازماً اس قسم کی تحریکوں کا باعث ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنوں ہی سے نفرت کر کے ہریجن ہند کی بنیاد رکھی۔ اس آفت میں آپ مبتلا تھے ہی کہ آپ نے ''مسلم ہند'' کے امکانات کا اس میں اور اضافہ کر دیا۔ اسے ہندو مسلمان دونوں خوب یاد رکھیں کہ زیگفر ڈ لائن اور مشیر نو لائن بنا کر وہ جنگ تو کر سکتے ہیں، اعتماد و عافیت کبھی نہیں حاصل کر سکتے۔ کچھ اور نہیں تو مسلمانوں کا یہ احسان تو ہندوستان ہمیشہ یاد رکھے گا کہ انھوں نے ہندوستان کے بے شمار دوراز کار اور نافرجام زیگفر ڈ اور مشیر نو لائنیں مٹادیں۔ مسلمان اور ان کا مشن اس قسم کی لائنوں کے خلاف ہے اور اس نے ہمیشہ اس کے خلاف جد وجہد کی ہے۔

صاحبو! اردو ہندی کے ساتھ ایک لفظ ہندستانی بھی بطور 'فدوی' شامل ہو گیا ہے۔ فدوی سے مراد یہاں واحد متکلم نہیں ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو، سورج اور چندر گرہن کے سلسلہ میں ایک بڑی دلچسپ روایت آبِ حیات حاصل کرنے اور پینے کی ہے۔ دیوتاؤں کی جماعت میں مسٹر راہو کس طرح داخل ہو گئے تھے اور ان کا کیا انجام ہوا۔ یہ سب آپ کو معلوم ہوگا، یہی حال اردو ہندی اور دیگر زبانوں کے درمیان اس ہندستانی کا ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے، بالخصوص لیڈروں کی زبان پر یہ جتنا معصوم معلوم ہوتا ہے، اتنا ہی مفہوم و مقصود کے اعتبار سے نامعقول ہے۔ یہ اندھے کی لاٹھی ہے یعنی اس سہارے کا کام بھی دیتی ہے جس کا اندھا محتاج ہوتا ہے، اور اندھے کی اس ترنگ کو بھی پورا کرتی ہے۔ جب وہ لاٹھی کے سہارے چلنے کی بجائے اسے چلانے لگتا ہے!

حضرات! اردو، ہندی، ہندوی، ہندستانی ایک ہی زبان اردو کے مختلف نام ہیں۔ اس کے تاریخی ثبوت موجود ہیں۔ اس پر خوب بحث ہو چکی ہے۔ میں ان کو دُہرانا نہیں چاہتا۔ البتہ اتنا یاد رکھئے کہ یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے، اور دوسرے مقامات پر سمجھی جاتی ہے۔ اردو کے حمایتی اسے ہندی کہتے ہیں۔ سارا جھگڑا اسی ایک محبوب کے دو چاہنے والوں کے سبب سے پیدا ہوا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ اچھا یہی ہندستانی ہندی ہے، تو پھر ہندی کے نام سے ایسی زبان کیوں پیش کی جاتی ہے جو نہ شمالی ہند میں مقبول ہے اور نہ عام طور پر بولی جاتی ہے، اور نہ دوسرے مقامات پر سمجھی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندستانی کے لیے کبھی 'ہندی ہندستانی' کا فقرہ استعمال کیا جاتا ہے، کبھی 'ہندستانی ہندی' کا، لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ فارمولے ایسے گریز پا ہیں کہ نہ ہمارے قابو میں آتے ہیں اور نہ ہم ان کے قابو میں! اس بحث کو ختم کرتے کرتے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندستانی معمولی روزانہ کی بات چیت کی زبان ہے جو مختلف تبدیلیوں کے ساتھ مختلف مقامات پر اظہار خیال کا وسیلہ بن گئی ہے، یہ تصنیفی زبان نہیں ہے۔ ہندستانی اکیڈمی کی بدنامی یا ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی تصنیفی زبان ہونے کے امکان کو امرِ واقعہ تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن جب علمی دقتیں اور جماعتی تنگ نظری سامنے آئی تو کسی کی ایک پیش نہ گئی۔ درحقیقت اس لفظ ہندستانی کو (جہاں تک

تصانیف کا تعلق ہے) مجاز کے طور پر نہیں بلکہ بطور معیار کے پیشِ نظر رکھنا چاہیے تھا۔ یعنی اردو لکھنے والے سہل سے سہل اور اسی طرح ہندی کہنے والے سہل سے سہل ہندی لکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے سر ولیم میرس سابق گورنر صوبہ سندھ کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھولتا کہ ہر ہندی داں کا حق ہے کہ اسے اردو سمجھنے دیا جائے۔ بالفاظ دیگر ہندی کے برتنے والے کے مدنظر یہ ہونا چاہیے کہ اس کی تحریر سے اردو داں بھی مستفید ہونے کا حق رکھتے ہیں، اور اردو کے ہر لکھنے والے کے پیشِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہندی داں بھی اس کی تحریر سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو رفتہ رفتہ ایک مشترک زبان وجود میں آجائے گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سچے اور اچھے اصول کو کون منوائے گا اور کون مانے گا۔ اس کا جواب میں تو یہی دے سکتا ہوں کہ آپ نوجوان اسے مانیں گے اور آپ ہی نوجوان اسے منوائیں گے۔ اگر ایسا ہونا ناممکن ہے تو پھر غالباً یہ بات ہوگی کہ ابھی ہم پر ایسا کوئی حادثہ نازل نہیں ہوا ہے جس کے ہم واقعی سزاوار ہیں، جس کے بعد ہم وہ سب کچھ مان لیں گے جواب نہیں مانتے۔

حضرات! میرا خیال ہے کہ اردو سے ہندوؤں کو اور ہندی سے مسلمانوں کو بدکنے اور بیزار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں سے قطع نظر یہ تو دیکھیے کہ اردو نے کبھی بھی اپنے دیرینہ محسن ہندوؤں کی خدمت کرنے میں کوتاہی کی؟ خود ہندو علماء اکابر نے اپنے مذہب، حکمت، اخلاق، شاعری سب کی اشاعت وترقی میں اردو کو وسیلہ بنایا۔ اردو ہی نے ہندی کا تعارف تمام ہندوستان سے کرایا۔ آج بھی غیر مسلم صاحبان فکر اور ارباب قلم کی اردو ویسی ہی خدمت کررہی ہے جیسا کہ کبھی پہلے کرچکی ہے۔ یہ باتیں محض لطف سخن کے سلسلہ میں نہیں عرض کررہا ہوں۔ وقت تنگ ہے ورنہ میں اپنے اور آپ کے کرم فرما اور فاضل بزرگ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے معرکتہ الآرا مقالہ ''اردو ہماری زبان'' کے وہ جستہ جستہ اقتباسات آپ کو سناتا جہاں موصوف نے اردو کے احسانات ہندوؤں پر اور ہندوؤں کے احسانات اردو پر تاریخی شواہد کے ساتھ بیان کیے ہیں!

دوسری بات جو میں آپ سے خاص طور پر عرض کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ہندی سے آپ خواہ مخواہ نہ ڈریں، نہ بدظن ہوں، معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اردو ہندی ہی سے

برآمد ہوئی ہے۔ اس کی نہاد ہندی ہی ہے۔ اردو، ہندی ہی کی ترقی یافتہ اور شائستہ صورت ہے۔ لیکن اس ہندی کی ترقی یافتہ اور شائستہ صورت ہے جو نواح دہلی کے عوام کی بولی تھی، جس زبان میں وہ رنج وراحت یا اپنی مختصر ضروریات کا اظہار کرتے تھے۔ پریم کے گانے گاتے تھے اور پالن ہار کی بڑائی کرتے تھے۔ وہ ہندی ہرگز نہیں جس میں آج کل بلالحاظ موقع ومحل لیڈر تقریریں کرتے پھرتے ہیں، اور اس کا مطلق لحاظ نہیں کرتے کہ ہوائی چھتریوں کے ذریعہ سپاہی تو اتارے اور سرنگیں تو بچھائی جاسکتی ہیں، الفاظ وعبارت اور ان کے مفہوم دلوں میں ہرگز نہیں اتارے جاسکتے۔ بذات خود میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ ہندی کو اصلی وقدیم ہندی سے کوئی نسبت نہیں۔ اسے تو جدید سنسکرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

صاحبو! ابھی ابھی میں نے ایک روایت بیان کی تھی کہ اردو ہندی نژاد ہے۔ اس سے ممکن ہے آپ کو کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہو۔ اس لیے میں صرف اس کی تصریح کر دینا چاہتا ہوں۔ اردو ہندی سے ماخوذ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہندی کے مقابلہ میں اردو کی حیثیت محض ضمنی ہے۔

بذات خود میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اردو ہندی کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ خود ہندی میں ایک الوالعزم، سیر چشم اور ملن سار قوم کا خلوص وشعور، متعدد ومختلف بیدار وبرسرکار زبانوں کا فیضان وفعالی ملک کی صحیح وصالح طلب اور اسی ملک کے رہنے بسنے والوں کی یک جہتی وحسن ومفاہمت نے ٹھیک وقت اور ٹھیک موقع پر ایک نشاۃ الثانیہ کی طرح ڈالی اور یہ ہندی کا نشاۃ الثانیہ تھا جو اردو کے تاج محل میں جلوہ گر ہوا۔

اس مسئلہ کی وضاحت بڑا وقت چاہتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ایک خالص علمی مسئلہ کی وضاحت میں آپ کو دیر تک بٹھا رکھوں۔ غالباً اتنا اشارہ کر دینا یہاں کافی ہوگا کہ بعد کی مختلف قوتوں نے جو وقتاً فوقتاً ابھرتی رہیں یا ابھاری گئیں اس عجیب وغریب تحریک کو صحیح راستہ پر رواں رہنے سے روک دیا۔ لیکن اس بحث کو یہاں ختم کیجیے۔

اردو خالص اپنے دیس کی چیز ہے۔ اس لیے اسے دیس ہی میں بدیس نہ ہونے دینا چاہیے۔ ہمارے دیس ہی میں کس چیز کی کمی ہے جو ہم خواہ مخواہ مایوس یا شرمندہ ہوں۔ اردو میں

ہر زبان ہر تحریک اور ہر تجربہ کی گنجائش ہے۔ لیکن اس گنجائش کو سمجھنے تولنے اور پرکھنے کے لیے محنت، دیانت وسعت نظر، اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ زبان وادب کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھنے چاہئیں، لیکن احتساب نہ اٹھانا چاہیے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ زبان وادب اپنے محتسب اور امین خود پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس کے نہ اجارہ دار ہوتے ہیں اور نہ اس کی خانقاہیں۔ دروازے کھلے رکھیے لیکن پاسبان ضرور رکھیے!

حضرات! زبان کی کامیابی کا مدار بالعموم دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ یعنی اسے عام طور پر لوگ کہاں تک بولتے سمجھتے اور کام میں لاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خواص یعنی ادیب، شاعر، مفکر اور ثقہ اسے کیا درجہ دیتے ہیں اور اس سے کیا اور کہاں تک کام لیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں واضح ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے اردو اب بھی ہندوستان میں ہر زبان سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی تمام مروجہ زبانوں سے زیادہ یہ ہندوستان سے باہر بھی مقبول و مروج ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خواص کی تقریباً ان تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے جس کا اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اردو اشعار یا مشاعرے کتنے ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں، عوام اور خواص دونوں اردو کلام پر وجد کرتے ہیں۔ ہماری ذہن وفکر کا وہ بہت دور تک ساتھ دیتی ہے۔ غیر زبان کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے جن باتوں کی ضرورت یا جن شرائط کی پابندی لازم آتی ہے، اردو بڑی حد تک ان کو پورا کرتی ہے۔ اس میں صلابت، نزاکت، لطافت، رعنائی، وسعت، وزن، عمق، بلندی، تنوع اور توازن سبھی کچھ ہے۔ یہ بڑی عالی ظرف اور ہمہ گیر زبان ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو ہر موقع پر ہر وقت مل سکتا ہے۔ اس میں جتنے اچھے سچے اور بے شمار سانچے ہیں، اس کا مجھے خوب اندازہ ہے۔ آپ میں سے بھی بہتوں کو ہوگا۔ یہ برکت ہے ان برگزیدہ ہستیوں کی اور ان برگزیدہ مقاصد کی جن کی یادگار ہماری آپ کی یہ اردو زبان ہے۔ اس کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ مطمئن ہو جائیں اور کوشش سے ہاتھ اٹھالیں۔ اردو نرغہ میں ہے اور ایسی ایسی قوتیں مخالفت میں برسر کار ہیں جن کا صحیح اندازہ ہم آپ نہیں کر سکتے۔ آپ تو شاید یہ بھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ خود ہم آپ اردو کی حمایت میں دوسروں سے کتنے پیچھے ہیں اور اگر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب المخاطب بہ اردو یار جنگ اردو کے دیرینہ محسن و مایہ ناز

محقق وادیب نے یہ نہ کہہ دیا ہوتا کہ ''ہم بھی پیچھے نہیں ہیں'' تو میں پیچھے کے ساتھ ہٹے کا اضافہ ضرور کر دیتا۔

صاحبو! حال میں ایک اخباری بحث کا بغور مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ اخباری بحث کا بغور مطالعہ کرنا دانش مندی کی بات نہیں ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں ہمیشہ دانش مندی ہی کی بات کرتے رہنے یا کیے جانے سے عمر کم اور حلیہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں نے عمداً اردو سے ہندی کے الفاظ خارج اور عربی، فارسی کے الفاظ داخل کیے۔ اس طور پر اردو مسلمانوں سے قریب اور ہندوؤں سے دور ہوگئی۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مثال خاص طور پر پیش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ متروکات کے اصولوں پر بھی بحث کی گئی تھی۔ اردو کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والوں کی نظر مولانا ابوالکلام کی تحریروں پر خاص طور پر پڑتی ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کو سب سے پہلے واضح کر دینا بہت ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ مولانا آزاد ایک خاص قسم کے اسلوب وانشاء کے مالک ہیں۔ ان کا اسٹائل (اسلوب) اور ان کا میٹریل (مواد) دونوں مخصوص انداز کے ہیں، جن پر آپ کوئی عمومی حکم نہیں لگا سکتے۔ مولانا ابوالکلام نے جس وقت لکھنا شروع کیا اس وقت مسلمانوں پر جنگ بلقان، جنگ طرابلس اور آخر میں ٹرکی کے شریک ہو جانے سے جنگ عظیم کے باعث ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ مولانا آزد اسلامی حکومتوں اور اسلامی اداروں کو پامال اور فنا ہوتے دیکھ رہے تھے اور وہی نہیں تقریباً ہر مسلمان یاس و اضطراب کے عالم میں مبتلا تھا۔ مولانا کے مخاطب صرف مسلمان تھے جن کی ذہنی کیفیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لازمی تھا کہ وہی کلمات، وہی باتیں اور وہی روایات مدنظر رکھی جائیں اور وہی انداز اور وہی لب ولہجہ اختیار کیا جاتا۔ جو مسلمانوں کے دلوں کو گرما یا برما سکتا۔ مولانا کو اس وقت مسلمانوں ہی کو سہارا دینا تھا اور انہیں سے سہارا پکڑنا مقصود تھا۔ ان کے مخاطب اس وقت نہ اردوداں تھے، نہ ہندی داں، بلکہ صرف مسلمان تھے جن میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے وہ اپنی خطابت اور عربی کی جزالت سے کام لینا ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے ان کی اس وقت کی تحریروں سے سند لینا صحیح نہیں ہے۔ دوسری طرف جب وہ دور گزر گیا اور نان کوآپریشن کا زمانہ آیا تو انھوں نے اپنی تحریر کا رنگ یک لخت بدل دیا۔ اس وقت ان کے مخاطب ہندوستان کے

سارے باشندے ہیں۔ اس لیے ان کی تحریریں بھی سلیس سادہ اور ہلکی پھلکی ہوتی ہیں۔ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ مولانا نے جو کچھ کیا وہ کبھی اس لیے نہ تھا کہ وہ ہندی کو پامال اور اردو کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ ایسا ہوتا تو آخر آج کون سی چیز مانع ہے کہ وہ اپنا پہلا اسلوب اختیار نہ کریں؟

اب رہا بعض ہندی الفاظ کا نکالا جانا اور ان کی بجائے فارسی الفاظ کا دخل پانا یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بعض ہندی الفاظ اور ترکیبوں کو خواہ مخواہ متروکات کی فہرست میں داخل کیا گیا۔ لیکن یہ کسی منظم تحریک کے باعث نہ تھا۔ اس سے آپ اردو کے بعض اساتذہ کا دامن پکڑ سکتے ہیں۔ من حیث الکل تمام مسلمان اردو دانوں کو مورد الزام نہیں قرار دے سکتے۔ لیکن انصاف شرط ہے۔ الفاظ ہندی کے ہوں یا عربی، فارسی کے زبان سے ہمیشہ نکلتے بھی رہیں گے اور شامل بھی ہوتے رہیں گے۔ شائستگی کے مختلف مراحل طے کرتے ہی ہندی نے جب اردو کی اور اردو نے ایک مستند اور مقبول زبان کی حیثیت اختیار کی تو زبان دانوں کے سامنے، اور اس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ وہ تمام مسائل آئے جو ایسی حالت میں ضرور پیش آتے ہیں۔ کون سے الفاظ کیسے ہیں۔ ان کو خراد پر چڑھا کر موزوں اور سڈول بنالینا چاہیے یا یک قلم نکال دینا چاہیے۔ ان کا زبان سے میل ہے یا نہیں، وہ ٹکسالی بنائے جاسکتے ہیں یا نہیں، امتداد زمانہ یا ترقی افکار کے فشار سے وہ قائم رہیں گے یا نہیں، زبان کو آئندہ جن مطالبات کو پورا کرنا پڑے گا اس کے لیے کس قسم کے ذخیرے یا کس طرح کے اصول وضع کرنے چاہئیں۔ یہ مسائل اردو کے فضلاء کے سامنے آئے اور انھوں نے جہاں تک ہوسکا اردو کو اس قابل بنانے کی کوشش کی کہ وہ مستند زبانوں کی صف میں جگہ پاسکے۔ ہندی کو جو حیثیت ابتدا میں تھی اس سے ہم سب واقف ہیں۔ وہ خود علمی یا ادبی زبان بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے دوسری زبانوں سے مدد لی گئی۔ اعتراض کرنے والے صاحب نے یہ نہیں دیکھا کہ آج کل بھی اردو کے اسالیب بدلتے جارہے ہیں اور نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں بڑی کثرت سے داخل ہورہی ہیں۔ حیدرآباد، پنجاب اور ترقی پسند مصنفین کی مطبوعات کا آپ غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا۔ اردو کے اسالیب بیاں ہی نہیں بدلتے جارہے ہیں، بلکہ سائنس، تنقید، افسانہ اور اس قبیل کے دیگر موضوعات نے اردو میں فنی، اصطلاحی اور ادبی الفاظ کی بھرمار کردی ہے اور ہر طرح کے الفاظ وفقرے اردو میں بڑی تیزی کے ساتھ داخل ہوتے جارہے ہیں۔

حضرات! گذشتہ مہینہ کے آخری ہفتہ میں صوبہ ہذا کے مشہور انگریز روز نامہ لیڈر میں نینی تال کے ایک نامہ نگار کا نوٹ شائع ہوا ہے کہ یوپی سکریٹریٹ کے ہندی ساہتیہ سنگ کا ایک غیر معمولی جلسہ شریمت سی بال کرشن راؤ آئی۔سی۔ایس کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اس رویہ پر اظہار افسوس کیا گیا تھا کہ جس قسم کی ہندستانی زبان وہاں استعمال کی جاتی ہے اس میں غیر مانوس بدیسی الفاظ بالخصوص عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔اس کے بعد آگے چل کر کہا گیا کہ آل انڈیا ریڈیو کی یہ پالیسی نہ صرف ہندی کو بے پناہ نقصان پہنچا رہی ہے، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو ان لوگوں کا بالکل لحاظ نہیں رکھتا جن کے لیے وہ قائم کیا گیا، اور جن کی وسیع اکثریت ہندی بولنے والی تھی۔آخر میں یہ نوٹ تھا کہ حاضرین میں مسٹر کے۔بی۔بھاٹیا۔آئی۔سی۔ایس ڈپٹی کمشنر سیتاپور اور ٹی۔این۔جھا آئی۔سی۔ایس ڈپٹی سیکریٹری صنعت وحرفت اور بعض دیگر عمائدین تھے۔

اس نوٹ پر لیڈر کے اڈیٹر نے ایک مستقل نوٹ میں اپنی جو رائے سپرد قلم فرمائی ہے اس کا خلاصہ بھی سنیے: ''ہم کو اکثر ایسی شکایات موصول ہوئیں کہ آل انڈیا ریڈیو سے خالص وہ بھی مشکل قسم کی اردو میں خبریں نشر کی جاتی ہیں جسے عام طور پر ہندی جاننے والے نہیں سمجھ سکتے۔'' (اس تمہید کے بعد نینی تال کے متذکرہ صدر نوٹ کا حوالہ دیا گیا ہے اور پھر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ان کے جستہ جستہ اقتباسات حسب ذیل ہیں)

''یہ ہندی کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے جو ہندوستان کی تمام زبانوں سے زیادہ بولی جاتی ہے — ہم کو اردو سے کوئی مخاصمت نہیں ہے۔ہم کو اس کی خوشی ہوگی کہ اگر وہ بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح اپنے خاص حلقہ میں ترقی کرے۔چوں کہ اس سنگ میں خالصتاً گورنمنٹ کے حکام شامل ہیں۔چوں کہ اس کی صدارت ایک سویلین نے کی۔چوں کہ غیر اراکین میں جن لوگوں نے اس کی تائید کی ان میں ڈپٹی کمشنر اور الہ آباد یونیورسٹی کے صدر ہیں اور چوں کہ رزولیوشن کے الفاظ ایسے ہیں جن پر اردو کا کوئی بہی خواہ کسی طرح معترض نہیں ہوسکتا۔اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جلسہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ کسی شرارت یا غیر ذمہ دارانہ جذبہ سے متاثر ہوکر آل انڈیا ریڈیو کو پریشان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان تمام

باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ شکایت بالکل بجا ہے۔ چناں چہ حکام کو چاہیے کہ اس کا جلد سے جلد تدارک کریں۔''

حضرات! جن اسباب کی بنا پر جو نتائج نکالے گئے ہیں ان پر ذرا غور فرمایئے۔ میں ان کی تشریح نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں پہلا سوال یہ ہے کہ کیا ایڈیٹر لیڈر کا یہ کہنا صداقت انصاف اور خلوص پر مبنی ہے کہ: ''ہم کو اردو سے کوئی مخاصمت نہیں ہے۔ ہم کو اس کی خوشی ہوگی اگر وہ بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح اپنے خاص حلقہ میں ترقی کرے۔''؟ دوسرا سوال یہ ہے کیا حکومت کے مقتدر حکام کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ہندی اردو کے مسئلہ میں منظم جماعتی پاس داری کا یوں کھلم کھلا مظاہرہ کریں؟۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ جب ایسے ایسے بارسوخ وصاحب اقتدار حکام منظّم ہو کر کسی مسئلہ پر اس شدومد کے ساتھ علی الاعلان اپنی پاس داری کا اعلان کریں گے تو آل انڈیا ریڈیو ہی کیا حکومت کا کوئی ادارہ خواہ وہ پولیس ہو، فوج ہو، عدالت ہائے دیوانی وفوج داری ہوں، محکمۂ تعلیم یا کوئی اور محکمہ ہو، انصاف ویکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض بجالا سکے گا، اور وہ لوگ عزت، عافیت اور آزادی سے رہ سکیں گے جو ان حکام کے ملت یا مسلک سے علیحدہ ہوں؟۔ چوتھا سوال یہ ہے کیا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ مقتدر حکام کی یہ جماعت جسے ہندی بتاتی ہے وہی ہندی ہندوستان کی بیش تر آبادی کی زبان ہے، اور اس زبان سے انحراف کرنا یا اس سے مختلف زبان استعمال کرنا آل انڈیا ریڈیو کا سب سے بڑا جرم ہے؟ پانچواں سوال یہ ہے کہ کیا بااختیار و مقتدر حکام وارباب حکومت کی یہی تنگ دلی اور تنگ نظری نہ تھی جس کی بنا پر گذشتہ دور حکومت میں اردو ہندی کے مسئلہ پر اردو کے بہی خواہوں کو سخت شکایت اور بد دلی کا موقع ملا تھا جس کے وہ آج تک شاکی ہیں؟۔ چھٹا سوال یہ ہے کیا صوبہ کی موجودہ حکومت اپنے سربرآوردہ حکام کی اس منظّم جماعتی پاس داری کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور کیا وہ گوارا کرلے گی کہ اس طرح کے دوسرے سخت متنازعہ فیہ مسائل پر اس کے دوسرے حکام اسی طرح کارروائی عمل میں لائیں؟۔ ساتواں سوال یہ ہے کیا آل انڈیا ریڈیو سے اچانک کوئی ایسی مجرمانہ بے عنوانی سرزد ہوئی تھی کہ سنگ کا نینی تال میں غیر معمولی اجلاس کیا جاتا شر یجت سی۔ بال کرشن راؤ آئی۔ سی۔ ایس اس کے صدر ہوتے اور فی الفور، لیڈر جس کی پالیسی کے سب سے بڑے کرتا دھرتا لبرلزم

کے مسلمہ لیڈر رسری، وائی چنتامنی ہیں، اپنے اڈیٹوریل کالم سیاہ کر دیتا؟۔ یہی لبرلزم ہے؟ اسی کو صحافتی دیانت داری کہتے ہیں؟۔

حضرات! یہ باتیں تو کب سے ہوتی آرہی ہیں اور معلوم نہیں کب تک جاری رہیں گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ ہم کچھ کرنا بھی چاہتے اور کچھ کر بھی سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم جانتے سب کچھ ہیں، چاہتے سب کچھ ہیں، کر بھی بہت کچھ سکتے ہیں۔ لیکن کریں گے کچھ نہیں۔ پوزیشن یہ ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیے کہ زمانہ وہ ہے جب آپ کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ خواہ آپ پسند کرتے ہوں یا نہیں، خواہ آپ میں سکت ہو یا نہ ہو!

ایسی صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم چند عقائد اور اصول متعین کرلیں اور اپنا عملی پروگرام مختصر رکھیں اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں مجھ میں آپ میں اختلاف بھی پیدا ہوسکتا ہے اور ہم آپ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی بن سکتے ہیں۔ اس لیے ان پر، خلوص اور سکون کے ساتھ غور فرمائیے۔

ا۔ آپ کے اصول اور عقیدہ کی بسم اللہ اس سے ہونی چاہیے کہ مادری زبان میں صحت و سہولت سے گفتگو کرنا اور اپنے بہترین خیالات کو بہترین اسلوب سے ظاہر کرنے کی قدرت رکھنا آپ کا فرض ہے اور فرض سے عہدہ برا ہونا نعمت! اس کو آپ اپنا ذاتی اور قومی امتیاز سمجھیں نہ کہ ننگ۔ جیسا کہ اب تک سمجھتے رہے ہیں۔ اگر آپ کا دل اس عقیدہ پر نہیں جمتا تو خواہ مخواہ دھوکہ دینے اور ہنگامہ مچانے سے باز آجائے۔ دوسرے یہ کہ اردو یا اسلام کو چھوئی موئی مت سمجھیے۔ مدتوں کی غفلت اور بزدلی نے ہم میں خواہ مخواہ چیخنے اور مدد مانگنے کی بدعادت پیدا کردی ہے۔ آپ یقین مانیں جب ہم اسلام اور اردو کے لیے چیختے چلاتے ہیں تو ہماری ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ اسلام یا اردو نہیں، بلکہ ہم خطرہ میں ہیں۔ ایسی حالت میں اسلام یا اردو کو بیچ میں لانا بڑی نالائقی ہے۔ اس بدعادت سے ہم نے اپنی استعداد کار مضمحل کردی ہے اور دوسروں کی نظر میں سبک ہوچکے ہیں۔ اسلام یا اردو کو سپر نہ بنائیے بلکہ ان کے سپر خود بنیے۔ آپ ایسا کریں گے تو آپ کی آواز میں اثر اور آپ کے عمل میں قوت پیدا ہوگی۔

تیسرے یہ کہ اردو کی حمایت میں آپ خواہ مخواہ سیاسی یا مذہبی جذبات سے مغلوب نہ ہوں۔ اردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہمارے ہم وطنوں کی بھی زبان ہے۔ اردو کی

حمایت جماعتی نہیں وطنی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہیے۔ دیسی بدیسی کسی زبان سے آپ کو برہم یا بدظن نہیں ہونا چاہیے۔ اردو کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ ہر زبان سے نئی زندگی حاصل کرتی رہی ہے اور ہر تحریک سے مستفید ہوئی ہے۔ آپ اس کو تمام ہندوستان کی مشترک زبان بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہندوستان کی زبانوں یا ان کے بولنے والوں سے خوف زدہ کیوں ہیں؟ اس طریقۂ کار اور وسعت نظر سے آپ میں بڑے اچھے لکھنے والے پیدا ہوں گے۔ آپ کی زبان نت نئی خوبیوں کی حامل بنتی جائے گی اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کی تعداد ترقی کرتی رہے گی۔

چوتھی بات یہ ہے کہ سہل اور بامعنی اردو لکھنے کی کوشش کیجیے۔ ادبی بازی گری یا مشاطگی کی اب نہ فرصت ہے نہ مانگ۔ کبھی اس کا بھی زمانہ تھا۔ یہ زمانہ فراغت کا نہیں مقابلہ کا ہے۔ بازار میں نئی، اچھی اور کارآمد چیزیں بہ کثرت آرہی ہیں۔ آپ بھی نئی اچھی اور کارآمد چیز پیش کیجیے۔ بھیک مانگنے، جیب کترنے یا ڈاکہ ڈالنے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ مقابلہ ایسا سخت ہے کہ آپ کا مال انیس ہوگا تو اسے آدھے دام پر بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ امتحان کر کے دیکھیے۔ اردو ایسی سچی، اچھی اور متنوع زبان ہے کہ آپ سیدھی سادی عبارت میں بھی زور اور بانکپن پیدا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے تجربہ کی بات کہتا ہوں، تمرد یا تمسخر کی نہیں۔ میرے نزدیک یہ بنیادی عقاید ہیں، جن پر اردو کے ہر حمایتی کو عمل کرنا چاہیے۔

صاحبو! اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم کو ابتدا میں عملی کام کا پروگرام مختصر رکھنا چاہیے، تاکہ اس پر آسانی سے عمل ہو سکے اس پروگرام کو میں دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔ ایک عملی، دوسرا تبلیغی۔

علمی کے سلسلہ میں فی الحال اور اس کانفرنس کی یادگار میں میں چاہتا ہوں کہ آپ بریلی کالج میں اردو کے ایم۔ اے کلاس کھولنے کی کوشش کریں۔

تبلیغی جزو کے سلسلہ میں عرض کروں گا کہ آپ اپنے آپ کو انجمن ترقی ہند دہلی سے وابستہ کرلیں۔ اس انجمن کے قابل فخر کارنامے ہم سب کو معلوم ہیں۔ ہندوستان بھر میں اس کی ساکھ قائم ہے اور اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں اور نہایت قابل قدر خدمات کام میں لا رہی ہیں۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب براہ راست ان شاخوں کی خدمات اور ان کی مختلف ضروریات پر نظر رکھتے ہیں۔

حضرات! اشارتاً ایک بات اور کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کانگریسی حکومت سے مسلمانوں کے سوءِظن کا سب سے بڑا سبب یہ رہا کہ زبان کے مسئلہ میں حکومت نے بڑی تنگ نظری اور بےعقلی سے کام لیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی (جس کا نکالنا مدتوں ناممکن رہے گا) کہ کانگریسی حکومت کا مقصد صرف مخصوص جماعتی نصب العین کی پیروی اور حمایت ہے۔ حکومت نے اس اصلی اور سچی بات کو کبھی دل میں نہیں جگہ دی کہ حکومت کا مذہب صرف انصاف و رواداری اور اس کی سب سے بڑی شامت جماعتی تعصب ہے۔

اس سانحہ کا سب سے زیادہ غم ناک پہلو یہ ہے کہ مسلمان مایوس اور برہم ہو کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ سوا، ان کے اردو کا کوئی اور حمایتی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلمانوں کا یہ خیال جلد دور ہو جائے گا اور ہم سب متحد ہو کر اس مایوسی اور برہمی کے ازالہ کی کوشش کریں گے۔

خواتین وحضرات! میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا، آپ نے جس لطف و مرحمت سے میری توقیر بڑھائی ہے اس کا میں دل سے احسان مند ہوں۔ اب اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جس صبر وسکوت سے اتنی دیر تک میرا ساتھ دیا ہے اس سے میں آپ کی اور بہت ہی باتوں کا بھی قائل ہو گیا۔

●●●

(مطبوعہ: نگار لکھنؤ، ستمبر 1940)

اصلاحِ زبان و مصطلحاتِ اردو

خطبۂ صدارت

کل ہند اردو کانگریس حیدر آباد (دکن)

منعقدہ 22/جولائی 1944

خواتین و حضرات!

میں نہ تو اتنا بر خود غلط ہوں کہ آپ نے اس شعبہ کا صدر بنا کر میری جو توقیر بڑھائی ہے اس کا اپنے آپ کو مستحق سمجھوں، نہ اتنا بدتمیز ہوں کہ آپ کے اخلاص و اخلاق کا شکریہ نہ ادا کروں اور اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ خوش ہونے اور فخر کرنے سے باز رہوں۔ میں اور میرے دوسرے رفیقِ کار آپ کے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شکرگزار ہیں، اور آپ کے پُر جوش اور جواں ہمت سکریٹری اور اپنے فاضل اور دیرینہ دوست ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے اس جذبے اور ولولے کے دل سے معترف کہ انھوں نے اردو کے خدمت گزاروں، بہی خواہوں، ادیبوں، شاعروں، معلموں اور اخبار نویسوں کو جو ہندوستان کے مختلف اور دور افتادہ گوشوں میں انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے زبان و ادب کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ بڑی محبت اور خلوص سے دعوت دی کہ وہ حیدرآباد آکر اپنی کہیں اور دوسروں کی سنیں، اور اس طور پر ذہنی ارتباط کا وسیلہ بنیں جو ہماری بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے لازمی ہے اور جس کے لیے شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اور زیادہ قرب و یک جہتی پیدا کرنا ہے۔ اس بڑے اور مبارک کام کے آغاز کے لیے حیدرآباد ہی کی سرزمین موزوں تھی۔ حیدرآباد کا اردو کی ترقی میں جو حصہ ہے خصوصاً اس دور میں، اس کی وجہ سے اردو کو جو استحکام و منزلت حاصل ہے، اس میں اس کے عدیم المثال شہریار کو بہت بڑا دخل ہے۔ خسرو دکن سے دوسرے اوصاف سے قطع نظر ہمارے نزدیک اعلیٰ حضرت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ موصوف سلطان العلوم بھی ہیں۔

چنانچہ مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد میں اردو کانگریس کا یہ اجتماع شہریار دکن کے زیرسایہ اور سرصدراعظم بہادر حیدرآباد کی شرکت سے بہرہ یاب ہوکر اردو کی خدمت کا بڑا اہم اور ممتاز گہوارہ بن جائے گا۔ جس کے ذریعے سے دکن اور ارباب دکن کی ادبی خدمات اور کارنامے بقیہ ہند کے رہنے والوں تک پہنچیں گے اور دونوں کے درمیان رشتۂ اتحاد کو مضبوط کرتے رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کانگریس اردو کے کسی ادارہ کی حریف نہ ثابت ہوگی، بلکہ دوسرے اداروں سے اشتراک عمل کرکے اردو کی خدمت کا جو حق ہم سب پر عائد ہوتا ہے اسے ادا کرے گی۔ اردو کا کام اتنا پھیل چکا ہے، اور کاموں کی نوعیت اتنی مختلف ہے کہ اب یہ صرف کسی ایک ادارے کے بس کا نہیں رہا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ ہم اردو کے لیے ہر طرح اور ہر طرف سے ایک ہی منزل مقصود کو سامنے رکھ کر اپنی اپنی بساط کے موافق کام کریں۔ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنیں، اپنوں پر نکتہ چینی کم کریں اور مدد زیادہ کریں، یہ وقت کا تقاضا ہے۔ ہم اسے پورا نہ کرسکے تو یہ ہمارا قصور ہوگا۔

حضرات!

اس شعبہ کی صدارت تفویض فرما کر آپ نے یقیناً اس امر کا اظہار کیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی خدمات کو آپ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ زبان و ادب کی خدمت یقیناً ایک سے زیادہ طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا بھی چاہیے، اور ہر طریقہ اپنی جگہ پر مفید اور مستحسن ہوسکتا ہے۔ البتہ سب سے زیادہ غیر مفید اور نامستحسن طریقہ وہ ہے جس سے اردو کی خدمت کرنے والوں کی رسوائی کی جاتی ہو۔ آیئے اس سے بچیں بھی اور بچائیں بھی، اردو کانگریس کا ایک کام یہ بھی ہوگا۔

حضرات! اردو زبان کی اصلاح کا مسئلہ جب کبھی معرضِ بحث میں آئے گا، علی گڑھ کی خدمات اربابِ نظر کے سامنے بار بار آئیں گی۔ سرسید اور ان کے رفقائے ادب نے اردو کو جس طرح بچایا، بڑھایا، سلجھایا اور سنوارا، وہ اردو زبان کے معمولی سے معمولی طالب علم کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں یہاں اردو کے معمولی طالب علم ہی نہیں، جید علما بھی موجود ہیں۔ اس لیے اس مسئلہ کی تفصیل و تشریح پر وقت صرف کرنا بے محل ہے۔ صرف اتنا عرض

کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اردو کو ملک کی مقبول و موقر زبان بنانے میں علی گڑھ نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ بے مثل ہیں۔ علی گڑھ کو درمیان سے نکال دیجیے، اُس وقت آپ اندازہ کر سکیں گے کہ اردو کی ترقی کے سلسلہ کی یہ کڑی کیا درجہ رکھتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علی گڑھ کے علاوہ کسی اور نے اردو کی قابلِ قدر خدمات انجام نہیں دی ہیں۔ لکھنؤ، کلکتہ، دہلی، لاہور اور حیدرآباد کی اصلاح و ترقی کی شاہ راہ پر بہت بڑے اور اہم نشانات منزل ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ علی گڑھ نے ہماری زبان کی حمایت اور اس کی ترقی و تہذیب میں جس زمانے میں جن حالات کے ماتحت جتنا کچھ جس دانش مندی اور سرفروشی کے ساتھ کیا، اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن!

حضرات! خود علی گڑھ کو علی گڑھ بنانے میں جو حصہ حیدرآباد کا رہا ہے۔ وہ قوم اور ملک میں ہمیشہ فخر و مسرت کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ علی گڑھ کی آبیاری جس جس عثمان ساگر سے ہوتی رہی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ حیدرآباد نے بڑے اہم اور نازک مواقع پر اوّل سے آخر تک علی گڑھ کی بیش بہا مدد کی ہے، اور ہمارے لیے یہ بھی کچھ کم موجب افتخار نہیں کہ جو اعانت علی گڑھ کو حیدرآباد سے ملی۔ اس کی سپاس گزاری میں علی گڑھ نے حیدرآباد کو ایسے فرزندان معنوی دیے، جنھوں نے حیدرآباد کا نام اونچا کرنے اور رکھنے میں تن من دھن سے کبھی دریغ نہ کیا۔ حیدرآباد میں علی گڑھ کے طلبائے قدیم حیدرآباد اور علی گڑھ کے باہمی ربط و رشتہ کی بڑی پاکیزہ اور دل کش مثال و یادگار ہیں۔

حضرات! بے موقع نہ ہوگا۔ اگر میں یہاں بھی یہ عرض کروں کہ مسلمان حکمرانوں بالخصوص مغلوں نے ہندوستان کے ساتھ جو کچھ اور جیسا کچھ سلوک کیا، اس سے قطع نظر انھوں نے ہندوستان کو تین ایسے نوادر بخشے ہیں جس کی مثال کچھ اور نہیں تو گذشتہ چند صدیوں میں نظر نہیں آتی، یعنی تاج محل۔ اردو اور غالبؔ اور معنوی اعتبار سے یہ تینوں ایک ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین کے لیے ان سے بہتر و حسین تر تاریخی تحفہ یا یادگار اور کیا ہو سکتی ہے۔ زبانوں کا وہ تاج محل یا تاج محلوں کی وہ زبان جسے اردو کہتے ہیں۔ آج ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے کا گھر بن گئی ہے۔ اسے میں بدنصیبی نہیں بدمذاقی سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک

بدمذاقی بدنصیبی سے زیادہ منحوس علامت ہے۔ میں علم الاقوام کا طالب علم نہیں ہوں کہ تقدیرِ اُمم پر رائے دے سکوں، لیکن طالب علم ضرور ہوں اس بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی نجات انہی اُصولوں کی بنا پر ہوگی جن پر اردو کی بنیاد ہے۔اردو اور تاج محل دونوں میں تخیل کی رفعت نظر کی وسعت و جامعیت اور ترصیع کی نزاکت ملتی ہے۔یہی باتیں آج ہماری زندگی سے مفقود ہیں۔ ہندو مسلمان اردو ہی کے راستہ سے یک جہت ہوئے تھے اور یہ اردو ہی سے منحرف ہونے کا نتیجہ ہے کہ آج ہم دونوں ایک سنسان پُرخطر بے راہ اور بے آب وگیاہ وادی میں بھٹک رہے ہیں۔

حضرات! اگر آپ ان تلازموں سے اُکتا نہ گئے ہوں تو میں ان کو تھوڑی دیر تک اور قائم رکھوں۔آج ہم سب اس شعبہ میں اردو کی اصلاح کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اردو کی اصلاح کا وہ انجام نہ ہو جو تاج محل کی اصلاح و مرمت کے سلسلہ میں حال میں پیش آیا تھا کچھ دن ہوئے تاج محل کی مرمت یا حفاظت کے لیے اس کے اردگرد بانس بلیوں کی پاڑھ باندھی گئی بانس بلیوں کا یہ مہیب جنگل عرصہ تک قائم رہا اور معلوم یہ ہونے لگا گویا یہ پاڑھ بجائے خود تاج محل کا ایک جزو ہے۔چنانچہ ''حیا بے ساختہ از بحر کافور'' کے بجائے یہ پیکر جمیل ہزاروں لاکھوں دیو پیکر چھپکلیوں یا ممنیون کے نرغہ میں نظر آنے لگا۔کوئی پوچھتا کہ یہ کیا ہے تو بتاتے تاج محل کی خاطر ہے۔پھر سوال کرتا کہ یہ خاطر آخر کب تک رہے گی تو جواب ملتا لاکھوں روپے، بہت ساری محنت اور طویل مدت اس پر صرف ہوئی ہے ان کو دور کرنے میں اس سے زیادہ صرفہ ہوگا۔اس لیے مسئلہ زیرِ غور ہے۔جرأت کر کے دبی زبان سے کوئی کہتا کہ اصلاح وتحفظ کے مسئلہ کا کیا حشر ہوا تو جواب میں فرماتے انہی بانس بلیوں میں یہ غریب بھی کہیں سر بہ گریباں مل جائے گا۔چنانچہ میری استدعا ہے کہ اردو کی اصلاح میں تاج محل کی اصلاح وتحفظ کا یہ اصول نہ برتنا چاہیے۔یہ بات میں نے شاعروں اور لیڈروں جیسی نہیں کہی ہے، اردو کے اردگرد اس قسم کی پاڑھ بندھ چکی ہے اور اب بھی جہاں تہاں اس کے آثار ملتے ہیں۔

حضرات! زبانیں تخلیق نہیں کی جاسکتیں، لیکن ان کی اصلاح ضرور کی جاسکتی ہے۔ تخلیق زبان ایک فطری امر ہے۔اصلاح زبان کی ضرورت اس کے فوراً بعد محسوس ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں زبان سدھار کی تحریک آج کی بات نہیں ہے۔ ہماری زبان کا معیار کب قائم ہوا، یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب دلی، منجو، ہور، سیون رکھیا وغیرہ بولتے ہوئے دکن سے دہلی میں وارد ہوئے تو دلی والوں کو ان کا لب ولہجہ اجنبی سا معلوم ہوا۔ اجنبیت کا یہ احساس اس بات کی دلیل ہوسکتی ہے کہ شمالی ہندوستان میں ترقی زبان کی رفتار تیز تھی۔ شمال میں اس وقت تک زبان کا معیار مقرر ہو چکا تھا۔ اصلاح زبان کی تحریک معاصرین ولی کے زمانہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ شمالی ہند میں اس کے پہلے علم بردار شاہ حاتم ہیں۔ شاہ حاتم کے سامنے کسی چیز کے بچاؤ کا سوال نہ تھا۔ ان کو صرف نئی اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے کچھ قاعدے مرتب کرنے تھے، وہ شاعری کی زبان کو قواعد کا بہت زیادہ پابند کرنا نہیں چاہتے تھے، کر بھی نہیں سکتے تھے۔ دلی کا شاعر فن کا دل دادہ کبھی نہ ہوسکا۔ لیکن شاہ حاتم کے بتائے ہوئے اصولوں پر اردو شاعری پھلی پھولی اور اس کی زبان میں زندگی حرارت اور تازگی آئی۔ اصلاح زبان کی دوسری تحریک ناسخ کی ہے۔ ان کے زمانے تک ہماری شاعری فارسی سے بہت کچھ حاصل کر چکی تھی، مگر ہندی الفاظ، علامات، دیومالا، متروکات کو آنکھ سے بالکل اوجھل بھی نہ کر سکی تھی۔ لکھنؤ کا شاعر دہلی کے شاعر کے مقابلے میں فن برائے فن کا زیادہ دلدادہ تھا۔ اس سے فن کو فائدہ بھی پہنچا، اس کا وقار بڑھا، اس کی حیثیت سوسائٹی میں بلند ہوئی اور شاعری فن شریف کہلائی۔ ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ لکھنؤ کے شاعر نے اپنی معیاری شاعری کے اردگرد جو حصار کھینچا، اس کی وجہ سے اچھی اچھی چیزیں ٹکسال سے باہر ہوگئیں۔ یہ میں مانتا ہوں کہ تذکیر و تانیث، متروکات، فصاحت وسقم اور زبان کا معیار مقرر کرنا ضروری تھا۔ لیکن میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس معیار میں سختی زیادہ تھی، وسعت بہت کم۔

میر امن دہلی کے تھے۔ رجب علی سرور لکھنؤ کے دونوں کی زبان دیکھئے تو ان کے مراتب کا فرق واضح ہو جائے گا۔ ناسخ کے زمانے میں انگریزی کا اثر ہندوستان پر شروع ہو چکا تھا۔ مگر ناسخ اس سے بالکل نا آشنا تھے۔ اس لیے غدر کے بعد ہمارے ہاں اصلاح زبان کی ایک تیسری تحریک وجود میں آئی۔ اس میں سرسید، حالی، آزاد سب کے سب شریک تھے۔ یہاں ادبی انقلاب سے بحث نہیں لسانی انقلاب کا ذکر ہے۔ سرسید اوران کے ساتھیوں نے نثر کی اہمیت پر

زور دیا۔ انھوں نے انگریزی کے بعض الفاظ کے استعمال کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا۔ تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ انھوں نے کیمیا کے بجائے کیمسٹری کو ترجیح دی ہے۔ اس معاملہ میں آج بہت سے ایسے ملیں گے، جو سر سید سے اتفاق نہ کریں گے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان سب سے پہلے ایک مغربی ذہن سے اسی طرح روشناس ہوئی۔ دہلی کالج والوں نے سائنس کے ترجموں کے جو قاعدے مقرر کیے تھے۔ ان میں خاصی لچک تھی۔ ہائیڈروکلورک تیزاب کو انھوں نے جائز قرار دیا تھا۔ کچہری ڈائرکٹروں کی ان کے نزدیک صحیح ترجمہ تھا۔ لیکن اصلاح زبان کی کوئی منظم تحریک اب تک بروئے کار نہ آئی تھی۔

حضرات! اب صورت حال مختلف ہے۔ زمانے کی جولاں گاہ وسیع ہوگئی ہے۔ لسانی مسائل میں نئی الجھنیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اس عام بیداری اور بدلتے ہوئے معیاروں کے دور میں زبان کی بقا اور اس کے سدھار کے مسائل ایک مرتبہ پھر زیر غور ہیں۔ اس موقع پر میں یہ بات صاف اور کھلے الفاظ میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ علمی، ادبی اور بول چال ہر قسم کی اردو کا ایک خاص معیار متعین ہو چکا ہے۔ چنانچہ ہم اصلاح زبان کے ذریعہ خواہ مخواہ نہ تو ہندستانی کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہندی والوں سے زبردستی کا کوئی سمجھوتا۔ ہم کو نہایت جرأت کے ساتھ اپنی زبان کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھ کر اس کی کسوٹی پر کھرے کھوٹے کی تمیز کرنا چاہیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری زبان کی یہ کسوٹی ہے کیا۔ یہ کسوٹی کھڑی بولی ہے۔ وہ جو دلّی اور اس کے اطراف میں آج بھی بولی جاتی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ مسلمانوں کی فتح دلّی کے وقت اس بولی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ لیکن یہ خیال رہے، میں نے حیثیت کہا ہے۔ شیرانی[1] کی طرح اس کے وجود سے انکار نہیں کیا ہے۔ پنجابی[2] اور برج بھاشا کی طرح کھڑی بولی بھی اس وقت جیتی جاگتی زبان تھی۔ البتہ اس زمانے میں برج بھاشا کا بول بالا تھا۔ مسلمانوں

---

1. حافظ محمود خان شیرانی مرحوم، تاریخ پیدائش اکتوبر 1880 ٹونک (ہندوستان) تاریخ وفات 15/فروری 1946 (ٹونک)۔

2. ملاحظہ ہو پنجاب میں اردو۔

کے زیر سایہ کھڑی بولی اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی اور برج کی گدی پر قابض ہوگئی۔ صدیوں کی کش مکش کے بعد سلطنت کے آخری دور میں اس کا اپنا معیار متعین ہوگیا۔ معیاری بولی بنتے ہی اس پر سے برج اور پنجابی دونوں کے اثرات زائل ہونے لگتے ہیں۔ اس میں پنجابی کا کرخت اور برج بھاشا کا شیریں لہجہ دونوں گھل مل جاتے ہیں۔ اصلاحِ زبان کا تخیل اس وقت سے پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب ایک طرف بدّل، لُٹا اور گڈی کے بجائے بادل، لوٹا اور گاڑی کہا جانے لگا اور دوسری طرف جوری، لری اور لرائی کی جگہ جوڑی، لڑی اور لڑائی استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ اردو زبان میں اصلاح کے لیے اس کھڑی بولی کی صرف ونحو کو کسوٹی ماننے میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔ اس کے صوتی اصولوں پر لفظوں کو پرکھنا چاہیے، اور اسی بنا پر پراکرت کے لفظوں کو سنسکرت کے الفاظ پر ترجیح دینا مناسب ہے۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے وہی الفاظ قابلِ قبول ہوں گے جو اس کا جزو بدن بن سکیں، اور ظاہر ہے کہ جو الفاظ گھل مل گئے ہیں۔ ان کو کسی طرح علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

حضرات! اردو ایک مخلوط زبان ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خود اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ اردو کی پیدائش میں ارتقائی کیفیتوں سے زیادہ انقلابی کیفیتیں پائی جاتی ہیں..... یہ لسانی ارتقا کی اتنی آئینہ دار نہیں ہے جتنی ایک انقلابی عہد کی یادگار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عربی، فارسی الفاظ، محاوروں، ترکیبوں اور گریمر کا بیش تر حصہ ہضم کر چکی ہے اور جب میں نے یہ کہا تھا کہ اردو کا اپنا معیار مقرر ہو چکا ہے تو میرے ذہن میں یہی بات تھی۔ میں ہضم شدہ حصوں کے اُگلنے یا اُگلوانے کا قائل نہیں۔ تراش، خراش کے عمل کے ساتھ عربی، فارسی گریمر کا کچھ حصہ کھڑی بولی کی گریمر کا جزو لاینفک رہے گا، اور اسی مقام پر ہم سے ہندی والے مفاہمت کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ شاید یہ بات آپ دلچسپی سے سنیں کہ انشا کی مشہور و معروف تصنیف ''رانی کیتکی کی کہانی''، جس میں بقول مصنف ''ہندی چھٹ دوسری بولی کی پٹ نہ آنے پاوے۔'' ہندی ادیبوں کے نزدیک ان کی زبان کا غوغہ نہیں ہے۔ یہ صرف اس لیے کہ اس کے اکثر جملوں کی ساخت فارسی کے نحوی قاعدوں پر ہے۔ اردو سے جس طرح ہم ہندی عناصر کو علاحدہ نہیں کر سکتے، اسی طرح عربی، فارسی کے عناصر کو بھی نہیں نکال سکتے۔ ہم چاہیں تو اسے آسان، جدید اور عام فہم بنا سکتے ہیں۔ ہم کو ایسا کرنا بھی چاہیے مگر ہم اسے اردو سے

بدل کر کچھ اور بنانے پر تیار نہیں ہیں۔ ''رانی کیتکی کی کہانی'' سے لے کر ''فسانۂ عجائب'' کی زبان تک اردو اسالیب کے بہت سے ہلکے اور گہرے رنگ ملتے ہیں۔ یہ سب ہمارے ہیں، ہم ان کو یک قلم کیسے ترک کر سکتے ہیں۔ ان اسالیب کی کثرت میں ایک ارتقائی وحدت بھی ملتی ہے۔ ہم داخل خارج کے اصول پر بھی کاربند رہے ہیں۔ زبانوں کے میل جول سے اسالیب کا بدلنا فطری امر ہے۔ فارسی، عربی اور ہندی کے اثر کے بعد اب انگریزی اثر کی کارفرمائی ہے۔ اردو کے لیے یہ بات اندیشہ ناک نہیں امید افزا ہے۔ انسانی رشتوں کی مانند زبان کے رشتوں میں اپنی پرائی کی تفریق محض اضافی حیثیت رہتی ہے۔

حضرات! نامناسب نہ ہوگا، اگر میں اس مسئلہ اصلاح ہی کے سلسلہ میں نئی ہندی کے بارے میں آپ کو ایک بات بتا دوں، جس کا تذکرہ میں نے انجمن ترقی اردو بستی کی کانفرنس میں حال ہی میں کیا تھا۔ نئی ہندی کے علم بردار جس طرح آنکھ بند کر کے سنسکرت کے ایسے الفاظ بول چال کی زبان میں داخل کرتے جا رہے ہیں جو عوام میں ''چالو'' نہیں ہیں اور فارسی عربی کے وہ الفاظ خارج کر رہے ہیں جو عام بول چال میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اسی ہندی کے لکھنے والے سراسیمہ بھی ہو رہے ہیں کہ یہ زبان کتنے دن چلے گی اور کس کے کام آئے گی۔ ان کو اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں سنسکرت کی طرح ان کی ہندی بھی ایک مقدس، لیکن مردہ جھیل بن کر نہ رہ جائے۔ بنگالی کا حشر ان کے سامنے ہے جہاں عوام کی زبان ایک ہے اور ادب کی دوسری۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ زبان کی اصلاح میں جماعتی تعصب یا سیاسی اقتدار کو دخل نہ دیا جائے، بلکہ یہ دیکھا جائے کہ خود زبان کا مزاج اور مطالبہ کیا ہے۔

حضرات! اصلاحِ زبان ہی کے سلسلہ میں اردو عروض کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کا تعلق شعر و ادب سے ہے، لیکن چوں کہ ہمارا قدیم ادب زیادہ تر نظمیات پر مشتمل ہے، اس لیے ابتدا میں ہماری زبان اسی پر بنی، ڈھلی اور سدھری ہے۔ چنانچہ اصلاح زبان کی جو تحریک ہمیں ابتدا میں ملتی ہے، وہ بیش تر متروکات و معائب سخن کی بحث تک محدود ہے۔ ہمارے ہاں غالباً سب سے پہلے عظمت اللہ خاں[1] مرحوم نے عربی عروض اور ہندی پنگل کی بحث چھیڑی تھی۔

---

[1] عظمت اللہ خاں 1887 میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ 1967 میں انتقال ہوا۔

ان کی شاعری ایک شدید قسم کے ردِ عمل کی آئینہ دار ہے۔ ہندی اور عربی عروض کی تفصیلات میں پڑنے کا یہ موقع نہیں، لیکن اتنا کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ عظمتِ تجدّد کے جوش میں جیسا کہ ہوتا آیا ہے، بہت آگے نکل گئے ہیں۔ عربی عروض اپنی جگہ پر ایک مکمل اور مقبول فن ہے، اردو زبان اس پر منجھ چکی ہے۔ اس کے بحروں کی شیرینی اور آہنگ کا اعتراف خود ہندی شاعروں نے کیا ہے۔ ان کی روانی اور سبک روی کی داد ہمارا سنگیت دے رہا ہے۔ اس لیے ان کا اخراج کسی طرح مستحسن نہیں۔ البتہ زحافات وغیرہ کے چکّر سے نکلنے کے لیے پنگل کے طریقۂ تقطیع کو جو بیک وقت سہل اور سائنٹفک ہے، اختیار کرنے میں خواہ مخواہ جھجکنا نہیں چاہیے۔ دراصل یہاں بھی ہم کو بجائے ایک چیز کو اٹل اور ابدی ماننے کی نئی ضروریات کے مطابق اپنی زبان کو ڈھالنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔ اردو شاعری کو ابھی اور رزمیہ، سماجی، سائنٹفک، عصری اور بیدار ہونا ہے۔ لامحالہ اسے نئے نئے اسالیب اختیار کرنے پڑیں گے۔ نیا ذہن اپنے لیے نیا اسلوب تلاش کرے اور آزاد شاعری یا بے قافیہ شاعری کے ذریعہ سے اپنی ترجمانی کرنا چاہے تو ہمیں خلاف فتویٰ دینے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

حضرات! غزل کی صناعی اور جدید نظم کی صناعی میں فرق ہے۔ دونوں کی زبان میں بھی اس اعتبار سے فرق ہو تو آپ آزردہ یا مایوس کیوں ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ہر سو میل کے فاصلہ پر شاعری کی زبان بدل دیں۔ لیکن دکن کی شاعری اور شمالی ہند کی شاعری ایک ادبی معیار کی پابندی کرتے ہوئے بھی مقامی خصوصیات کی حامل رہ سکتی ہے، اور ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی بہت کچھ لے سکتی ہے۔ پنجاب کے ایک مشہور افسانہ نگار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ شروع میں ہندی اور پنجابی میں لکھا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو اپنے خیالات کو وسیع تر حلقہ میں لے جانا چاہیے تو انھوں نے اردو میں لکھنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر ہم میں سے بہتوں نے صرف یہ دیکھا کہ ایک پنجابی سکھ زبان کے روڑے لڑھکا رہا ہے۔ لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اردو کو پنجاب کے اَن پڑھ مگر تندرست جوانوں کے خون کی حرارت بخش رہا ہے۔ اس کی اردو میں لغزشیں اس لیے نہیں ہیں کہ وہ پنجابی ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اسے لکھنے کے فن پر قدرت حاصل نہیں ہوئی ہے، لیکن کیا آپ کو

اس میں بھی شبہ ہے کہ اس طرح ہمارے ادب کو کئی بہت اچھے افسانے اور ایک بہت اچھی فضا ملی ہے۔

لیکن حضرات! یہاں ایک اندیشہ کا بھی اظہار کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ زبان، بیان، تلفظ، تذکیروتانیث اور اس قبیل کے اور بہت سے نقائص بعض ایسے لکھنے والوں میں ملتے ہیں جو اردو کے مختلف مراکز سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں یہ عصبیت پیدا ہوگئی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی صحیح ہیں، اس لیے کہ ان کا صوبہ یا مرکز بھی اردو کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بولیاں اور تلفظ مقامی یا صوبہ جاتی ہوسکتی ہیں۔ ادب کی زبان یکساں اور معیاری ہونی چاہیے۔ اس سے اچھی اور صحیح زبان کو استحکام ہوتا ہے۔ جس کے فوائد بے شمار ہیں۔ شاعری کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ وہ زبان کی صحت برقرار رکھتی ہے۔ یہ بات اس طور پر جلد سمجھ میں آجائے گی کہ آپ ہندوستان کے مختلف حصوں کے شاعر اور ادیبوں کے کلام کا مطالعہ کریں۔ دلّی اور میسور کے اردو شعرا کا کلام آپ کو صحت زبان کے اعتبار سے یکساں نظر آئے گا۔ آپ میسور کے کسی مشاعرہ میں شرکت کریں تو آپ کو جہاں تک زبان کا تعلق ہے، یہ کبھی محسوس نہ ہوگا کہ آپ دلّی سے باہر ہیں۔ لیکن پنجاب، بہار اور دکن کے نثر نگاروں کی تحریر میں آپ کو بیّن فرق محسوس ہوگا۔ اردو کے غیر ملکی طالب علم کے لیے یہ فرق بڑے تردّد کا موجب ہوگا۔ اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ادبی تحریروں میں زبان کے مقامی نشیب وفراز کو نہ آنے دینا چاہیے۔ انشا پردازی میں متنوع شخصیتوں کا اظہار مستحسن ہے۔ اردو زبان کی مقامی معذوریاں غیر مستحسن۔

حضرات! زبان کی سطح کو ہموار اور بلندی کی طرف مائل رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ معیار کی یکسانیت کو قائم رکھا جائے اور اس کی ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ ہماری خواتین صحیح اور اچھی اردو بولیں، لکھیں اور پڑھیں۔ یہی بات میں اپنے شعرا سے بھی کہوں گا (اگر ان میں سے دونوں یا کوئی ایک باہم دگر کیے جانے پر بظاہر مجھ سے برہم اور دل میں خوش نہ ہو رہا ہو) دونوں ہماری زبان کے امین رہے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر نہ زبان کی اصلاح ہوسکتی ہے اور نہ اس کو قبول عام نصیب ہوسکتا ہے۔ صحیح اور شیریں تلفظ اور لب ولہجہ پیدائشی ہوتا ہے، اور یہ باتیں بچوں میں شیر مادر ہی کے ساتھ پہنچائی جاسکتی ہیں۔ شعرا سے میں یہ درخواست کروں گا کہ وہ اپنے کلام میں

زندگی اور زمانے کے بے پایاں مسائل کو سلجھائیں اور بتائیں اور آلامِ حیات کو اس طرح پیش کریں کہ ہم ان سے شرافت اور شجاعت کے ساتھ عہدہ برآ ہونے پر آمادہ ہوں۔ عورتیں ہمارے لیے بہت کچھ نہیں سب کچھ ہیں۔ لیکن شاعری میں ان کو سب کچھ بنا لینا کوئی بڑائی کی بات نہیں ہے۔ ہمارا ادب بحیثیت مجموعی رومانی زیادہ ہے، موضوعِ فکر اور طرزِ بیاں دونوں کے اعتبار سے اس کو زیادہ مردانہ اور سائنٹفک بنانا ہے۔

حضرات! اصلاحِ زبان کے سلسلہ میں ہم کو بعض مبادیات کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اوّل یہ کہ یہ زبان کسی خاص فرقے یا قریہ کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ یہ زبان ورثہ یا ملکیت ہے ان تمام فرقوں کی جو اسے بولتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ زندگی اور زمانہ زبان کے پابند نہیں ہیں۔ بلکہ زبان کو زندگی اور زمانے کے مطالبات اور مقتضیات کا پابند ہونا چاہیے۔ ہم کو الفاظ و اسالیب کی پرستش نہ کرنا چاہیے۔ الفاظ و اسالیب کو اپنا خادم بنانا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ ہم کو دوسری زبانوں کے الفاظ ہی نہیں اسالیب کے اختیار کرنے میں بھی خواہ مخواہ تامل نہ کرنا چاہیے۔ یہ الفاظ اور اسالیب اردو میں اجنبی معلوم ہوں تو مضائقہ نہیں بے تکے اور لاوارث نہ معلوم ہوں۔

حضرات! اب میں علمی مصطلحات کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کے معیار کو ایک دفعہ مقرر کر لینے اور اس کی کسوٹی کو جان لینے کے بعد اصلاحِ زبان کی طرح وضعِ اصطلاحات کا مسئلہ بھی منقح ہو جاتا ہے۔ جس طرح اصلاحِ زبان کی تمام کوششوں میں ہمیں اپنی زبان کی قدرتی بناوٹ کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اسی طرح علمی مصطلحات وضع کرتے وقت بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ وضعِ اصطلاحات کی جس ڈگر پر آج ہم چل رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ صحیح راستہ ہے اور جو اصول مولوی وحید الدین سلیم[1] مرحوم نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''وضعِ اصطلاحات'' میں نہایت خوبی اور وضاحت سے درج کر دیے ہیں۔ ہمارے لیے ہمیشہ نشانِ راہ کا کام دیتے رہیں گے۔ وضعِ اصطلاحات کے بارے میں عام رائے رہی ہے کہ انگریزی کی مصطلحاتِ علمیہ کے مقابلہ میں اردو کی اپنی اصطلاحیں بنانی چاہئیں، اور ان کو وضع کرتے وقت ہم کو ہندی، عربی، فارسی اور ان تمام زبانوں سے مدد لینا چاہیے جو اس کے

---

[1] سال پیدائش غالباً 1859، 29/جولائی 1928 کو ملیح آباد میں انتقال ہوا۔

اجزائے ترکیبی ہیں۔ انگریزی مصطلحات کو اختیار کرنے کے خلاف ہمارے ہاں ایک عام تعصب ہے۔ دراصل علمی مسائل میں مجھے ہر اس قسم کی تحریک کی طرف سے شبہات پیدا ہوتے ہیں جس کو اٹل اور ابدی مان کر جزو ایمان بنا لیا جائے۔ جس طرح تالاب میں کنکری پھینک کر دائروں کو پھیلنے سے نہیں روکا جا سکتا اسی طرح دنیا کی آزاد ہواؤں کو روکنا میرے آپ کے بس کی بات نہیں۔ اصطلاحات کا تعلق چوں کہ علوم اور علمی دنیا سے ہے اس لیے اس میں وسیع النظری سے کام لینا چاہیے۔ میرے خیال میں انگریزی مصطلحات علمیہ پر قیود و بند عائد کرنا خاص کر ایسی صورت میں جب کہ ہمارے علمی طبقہ کی پہنچ اس تک ہے۔ اپنے گرد ایک ایسا خول چڑھانا ہے جسے آئندہ علمی زبان کے تقاضے سے مجبور ہو کر ہم پھر توڑنا چاہیں گے۔

خالص علوم مثلاً سائنس، علم الحساب اور طب جدید وغیرہ کی اکثر و بیش تر اصطلاحیں ہم وہی رکھ سکتے ہیں جو یورپ کی تمام زبانوں میں خفیف تغیر و تبدل کے ساتھ مشترک ہیں۔ بین الاقوامی زبان کا خواب، خواب سہی علوم کی بین الاقوامی اصطلاحات کا دن دور نہیں ہے۔

حضرات! وضع اصطلاحات کے سلسلے میں اب تک جو کوششیں ہوئی ہیں، ان میں ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دلی اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے علاوہ حال میں دارالترجمہ حیدرآباد انجمن ترقی اردو، دہلی، ہندستانی کمیٹی، پٹنہ اور ایک حد تک آل انڈیا ریڈیو، دہلی کی کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ ان کوششوں کی دو نوعیتیں ہیں، ایک تو ان اداروں کی کوششیں ہیں جو اردو ادب کی خدمت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور اسی نقطۂ نظر سے اصطلاحات وضع کر رہے ہیں۔ دوسری وہ مساعی ہیں جو محض اردو کے لیے نہیں بلکہ ایک آسان زبان کو مدنظر رکھ کر کی جارہی ہیں جو اردو ہندی کو ایک دوسرے سے قریب کر سکے۔ اوّل الذکر میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دارالترجمہ حیدرآباد انجمن ترقی اردو ہند کی کوششیں ہیں۔ دوسری میں ہندستانی کمیٹی، پٹنہ، آسان اردو کمیٹی کشمیر، آل انڈیا ریڈیو اور اس قسم کے دوسرے ادارے ہیں۔ دونوں سے ایک چوک ہوئی اور یہ اس لیے قابلِ معافی ہے کہ اس سے بچنا بہت مشکل تھا۔ اوّل الذکر نے اپنے کام کی نوعیت سے مجبور ہو کر عربی، فارسی سے بیش تر استفادہ کیا۔ دوسری طرف موخرالذکر نے بعض مصالح کو نظر میں رکھ کر عجیب و غریب ہندی اور نامانوس سنسکرت الفاظ اور ترکیبوں کو

ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں مغائرت پیدا ہوگئی، اور ایک طور پر اصطلاحات کے جو فوائد ہو سکتے تھے، وہ ہاتھ نہ آئے اور وضع اصطلاحات کا مسئلہ بھڑوں کا چھتا بن گیا۔

حضرات! اب ہمارے لیے یہ بہتر ہوتا کہ ہم دونوں قسم کے اداروں کی ناکامی سے سبق سیکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کے وضع کرنے میں ہم کو علمی نقطۂ نظر اور عوام کی ذہنی سطح دونوں کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ یہ تو ہمارا نصب العین ہونا چاہیے، لیکن اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ خالص علمی اصطلاحات کو اگر عوام نہ سمجھیں تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے، اور عوام کی اصطلاحات خواص کو نہ بھائیں تو اس کا ماتم بھی نہ کرنا چاہیے۔ البتہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ علمی اصطلاحات خود خواص کی سمجھ میں نہ آئیں تو عوام کی اصطلاحات مضحکہ خیز بن جائیں۔ نئی اصطلاحات کے بنانے کے لیے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا ذہن نہیں۔ بیسویں صدی کا ذہن درکار ہے جو نہ ہندی کو اچھوت سمجھتا ہے اور نہ خالص عربیت کا مداح ہے۔

حضرات! میں مہمان ہوں، مجھے ایسی بات کرنے یا کہنے میں یقیناً تامل ہوگا جو آپ کی آزردگی کا باعث ہو۔ لیکن ایک عرصہ سے اور ایک بڑے ہی مستند اور موقر علمی ادارے نے میرے سپرد اردو کا کام کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ میرا فرض ہے کہ اس سلسلہ میں جو بات مجھے علمی نقطۂ نظر سے کھٹکے اس سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ حیدرآباد کی بہت سی باتیں حیدرآباد میں ممکن ہے، عجیب نہ معلوم ہوں۔ حیدرآباد کے باہر انگشت نمائی کا سبب بن سکتی ہیں۔ اس لیے میں اس کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ حیدرآباد کو میں اردو کی آبرو سمجھتا ہوں، اردو کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانا حیدرآباد کی فضیلتوں میں میرے نزدیک سب سے بڑی فضیلت ہے۔ میرے ہی نزدیک نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں کے نزدیک جو اردو کو ہندوستان کا کارنامہ اور ہندوستان کی زبان بے زبانی سمجھتے ہیں۔ میں حیدرآباد میں اس کثرت سے ایسے اردو کے مترادفات سنے کہ میں بدحواس ہوگیا اور سوچتا ہوں کہ میں کہاں ہوں اور میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ حیدرآباد ایک طور پر ترجمہ آباد بن گیا ہے۔ میں حیدرآباد کو اردو کا مرکز اور اردو کا گہوارہ سمجھتا ہوں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر چیز اردو کا ترجمہ بن جائے۔ اردو کے معنی اردو کا ترجمہ ہرگز نہیں۔ حیدرآباد کو اندھادھند ترجمے کی دلدل یا بھنور سے نکلنا چاہیے۔ کسی غیر زبان کے مخصوص

عام فہم لفظ کا سہل، سبک اور عام فہم اردو ترجمہ نہ ملے تو اس لفظ کو جوں کا توں رکھ دینے میں مضائقہ کیا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ صحیح مترادف موجود ہوتا ہے، لیکن غلط اور مضحکہ خیز مفہوم کا مترادف رکھ دیا گیا ہے۔ محض بر بنائے مثال میں راشن کا لفظ پیش کرتا ہوں۔ کنٹرول یا راشن کا لفظ عام نہیں عالم گیر ہو رہا ہے۔ حیدرآباد میں راشن کے بجائے راتب کا استعمال نہ مہمان کے لیے باعث فخر ہے، نہ میزبان کے لیے راشن نہیں منظور ہے تو رسد یا خوراک کے لفظ میں کیا قباحت ہے۔ بازار میں مجھے ایک جگہ سائن بورڈ پر ''مخزن الثمرات'' لکھا نظر آیا۔ پھل کو عام بول چال میں ثمر یا ثمرات کون بولتا ہے۔ اس کے بجائے ''پھلوں کی دکان'' کہنے میں کیا ہرج ہے۔ اردو کی نسبت سے حیدرآباد جغرافیائی حدود سے آزاد بھی ہے اور بلند بھی اس اعتبار سے یہاں کا کوئی اقدام ایسا نہ ہونا چاہیے جس کی تقلید کرنے کی بجائے لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے۔ بے تکے اور بے تکان ترجمے کے مضر اثرات عام بول چال سے نکل کر یہاں کی ادبی تحریروں میں بھی سرایت کرنے لگے ہیں۔ اس سے اردو کی فطری ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی ہے۔ جس کو خود حیدرآباد کے لوگ بھی گوارا نہ کریں گے۔ میری قطعی رائے ہے کہ اس کے لیے ایک مستند کمیٹی بنا دی جائے جو علمی اصطلاحات نہ سہی عام بول چال میں آنے والی اصطلاحات یا مترادفات پر نظر ثانی کرے اور حیدرآباد کو اس مخمصہ سے نجات دلائے۔

حضرات! زبان کی اصلاح و اصطلاح کے سلسلے میں اب تک جو گفتگو ہوئی، وہ ایک طور پر عنوان بحث کے ماتحت ہوئی۔ اب میں آخر میں ایک ضروری لیکن بظاہر غیر متعلق امر کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اصلاح و اصطلاح کے مسائل فی نفسہٖ ایک علمی بحث کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہمارا مقصد دراصل یہ ہے کہ کس طرح اردو کو اس کے جائز اور بلند رتبہ پر لایا جائے۔ ایک صورت اصلاح و اصطلاح کی ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ہم اردو کو پیش اس طور پر کریں کہ وہ لوگ جو کسی سبب سے اس کے مخالف ہیں۔ اس کی خوبی اور دل آویزی کے قائل ہو جائیں۔ یہ دونوں صورتیں دراصل ایک ہیں۔ سیاسی جھگڑے یا قومی تعصب زیادہ دن تک قائم نہ رہے گا، ہوا بدل کر رہے گی۔ لحاظ رکھنا چاہیے کہ جب ہوا بدلے اس وقت ہماری اردو پیچھے نہ رہ جائے۔ بھنور میں پھنس جانا تعجب کی

بات نہیں بھنور سے نہ نکلنے پر اصرار کرنا اور بھنور کو صحیح فضا سمجھنا بڑی بھاری غلطی اور پست ہمتی ہے۔ ہم کو کوشش کرنا چاہیے کہ ہماری اردو اتنی اچھی اور خاص و عام کے دلوں کو موہ لینے والی ہو کہ لوگ ہر تعصب یا تکلیف کے مقابلے میں اردو کو اپناتے رہیں۔ بیسویں صدی کی کتنی ایجادیں کتنوں کو بھائیں۔ لیکن ان کے سہل الحصول اور کارآمد ہونے کا بالآخر اتنا اثر ہوا کہ ہم سب ان کے قائل ہو گئے۔ اسی طرح اردو کو لکھنے پڑھنے کی ایسی آسان، مفید اور دل پذیر زبان بنانی چاہیے اور اس کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ لوگ اس کو اپنا نا فخر سمجھنے لگیں۔ آپ یقین مانیں اردو ایسی ہی زبان ہے۔ کسر صرف اتنی ہے کہ ہم اس کو اچھی طرح اور پورے طور پر پنپنے پھیلنے اور پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دیتے۔ میں جانتا ہوں اردو کی خوبیوں کے وہ لوگ بھی دل سے قائل ہیں جو زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتے ہم کو اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور جس جس طرح اور جس جس شکل میں اردو سے لوگ آشنا کیے جا سکتے ہیں، ان سب کو قبول کرنا چاہیے۔ میں تو اردو کو ہر رسم الخط میں دیکھ کر خوش ہوں گا، اس لیے کہ ہر رسم الخط والے اردو کو پا کر خوش ہوں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔

حضرات! اتنا اور سُن لیجیے کہ زبان کی اصلاح و اصطلاح کے مسائل نہ تو عقیدے کی بنا پر حل ہو سکتے ہیں، اور نہ کسی ازغیبی دھکے سے انھیں عقلی دلائل کے ذریعہ اور زمانہ و زندگی کی مقتضیات کو مدّ نظر رکھ کر حل کرنا ہوگا۔ میں اس سلسلہ میں آپ کے لیے شمالی ہند سے کوئی چلتا ہوا منتر بھی نہیں لایا ہوں۔ تمام مسائل سر جوڑ کر سوچنے کے ہیں۔ ان میں تعصب، ہٹ دھرمی اور لاگ لپیٹ کو ذرا بھی دخل نہ ہونا چاہیے۔ قومی زبان کا مسئلہ ہمارے دیگر قومی مسائل کی طرح گرمی سے نہیں روشنی سے حل ہوگا۔

آخر میں، میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری باتوں کو لطف اور سنجیدگی کے ساتھ سُنا اور دیر تک سنا۔ عام طور پر آج کل نہ تو ایسا کرتے ہیں اور نہ کرنے دیتے ہیں۔

●●●

(مطبوعہ ادبی دنیا، لاہور، ستمبر 1944)

خطبۂ صدارت

یومِ اقبال

رضا کالج، رام پور

منعقدہ 3/اپریل 1945

بزرگانِ رام پور، دوستو اور عزیزو ــــــ

آپ نے مجھے یاد فرما کر میری توقیر بڑھائی، اسے میں ذاتی منزلت کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو کی بھی منزلت سمجھتا ہوں جس کے متعدد ارکان اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ سرورؔ صاحب آپ میں ممکن ہے پرانے ہو چلے ہوں، لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم۔اے ہیں جن کا مقالہ آپ سہ پہر میں سنیں گے۔ یہ ہمارے ہاں پی۔ایچ۔ڈی کے طالب علم اور شعبہ میں معلم بھی ہیں، تیسرے مسٹر نور محمد ہیں جنھوں نے اردو میں ایم۔اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

صاحبو! مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لیے جائیں گے، باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبالؔ کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے۔ شاید ہی کسی اور نے کیا ہو، اس کا نتیجہ ان کے حق میں قابل رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں انھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبالؔ کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں۔ ریاست رام پور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے۔ گو مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اس حال میں بھی یومِ اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو! اردو شاعری کی تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حدتک ترجمان رہی، اس حدتک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعروادب میں علی گڑھ تحریک یا حالؔی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا تہلکوں کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعرا شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے۔ حسن عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل سے مشکل بحر، قافیہ اور ردیف میں جلد سے جلد سہ غزلہ چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے، لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں ''شکست کی آواز'' ملتی ہے۔ ''دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔'' میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعرا پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ ان چوٹوں کو ابنائے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے، لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ حسن ظن سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سر کیے ہیں، یہ ایک اور سہی! اردو شاعری میں ہمارے بیش تر شعرا نے تفریح یا تفرّع سے جو کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک سے قطع نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی۔ زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاعری نہیں کی۔

صاحبو! میں اتنا ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض نازک مواقع پر اچھے راستہ پر لگایا ہے۔ اس کی پہلی مثال انیسؔ کی ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا، اس کو منقلب کر دینے کا سہرا انیسؔ اور انیسؔ کے خاندان کے سر ہے۔ انھوں نے قوم کے مزاج کو پہچان کے شاعری کا رخ بدلا، لیکن اپنے زمانہ کے ڈھنگ کو نہ بدل سکے۔ شعروادب کو گراں مایہ کیا، مذہبی شاعری میں محسنؔ کاکوروی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محسنؔ کے اس کمال کا اعتراف کم لوگوں نے کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے ہی شاعر ہیں جنھوں نے لکھنوی شاعری کے کمزور پہلو کو اپنے نعتیہ کلام سے دلکش بنا دیا۔ دیا شنکر نسیمؔ ان سے پہلے گزرے ہیں جن کی گلزار نسیم کی بے ساختہ صناعی کی نظیر ہماری شاعری

میں نہیں ملتی۔ لیکن جس پل صراط پر محسنؔ کو چلنا پڑا تسیمؔ اس سے بالکل محفوظ رہے۔ انیسؔ اور انیسؔ کے کلام نے ہمارے ادبی مزاج کو سدھارا اور سنوارا۔ بالخصوص اس وقت جب ہمارے ہاں سوٴ مزاج کے سوا کچھ اور نہیں رہ گیا تھا۔

انیس کے بعد حالیؔ نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو موڑا اور اس کو ایسی وادیوں سے گزرنے کا موقع دیا، جہاں نہ صرف اس دھارے کی حیات بخشی میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی رَو اور روانی میں زور آیا۔ حالیؔ سے پہلے شعرا تلخی کام و دہن کی آزمائش میں بطور کارِ خیر شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حالیؔ زہر غم قلب و جگر میں اتار چکے تھے۔ ان کا رنج والم شخصی یا رسمی نہ تھا۔ ان کے ماتم سے انسانیت ماتم گسار نظر آنے لگتی تھی۔ حالیؔ کے ماتم میں حرکی و تخلیقی استعداد پائی جاتی ہے۔ حالیؔ نے غالباً سب سے پہلے اس حقیقت کو پیش کیا کہ خلوص و دردمندی، علم، آرٹ اور انسان سب کی معراج ہے۔ شاعری میں حالیؔ نے سچائی کو آزمائش و زیبائش پر ترجیح دی۔ حالیؔ کا لہجہ دھیما ہے، لیکن اس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ شور و سکوت دونوں میں یکساں سنائی دیتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حالیؔ کی شاعری نے مسلمانوں میں اضمحلال و افسردگی پیدا کردی۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ حالیؔ کی مثال اس شخص کی ہے جو سردار کی بے گور و کفن نعش پر مجہول بین و بکا نہیں کرتا، بلکہ ایک خطبۂ میت دے رہا ہے جس سے تھکی ہاری سپاہ اور ساتھیوں کا عزم نئے سرے سے بیدار ہوتا ہے۔ مسدس سے قطع نظر حالیؔ کی ''شکوۂ ہند'' میں بصیرت رکھنے والوں کو وہ چیز نظر آئے گی جو مسلمانوں سے نہیں انسانیت سے اُوجھل ہوگئی تھی۔ حالیؔ نے مسلمانوں کے زوال کو انسانوں کا زوال منوایا ہے۔ حالیؔ نے مسلمانوں کے جن فضائل کے زوال کا ماتم جس خلوص اور سطوت حزیں سے کیا ہے۔ اس نے ''شکوۂ ہند'' کو دنیائے ادب کی عظیم المرتبت المیہ کے بہت قریب کردیا ہے۔

حالیؔ اور اکبرؔ کا زمانہ ایک ہے، لیکن دونوں کی شاعری کے حدود مختلف ہیں۔ حالیؔ کے مدّ نظر اسلام اور مسلمان ہیں۔ اکبرؔ مشرق اور مشرقیت کے نمائندہ ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو مغربیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھتے ہیں، اور اپنی جیسی کر گزرتے ہیں۔ اکبرؔ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کو مغرب میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ وہ مغرب سے

ناواقف تھے۔ وہ مغرب کی سطحی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ قدیم کو ہر اعتبار سے مقدس و محترم گردانتے تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انگریزی تعلیم بھی پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اکبر جس زمانہ میں تھے، اس میں ہمارے بڑے سے بڑے صاحبِ فکر و نظر یورپ کی اس نصیحت سے مرعوب تھے جو اکبر کو نظر آتی تھی۔ اس زمانہ کی مقتدر تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اور تو اور ہم اپنے مذہب کو بھی اسی حد تک برحق یا قابلِ اعتبار سمجھتے تھے۔ جس حد تک اس کی سند جواز مغرب کے اعمال و افکار میں ملتی تھی۔ اس زمانے میں بھی اکبر مغرب سے مرعوب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی حد تک ان کی بڑائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ لوگ جو مغرب سے پورے طور پر آشنا ہیں۔ ان میں کتنے ایسے ہیں جو آج بھی اسی دیار اکبر میں یورپ کی بڑائی ہر شعبۂ حیات میں تسلیم کرتے ہیں۔

اکبر کی مصطلحاتِ شاعری ذرا ہریجن قسم کی ہیں۔ ان کے بدّھو آج بھی تنقیدی برہمنوں کو نہیں بھاتے۔ اکبر سیدھی بات بہت جلد بغیر کسی پینترے کے کہہ دیتے ہیں۔ اس سے شعروادب کے ''اشراف وثقات'' گھبراتے ہیں۔ یہ رویہ یا نقطۂ نظر تنقید کی شریعت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر ہر شاعر کو اختیار ہے چاہے وہ کل سے جزو کا استنباط کرے، چاہے جزو سے کل کا۔ اکبر ہی نہیں کوئی بڑا شخص یا شاعر کولیشن منسٹری نہیں بنا سکتا۔ اس کے ہاں مفاہمت نہیں ہوتی، یعنی ''یہ بھی درست اور وہ بھی نادرست نہیں'' شاعر کا یہ ٹکنیک نہیں ہوتا۔ یہ کام ہمارا آپ کا ہے کہ ہم شاعر کو جریب اور ترازو سے ناپنے کے بجائے اس کو سمجھنے اور چاہنے کے لیے ذوق و ذہانت سے کام لیں۔

حالؔی کے زمانے میں ہونے کے باوجود نفسیاتی ترقی کے اعتبار سے اکبر ایک طور پر حالؔی سے آگے ہیں۔ سوؔدا کی ہجویات سے قطع نظر اکبر ہماری شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہنسنے ہنسانے میں پہل کی ہے۔ یہ کام حالؔی کے عہد میں کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

صاحبو! میری گفتگو اب تک آپ کو غیر متعلق معلوم ہوئی ہوگی، لیکن اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ان مقامات سے گزرنا ضروری تھا۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اقبالؔ اب اس درجہ پر فائز ہیں جہاں یہ حکم لگانا بے محل نہ ہوگا کہ جو اقبالؔ کا معتقد نہیں، وہ خود بے بہرہ

ہے۔کوئی شاعر یا آرٹسٹ وسیع اور حقیقی معنوں میں شاعر یا آرٹسٹ نہیں ہے، اگر وہ سارے جہاں کا شاعر یا آرٹسٹ نہ ہو۔آپ اور میں اقبالؔ کو مسلمان شاعر مانتے ہیں اور غلط نہیں مانتے، اور نہ ایسا سمجھنا اقبالؔ ہی نہیں کسی بڑے شاعر کی شان کے منافی ہے۔اقبالؔ کو میں انھیں معنوں میں مسلمان شاعر مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہاں کا مذہب سمجھتا ہوں۔اگر رحمتہ اللعالمین سارے جہاں کے لیے باعثِ رحمت ہیں تو ان کا نام لیوا، خواہ وہ شاعر ہو یا لیڈر، سارے جہاں کے لیے شاعر اور لیڈر رہو گا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہم میں آپ میں جو لوگ اقبالؔ سے ناواقف ہیں یا اقبالؔ کے قائل نہیں ہیں، وہ نہ صرف غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ غیر متمدن بھی ہیں۔وہ شخص یقیناً تعلیم یافتہ یا متمدن نہیں کہا جاسکتا جو آفاق گیر شعرا یا آرٹسٹ کی عظمتوں سے ناآشنا ہو۔

شاعر، مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبال کو ہمارے ادب اور زندگی میں وہ درجہ حاصل ہے جو آج تک مسلمانانِ ہند میں کسی اور شاعر، مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا، فرداً فرداً ممکن ہے۔ ہمارے بعض شعرا کا پایہ اقبالؔ سے برتر ہو، لیکن بحیثیت مجموعی اقبالؔ ہمارے اردو شعرا میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں، اور مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم طویل مدت تک اردو شاعری میں اقبالؔ کی حیثیت خاتم الشعرا کی رہے تو تعجب نہیں، مذہب ہی نہیں، شاعری میں بھی بنی، اکثر گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔رسول کم ہوئے ہیں۔

صاحبو! جب اقبالؔ نے اپنا کلام و پیام ملک کے سامنے پیش کیا، اور یہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اُٹھا، لیکن ان کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آگیا جب ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اقبال کا قائل نہ ہو۔ہم ان کے کلام کو صوری و معنوی ہر صورت سے سراہتے ہیں اور ان کو سب سے بڑا شاعر اور مفکر گردانتے ہیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ ابتدا میں ان کی شدید مخالفت کی جائے اور آخر میں ان پر جاں نثار کی جائے۔اردو میں ایک سے ایک بڑا شاعر مانا جاتا ہے مگر ہمارے ذہنوں پر اقبالؔ کی جو عالم گیر گرفت ہے، وہ کم تر کسی کے حصہ میں آئی۔ یہاں تک کہ ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اقبالؔ کو خاصانِ خدا کے زمرہ میں رکھتے ہیں۔

اردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ غالبؔ کے ہاں ملتا ہے۔ اردو میں غالبؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعرانہ جذبہ میں مفکرانہ گہرائی پیدا کی۔ اس کا اعتراف خود اقبالؔ نے کیا ہے۔ غالبؔ کے عجمی تصورات سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو فلسفیانہ شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا سہرا غالبؔ کے سر ہے۔ بعض غزلوں یا اشعار سے قطع نظر غالبؔ کی زبان جہاں کہیں انھوں نے فکر و فلسفہ کو دخل دیا ہے، علمی زبان بن گئی ہے۔ معتقدانہ شاعرانہ انداز میں شاعری کرنے کا امتیاز انیسؔ و محسنؔ کو حاصل ہے۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ مرثیہ نگاروں میں انیسؔ وہ ہیں جنھوں نے مرثیہ کے زور سے اپنی شاعری کو نہیں بلکہ اپنی شاعری کے زور سے مرثیہ کو چمکایا۔ زبان کے اعتبار سے انیسؔ کو جو درجہ حاصل ہے وہ مسلّم ہے، لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرنا چاہیے کہ اردو بیش تر شاعرانہ زبان رہی ہے۔ اس لیے ایسی شاعری میں جہاں خیالات سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہو۔ یہ خوب کام دیتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اس میں ایسے عناصر داخل کیے گئے جو خالص شاعرانہ نہ تھے، تو یہ ناہموار نظر آنے لگی۔ ایسی ناہموار کہ اس کے پرستار اس شاعری کے بھی قائل نہ رہے، جس نے اس میں اپنا کلام پیش کیا۔ غالبؔ اور حالیؔ کا کیا حشر ہوا۔

صاحبو! اقبالؔ کو بھی اس منزل سے گزرنا پڑا۔ انیسؔ کا یہ کمال تھا اور مرثیہ کی خوش بختی کہ انیسؔ نے مرثیہ میں وہ ساری خوبیاں جمع کر دیں جو دیگر اصنافِ سخن میں علاحدہ علاحدہ موجود تھیں۔ ان کے کلام میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدّس حتیٰ کہ ڈراما اور افسانہ سب کے خصوصی امتیاز بڑے دلکش اسلوب میں سمائے ہوئے ملتے ہیں۔ میرؔ کے بعد انیسؔ کو زبان پر جو قدرت تھی، وہ آج تک نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ اقبالؔ کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ میرؔ و انیسؔ کے مقابلہ میں، آپ اقبالؔ کی زبان کو شاید ناقابلِ التفات سمجھیں، لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرہ اور محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مدّ نظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں کی بنا پر اختیار کی ہے، اور کامیاب یا ناکامیاب رہا ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ اقبالؔ کا موضوعِ سخن کیا ہے، ان کا اندازِ تخاطب کیا ہے، ان کی ذہنی پرداخت کیسی اور ذہنی پرواز کس طرف تھی۔ ان کا مقصد کیا تھا اور ان کے مخاطب کون ہیں، تو

آپ اقبالؔ کی زبان کے قائل ہو جائیں گے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا ہے کہ جہاں تک مسائل علمیہ وفکریہ کو شعر میں ڈھال کر دل نشیں اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے۔ غالبؔ کی زبان سے اقبالؔ کی زبان زیادہ متوازن وشگفتہ ہے۔ گو یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس وادی کے کانٹے نکالنے کا کام غالبؔ ہی نے کیا، اور اس طرح اقبالؔ کے لیے زمین ہموار اور صاف ملی۔ روزمرہ اور عام بول چال کی زبان سے یہاں بحث نہیں۔ اقبالؔ کے ہاں اس زبان کا گزر نہیں، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبالؔ نے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو جس ماہرانہ وشاعرانہ انداز سے اپنے اردو کلام میں منتقل کیا ہے۔ اس سے ہندوستان میں اردو اور فارسی دونوں کا وزن دو تار بڑھ گیا۔

صاحبو! اردو شعرا میں ایسے اصحاب بھی نظر آتے ہیں جو شاعری کے علاوہ دوسرے علوم وفنون پر بھی قدرت رکھتے تھے، لیکن اس کا اثر ان کی شاعری پر بہت کم نظر آتا ہے۔ بعض شعرا علمی وفنی مصطلحات کی رعایت اپنے کلام میں مدّ نظر رکھتے ہیں۔ ہم اپنے حسنِ ظن سے ان کو اس علم وفن کا امام قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ جو لوگ شعرا اور انشا پرداز کے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی رعایات ومناسبات کا فن جاننے سے دور دور تک کا تعلق نہیں۔ یہ سارا کرشمہ ضلع جگت یا رعایاتِ لفظی کا ہے جو ایک زمانہ میں ہمارے شعروادب اور روزمرہ کی صحبتوں میں بہت مقبول تھے۔ یہی حال بڑی حد تک اردو شاعری میں تصوف کا ہے۔ اردو میں ایسے شعرا بہت کم گزرے ہیں جو واقعتاً تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے یا جنھوں نے تصوف کا مطالعہ کیا ہو، یہی سبب ہے کہ ہم کو اردو شاعری میں زبانی کھیل زیادہ ملتا ہے۔

صاحبو! ہم میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ شاعری میں جذبہ ہی سب کچھ ہے۔ میں ایسے جذباتی شعرا سے واقف ہوں جو جذبہ کو خدا کی سب سے بڑی دین اور اپنا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار گردانتے ہیں۔ جذبہ کو میں بھی خدا کی بہت بڑی دین سمجھتا ہوں، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ ہمارے شعرا کی شناخت بھی بن گیا ہے۔ اگر غور فرمایئے تو معلوم ہو جائے گا کہ جذبہ بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر اس کو حرکت میں لانے اور صحیح راستہ پر لگانے کا ملکہ فکر وتجربہ نے شاعر کو نہ عطا کیا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی اقبالؔ شاعر نہیں فلسفی ہیں یا ان کی شاعری پر فلسفہ غالب ہے۔

میرے نزدیک اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اقبالؔ کا درجہ (اور برگزیدہ شاعر کا درجہ) اس بحث سے کہیں بلند ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں فلسفی بعد میں یا اس کے برعکس بحیثیت مجموعی شاعری میرے نزدیک مخصوص پیرایۂ اظہار ہے۔ نہ موضوعِ بحث، تمیز ہو تو فلسفہ، سائنس، منطق وغیرہ کو بھی شاعری کا رنگ و آہنگ دیا جا سکتا ہے، اور سلیقہ نہ ہو تو حسن و عشق کی بھی کوئی حیثیت نہیں، چنانچہ میرے نزدیک اقبالؔ کا شاعر ہونا ان کے فلسفی ہونے کا منافی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے مفکر یا فلسفی ہونے سے ان کی شاعری کی منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نرا شاعر اور نری شاعری کا چسکا ہم کو غزل سے پڑا۔ یہاں تک کہ اکثر ہم غیر شعوری طور پر بھی یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعری عبارت ہے، غزل سے بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری اور تغزل مترادف نہ سہی، ان کا چولی دامن کا ضرور ساتھ ہے۔ شاعری کا یہ تصور اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ اس سے ہمارے تمدنی مزاج کی غمازی ہوتی ہے۔ یعنی حسن و عشق تمام تر عبارت ہے، عورت کے حسن سے اور عورت کے عشق سے!

اقبالؔ کا حسن و عشق اس سے علاحدہ بھی ہے، بلند بھی ہے اور شاید اس کا منافی بھی۔ لیکن اس بحث کو کسی دوسرے موقع کے لیے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اقبالؔ کی عظمت کی نشانی ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام میں شاعر اور مفکر دونوں نظر آتے ہیں۔ مفکر اگر شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم اس کی بات سمجھ لیں۔ یہ البتہ دشوار ہوگا کہ ہم اس کے کہے پر عمل بھی کریں۔ اسی طرح شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم مشاعرہ میں واہ واہ کر لیں، تنہائی و تکلیف میں وہ ہمارا مونس یا رہبر نہ بن سکے گا۔ اردو شاعری میں خالص شاعر بھی گزرے ہیں۔ ان کی شاعری کو ہم اچھی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں، البتہ بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے ہاں اچھے شاعر بہت سے گزرے ہیں۔ بڑے شاعر یقیناً بہت کم ہیں۔

صاحبو! اردو شاعری میں صرف اقبالؔ کی شاعری ایسی ہے جو ہم کو ان علوم و مسائل تجربات و تحریکات کی طرف بے اختیار متوجہ کرتی ہے جو اس وقت عالم گیر ہیں، اور جن کی گرفت عام اور تعلیم یافتہ ذہنوں پر ہے۔ انھوں نے دنیا کے اکابر، اصحابِ فکر و عمل کے خیالات، تعلیمات و جد و جہد کو اپنے کلام کے ذریعہ اس شاعرانہ لطف و نزاکت اور عالمانہ بصیرت و سنجیدگی

سے پیش کیا کہ ہم کو ان اصحابِ فکر سے ایک طرح کا ذہنی ربط پیدا ہو گیا، اور اس طور پر ہم نہایت آسانی کے ساتھ ان تمام عالم گیر ذہنی تحریکوں سے آشنا ہوئے جن سے کسی اور طرح ہمارے عامتہ الناس روشناس نہ ہو سکتے تھے۔ شاعری کا بڑا کمال اور اس کے لیے سب سے مستند سند جواز یہ ہے کہ وہ مشکل گہرے اور نازک تصورات وخیالات کو بہت جلد زیادہ سے زیادہ دلوں میں اُتار دیتی ہے کہ یہ وہ کارنامہ ہے جو شاعری کے علاوہ کسی اور فن کو نصیب نہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات صرف اقبالؔ کے ہاں ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبالؔ نے ان افکار وتحریکات کی خوبی اور خامیوں کو اسلامی افکار واعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص وعوام دونوں گمراہ ہونے کے بجائے بہرہ مند ہوئے۔

سیاسی لیڈر تو ہم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن ذہن وفکر کو طاقت وتازگی بخشنے اور صحیح راستہ پر رہ نمائی کرنے والا ہم میں عرصہ سے نہیں پیدا ہوا تھا۔ آج کل مادّی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی ذہن ودماغ کا کام نہیں ہے۔ آج کل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے، اتنا ہی ذہنی قیادت مشکل ہے۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہے، لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی میں اقبالؔ کو نصیب ہوئی۔ اقبالؔ نے زندگی اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل مہمہ پر حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے، اور کچھ ایسے دلکش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں، ان مسائل کو سمجھنے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کامیاب ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے، اور نہیں کامیاب ہوتا ہے تو کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبالؔ کے وسیلہ سے قوائے علمیہ وعملیہ کس طرح بیدار وبالیدہ ہوتے ہیں۔ اقبالؔ کے کلام کی مثال اس متاعِ یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کے اہل ثروت واقتدار ہی نہیں، بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازارِ مصر میں آ موجود ہوئی تھی۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبالؔ کی اس کرامت کا عام ذہنی نشوونما اور ذہنی حوصلوں پر کیسا عظیم الشان اثر ہے۔

صاحبو! اسلام نے اپنے پیروؤں کو دین و دنیا کی ان منزلتوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی اور منزلت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن و عمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سراسیمہ یا متحرک کر سکتا۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر مذلّت میں جا پڑے، اور اس تصور نے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے، لیکن کرتے کچھ نہ تھے۔ ان کو شدید نقصان بھی پہنچایا، یہ سب ہمارے آپ کے سامنے کی باتیں ہیں۔ ہم نے ہر طرح کے جتن کیے، لیکن شعور کی وہ بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے ہیں، مدتوں نصیب نہ ہوئی۔ مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم مسحور و مرعوب ہوتے رہے۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار تھے۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور بیش تر ادارے اس پر گواہ ہیں۔ اقبالؔ کے کلام کی گرمی اور تازگی ان کی تعلیم کی گیرائی اور گہرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خشک سوتے اُبل پڑے، اور کتنے سوئے ہوئے ساز نغمہ سرا ہو گئے۔ ہندی مسلمانوں میں جو ہمہ جہت بیداری آج نظر آرہی ہے، اس کو جو نام چاہے دے لیجیے۔ یہ کرامت اقبالؔ ہی کی ہے جس کے لیے انیسؔ و غالبؔ، حالیؔ و اکبرؔ، سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔

صاحبو! اقبالؔ سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو در کنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا تھا۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی ہو مستند اور مشرق کا ہر تصور تصویر مردود تھی۔ اقبالؔ کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کر دی۔ اب کسی بحث میں اقبالؔ کا کلام یا ان کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے۔ بعض فروعی باتوں سے قطع نظر اقبالؔ نے وہی چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں موجود تھیں، لیکن نیا ذہن ان کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ اقبالؔ کی تعلیم کی بنیاد قرآن، حدیث، ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اقبالؔ نے ان باتوں کو جس قابلیت، خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی

نظروں میں محترم ہو گئے اور اس طور پر بنے کہ دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں، بلکہ کچھ دور تک ایک ساتھ چلی گئی ہیں۔

صاحبو! ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبالؔ کو مفکرین یورپ کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کل بعض حلقوں میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ خود اسلام اپنے پیش رَو مذاہب سے ماخوذ ہے یا اُن کا خوشہ چیں ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک بات یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اقبالؔ نے جو بات کہیں بھی مفید مطلب پائی، اختیار کر لی اور باقی کو ترک کر دیا۔ یہ سارے اعتراضات تسلیم کر لینے چاہئیں۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک اسلامی تصورات کی تصدیق کرتے ہیں نہ کہ تکذیب، واقعات صحیح ہیں، صرف ان سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اور کبھی دعویٰ نہ کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی وتمدنی آثار و کسر انکسار سے یکسر محفوظ وعلاحدہ رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہو گیا۔ وہ جملہ دوسرے ادیان کا ناسخ بھی ہے اور تصدیق کرنے والا بھی۔ ناسخ اس لیے کہ اسلام دینِ کامل قرار دیا گیا۔ اس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مردِ کامل ہے اور اس طاقت نے اس کو کامل قرار دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آسکتی، اور تصدیق کرنے والا یوں کہ وہ ان ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اس سے پہلے کے ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اس سے اسلام کا درجہ فروتر کیوں کر ہوا؟ کلام الٰہی یا مذہب الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات و حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، بذاتِ خود میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی، حال و مستقبل سے بیگانہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی تاریخ تقدیرِ الٰہی سے باہر نہیں۔

صاحبو! اس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبالؔ نے مفکرین یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے، اور اقبالؔ نے مفکرین یورپ کی انھیں باتوں سے سروکار رکھا ہو جو ان کے کلام و پیام کی تائید و تصدیق کرتے ہوں، (بقیہ سے نہیں) تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت

دوں گا کہ مفکرین یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامیوں کے تصرفات ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے، تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ بحث بڑی طوفانی ہے۔ اس صحبت میں مَیں صرف اقبالؔ کو مدّنظر رکھنا چاہتا ہوں۔ اقبالؔ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفۂ مغرب کا کافی اثر تھا، لیکن اس کے ساتھ اقبالؔ نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مطالعہ سے پہلے وہ ان اسلامی تصورات وعقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو کلام پاک کے مطالعہ کا نتیجہ تھے۔ میرے نزدیک ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اقبالؔ مغربی مفکرین سے متاثر ہی اس لیے ہوئے کہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ اسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن وعمل کو انسانی ارتقا کی اس وادی سے لے جاتے ہیں، جس کا ایک سرا میلادِ آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا معراج آدم میں پوشیدہ۔

صاحبو! اس بحث میں گفتگو کی بڑی گنجائش ہے، لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے میں اس مسئلہ کو یہاں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور اپنے ان نوجوان دوستوں کو جو اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبال کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلام پاک کا مطالعہ کریں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبالؔ پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے، اور اقبال کو مغربی مفکرین کے تصورات سے دلچسپی ہی اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے تصورات کلام الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبالؔ ان مفکرین کے اسی حد تک ہم نوا ہیں، جس حد تک قرآن پاک سے ان تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے ایک عزیز و ذی استعداد طالب علم نے اس پر کام کرنے کا تہیا کر لیا ہے۔ کچھ تعجب نہیں آئندہ سال یومِ اقبالؔ کے موقع پر سرورؔ صاحب کی معرفت آپ طالب علم کے اس مقالہ سے اسی ایوان میں آشنا ہوں۔

بعضوں کے نزدیک اقبالؔ کے ہاں جہاں تہاں منطقی الجھنیں ملتی ہیں۔ خودی اور خدائی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارہ یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں، اور کبھی اس سے روگرداں ہو جاتے ہیں، اور اس قبیل کی دوسری باتیں۔ لیکن یہ امور ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آسکے۔ جہاں تک میں

سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا کی قدرت کا سب سے بڑا اور نادر نمونہ انسان ہے اور انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے، اور یہ رشتہ زندگی کا ہے۔ اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو اوجھل ہوتی رہتی ہے، معدوم نہیں ہوتی۔ یہ زندگی خدا سے شروع ہوتی ہے اور خدا ہی پر ختم ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کبھی اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؔ کی خودی ہمیشہ انسانی خودی رہے گی، اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے۔ بلکہ خدا کی صفات سے قریب تر ہو کر مرفع تر و مستحکم تر ہوتی رہے۔ انسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک انسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے، اس لیے کہ انسان کا خدا بن جانا انسانیت کے مقاصد میں نہیں ہے۔ استحکام خودی سے اقبالؔ کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ضم نہ ہو۔ انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے، کسی اور کی ابتدا یا انتہا نہیں۔

صاحبو! یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں، اس لیے کہ مذہب اس بحث سے بلند بھی ہے، اور علاحدہ بھی۔ دراصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام کا مدار چند بنیادی عقائد پر ہے۔ اس کے بعد ان عقائد کے ماتحت تمام تر عمل پر ہے۔ بذاتِ خود میں سمجھتا ہوں کہ عقائد کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اُتریں۔ عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ سائنٹفک ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ فلسفہ دراصل مذہب کا گورستان ہے۔ دنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا، وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفہ کے جراثیم موجود تھے۔ اگر اسلام مذہب عمل نہ ہوتا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اس درجہ اہمیت نہ دی جاتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ سے شجرِ اسلام میں نمی و نمو ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام پر بُرے سے بُرا وقت آیا لیکن اس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہ ہوئی۔ انسانی جہد و عمل کا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ درسِ خودی میں اقبالؔ اسی جہدِ پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں ''محبت فاتحِ عالم'' بھی شامل ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اقبالؔ کے بیانات میں تضاد ملتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ اسلام کے خدا کی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر

برسرِ کار آتی ہیں۔ اسلامی سیرت وشخصیت میں 'فولاذ و پرنیاں'، دونوں ملتی ہیں۔ ضربت کاری بھی وخوئے دلنوازی بھی! لیکن اس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہیے۔ بہت ممکن ہے آج کی صحبت میں کسی گوشہ سے ان پر تفصیلی گفتگو سننے میں آئے۔

صاحبو! میں نے اقبالؔ کا کلام پڑھا ہے، بار بار پڑھا ہے، ہر حال میں پڑھا ہے، ہر موقع پر پڑھا ہے۔ (پھر بھی سرورؔ صاحب سے کم پڑھا ہے) مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اقبالؔ کا کلام اس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے، گرمی، برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو کبھی یکساں نہیں ہوتے، جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے، اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا اس بساط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، اور آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین پُر اسرار ڈرانے والی، تسکین دینے والی، حوصلہ دلانے والی تصویریں اور تصورات، جیسے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے 'دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من' جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان جن کو جب دیکھیے جتنا دیکھیے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور محسوس ہوگی جو پہلے نہ ہوئی تھی!

صاحبو! آپ کو یاد ہوگا، میں نے عرض کیا تھا کہ اقبالؔ کا کلام و پیام ہماری زندگی کی سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبالؔ کے کلام و پیام سے مسلمانانِ ہند میں ایک جدید نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبالؔ کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی۔ ان کے فلسفہ نے نئے علم کلام کا دروازہ کھولا، شعر وادب میں نئی قدریں سامنے آئیں۔ تعلیمی مسائل میں اقبالؔ کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی ہیں۔ ہمارے آپ کے پروفیسر سیّدین[1] نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف[2] میں اقبال کے ان نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی اساس مانے جاتے ہیں۔ ہماری موجودہ سیاسی تگ وتاز میں اقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی میں اقبال کی تعلیم نے

---

1 خواجہ غلام السیدین: تاریخ پیدائش 14رفروری 1904 تاریخ وفات: 17ردسمبر 1971

2 اصول تعلیم، الہ آباد، ہندستانی اکیڈمی، یوپی 1939۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر سر سیدراس مسعود صاحب نے لکھا تھا۔

وہ کام کیا جو اب تک پورا نہ ہوا تھا۔ اقبالؔ ہی کے تصرف سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا، اور قومی شعور کی صحیح راستہ پر نشوونما ہوئی۔ اقبالؔ کے کلام و پیام سے مجددؔ الف ثانی علیہ الرحمتہ، شاہ ولیؔ اللہ علیہ الرحمتہ اور حضرت اسمٰعیلؔ شہید کے کارناموں کو از سرِ نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اتنا جامع حیثیات شاعر اب تک نہیں پیدا ہوا جو بہ یک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلّم و مفکر تھا۔ اس کی یادگار منانا اور اس کے بتائے ہوئے راستہ اختیار کرنا سعادت مندی بھی ہے، اور اقبال مندی بھی۔ خدا آپ کی مدد کرے!

(مطبوعہ نگار، لکھنؤ، اپریل 1946)

●●●

ہماری زبان وادب کا اگلا قدم کیا ہوگا؟

خطبۂ صدارت

ادبی کانفرنس نشرگاہ، لاسلکی

حیدرآباد (دکن)

منعقدہ فروری 1947

اس ادبی کانفرنس کی صدارت تفویض فرما کر اربابِ نشر گاہ لاسلکی، حیدر آباد نے مجھے جس کشاکش میں مبتلا کر دیا ہے، آپ بہ مشکل اس کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔ میں اس کو واضح کرنے پر آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔ صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ اس کش مکش میں حیرت، ذمہ داری اور شکر و مسرّت کے گوناگوں جذبات کی رنگارنگی نے اسے ایک ایسی قوسِ قزح کی حیثیت دے دی ہے جس کا ایک سرا حیدر آباد میں پیوست ہے اور دوسرا علی گڑھ میں، اور اس کی رفعت اور رنگینی آسمانوں تک پہنچتی ہے۔

علی گڑھ کو دولتِ آصفیہ سے جو دیرینہ محکم اور مبارک نسبت رہی ہے، اس کا اعتراف و اعلان مجھ سے بہتر لوگوں نے اس طور سے اور اتنی بار کیا ہے کہ میرا کچھ نہ کہنا ہی سب کچھ کہہ دینا ہے۔ سب کچھ کہہ دینے کا ایک طریقہ اور کبھی کبھی سب سے موثر طریقہ یہ بھی ہے۔

یہ بتانے سے پہلے کہ اردو زبان و ادب کا اگلا قدم کیا ہوگا، میں اپنے ایک اصول یا کمزوری کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں قدم کے ٹھیک اٹھنے اور پڑنے کا قائل ہوں۔ اگلے اور پچھلے کے پھیر میں نہیں پڑتا۔ میرے نزدیک مستقبل کا کاروبار کرنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اکثر خبطی ورنہ پیغمبر، تاریخ میں بعض مناظر ایسے بھی ملتے ہیں جب خبطی پیغمبر کے درجہ پر فائز کیے گئے اور پیغمبر خبطی تصور کیے گئے۔ میں انجام کی دونوں صورتوں سے گھبراتا ہوں، اس لیے بالعموم مستقبل کو خود اپنی خیر منانے کا موقع دیتا ہوں!

میں نے مستقبل کو اس افراط اور تیزی سے حال اور ماضی میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے کہ میں اب اسے خارجی طور پر کبھی صرف ماضی اور حال کا نکلا اور بڑھا ہوا جز (Projection) سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے اندازہ کیا ہے کہ حال کو سنبھالتے سنوارتے رہیے تو مستقبل وہی ہوگا جو اسے ہونا چاہیے۔

زبان و ادب کے مسائل میرے ذہن میں دو طرح آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کارواں ٹھیک راستہ پر گامزن ہے یا نہیں۔ دوسرے زادِراہ کتنا اور کیسا ساتھ ہے۔ میں چھوٹے چھوٹے مسائل یا مسائل مرکب میں الجھنے کی نہ اہلیت رکھتا ہوں نہ ہوس یا حوصلہ۔ میں ادب اور تنقید کے فرانسیسی، المانی، روسی، ولندیزی یا ماورالنہری اور وراءالورا تصورات سے بھی واقف نہیں۔ اسے آپ خود اعتمادی سمجھیں یا خود فریبی، مجھے اپنی زبان اور ادب پر کچھ ایسا اعتماد ہے کہ میں اپنے مسائل کو خواہ وہ ادب کے ہوں۔ خواہ سیاست کے اسی سرزمین پر اور یہیں کی چھوٹی بڑی قدروں کو نظر میں رکھ کر طے کر سکتا ہوں اور کرنا بھی چاہیے!

ان باتوں کے ماننے یا نہ ماننے کے بعد اگر ہم اپنے ادب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ پچھلے چند سالوں میں نوجوانوں نے ادب کی ترقی میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں۔ فن اور موضوع دونوں میں نئے نئے تجربے کیے گئے، اور اسالیب برتے گئے اور اس سلسلہ میں دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی روایات سے مدد لی گئی۔ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اس کام کو چند مخصوص فن کاروں نے اپنے ہاتھ میں لیا اور مخالفت یا موافقت سے بے نیاز ہو کر اسے چلاتے رہے۔ یہ کارنامہ بجائے خود بڑا امید افزا ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اچھے صحت مند اور ترقی پذیر ادب میں کیا چیزیں ہونی چاہئیں، لیکن اتنا ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کسی قوم کی زندگی اور تصورات کے تمام پہلوؤں کے اظہار کے لیے اس کے ادب میں خاص طور پر تاریخ و سیرت، فلسفہ و سیاسیات، ناول و افسانہ، رزمیہ و بزمیہ، نیچرل، غنائی شاعری، ڈرامہ، صنائع و بدائع، تنقید اور طنز و مزاح کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ تمام کسی ادب کے ایک ہی دور میں فروغ نہیں پاتیں۔ یہ بھی کچھ ضروری نہیں ہے کہ تاریخ کو تاریخ یا فلسفہ کو فلسفہ ہی کے اسلوب میں پیش کیا جائے۔ آخر اقبال نے شاعری اور ٹالسٹائے نے ناول

سے کون سا کام نہیں لیا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر ہمارے فن کار مخصوص اسالیب ہی کو اتنی وسعت دے دیں کہ وہ زندگی کے بیش تر پہلوؤں پر حاوی ہوں اور ان کو پیش کرنے، سلجھانے اور سنوارنے کی صلاحیت رکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس طرح دیکھیں تو اس دور کا اہم کارنامہ نثر میں افسانہ اور نظم میں نظم آزاد و معریٰ ہیں۔ نظم میں یہ تحریک ذرا دیر میں شروع ہوئی اس لیے ابھی اس کے نتائج واضح نہیں ہیں۔ ایک دو کے علاوہ ہمارے اوّل درجہ کے فن کاروں نے اس طرف توجہ نہ دی، اس لیے خاصے کے نمونے بھی کم ہیں۔ پھر بھی اس کے واسطے سے خیال اور اسلوب میں بنیادی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ البتہ یہاں اپنا ذاتی خیال ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ راشد[1] کی بعض آزاد نظموں میں مجھے اس آزادی، جدت اور تازگی کا احساس نہ ہوا جو مثلاً فیض[2] کی اکثر پابند نظموں میں شدت سے کارفرما ہے۔ اس سے اسلوب یا سانچے کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ خود آزاد نظم کا مستقبل بھلا ہو یا برا، اس نے جو نئے اور نادر موضوع شاعری میں داخل کیے ہیں، ان کی اہمیت مسلّم ہے۔

نظم کے اس جائزے کے بعد ہم نثر کی طرف آتے ہیں۔ علم نثر کی تاریخ وارتقا کے بارے میں آپ میرے دیرینہ اور فاضل دوست ڈاکٹر زورؔ[3] کے خیالات سے روشناس ہو چکے ہیں۔ اس لیے براہِ راست اسلوب کے متعلق مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے اس سلسلہ میں بہت مستند اور قابلِ وقعت ہے۔ البتہ اصناف اور موضوع کے اعتبار سے جب ہم اس دور کے نثری سرمائے پر نظر ڈالیں گے تو ہماری نظر زیادہ تر ناول اور افسانوں پر پڑتی ہے۔ پریم چند کے میدان سے الگ ہٹ کر اور ان سے زیادہ غیر جذباتی بلکہ ''غیر اخلاقی'' ہو کر افسانے کے دلچسپ اور متنوع تصورات اُبھارے اور برتے گئے۔ جنسیاتی مسائل کو ادبی خوش ذوقی کے

---

1. نذر محمد راشدؔ۔ تاریخ پیدائش 9/نومبر 1910 تاریخ وفات 9/اکتوبر 1975
2. فیض احمد فیضؔ۔ تاریخ پیدائش 13/فروری 1911 تاریخ وفات 20/نومبر 1984
3. ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ۔ تاریخ پیدائش 28/رمضان المبارک 1322ھ/1922 حیدرآباد دکن، تاریخ رحلت 24/ستمبر 1962ء، سری نگر (مرتبین)

تقاضوں سے کہیں زیادہ اہمیت دی گئی ہے، اور لہجے میں تندی، بیزاری اور زہرناکی کا عنصر اکثر نمایاں رہا۔ لیکن جب ہم یہ دیکھیں کہ یہ ملبا کتنی صدیوں سے دبا پڑا رہا اور جس ماحول میں اس کام کا بیڑا اٹھایا گیا، وہ کیسا غیر اطمینان بخش، بحرانی اور گوناگوں مطالبات کے لحاظ سے کتنا عافیت سوز اور حوصلہ شکن تھا، تو ہم کو کوئی تعجب نہیں ہوتا اور یہ بات یقیناً قابلِ تحسین ہے کہ ہمارے بعض نوجوان فن کاروں نے زندگی کو مردانہ وار دیکھا بھی، اور دکھایا بھی۔ انھوں نے اصولوں اور قدروں کی بعض ابدی اور قطعی حیثیتوں کو پہچانا، ٹکنیک میں نئی راہیں نکالیں، کردارنگاری میں گہرائی اور بے باکی کا ثبوت دیا۔ معاشیات کو ادب سے آمیز کیا اور زندگی کے بدلتے ہوئے رنگ سے ادب کی محفل کو آراستہ کیا۔ سردار[1] جعفری صاحب نے کہیں کہیں شدت اور تلخی کے ساتھ بعض نئے لکھنے والوں پر نام بہ نام نکتہ چینی کی ہے۔ اس سے آپ ان کے خلوص کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ممکن ہے آپ اس میں بے باکی اور تلخی کا عنصر غالب پائیں۔ اس موقع پر میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فاضل نقاد جس منزل پر اب پہنچے ہیں، ترقی پسند مصنفین کے بعض خیر اندیش نقاد آج سے بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ لیکن ان کو اچھی نظر سے نہ دیکھا گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے نوجوانوں پر بعض ابدی صداقتوں کا وزن اور گہرائی اس کی عصمت وعظمت بالآخر جلوہ فگن ہونے لگی ہے۔ یہ آثار نہایت درجہ مبارک ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ ادبی دلچسپی کا مرکزِ ثقل اب رفتہ رفتہ افسانوں سے ہٹ کر ناول کے آس پاس جا پہنچا ہے۔ اردو میں کئی ناول جلد جلد نکلے ہیں۔ ان میں قابل قدر دو ایک ہی ہیں، لیکن ہوا کے جس رُخ کی طرف یہ اشارہ کر رہے ہیں، وہ مریضانہ ہو کر بھی خود احتسابی سے گریزاں نہیں!

ڈرامے میں خاصے کی چیزیں دو ایک ہی ہو سکیں۔ ان میں اکثر ریڈیائی ڈرامے ہیں جن کے لکھنے والے موضوع سے زیادہ فنی اور سرکاری ضروریات یا مصالح کے پابند ہیں۔ سینما کے لیے جو ڈرامے لکھے گئے، ان کے لیے جیسا کہ کیفی[2] صاحب کے فلمی جائزے سے صاف

---

[1] علی سردار جعفری ترقی پسند شاعر، ناقد اور رشید صاحب کے شاگرد۔ بلرام پور، یوپی میں 1912ء میں پیدا ہوئے۔

[2] کیفی اعظمی 1918ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔

ظاہر ہوتا ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارے اچھے اور مقبول افسانوی ادب اور ادیبوں کا تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ اس لیے اس کے ماضی پر کوئی رائے دینے سے پہلے ہمیں اس کے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔ رہ گئے اسٹیج کیے جانے والے ڈرامے، وہ جس ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ ماحول خود ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ اسی لیے عوامی تھیٹر یا دوسرے اداروں کے باوجود کم سے کم شمالی ہند میں تھیٹر داستان پارینہ ہو کر رہ گیا ہے۔

آخری قسم ان ڈراموں کی رہ جاتی ہے جو پڑھنے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ گو ظاہری ہیئت میں اسٹیج کی ضروریات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ بڑے ڈرامے یہاں بھی نظر نہیں آتے، لیکن ایک ایکٹ کی بعض تمثیلیں تاثر کے لحاظ سے افسانوی سے کم نہیں۔ ان کا عیب و ہنر دونوں یہ ہے کہ آداب تسلیمات کی قسم کی چیزوں سے قطعِ نظر یہ ڈرامے تقریباً افسانوں ہی کے ٹکنیک کے مطابق لکھے جاتے ہیں۔

ان چیزوں کے علاوہ چند نمونے مزاح اور طنز کے بھی مل جاتے ہیں۔ مزاح اکثر سطحی اور طنز ہمیشہ تیکھا، تیز اور کبھی کبھی جانب دار بھی۔ جس میں خوش طبعی یا شگفتگی کا دور دور پتہ نہیں، حکمرانوں کے مجرمانہ دورِ حکومت کا ایک خاکہ نظر آتا ہے، مگر سیاسی بصیرت سے زیادہ اس میں پروپیگنڈے کا عنصر راہ پا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی طنز کے سلسلہ میں پیروڈی کے بعض نمونے ملتے ہیں جو اس ہیئت میں تو اردو میں پہلے موجود نہ تھے۔ اگر چہ ان کا تانا بانا یعنی تنقید و ہجو الگ الگ اردو میں پرانی چیزیں ہیں۔ ان کوششوں کی ادبی حیثیت تو کچھ زیادہ نہیں ہے، لیکن جدید شاعری کے چند بدیہی خطرات واضح کرنے کی وجہ سے نئے ادب کو اسی طرح ان کا ممنون ہونا چاہیے، جس طرح ہواباز کو موسمی پیشن گوئیوں کا۔

اس دور کی تنقید بھی بعض نمایاں خصوصیات کی حامل ہے۔ جیسا کہ پروفیسر عزیز احمد[1] صاحب نے کل اپنے مقالہ میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ لفظی بحثوں، بندش کی چستی، اور محاوروں کی صحت و عدم صحت کے بجائے خیال کی وحدت عقبی زمین کی اہمیت خود اظہاریت اور

---

1 عزیز احمد۔ تاریخ پیدائش: 11 نومبر 1913ء ضلع بارہ بنکی، حیدرآباد (دکن) تاریخ وفات: 12 دسمبر 1978ء ٹورنٹو (کینیڈا) مرتبین۔

رومان یا انقلاب کے پیرایہ میں بھی واقعیت کی تلاش ہمارے ادب میں اسی تنقید کے وسیلے سے آئی ہے۔ اس کے باوجود اس میں اصول کم اور شخصیت زیادہ نمایاں ہے۔ ہر جدید ٹکنیک کو جلد از جلد کسی مغربی تحریک یا رجحان پر منطبق کرنے اور اسی نظریہ کے ماتحت ادبی تخلیقات کا جائزہ لینے کی وجہ سے تنقید کا معیار محاکمہ کے بجائے بحث و تمحیص سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ شاعر یا افسانہ نگار عام طور سے خود ہی ناقد بھی ہیں۔ اس لیے خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدلنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

ادب یا ادبی سرمائے کی بقیہ اصناف سے اس دور کا دامن یکسر ''پاک'' ہے اور اکثر اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر یہ تحریک مجھے انگریزی میں انیسویں صدی کی رومانی تحریک کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں میں اس کے بارے میں براہِ راست تو کچھ نہیں کہنا چاہتا، لیکن ادب کے متعلق ''چند عمومی معروضات'' کا مرتکب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا!

میرے نزدیک ادب خواہ کسی ملک یا قوم کا ہو، ہمیشہ بڑے ذہن کے اچھے لمحوں یا تجربوں کا موزوں اظہار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں بڑائی، اچھائی اور موزونیت اتنے 'محفوظ' اور 'بے ضرر' الفاظ ہیں کہ ان کے ساتھ ساتھ اور اسی سانس میں اگر میں سچائی کی شرط بھی کہیں نہ کہیں لگا دیتا تو آپ میرا کچھ نہ بگاڑ سکتے، لیکن میں اس کی ضروریات یوں نہیں سمجھتا کہ میرے نزدیک 'صداقت' کوئی واقعہ نہیں، بلکہ ایک رشتہ ہے جو ایک سے زیادہ جھوٹ یا غلط باتوں کو ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتا رہتا ہے۔ دراصل سچ ایک مفروضہ ہے جس کی اصل قیمت مختلف ذہنوں ہی میں نہیں، بلکہ ایک ہی ذہن کے مختلف مسائل پر بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ چنانچہ مابعد الطبعیات، اخلاقیات، جمالیات اور اس قسم کی دوسری 'یات' حقیقت و صداقت کے بدلتے ہوئے رنگوں سے ہولی کھیلنے میں تو ایک سے ایک بڑھ کر ہیں، لیکن ان کا کوئی ایسا قطعی تصور، جو ہر جگہ قابل قبول ہو اور جس کا اطلاق ادب، فلسفہ، اخلاق اور زندگی و موت پر یکساں ہو سکتا ہو۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ہر میدان یا کائنات کا سچ وہ ہے جو اس میدان یا کائنات کے معیار سے بڑائی، اچھائی اور موزونیت کو ہم آہنگ کر سکے!

ادب زندگی کے سامنے جواب دہ ہو یا فلسفہ و اخلاق کے روبرو، وہ خواب کی باتیں کرے یا بے خوابی کی، وہ پوری کائنات اور اس کے تمام پہلوؤں کو ایک ہی نظر سے دیکھے یا ہر چیز

کو دیکھنے کے لیے الگ الگ رنگوں کی عینک استعمال کرے۔ وہ انسانی کمزوریوں اور نارسائیوں کو جرم قرار دے کر ان کا مرافعہ کرے یا مرض سمجھ کر اس کے استیصال کا بیڑا اُٹھائے، وہ ایک کاروباری قرض خواہ کی طرح انتقام اور سب وشتم کا ڈنڈا سنبھالے، یا مقروض انسانیت کے دیوالیہ پن کو خزینۂ الٰہی کی مصلحت کوشی پر محمول کرے۔ یہ اور اسی طرح کے اور بھی کئی مختلف النوع نظریے ہیں، جنھوں نے ادب اور ادیبوں کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے، اور ان کی تکنیک اور تکنیک سے زیادہ ان کے تخلیقی مزاج اور ان کے نظریۂ حیات کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے، لیکن اس کے باوجود زندگی اور ادبی صداقت کے اس اختلاف کی نوعیت کچھ ایسی اندیشہ ناک نہیں۔ دنیا کا عظیم ادب جو کچھ اور جتنا کچھ بھی میری نظر سے گزرا ہے، اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ چیز اپنے میدان میں اچھی، بڑی اور موزوں ہو تو صداقت ہی نہیں، حقیقت یا حقیقت نگاری کے تمام اصول اور تمام تقاضے اس کے قدم چومتے ہیں! جس طرح مذہب میں اجتہاد اور الحاد دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس طرح ادب اور زندگی میں بھی تنوع اور تضاد کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن جسے عام طور پر تضاد کہا اور سمجھا جاتا ہے، اسے اکثر تنوع کی کارفرمائی قرار دیتا ہوں۔

مثلاً یہی ٹریجڈی اور کامیڈی کو لے لیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں زندگی کے دو مختلف نظریے ملتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور ناقابلِ انکار طور پر الم انگیزی کو طرب آفرینی سے الگ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں (Ibsen) ابسن اور (Shacu) شا کو ایک ہی گھاٹ پانی پیتے دیکھتا ہوں، یا مثلاً زندگی کی وہ صداقتیں جو فانی[1] کے ہاں ملتی ہیں۔ یکسر مختلف اور بالکل ایک دوسرے قسم کی ہو کر بھی جگہ جگہ اصغر[2] کی حقیقتوں کی تائید کرنے سے باز نہیں آتیں۔

''وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے''

---

1. فانی بدایونی: شوکت علی خاں فانی۔ تاریخ پیدائش 13/ستمبر 1879ء اسلام نگر، ضلع بدایوں، تاریخ وفات: 26/اگست 1941ء حیدرآباد، (دکن)

2. اصغر حسین اصغر گونڈوی۔ تاریخ پیدائش یکم/مارچ 1884ء تاریخ وفات: 29/نومبر 1936ء الٰہ آباد (اصل وطن گورکھپور ہے) مرتبین

اور ایک کے اصول دوسرے کے مستثنیات نظر آنے کے باوجود اس مشہور انگریزی مثل کی یاد دلاتے ہیں جس میں استثنا سے اصول کو اور زیادہ تقویت پہنچنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے! چنانچہ جب ہم ایک محقق کی طرح ادب کی چھان پھٹک کرنے بیٹھیں گے تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ادبی تجربوں کی قدر و قیمت آپ کے جھوٹ یا میرے سچ کے اعتبار سے نہیں، بلکہ ان تجربوں کی اپنی بڑائی اور برتری یا سبکی و سطحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈرامے کو قصیدے یا غزل کو مسدس کے معیار سے نہیں جانچا جا سکتا، بلکہ ہر صنف کی پرکھ کے لیے اس صنف کے اصول وضوابط برتنے پڑیں گے۔

میں نے ادب پر گفتگو کے سلسلہ میں اسی ایک مسئلہ کو اس لیے اہمیت دی کہ میرا خیال ہے۔ پچھلے چند برسوں میں ادبی حلقوں میں کوئی اور چیز ہمارے ہاں اس سے زیادہ غور وفکر اور بحث وتمحیص کا موضوع نہیں بنی ہے۔ یہ بحث بے معنی تو شاید نہیں، لیکن بے محل یا قبل از وقت ضرور ہے! ادب میں کیا چیزیں دخیل ہوتی ہیں، اور کس طرح زندگی کے کون سے پہلو ادبی اظہار کے لیے موزوں ہیں اور کون سے ناموزوں۔ ادیب صرف بات کہے، یا منوانے کے پھیر میں پڑے۔ یہ سب سوالات فروعی ہیں، اور نہ صرف ادیب بلکہ ناقد کی سرگرمیوں میں بھی ان کا دوسرا درجہ ہے۔ ہر ادیب اپنا انفرادی ذہن، انفرادی مزاج اور انفرادی نظریہ لاتا ہے۔ پہلے ہمیں اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہ بڑا، اچھا اور ایمان دار آدمی ہے۔ اس کے بعد بجائے ان بحثوں پر ٹوٹ پڑنے کے کہ چوں کہ اس نے سوریئلی تکنیک کو نہیں برتا ہے۔ اس لیے قابل ملامت ہے، یا چوں کہ اس کے استعارے روایتی ہیں، اس لیے واہی تباہی بکتا ہے۔ ہمیں براہِ راست اس کی باتوں پر اسی کے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، اور کیوں؟ دنیا کا جو عکس اس کی نظر میں ہے، وہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے، اور اگر صحیح ہے تو اس میں حسن یا بدصورتی کے کیا کیا پہلو نکلتے ہیں۔ اس نے کہاں تک اپنے آپ سے اور پھر دنیا کے اس عکس سے انصاف کیا ہے۔ اس کی نظر کتنی وسیع ہے یا اس کے کیا حدود ہیں، کہاں پر وہ اپنی ذات کا غلام ہے، اور کہاں اس سے اُونچا اُٹھ جاتا ہے۔ زندگی اور زمانے کے کون کون سے واقعات یا امکانات اس نے پیش کیے ہیں، مختصر یہ کہ اس کا تجربہ کہاں تک انسانی، کائناتی یا آفاقی تجربہ ہے۔

کسی ادبی کارنامے کو تولنے کے لیے ہمیں ان تمام اوزان کی ضرورت ہوگی، اور خود ادیب بھی اپنے کو اسی آئینے میں دیکھ سکے گا! جس طرح بچے کو پہلے چلنا سکھایا جاتا ہے۔ پھر چلنے پھرنے کے فوائد اس کے سامنے آتے ہیں، اور پاؤں پاؤں چلنے سے پہلے رفتار کے اصول وضوابط سکھانا دانش مندی نہیں، اسی طرح ادیب کو بھی پہلے اپنے پاؤں سے چلنا چاہیے۔ ادیب کا شعور اس کی وہاں رہنمائی کرے گا، جہاں ناقد کی دلیل سیلی ہوئی بارود بن کر رہ جاتی ہے۔ مجھے 'یہ برائے وہ' میں ذرا مشکل ہی سے اعتماد واعتقاد ہوتا ہے، میرے نزدیک ادیب خود اپنے لیے ہوتا ہے، اور صرف اپنے ہی سامنے جواب دہ بھی۔ یہ سوچنا یا کہنا صحیح نہیں ہے کہ ادیب اپنے ہی سامنے جواب دہ ہو تو وہ دنیا سے قطع تعلق کر لے گا اور زندگی اس کے لیے (No Man's Land) سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھے گی۔ ادب کا معاملہ سائنس یا مشین جیسا نہیں جس کا شعور اور کارنامہ دونوں اصول کے پابند ہوں۔ ادیب کا شعور حسن شناس ہی نہیں موقع شناس بھی ہوتا ہے۔ اسی شعور کو احساس موزونیت کہتے ہیں، جو فن کار کی عظیم ترین اور منفرد جاگیر ہے۔ یہ شعور یا احساس موزونیت نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ پچ، ادب و ادیب کا نہیں محض ماہر یا مداری کا ہے!

ادب کے اسی تصور کی بنا پر میرے نزدیک تنقید کی بھی دو بڑی اور منفرد حیثیتیں ہیں۔ ادبی اور انسانی ادبی تنقید تمام تر کارناموں سے سروکار رکھتی ہے، اور انسانی تنقید شخصیتوں سے، یہاں وہاں ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے کے باوجود ان دونوں قسم کی تنقیدوں کی الگ الگ ہمدردیاں آسانی سے پہچانی جاسکتی ہیں، جن کے پیش نظر ہمیں ہر دور میں تنقید کے دو مختلف دبستاں نظر آتے ہیں، ان میں آپس کے بعض فروعی اختلافات کے علاوہ ایک بڑا فرق ہمیشہ اسی فنی یا انسانی ہمدردی کا رہا ہے! زاویہ نظر کی اک ذراسی تبدیلی تنقید کے دو اور پہلو اجاگر کرتی ہے، یعنی مقصد کی تلاش یا تجزیہ محض۔ خلط ملط ہونے کے امکانات یہاں بھی کچھ کم نہیں، لیکن تنقید کا رجحان دیر تک چھپا نہیں رہتا اور ہم بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ناقد نے بے کم وکاست تجزیے کے ایماندارانہ نتائج کو پیش کر دینا ہی کافی سمجھا ہے، یا اس کی توجیہ وتعبیر کے لیے اس کے سبب، رفتار اور مقصد کا تعین بھی ضروری خیال کیا ہے!

تفصیلات میں آئیں گے تو ان پہلوؤں کی نوعیت تبدیل ہوتی جائے گی اور تنقید کا خام مواد ہمیں زندگی اور اس کی عکاسی کی مختلف شکلوں اور منزلوں میں ملے گا۔ مثلاً تنقید کے دو ازلی مطالبات صداقت سے متعلق ہیں۔ یعنی ناقد ادیب سے کس زندگی کی عکاسی کا طالب یا خواہاں ہے۔ وہ جو موجود ہے یا وہ جو ہونی چاہیے؟ یا مثلاً حسن اور صداقت میں سے کون سی قدر اعلیٰ اور برتر ہے، اور جب ایسے مواقع یا مرحلے آئیں کہ حسن کا مطالبہ کچھ اور ہو اور صداقت کا تقاضا کچھ اور، تو کس کو کس پر ترجیح دی جائے؟ ادیب کی طرح اور تقریباً اسی کے متوازی تنقید نگار کے مسائل بھی ایک دو نہیں، بے شمار ہیں۔ وہ ادبی تنقید کا جوا اٹھائے، قدم قدم پر ایسے چورستے پائے گا جہاں ایک راہ اخلاق یا فلسفے کو جاتی ہے، دوسری نغمگی یا رومانی تسکین کو، تیسری تیکھی یا بے لاگ حقیقت نگاری کو، چوتھی مجرد طور پر خیال، جذبہ اور طرز ادا کی مکمل ہم آہنگی کو۔ وہ کون سی راہ پر قدم اٹھائے اور کسے نظر انداز کر دے! ارسطو سے ایلیٹ تک تنقید نگار انہی مسائل پر اُلجھا رہا ہے جیسے کسی کو جج تو بنا دیا گیا ہو، مگر قانون کی کوئی کتاب اسے نہ دی گئی ہو۔ ایسے چوراہوں پر یہاں وہاں ہمیں ایک سے زیادہ تنقید نگار مبہوت، فکر میں غرق دکھائی دیتے ہیں۔ اصول بناتے ہیں اور پھر ان کے استثنا سے دوچار ہو کر جھجک جاتے ہیں۔

ایسے تنقیدی متشکک ادبی تاریخ کی کڑیاں بھی ملاتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر رکے ہوئے اس بھنور کی طرح چکّر کاٹتے بھی نظر آتے ہیں جس کے حلقے میں پھنس کر ہر لہر اپنی خودسری یا انفرادیت بھول جاتی ہے اور خود اس بھنور کی طرح چکّر کاٹنے لگتی ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ٹھہر کے دیکھنے کے بجائے کسی ایک راستے پر چل پڑے ہیں اور ایک ہی طرف کے ہو کر رہ گئے ہیں! آرنلڈ اور پیٹر (Peter) انگریزی میں یا حالؔی اور بجنوریؔ اردو میں کچھ اسی قسم کی 'یک طرفہ پن' کا شکار ہو گئے ہیں۔ آرنلڈ اور حالؔی نے اپنی ہلکی سی رومانیت کو جو ان کی شاعری میں بار بار مچل کر سامنے آجاتی ہے، اصلاح پسندی میں جذب کر کے تنقید کو جانچنے نہیں بلکہ تبلیغ کرنے کا وسیلہ بنایا، اور (Peter) پیٹر کی جمالیات میں شراب بننے سے پہلے جو خمیر سا اٹھتا ہے اس نے تنقید کو شاعری کا نشہ بنا ڈالا ہے، وہ خام تنقید، خام شاعری اور خام امتزاج کا اچھا نمونہ ہے۔ بجنوری کے ہاں تنقید شاعری نہیں بلکہ نِری مبالغہ آرائی کا نشہ ہے، جیسے شراب میسر نہ ہو تو جام و

مینا کی کھنک ہی سے کوئی تسلی دے اور پار ہا ہو! بجنوری میں صرف فریب دہی نہیں بلکہ اس سے بھی خطرناک چیز یعنی خود فریبی کا بھی احساس ہوتا ہے، جیسے بعض لوگ جنت کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے خود مشرف بہ جنت ہوں۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ جنت کی حقیقت خود ان کے غالب کو بھی کچھ کم نہیں معلوم تھی!

میں نے یہ نام یوں ہی نہیں لیے ہیں، یہ ان تمام بے راہ رویوں کی بڑی اچھی نمائندگی کرتے ہیں۔ جنھوں نے تنقید کو اس کے جائز منصب سے ہٹا کر، اسے تبلیغ، شاعری یا مبالغے میں محدود کر دیا ہے لیکن اسے کیا کیجیے کہ فن کو شخصیت یا شخصی رجحانات سے الگ کر کے رکھنا اور دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے اندرونِ قعرِ دریا 'تختہ بند' کر دیے جانے والوں سے 'دامن تر مکن' توقع رکھی جائے۔ یہ ذاتی و شخصی رنگ کسی نہ کسی حد تک تنقیدی کارناموں میں ضرور نمایاں ہو جائے گا اور اس طرح تنقید کا فن بقول افلاطون نقل کی نقل ہو جاتا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال شیکسپیئر کے نقاد یا غالب کے شارح پیش کرتے ہیں جن میں ہر ایک کا اپنا الگ شیکسپیئر یا غالب ہے، نہ صرف معنی و مطالب بلکہ شخصیت اور ذہنیت کے اعتبار سے بھی! میں ادب میں تخلیقی اُپج کی خودروی یا بیگانہ روی کو جتنا سراہ سکتا ہوں، تنقید میں اسی قدر اصولوں سے قربت اور مرتب و منظم سنجیدگی اور میانہ روی کا قائل ہوں۔ وہ خارجی بالواسطگی جسے میں ادب کا حق ہی نہیں، اس کا حسن بھی سمجھتا ہوں، خالص تنقید کے سراسر منافی ہے۔ معالج یا ناقد کا رومانی یا جذباتی ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔

میں پروفیسر عزیز[1] سے بالکل متفق ہوں کہ تنقید کے کوچے میں بقول اقبال عشق کو بھی پروئی عقل خداداد کرنا چاہیے!

تنقید اور تنقید نگار کے سلسلہ میں یہاں ایک بشارت کا اعلان ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ نے بچپن میں ایک روایت سنی ہوگی کہ جب ملک الموت ہر ایک کی روح قبض کر چکیں گے تو باری تعالیٰ فرمائے گا کہ اب ملک الموت کی روح قبض کرو اس وقت یہ چیختے چنگھاڑتے کبھی مشرق کو بھاگیں گے کبھی مغرب کو کبھی اُتر کبھی دکن کبھی نیچے کبھی اوپر، لیکن ان کی ایک پیش نہ جائے گی اور ان کو پچھاڑ کر ان کی روح قبض کر لی جائے گی۔

---

[1] عزیز احمد۔ شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، نقاد، مضمون نگار اور مترجم

ہمارے تنقید نگار ملک الموت کے اس انجام کو نہ بھولیں!

اب ذرا دیر کے لیے شعر و ادب کی ان علمی بحثوں سے قطع نظر کر کے اس مسئلہ پر بھی غور کر لیجیے کہ اردو کو اس وقت جن غیر متوقع اور تشویش ناک مشکلات کا سامنا ہے اور اس بنا پر اس کا جو انجام نظر آ رہا ہے اس کا ہمارے پاس کیا علاج ہے۔ میں تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتا بلکہ بغیر کسی تکلف کے جلد از جلد یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جہاں اور تدابیر عمل میں لائی جا رہی ہیں وہاں میرے نزدیک ہمارے پاس ایک بڑا کاری حربہ یہ ہے کہ ہم اپنے مخالفین سے یہ منوالیں کہ اردو اپنی محافظ خود ہے!

میرے نزدیک اس کی صورت یہ ہے کہ ہمارے چوٹی کے لکھنے والے خواہ وہ شاعر ہوں یا نثر نگار، اس وقت ہر طرف سے منہ موڑ کر ایک آخری کوشش یہ کر ڈالیں کہ وہ ادب کے جس صنف کے ماہر ہوں اس کا صرف سب سے اچھا نمونہ جوان سے ممکن ہو پیش کریں۔ ہر لکھنے والے نے دو چار ایسی چیزیں پیدا کر دیں تو وہ اردو کی اہمیت اور منزلت کو ہمیشہ کے لیے مستحکم کر دے گا۔ ممکن ہے اردو کو جس سیلاب کا سامنا ہے وہ اسے غرقاب کر دے لیکن جس وقت سیلاب تھما (اور سیلاب ختم ہو کر رہتا ہے) اردو کے یہ منارے جگمگانے لگیں گے۔

تعصب فن کے شاہ کار کو نہ مٹا سکتا ہے نہ بے نور کر سکتا ہے۔ ہر ادب کو خواہ وہ کہیں کا ہو، بالآخر اردو ادب کے ان گراں مایہ جواہر پاروں کا احترام کرنا پڑے گا۔ ہندوستان کا آئندہ کوئی ادب ہو، وہ میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حالیؔ، اکبرؔ، پریمؔ چند اور اقبالؔ کا منکر ہو کر بے بہرہ کہے جانے پر راضی نہ ہوگا۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے سب سے اچھے لکھنے والے خواہ وہ پرانے کہلاتے ہوں خواہ نئے، بوڑھے ہوں یا نوجوان، اس پر آمادہ ہو جائیں کہ وہ ایمان داری کے ساتھ اپنی بے پایاں اور بے نظیر استعدادِ شعر و ادب سے ہمارے خزانے کو معمور اور ہماری دیواروں کو استوار کریں۔ اس کے لیے کسی عظیم الشان اسکیم بنانے یا کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص کو اپنی اپنی جگہ پر اپنی بساط کے مطابق کام کر دینا چاہیے۔ اچھے کاموں کا کارنامہ بن کر سامنے آتے رہنا سب سے اچھی اور کامیاب اسکیم ہے۔

میرا ایمان ہے کہ کثرت پر خوبی غالب آ کر رہتی ہے۔ اسی بنا پر میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے ہم بحث یا ماتم کرنا ترک کر دیں اور بہترین چیز پیش کرنے کی کوشش کریں، خواہ وہ کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو!

مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس تجویز پر عمل کریں گے، دوا سمجھ کر نہ سہی تعویذ ٹوٹکا ہی سمجھ کر۔

(مطبوعہ ادیب (علی گڑھ) انشائیہ نمبر، مئی 1959)

●●●

انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ

کے سالانہ اجلاس سے

خطاب

(1948)

آپ نے اس منصب پر مجھے فائز فرما کر جو کرم کیا ہے، اس کی مجھے بڑی خوشی ہے، ایسی خوشی جس میں شکرگزاری شامل ہے، ایسی خوشی اور ایسی شکرگزاری جس کا مجموعہ فخر کہلاتا ہے۔ یہ تینوں جذبات میں اپنے اندر پاتا ہوں اور یہی نذر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

سرور صاحب نے میرے متعلق جو کچھ فرمایا ہے میں سوچتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے کاش میں اس کا اہل ہوتا۔ میں یقیناً اس کا اہل نہیں ہوں، لیکن جس لطف و محبت سے انھوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے، اس سے میں دل میں ایک ولولہ پاتا ہوں کہ میں کوشش کروں کہ اس سطح پر پہنچ سکوں، جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہوں کہ اپنے خیالات کا اظہار آپ کے سامنے کس طرح کروں، اس لیے کہ اس زمانے میں حالات کچھ اس طرح سے بدلے ہیں کہ میری سمجھ میں تو آتا ہے، لیکن دوسرے اس درجہ سراسیمہ اور پریشان ہیں کہ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جو اثر میرے دل پر ہے یا جس کی طرف لوگ اشارہ کر رہے ہیں وہ واقعہ ہے، دراصل یہ واقعہ نہیں ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، میں اس قدر پریشان اور مایوس نہیں ہوں جس قدر ہمارے دوست ہیں۔ ابھی جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا تھا تو مجھے دو رسالے ملے، ایک کا نام 'پنچھی سبھا' ہے اور دوسرے کا 'اردو کا جنازہ' صورت حال کچھ بھی ہو، نہ تو ہماری کیفیت ایسی ہے کہ ہمارا شمار چڑیوں میں ہونے لگے، اور نہ جنازہ نکالنے کی کوئی وجہ نظر آتی ہے۔ بہرحال یہ عرض کرنا اس وقت بے محل نہ ہوگا کہ علی گڑھ نے اردو کو جمہوری بنانے میں نمایاں خدمات انجام

دی ہیں۔ جو لوگ اردو کی تحریکات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ علی گڑھ کسی طرح نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ اردو کو مخصوص حلقوں سے نکال کر جمہور تک پھیلانے میں علی گڑھ کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر جب علی گڑھ تحریک شروع ہوئی اور سرسید اور ان کے رفقائے کار برسرِ اقتدار آئے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ اردو جو پہلے پہل ٹکسالی ہونے کی حیثیت رکھتی تھی، دہلی اور لکھنؤ کے ٹکسالوں میں مقید رہی۔ سرسید اور ان کے رفقا نے یہ قید توڑی اور وہی اردو مستند اور مقبول عوام ٹھہری جو علی گڑھ میں پیدا ہوئی۔ آپ دیکھیں گے اس وقت ایسی نسل موجود ہے جو عوام میں اخبارات و رسائل اور ادبی جرائد میں، مقبول ہے۔ ان سب کے امام اب تک وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس تحریک کو علی گڑھ سے اُٹھایا اور چلایا۔ نثر کا کون سا اسلوب ایسا ہے جو سرسیّد، حالؔی، شبلؔی، نذیر احمؔد، کے اسکول سے تعلق نہیں رکھتا، اور یہ اسالیب اتنے رواں دواں ہیں کہ ہندوستان میں جہاں کہیں اردو مقبول ہے اور اردو کا کاروبار ہوتا ہے وہاں پر ان کی رہبری سے کسی کو مفر نہیں، ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی طرف سے جو اعزاز مجھے بخشا گیا ہے اس سلسلے میں مجھے عرض کرنا ہے کہ ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ مجھے بعض حلقوں میں پرانے خیال کا لکھنے والا سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد وہ وقت آیا جب مجھے نئے طرز کے لکھنے والوں میں سمجھا جاتا تھا، آج وہ وقت ہے کہ نئے اور پرانے دونوں اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں اپنے انجام سے ڈرتا ہوں کہ کہیں دونوں مجھ سے دست بردار نہ ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے وہ زمانہ کبھی نہیں آئے گا۔ میرے ایک بڑے ہی عزیز دوست سرؔور صاحب کے ایک بڑے مصنف کا مقولہ ہے کہ ''دنیا میں جہاں کہیں بھی حسین عورت ہے وہ میری محبوبہ ہے، اس لیے اردو جس شکل میں بھی رہے مجھے وہ محبوب ہوگی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پچھلی صحبت میں ایک گوشے سے یہ تحریک پیش کی گئی کہ ترقی پسند مصنفین میں لوگوں کا مسلک کچھ ایسا ہے جس سے بہت سے لوگ اتفاق نہیں کرتے، اس لیے ان کو انجمن سے علاحدہ ہو جانا چاہیے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس تحریک میں کوئی بھی شائبہ حقیقت کا ہو، اردو کو جو لوگ عزیز رکھتے ہیں خواہ ان کا مسلک کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کی حیثیت ہمیشہ یکساں ہے اور یکساں ہونی چاہیے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی آپ اس مسئلہ پر غور کریں تو یہ بات دل سے محو کر دیں اور آپ یہ نہ سوچیں کہ وہ شخص کس

عقیدے سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا مسلک کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اردو کی طرف سے ہرگز ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ ہاں بعض اردو دانوں کی حرکتوں سے مایوس ضرور ہوں۔ یہ خیال کتنا غلط ہے کہ اردو کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے، اردو کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہرگز نہیں، بلکہ اس کا تعلق اس ملک کے بیش تر رہنے والوں سے ہے، بات بڑی نازک ہے اور نازک میں خطرناک کے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ ایک وقت آیا جب کچھ لوگوں نے ایک تحریک اُٹھائی اور وہ برسر کار آئی۔ کچھ لوگ رہ گئے، کچھ چلے گئے۔ جو چلے گئے ان کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اردو کسی خاص فرقے یا طبقہ کی ملکیت ہے، اگرچہ کوئی مخصوص گروہ اس کی اجارہ داری کا مدعی نہیں ہو سکتا، لیکن ان لوگوں کو جو آج دوسروں کے کہنے میں آکر اس سے رشتہ توڑ رہے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ ان کو انھیں الفاظ میں یاد کرے گی، جن سے آج ہندوستان سے کسی دوسرے ملک میں جانے والوں کو یاد کیا جاتا ہے، صاف صاف الفاظ میں یہ غداری ہوگی۔ اس زبان کو ہم دونوں نے بنایا، دونوں نے اس کی خدمت کی، اس پر فخر کیا اور اسی پر ہم دونوں کو ناز ہے۔ اب حکومت کے کہنے سے اگر وہ ساتھ چھوڑ دیں گے تو وہ قابل الزام ٹھہریں گے اور انھیں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا نام مورّخ کے یہاں کس طرح لیا جائے گا۔

لکھنؤ میں اردو کی وہ حالت نہیں ہونی چاہیے، جو بعض جگہ بنا دی گئی ہے۔ ایک چیز پورے طور پر ملحوظ رکھیں۔ یہ بات ہماری سرشت میں داخل ہوگئی ہے کہ جو حکومت کہتی ہے وہ صحیح کہتی ہے، اور ہم اس کے کرنے پر ہر طرح سے مجبور اور لاچار ہیں، اور جو کچھ ہم کہیں گے یا کریں گے وہ یکسر خراب و ناقص ہے۔ حکومت کا کسی چیز کو نافذ کر دینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حق بجانب ہے۔ میں اردو کے مستقبل سے مایوس ہو جانے والوں سے اپیل کرتا ہوں کہ موجودہ حالات سے متاثر نہ ہوں بلکہ اس کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کے لیے جدّ و جہد کریں۔

(مطبوعہ علی گڑھ میگزین، 49-1948)

●●●

خطبۂ صدارت

کل بہار ریاستی اردو کانفرنس

(منعقد، پٹنہ 12/تا 14/مئی 1951)

صاحبو! اس شان دار اجتماع میں میرا اس مقام پر ہونا جہاں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں، ستم ظریفی سے خالی نہیں۔ اس ستم ظریفی کا جواب اگر کچھ اور ہوسکتا ہے تو حکومت کا یہ مفروضہ ہے کہ اردو اس ملک کے کسی خطہ کی زبان نہیں، اور جسے ہم آپ اردو کہتے ہیں وہ اردو نہیں کچھ اور ہے!

تصوف کے ہمہ اوست کے چکر سے ہم ابھی پورے طور پر نکل نہ پائے تھے کہ زبان کے ہمہ اوست یا ہمہ از اوست کے بھنور میں ڈھکیل دیے گئے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ہم اور آپ آج اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ نام کے اس پھیر کو قسمت کا پھیر نہ سمجھنے لگیں۔ یہ عقل کا بھی پھیر نہیں ہے۔ شاید نیت کا پھیر ہو! نیت کا پھیر اس لیے کہ ان دنوں اناج کی کمی اور اسلحہ کی وجہ سے نہ کسی کی نیت بخیر ہے نہ کسی کا مزاج بخیر!

آپ کی سرزمین اردو شعروادب کا گہوارہ رہی ہے اور اب بھی ہے۔ پٹنہ کا نام اردو کے مرکز ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ لیا گیا۔ اردو کی حمایت میں اس کانفرنس کا یہاں منعقد ہونا، میرے ذہن کو ہندوستان کے مذہب واخلاق کے اس مبارک عہد کی طرف لے جاتا ہے۔ جب مہاتما بدھ نے بہار ہی کی ایک بولی میں مذہب واخلاق کی برکتوں کو عوام تک پہنچایا، اور وہ بولی اس درجہ تک پہنچ گئی جہاں خود سنسکرت کو یہ محسوس ہوا کہ جب تک خدا

عوام کی زبان میں گفتگو نہ کرے گا، عوام خدا کی زبان اور فرمان پر کان نہ دھریں گے۔ یہ نکتہ سب سے پہلے اسی بہار کی سرزمین پر مہاتما بدھ نے روشن کیا اور یہ نکتہ ان لوگوں کو خاص طور پر فراموش نہ کرنا چاہیے جو زبان و عوام کے مزاج و منشا کے سمجھنے کے بجائے زبان اور عوام کو سیاست کے مہروں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے!

اس نکتہ پر سب سے زیادہ وسیع پیمانہ پر اور سب سے زیادہ خلوص اور حوصلہ سے اس زبان نے عمل کیا جو آخر میں اردو کہلائی، اور جس نے ہندوستان کے تقریباً ہر مذہب و اخلاق کو پھیلانے اور مقبول عام بنانے میں ہندوستان کی ساری زبانوں سے زیادہ فراخ حوصلگی سے کام لیا۔

پھر بہار کی سرزمین پر علی گڑھ کے ایک خدمت گزار کو آپ نے یاد فرما کر ان روایات کی یاد تازہ کی ہے، جو اردو کے نشاۃ الثانیہ سے وابستہ ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء ادب نے اردو کو مقبول و مستحکم بنانے میں جو ہمہ جہت کوشش کی ہے، وہ اردو کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔ اردو شعر و ادب میں جتنی تعمیری تحریکیں علی گڑھ کے قیام سے اب تک بروئے کار آئیں اور جن کی وسیلہ سے اردو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی ہم دوش بنی، ان کے بیش تر (اگر تمام تر نہیں) ابتدا کرنے والے اور پروان چڑھانے والے علی گڑھ ہی کے وابستگان دامن رہے۔ اور اب جب کہ انجمن ترقی اردو ہند کا صدر دفتر پھر سے علی گڑھ میں قائم ہوا ہے، اور اس کے کرتا دھرتا اور خود یونیورسٹی کے سرخیل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وہاں موجود ہیں۔ اُمید ہے کہ اردو کے تمام خدمت گزار خواہ وہ کہیں ہوں اور کسی حال میں ہوں، تازہ دم ہو کر امید و حوصلہ کے ساتھ اردو کی ترقی کا کام شروع کر دیں گے اور اس کام کی اہمیت و عظمت ان کے دلوں میں وہ رفاقتِ نگاہ کو وہ رفعت اور بازوؤں میں وہ قوت پیدا کرے گی جس کی اس وقت بڑی ضرورت ہے اور جس کے بغیر اردو کا سفینہ ساحل مراد تک نہ پہنچ سکے گا!

پٹنہ میں یہ اجتماع جیسا کہ میں اشارہ کر آیا ہوں، بڑا نیک شگون ہے۔ علی گڑھ کو اس موقع پر یاد رکھنا بڑی قدر افزائی ہے اور ذاکر صاحب کا ہم سب کے ساتھ ہونا ایک بشارت ہے!

اردو کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق اتنی باتیں اتنے طریقوں اور اس کثرت سے کہی گئی ہیں کہ ان کو یہاں دُہرانے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ملک کی تقسیم کے بعد سے حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں ہماری پالیسی اور پروگرام کا نقشہ بھی اور ہونا چاہیے۔ نئے حالات و مسائل کو پرانی منطق سے ربط دینے کا وقت نہیں رہا، پھر بھی یادداشت تازہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس اعتبار سے بہت ممکن ہے کسی مسئلہ کو نئے زاویہ سے دیکھا جائے تو نئے نقش و نگار سامنے آئیں یا جو دھندلے ہو گئے ہوں ایک بار پھر واضح اور روشن ہو جائیں۔

یہاں میں اردو لسانیات پر کوئی درس نہیں چھیڑنا چاہتا جو میرے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آپ کے لیے عذاب جان! میں صرف اشارہ و خلاصہ پر اکتفا کروں گا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ اردو ہند آریائی زبان کی سب سے نکھری اور نتھری ہوئی شکل ہے۔ یہ نہ آسمان سے اُتری نہ پاتال سے لائی گئی، نہ خلا میں پیدا ہوئی۔ یہ ایک ترقی پسند تحریک تھی جو آریوں کے داخلہ ہند سے شروع ہو گئی تھی۔ تقریباً پندرہ سو سال قبل مسیح سے تاریخی اور لسانی اعتبار سے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو زبان کی ابتدا خاص طور پر مسلمانوں کی آمد سے ہوئی۔ اردو کا ہیولیٰ مدت الایام سے وادیِ جمن میں تیار ہو رہا تھا۔ اس تحریک کی خصوصیت و خوبی یہ تھی کہ اس نے ہر طرح کے ترقی پسند اثرات کو قبول کیا، اور اس کو جب کبھی منزہ یا محدود رکھنے کی کوشش کی گئی، اس نے انحراف کیا۔ ابتدا میں اسی تحریک نے سنسکرت کی شکل اختیار کی تھی جس کو ایک فرقہ نے پراکرتوں کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت صرف ادب و عبادت بن کر رہ گئی۔ جس نے ہندوستان کو صدیوں مجہول اور منجمد رکھا!

یہ لسانی رو سنسکرت کو ایک محدود و مقید جھیل کی شکل میں چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور ترقی کے راستے طے کرتی ہوئی اس منزل تک پہنچی، جہاں مسلمانوں کی آمد سے اس کو اور دوسری پراکرتوں کو یک لخت بڑھنے پنپنے کا موقع مل گیا۔ اردو کے طالب علم جانتے ہیں کہ اردو بھی وقتاً فوقتاً ان قوتوں کی زد میں آتی رہی ہے۔ جنھوں نے سنسکرت کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہ ہو سکی، لیکن چوں کہ اردو اپنے مزاج و نہاد کے اعتبار سے ترقی پسند عناصر پر مشتمل تھی۔ اس نے

زیادہ دنوں تک قید و بند گوارا نہ کیا، اور تازہ ہوا اور کھلی فضا میں سانس لینے سے باز نہ آئی۔ چنانچہ مقامی زبانوں کو زندگی کا نیا روپ اور رنگ دیتی ہوئی سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ یہ کسی مقامی زبان کو دبا کر آگے نہ بڑھی۔ اس نے ہر مقامی زبان سے فائدہ اُٹھایا، اور ان کو فائدہ پہنچایا۔ یہی سبب ہے کہ اردو وقتاً فوقتاً جتنے ناموں سے یاد کی گئی، ہندوستان کی کوئی اور زبان نہیں یاد کی گئی!

قوس قزح میں جتنے رنگ ہیں وہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ کمان اپنے گرد و پیش کی کن جھلکیوں سے مرکب ممزوج اور مزیّن ہے!

آپ نے ہندوستان کی کسی اور زبان کے بارے میں یہ سنا ہے کہ وہ ہندی ہندوی، ہندستانی ریختہ اردوئے معلیٰ اور اردو، اتنے مختلف ناموں سے مشہور ہوئی ہو! اس کو اتنے نام کیوں دیے گئے؟ غالباً اس لیے کہ وہ زبان اور زمانہ کے رجحانات کی ہم عنان رہی، یہاں تک کہ وہ ہمارے سماج کے ہر طبقہ سے منسوب ہو کر ہمارے سامنے آتی رہی۔ مثلاً کرخن داروں کی اردو، فوجیوں کی اردو، عورتوں کی اردو، مولویوں کی اردو، سیٹھوں کی اردو، بنگالیوں کی اردو، پنجابیوں کی اردو، دکھنیوں کی اردو، آپ کی اردو، میری اردو غرض اردو ہی اردو۔ یہ کیوں اور کس لیے؟ اس لیے کہ اس میں ڈھالنے اور ڈھل جانے کی بڑی صلاحیت ہے۔ اردو کی اس صفت و صلاحیت نے ملک کے دور دراز فاصلوں اور اس میں رہنے سہنے والوں کے مزاج و معاشرت کا لحاظ رکھ کر ان کی آپس کی اور خود اردو کی اجنبیت کو کم سے کم کر دیا۔ یہ صفت دنیا کی صرف بڑی زبانوں میں ملتی ہے۔ کبھی کبھی یہ صفت ایسی زبان میں بھی مل جاتی ہے جو خطّہ کی زبان نہ ہو۔!!

پھر یہ دیکھیے کہ انشا پردازی اور موضوع دونوں اعتبار سے کس کس طرح کے لکھنے والے اس میں موجود رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر پنڈت سندر لال تک دیکھ جائیے، آپ کو ہر طرح کے لکھنے والے مل جائیں گے۔ اتنی متنوع نگارش کے نمونے آپ کو اردو کی معاصر زبانوں میں شاید ہی ملیں۔ پھر یہ نہیں کہ ایک لکھنے والا قبل مسیح کا ہو اور دوسرا 12 رمئی بعد مغرب کا، بلکہ دونوں 12 رمئی بعد مغرب تک بفضلہٖ بقید حیات ہیں!

شاعروں کا میں نام نہیں لیتا۔ یہ گلستاں ایسا نہیں جس کی بہار کا قیاس نہ کیا جا سکے۔ پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کا کوئی مقام نہیں! معلوم نہیں کس مقام کو مدّنظر رکھ کر ظریف لکھنوی نے کہا تھا۔

وحشت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

آپ کی اردو میں اچھے اور مستند لکھنے والے جن مختلف ملتوں سے وابستہ ہیں اس دیس کی کس اور زبان میں پائے جاتے ہیں؟ مسلمان، ہندو، انگریز، سکھ، ان میں سے ہر ایک اردو شاعر اور انشا پرداز کی حیثیت سے اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ مسلمان لکھنے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دوسری جماعتوں کے لکھنے والوں کو مستند نہیں مانتے۔ یہ بہتان ہے، اردو کے قدیم تذکروں سے لے کر آج تک کی۔ متعلقہ تحریروں میں اردو کے غیر مسلم لکھنے والوں کو مسلمان تذکرہ نویسوں نے دل کھول کر سراہا ہے۔ غالب اور ناسخ تک نکتہ چینوں کے ہدف بنے، لیکن نسیم، سرشار، چکبست، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم، امرناتھ ساحؔر دہلوی، نرائن پرشاد بیتاب، دلورام کوثر، پنڈت کیفی دہلوی، کشن پرشاد کول، شانتی سروپ بھٹناگر، فراق گورکھ پوری، آنند نرائن ملاّ، عرش ملسیانی، امین سیال کوٹی، وحشی کان پوری اور بہت سے جن کا نام اس وقت ذہن سے اُتر گیا ہے ان پر نہ صرف یہ کہ کسی نے حرف گیری نہ کی، بلکہ ان کو اردو غزل، نظم، ڈراما، افسانہ، ناول، نعت، تنقید، طنز و ظرافت اور کردار نگاری میں ائمہ فن کا درجہ دیا گیا۔

اردو کے پہلے تذکرہ گلشن ہند میں مرزا علی لطف اردو کے ایک شیدائی رائے سرب سنگھ دیوانہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اکثر ریختہ گو لکھنؤ کے مرزا جعفر علی حسرؔت اور میر حیدر علی حیرآؔں اس کے شاگردوں میں ہیں۔''

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا کسی کی خوشامد کی خاطر کیا گیا تھا یا اب کیا جاتا ہے؟ کچھ دنوں سے اردو ہی نہیں ہندوستان کی ہر زبان میں افسانہ نویسی اور ناول نگاری کو سب سے زیادہ قبول عام نصیب ہے جن کو پرکھنے کے لیے بڑے سائنٹفک اور 'اپ ٹو ڈیٹ' اصول مروّج ہیں۔ ان اصناف میں ہندو اور سکھ لکھنے والے مسلمان لکھنے والوں سے یقیناً زیادہ اونچے درجہ پر فائز ہیں۔ بچھڑے ہوؤں میں پریم چند اور ساتھیوں میں کرشن چندر اور بیدؔی کے نام سے ہم میں کون واقف نہیں!

میں نے یونیورسٹی میں چوتھائی صدی کے لگ بھگ معلمی کی ہے، اکابر کی تصانیف پڑھی ہیں، ان کی صحبتیں اُٹھائی ہیں۔نوجوانوں کو سچ کی تلاش اور سچ کے اعلان پر آمادہ کیا ہے۔ میں کیسے مان لوں یا آپ کو مان لینے کی ترغیب دوں کہ اس دیس میں اردو کسی خطّہ کی زبان نہیں ہے، یا اردو صرف نوابوں اور اُمرا کی زبان رہی ہے، یا اردو کی خوبو بدیسی ہے یا اردو داں ملک کے بداندیش ہیں، یا اس دیس کا نام اونچا کرنے میں اردو کا کوئی حصہ نہیں یا اردو کا کوئی مستقبل نہیں یا یہ کہ اردو ہندی ہی نہیں کسی زبان کی دشمن ہے۔

آپ یقین کریں کہ ادب کا کام کرنے والے کسی ادب کے ہرگز دشمن نہیں ہوتے۔ اردو کا جو گہرا اور بنیادی رشتہ ہندی سے ہے اس کی اہمیت سے انکار کرنے والا جاہل محض یا کور باطن ہے۔ ہندی کے الفاظ ،فقرے، ترکیبیں، پہیلی، پھبتی، پھکڑ گیت، کہاوتیں اور اس قبیل کی اور چیزیں جتنی اردو کے دامن میں ہیں،خود جدید ہندی کے دامن میں نہیں ہیں۔ یہ چیزیں اردو میں گری پڑی یا لستم پستم نہیں ہیں، بلکہ شعر وادب میں نگینہ کی طرح جڑی ہوئی ملتی ہیں۔ اردو داں اس ملک کے بدخواہ ہوں یا نہیں، اس ملک کو غلامی سے نجات دلانے اور جبر واستبداد کی قوتوں سے ٹکر لینے میں ہندوستان کی کوئی اور زبان یا ادب اردو سے شاید ہی آنکھ ملا سکے۔

اردو شاعری میں غزل بڑی محبوب بھی رہی ہے اور خاصی مردود بھی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ ہمارے ہاں بڑے معقول غزل گو بھی گزرے ہیں اور نامعقول بھی۔ کچھ دنوں سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا یا بُرا کہنے کا جی چاہتا ہے وہ غزل پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں۔ایسوں کو درگزر کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ وہ غزل کی تاریخ اور تقدیر دونوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک غزل ایک مکمل تہذیب ہے۔اس لیے کہ اس میں ہمارے فضائل کی رنگارنگی ملتی ہے۔ یہ قومیت بھی ہے اس لیے کہ اس میں انسانیت کا ظہور ملتا ہے۔ یہ ادب بھی ہے اس لیے کہ اس میں انسانوں کی ترجمانی ملتی ہے۔ یہ فن بھی ہے اس لیے کہ یہ ہماری انسانیت کے اظہار کا وسیلہ ہے!

تہذیب کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ڈگر سے بڑی مشکل سے اور بڑی دیر میں ہٹتی ہے،لیکن غزل کی توفیق دیکھئے کہ وقت آیا تو اسی غزل کو کسی اور نے نہیں ہمارے کٹر غزل گویوں

ہی نے وطن کی آزادی واتحاد میں ڈھال دیا۔ اقبال نے 'شمشیر وسنان اوّل، طاؤس ورباب آخر' کو تقدیر امم بتایا ہے، لیکن اردو غزل گویوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں طاؤس ورباب تک کو شمشیر وسناں بنا دیا۔

شبلی، اکبر، محمد علی حسرت اور جگر مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور سنیے، انیس اردو کے بڑے کٹر شخص اور شاعر ہیں اور دلّی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے مسلمہ اور چوٹی کے نمائندہ، انھوں نے اپنے مرثیوں میں اہلِ بیت اظہار کے رنج وراحت، عمل ردّ عمل، رسوم وقیود، بین وبکا، سیرت وشخصیت کا نقشہ ہندی ہی نہیں ہندوانہ رکھا ہے۔ محسن کاکوروی مدّاح رسول ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک مشہور ومقبول نظم 'سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل' جس کا موضوع خالص مذہبی ہے، سارے تلازمے اور ساری تلمیحات ہندی اور ہندوانہ رکھے ہیں۔ اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کا شکار ہو گئے۔ جسے فرقہ پرستی بتایا جاتا ہے، اقبال کے ہاں وہ کیا ہے اس کے بتانے سمجھانے کا یہ موقع نہیں۔ اس غلط فہمی کا جواب بارہا دیا گیا ہے اور اتنا معقول دیا گیا ہے کہ ان کے دہرانے کی یہاں مطلق ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اقبال نے ہندو اور دوسرے غیر مسلم مذہبی اکابر وافکار پر محبت وعقیدت سے بھری جتنی پاکیزہ و بلند پایہ نظمیں لکھیں اور خود ہندوستان کی بڑائی میں جس حد تک رطب اللسان رہے، اس کی مثال اس پایہ کے کسی اردو کے شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ اقبال کے طالب علم جانتے ہیں کہ اقبال کسی کی تعریف اپنے کلام میں محض شعر گفتن کے سلسلہ میں نہیں کرتے تھے۔ جذبات وافکار دونوں کے اعتبار سے جب تک ان کے قلب و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں ہلچل واقع نہیں ہو جاتی تھی، اور وہ اس کو بہترین جامہ شعری نہیں دے لیتے، اس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے۔ اس لیے اقبال کا تھوڑا بہتوں کے سارے پر بھاری رہا ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ اردو آس پاس ہی نہیں دور دراز ملکوں اور اس کے رہنے بسنے والوں کے درمیان اپنی ابتدا اپنی ساخت پرداخت اور اپنی کارگزاریوں کے اعتبار سے سب سے موزوں ومعتمد سفیر کی حیثیت رکھتی ہے!

بات میں بات نکلتی ہے۔ آپ میں سے بہتوں کی نظر سے ہندوازم پر مشہور فاضل و فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تصانیف گزری ہوں گی۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ ہندوستان اور ہندوازم کا یہ روایتی شعار رہا ہے کہ اس نے ہر ملت و مسلک کو انگیز کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود ہندو مذہب کے حلقہ میں مختلف دیوتاؤں یا شعار مذہبی کے ماننے والے موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس نظریہ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہندوستان مذہبی مفاہمتوں کا ایک گہوارہ ہے۔

اب میں آپ کی اجازت سے یہاں اردو کا وہ کارنامہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو بقول ڈاکٹر صاحب ممدوح ہندوستان کا روایتی امتیاز رہا ہے۔

میرے ایک عزیز رفیقِ کار نے حال ہی میں ایک مقالہ بڑی تحقیق و تفتیش سے مرتب کیا ہے جس میں مسلم یونیورسٹی نے ان کو اردو میں ڈاکٹریٹ تفویض کی۔ اس کا عنوان ہے ''غیر مسلم مذاہب و اخلاق کے مقبول عام بنانے میں اردو کا حصہ''۔

میں تفصیل نہ پیش کروں گا۔ مقالہ کے مختصر اقتباسات جہاں تہاں سے عرض کرتا ہوں۔ انڈیا آفس کی فہرست کتب میں جس میں صرف اُنیسویں صدی کے آخر تک کی کتابیں درج ہیں، اردو اور ہندی کی مذہبی مطبوعات کا شمار حسب ذیل ہے:

مذاہب	اردو	ہندی
عیسائی	536	213
ہندو	153	224
جین	3	32
برہمن سماج	20	13
بودھ	1	×
سکھ	0	3
میزان	**713**	**485**

اس طرح ہندوستان میں غیر مسلم مذاہب و اخلاق کی اشاعت میں اردو نے تقریباً

60فی صدی اور ہندی نے 40فی صدی حصہ لیا، اردو میں ان مطبوعات کی کثرت کا سبب اوروں سے قطع نظر لالہ لاجپت رائے صاحب اپنی کتاب 'مہاراج سری کرشن اور ان کی تعلیم' (مطبوعہ ہندستانی برقی پریس، لاہور1900ء) کے دیباچہ میں یہ بتاتے ہیں:

''اردو حقیقت میں ہندستانیوں کی زبان ہے، بلکہ اکثر موقعوں پر اردو اور ہندستانی ایک ہی معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں۔''

پنڈت جیشور پرشاد مائل دہلوی نے 'حسن اوّل' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں جین بودہ اور ہندو مذاہب کے فلسفہ، اخلاق، ادب اور علوم وفنون کا خلاصہ نہایت شستہ اردو میں پیش کیا ہے۔ اس کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

''........گرچہ اردو کا جنم خاص دلی میں ہوا اور اس نے اسی خطّہ میں پرورش پائی مگر تھوڑی سی مدت میں اتنی بڑی چڑھی کہ تمام ہندوستان کی زبان یہی ہوگئی، بلکہ اردو سے ہندوستانی زبان کہلانے لگی......اردو میری مادری زبان ہے۔ اس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا ایک سعادت منداولاد کی طرح میرا فرض ہے.......''

(حسن اوّل مطبوعہ انڈین پریس، الہٰ آباد)

بیش تر مصنفین نے مذہبی تصانیف کو اردو کے جامہ میں پیش کرنے کا سبب یہی بتایا ہے کہ اردو یا ہندستانی تمام ہندوستان میں دوسری زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اردو کا یہ رول محض اتفاقی نہ تھا۔ اردو نے ہندوستان کی روایتی مذہبی رواداری کی پیروی کی۔ اس کی پرورش اولیائے کرام کے دامن میں ہوئی۔ اس حقیقت پر یقین لانے کے لیے ان تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیے جن میں نہایت تفصیل سے نام بہ نام بتایا گیا ہے کہ صوفیا اور بھگتوں نے اس زبان کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔

اُسی سلسلہ میں ضمناً میں آپ کی توجہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ بات میں بات نکلنے سے آپ اُکتائیں نہیں، اس عہد کی یاد آج کے اضطراب و مایوسی میں بڑے کام کی چیز ہے!

ڈاکٹر نندلال چٹرجی کا بیان ہے کہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے ادب کا سب سے بڑا وصف یہ رہا ہے کہ اس کی ترقی میں ہندو مسلم یگانگت اپنی انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ مختلف کلچروں کا نہایت دلکش توازن اس عہد کی تصانیف اور مصنفین میں ملتا ہے۔ اس عہد کے تہذیبی عوامل بادشاہ، اُمرا، شعرا، دیسی زبانیں اور دیس ہی کے رسم و رواج تھے۔ بادشاہ علم دوست ہوتے تھے، اُمرا ان کی پیروی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ شعرا اپنی اپنی زبانوں میں نوادر تخلیق کرتے اور جہاں تک رسم و رواج کا تعلق ہے، اونچا طبقہ نچلے طبقہ کی پیروی کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا۔ اس عہد کا سب سے اونچا شاعر ایک مسلمان امیر تھا۔ خود فارسی ہندوستان کا آب و رنگ اختیار کرتی جارہی تھی اور مذہبی الفاظ بڑی تیزی سے ملکی زبانوں میں گھل مل رہے تھے۔ فارسی شاعری کی ہیئت اور اس کا عروض ہندی آہنگ قبول کرنے لگا تھا، اور ہندی شاعری فارسی عروض سے متاثر ہورہی تھی۔ ہندستانی زبانوں میں تخلص کا لایا جانا فارسی کا تصرف تھا۔

ہندو شعرا اپنے فارسی کلام کی ابتدا حمد و نعت سے کرتے تھے اور مسلمان دیسی زبان میں لکھتے تو گنیش جی اور سرسوتی دیوی کی حمد و نعت سے شروع کرتے۔ رحیم نے سری گنیش جی کی حمد سے ابتدا کی ہے۔ الحمداللہ نے نائکا بھید میں شری رام جی اور گنیش جی اور یعقوب نے رس بھوشن میں رادھا کرشن اور گوری شنکر کی حمد سے اپنے کلام کی ابتدا کی ہے۔ موضوع کے انتخاب میں بھی کسی قسم کے تعصب کو دخل نہ تھا۔ مسلمان شعرا کو ہندو فلسفہ کے صوفیانہ رجحانات پر بڑا عبور اور ان رجحانات سے بڑا شغف بھی تھا۔ ہندستانی دیسی ادب کو تمثیلی شاعری مسلمانوں نے دی، اس قبیل کی تصانیف میں جائسی کی پدماوت منجھن کی مدھومالتی عثمان کی چترا ولی اور نور محمد کی اندراوتی کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

ان تصانیف میں ہندو مسلم جذبات عقیدت کا بڑا نادر امتزاج ملتا ہے۔ جائسی کی پدماوت کا موضوع ہندو ہی ہے، لیکن اس کی داخلیت تمام تر اسلامی ہے۔ اس سلسلہ میں کبیر کا نام بڑے فخر و احترام سے لیا جاسکتا ہے، جن کے پیروؤں میں رجب یاری صاحب[1] اور

---

[1] دو دریا صاحب ایک ہی زمانہ 1731-1733 بکرمی میں گزرے ہیں۔ ایک آپ کے بہار کے اور دوسرے مارواڑ کے بہاری دریا صاحب کے پیرو بہار گورکھ پور اور کٹک میں ملتے ہیں۔

دریا صاحب ہیں جنھوں نے ہندستانی شاعری میں صوفیانہ رنگ و آہنگ کو بڑی خوبی سے سمویا۔ یہاں تک کہ ہندی ادب کے بعض نقاد یہ بیان کرتے ہیں کہ رسؔ کھان (سترہویں صدی بکرمی) کی نظمیں اظہار اور اثر آفرینی کے اعتبار سے سورداس کی نظموں سے زیادہ لطیف اور دل نشین ہیں۔

زبان شعر و ادب اور مذہب و اخلاق کے علاوہ ہندوستان کی موسیقی، مصوری اور فن تعمیر میں بھی دونوں جماعتوں کی ذہانت یگانگت اور صناعت کا نہایت دلکش امتزاج ملتا ہے جس کا اندازہ آپ بے شمار مستند تصانیف سے کر سکتے ہیں۔

بے محل نہ ہوگا اگر ہم یہاں یہ بھی دیکھتے چلیں کہ اس ملک کو اتحاد و آزادی دلانے میں اس زبان کا کیا حصہ رہا ہے، جو 'کسی خطہ کی زبان نہیں'! اور جسے بدیسی کہا جاتا ہے!

ملک کو سامراجی قوتوں سے نجات دلانے میں شبلؔی، اکبر، محمد علی، حسرتؔ اور جگرؔ کا ذکر آپ کے سامنے آچکا ہے، یعنی باوجود اس کے کہ یہ خالص غزل گو ہیں۔ وقت آنے پر انھوں نے غزل ہی کے محاذ سے جور و استبداد کی قوتوں کے خلاف نعرہ جنگ بلند کیا۔ اردو ادب میں نواب سید محمد آزاد کے مضامین مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبات، شبلؔی، چکبستؔ اور محمد علی کی غزلیں اور نظمیں اکبر کی طنز و ظرافت اور ظفر علی خاں کی نظمیں بیسویں صدی کی ابتدا میں شمالی ہند کی سیاسی تحریکوں کی نہ صرف ادبی طور پر آئینہ دار ہیں بلکہ انھوں نے ان تحریکوں کی سمت و رفتار متعین کرنے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔

یہ سلسلہ شعر و شاعری جس میں سلسلہ دار و رسن بھی شامل ہے، پہلی جنگ عظیم طے کرتا ہوا 1935ء کے آس پاس تک پہنچا، جہاں سے ابتدا ہوتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے بروئے کار آنے کی ترقی پسند مصنفین کا بنیادی مقصد اشتراکی انقلاب تھا، سیاسی، ادبی، تہذیبی ہر اعتبار سے۔ اردو شعر و ادب کو اس کا ایک وسیلہ بنایا گیا۔ ان کے ادبی تجربوں اور ابتدائی نمونوں پر موافقت اور مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ بالآخر ان کی ترقی پسندی اور اردو کی ترقی پسندی نے مل کر ہمارے شعر و ادب کو عام پسند اور مفید عام بنانے میں بڑی تقویت پہنچائی۔ بذات خود میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں کا مقصد کچھ بھی رہا ہو، اردو شعر و ادب کے حق میں نتیجہ بڑا اچھا نکلا۔ گذشتہ پندرہ سولہ سال میں اردو میں موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے جتنے نئے کامیاب اور

مفید تجربے ہوئے اتنے اردو کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے، اور باوجود اس کے کہ ترقی پسند مصنفین میرے کچھ ایسے عاشق زار بھی نہیں۔ میں اس کا قائل ہوں کہ انھوں نے اردو کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ البتہ یہ بات نہ پہلے کبھی کہنے سے باز رہا نہ اب رہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند مصنفین کو یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ جب تک انسانیت کے بہترین مقاصد انسانیت ہی کے بہترین طور طریقوں سے پورے نہ کیے جائیں گے، نہ اعلیٰ انسان وجود میں آئے گا، نہ اعلیٰ ادب!

تقسیم ملک کے بعد دونوں ملکوں میں جو قیامت مچی، اس کو فرو کرنے اور رجعت پسند طاقتوں سے ٹکر لینے میں ترقی پسند مصنفین کا قلمی جہاد نہ صرف اردو ادب میں بلکہ اس دیس کی تاریخ میں شکرگزاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ اس قلمی جہاد میں بعض ایسی تصانیف وجود میں آئیں جن کا اردو ادب میں کلاسیکی درجہ ہے۔

یہ ساری باتیں جو میں نے عرض کی ہیں، وہ ہرگز نئی نہیں ہیں۔ ہمیشہ لکھی پڑھی اور سنائی گئی ہیں۔ اس مجمع میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نہ صرف یہی باتیں بلکہ ان سے کہیں بہتر دوسری باتیں بھی مجھ سے بہتر طور پر آپ کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ میرا مقصد یہ بتانا تھا کہ ان باتوں کے ہوتے ہوئے زبان کے خدمت گزاروں کو اس دیس میں نہ کسی سے گھبرانا چاہیے نہ شرمانا چاہیے۔ اردو کے خدمت گزاروں سے آنکھ ملانے والے بھی کچھ زیادہ نہ ہوں گے۔ اس لیے سر اونچا رکھنے میں بھی ہم حق بجانب ہیں۔

ان حالات کے ماتحت ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اردو کے تحفظ و ترقی میں ہم کو کیا کرنا ہے اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو میں جلد سے جلد کہہ دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہم کو بدحواس نہ ہونا چاہیے۔ بدحواس ہونے سے آدمی بدلگام، بداطوار یا بددل ہو جاتا ہے۔ آزمائش کا وقت آئے تو ان باتوں سے بچنا چاہیے۔ جتنی بڑی آزمائش ہوگی اتنی ہی زیادہ سختی جھیلنی پڑے گی۔ اس قول سے آپ کو اتفاق ہو یا نہیں اس پر عمل ضرور کیجیے۔

اس کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ ہندی جمہوریہ ہند کی سرکاری زبان ہے۔ پارلیامنٹ نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔ ہندوستان کی بھاری اکثریت اس کی موافقت میں ہے۔ حکومت میں

حصہ لینا ہے یا حکومت سے فائدہ اُٹھانا ہے یا حکومت کو فائدہ پہنچانا ہے، اور کون ہے جسے ان باتوں سے انکار ہوگا تو جن کو ہندی نہیں آتی ان کو ہندی سیکھنی پڑے گی، بلکہ بہتوں سے بہتر ہندی جاننے کا حوصلہ رکھنا چاہیے۔ اردو جن کی مادری زبان ہے، ان کو اور ان کے بچوں کو یقیناً بڑی دشواری کا سامنا ہے۔ اس دشواری سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ اردو کے لیے کتنی ہی سہولت بہم کیوں نہ پہنچائی جائے، ہم کو ہندی سیکھنے سے ہرگز ہرگز بے نیاز نہ ہونا چاہیے۔ قانوناً ملک کی سرکاری زبان ہندی ضرور ہے، لیکن عملاً وعموماً سارے ملک میں جو زبان بولی یا سمجھی جاتی ہے وہ یقیناً اردو ہندستانی یا ٹوٹی پھوٹی اردو ہی ہے۔

نام بدل دینے سے قانون کی خانہ پُری کی جاسکتی ہے، انصاف کا تقاضا نہیں پورا کیا جاسکتا! انصاف کا مدار سچائی اور انسانیت پر ہونا چاہیے۔ قانون پر نہیں کبھی کبھی سچائی کی ذمہ داری یا کلفتوں سے بچنے کے لیے قانون وضع کیا جاتا ہے۔ مصلحت کا قانون اور دھرم کا قانون ایک ہی بات نہیں ہے۔ قانون طاقت وروں کا اسلحہ نہیں ہوتا، کمزوروں کا آسرا ہوتا ہے۔

اردو کو عزیز رکھنے والے اب بھی موجود ہیں، اور کافی تعداد میں موجود ہیں۔ مجھے اس کا فخر اور شکر گزاری کے ساتھ اعتراف ہے کہ اردو کی حمایت میں ہمارے مستند غیر مسلم اہل قلم بڑے خلوص اور بے خوفی سے ہمارے ساتھ ہیں۔ اس لیے ہم کو خوش ہونا چاہیے، اور ڈھارس پکڑنی چاہیے کہ ہمارا اچھے لوگوں کا ساتھ ہے۔ ہمارا مقصد مبارک ہے اور ہمارا پروگرام تعمیری ہے۔

اب میں آپ کی توجہ ایک ایسے مسئلہ کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جس سے ممکن ہے ہم میں کچھ احباب ایسے موجود ہوں، جو خواہ مخواہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ غلط فہمی ہمارا پیدائشی حق ضرور ہے اور میں کسی کا یہ حق مارنا بھی نہیں چاہتا، لیکن یہ کہنے سے باز بھی نہیں رہ سکتا کہ یہ ایک بیماری ہے جس کے علاج کا دنیا کا بڑے سے بڑا عطائی بھی دعویٰ نہیں کرسکتا۔

وہ بات یہ ہے کہ اردو کو ایک نئے دور سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ ہم کو بہت سی موافق یا ناموافق قوتوں سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سنجیدگی اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھیں، اور ان قوتوں کو اس طرح موڑیں اور ڈھالیں کہ ان سے ہم کو نفع پہنچے۔ اردو پر یہ دور

کچھ نیا نہیں ہے۔ اردو کی زندگی میں بہت سے موڑ آئے ہیں، اور چوں کہ یہ زبان ایک زندہ اور ترقی پسند قوت رہی ہے اس لیے ہر موڑ پر اس کو ترقی کی شاہراہ ملی۔

اردو گلیوں بازاروں اور عوامی زندگی کی نیچ اونچ سے اُبھری اور بڑھی، اس لیے اس کو ہر عوامی تحریک یا تقاضے سے فائدہ پہنچا ہے۔ ہمارے لیے یہ صورت حال امید افزا ہے۔ مایوس کن ہرگز نہیں۔ میں یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا بلکہ اس پالیسی اور پروگرام کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو انجمن ترقی اردو ہند نے متعین کیا ہے۔ یعنی ہم کو ہر وہ کوشش کرنی چاہیے جس سے اردو کی قیمتی سرمایہ سے وہ لوگ بھی آشنا اور بہرہ مند ہوں جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں، لیکن اردو بولتے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اگر اردو[1] کے مسلمہ ومعینہ رسم الخط کے علاوہ (بجائے نہیں) ہم اس رسم الخط سے بھی فائدہ اُٹھائیں۔ جو ہمارے ملک میں رائج ہیں مثلاً ناگری رومن، گورمکھی وغیرہ! اگر ہم دوسری زبانوں کے تراجم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور دوسری زبانیں اردو تراجم سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں، اور اس کاروبار میں دونوں کا نفع ہے۔ نقصان کسی کا نہیں تو اگر ہم رسم الخط کے بارے میں بھی یہی طریقہ کار ملحوظ رکھیں تو کیا قباحت ہے۔

اردو رسم الخط کو اور زیادہ مقبول اور کارآمد بنانے کے لیے میں اس میں بھی کوئی ہرج نہیں دیکھتا، اگر اپنے مبتدیوں کے لیے ہم اپنے رسم الخط، قواعد املا اور ہجے کو آسان سے آسان تر بنانے کی کوشش کریں۔ کم پڑھے لکھے لوگ اب بھی قواعد اور اِملا کی غلطیاں کرتے ہیں، لیکن کام چلا لیتے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی نقصان نہیں اگر ہم ضروری اصلاحات و رعایات قبول کرلیں۔ یہاں اس نکتہ کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اردو یہاں کے عوام کی زبان ہے۔ اس لیے عوام کو حق حاصل ہے کہ وہ اردو کو اپنے قابو سے باہر نہ ہونے دیں۔ خواص کا بھی اردو پر حق ہے، لیکن نہ اس قدر کہ ان کی تخلیقات سے عوام بے بہرہ رہ جائیں۔ خواص گناہ کے مرتکب ہوں گے، اگر وہ اس ارادہ سے نہ لکھیں کہ عوام کو ان کی تحریروں سے براہِ راست جلد سے جلد اور زیادہ سے

---

[1] رسم الخط کے مسئلہ پر کسی شریف آدمی کو رسوا کرنے سے پہلے خط کشیدہ عبارت کا کم سے کم ایک بار ضرور ورد فرمالیجیے۔

زیادہ فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے۔ خواص کو یہ سمجھ لینا چاہیے وہ سماج کی ملکیت ہیں، اور یہ سماج کا حق ہے کہ وہ اس پر کڑی نگرانی رکھے کہ خواص سماج کی خدمت چھوڑ کر سموات سے تو کہیں رشتہ نہیں جوڑنے لگے ہیں۔ اردو کے پنڈتوں کو اردو کے پجاریوں سے ذرا ڈرتے ہی رہنا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ اردو کے ادبی ذخیرے میں سے انتخاب کر کے عام دلچسپی رکھنے والے شہ پاروں کو دیوناگری، رومن اور گورمکھی رسم الخط کا لباس پہنا کر ملک کے سامنے پیش کرنا چاہیے تاکہ اردو ادب کی صحیح قدر و قیمت واضح ہو، اور اس کے خلاف غیر ملکی ہونے کا جو الزام ہے وہ غلط ثابت ہو جائے۔

چوتھے یہ کہ اردو ادب نے قومی آزادی کی جدوجہد میں جو حصہ لیا ہے اس کو اجاگر کرنا چاہیے۔

پانچویں یہ کہ اردو ادب نے ہندستانی ماحول اور ہندستانی تہذیبی روایات کو جس حد تک اپنایا ہے اس کو واضح کرنا چاہیے، اور موجودہ دور میں اس بات کی خاص طور پر کوشش کرنی چاہیے کہ اس عنصر کا اضافہ ہو۔ ایسا ادب پیدا کیا جائے جو ہندوستان کے عام باشندوں کے لیے دلکش بھی ہو اور مفید بھی۔

چھٹے یہ کہ اردو کی قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ کتب خانے قائم کیے جائیں اور منتشر نوادر کو یکجا کیا جائے۔ مخطوطات کی فہرستیں مرتب ہونی چاہئیں۔ اردو کے فارغ التحصیل طلبا اس کام کو خاص طور پر اپنے ہاتھ میں لیں۔

ساتویں یہ کہ انجمن ترقی اردو کی تنظیم کو پھیلایا اور مضبوط کیا جائے۔ جگہ جگہ شاخیں قائم کی جائیں اور متحدہ طور پر اردو کی ترویج و ترقی کی کوشش کی جائے۔

آٹھویں یہ کہ اردو سکھانے کے لیے شبینہ مدارس اور دارالمطالعے قائم کیے جائیں۔

آخر میں مَیں کچھ مطالبات حکومت سے کروں گا، نہایت وقار اور اعتماد سے۔ وقار سے یوں کہ یہ بہار اور اتر پردیش کا ہمیشہ سے شیوہ و شعار رہا ہے۔ اعتماد اس لیے کہ حکومت کہیں باہر کی نہیں ہے، اپنی ہی ہے۔ اس وقت سوال یہی اور اتنا ہی نہیں ہے کہ فلاں بات کی گئی یا نہ کی

گئی تو حکومت کس کو منہ دکھا سکے گی، یا نہ دکھا سکے گی۔ بلکہ یہ سوال بھی اتنا ہی نازک پیچیدہ اور حل طلب ہے کہ فلاں بات کی گئی یا نہ کی گئی تو ہم اردو والے کس کو منہ دکھا سکیں گے۔ جمہوریہ میں حکومت کا وقار اور جمہور کا وقار ایک ہی چیز ہے دو نہیں!

اس کے بعد میں یہ عرض کردوں گا کہ بہار اور اتر پردیش میں کروڑوں کی تعداد میں ایسے انسان ہیں جو اردو کو اپنی مادری زبان مانتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کی تعلیم اردو کے ذریعے سے ہو۔ ہندوستان کے دستور اساسی کی رو سے یہ ان کا بنیادی حق ہے۔ سرکاری بیانات میں بھی یہ حق تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سرکاری اور نیم سرکاری مدرسوں میں اس اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ہم حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ محکمہ تعلیم کے افسروں اور اسکولوں کے منتظمین کو مجبور کرے کہ وہ اس حق کو عملی طور پر تسلیم کریں، اور جو مدارس اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہیں ان کے راستہ میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈالیں۔

دوسرے یہ کہ جن درجوں میں مادری زبان کی تعلیم لازمی ہے، ان میں اردو اور ہندی کو مساوی حیثیت حاصل ہو۔ جس کا جی چاہے ہندی پڑھے اور جس کا جی چاہے اردو۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کو ثانوی تعلیم کا لازم جزو بنایا جا سکتا ہے، لیکن اسی حد تک کہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں ہر طالب علم کے لیے ہندی کا امتحان پاس کرنا ضروری ہو۔ جو لوگ ہندی کو مادری زبان کی حیثیت سے نہ اختیار کریں ان کے لیے ہندی کا ابتدائی نصاب رکھا جائے۔

تیسرے یہ کہ سرکاری اعلانات اور بیانات اردو میں بھی شائع کیے جائیں تاکہ جو لوگ ہندی سے پوری واقفیت نہیں رکھتے وہ محروم نہ رہ جائیں۔

چوتھے یہ کہ دادرسی کے لیے عدالتوں اور آفسوں میں عرضیاں اردو میں بھی قبول کی جائیں، یہ بڑی غیرت اور عبرت کی بات ہے کہ ہم کو اپنے ہی دیس اور اپنی ہی حکومت میں یہ دن دیکھنا پڑے کہ ہمارے معصوم مادری زبان میں تعلیم نہ حاصل کرسکیں، اور ہمارے مظلوم مادری زبان میں فریاد نہ کرسکیں!

پانچویں یہ کہ پٹنہ اور الہ آباد کے ریڈیو اسٹیشنوں سے مناسب تعداد میں اردو میں تقریریں، خبریں، ریویو اور فیچر نشر کیے جایا کریں۔

چھٹے یہ کہ مقتدر حیثیت کا ایک گشتی انسپکٹر مقرر کیا جائے جس کے سپرد اس امر کی نگرانی ہو کہ ابتدائی درجوں سے لے کر ہائی اسکول تک اردو کی تعلیم کے لیے مناسب سہولتیں فراہم ہیں یا نہیں، یا کس قسم کی دقتیں کہاں پیش آ رہی ہیں جن کا دور کرنا ضروری ہے۔

ساتویں یہ کہ یہ کانفرنس دستور ہند کی Part XVIII, ChapterII, Regional Languages, Article 347 کی رو سے اس بات کی خواست گار ہے کہ اردو کو بہار کی علاقہ داری زبان قرار دیا جائے۔

(مطبوعہ 'علی گڑھ میگزین'، 52-1951)

خطبۂ افتتاحیہ

مشاعرۂ جشنِ جمہوریت، دہلی

24/جنوری 1964

جناب صدر، شرفائے ادب، خواتین و حضرات!

آپ نے طلب فرمایا، میں حاضر ہو گیا۔ عذر و معذرت میں شاعرانہ کسر نفسی تک کے آداب ملحوظ نہ رکھے! اب وسوسہ ہو رہا ہے کہیں ہم دونوں نے غلطی تو نہیں کی۔ عجلت میں 'ایجاب و قبول' اکثر مہنگا پڑتا ہے۔ بہر حال اب تو اس افتاد کو خوش و ناخوش انگیز کرنا ہی پڑے گا۔ شریفوں میں یہی دستور چلا آ رہا ہے۔ عام طور پر ایسی تقریبوں میں، جن سے ہم آپ آج گزر رہے ہیں۔ ایک طرف مہمان اپنی نااہلی و معذوری اور دوسری طرف میزبان کے لطف و کرم کا اعتراف کرتا ہے۔ یقین مانیے زبانِ حال سے میں بھی کر یہی رہا ہوں۔ لیکن اس وقت میرا حال اس حبشی طالب علم سا ہو رہا ہے جس کا پُر تپاک خیر مقدم انگلستان کی ایک مشہور دانش گاہ کی انجمنِ اتحاد میں کیا گیا تو اس نے شکریے کی جوابی تقریر میں کہا، صاحبو! آپ کے احسان و عنایت سے میرا عجیب عالم ہے۔

I AM BLUSHING ALL OVER, ONLY YOU CANNOT SEE IT.

میرا بھی یہی حال ہے۔ اس لیے آپ مجھے بھی اسی حبشی کی مانند سمجھیں، صرف اتنے سے فرق کے ساتھ کہ مجھے ہندوستان کا حبشی سمجھئے، جنوبی افریقہ کا نہیں! یہ اس لیے کہنا پڑا کہ آج کل دنیا کی غیر صالح سرگرمیوں میں 'ایں ہم بچۂ شتر است' کا ٹھپا بہت جلد لگا دیا جاتا ہے، کہیں میں نہ اس زد میں آ جاؤں!

صاحبو! جس منصب پر اور جس تقریب میں اس وقت آپ مجھے دیکھ رہے ہیں، وہ صرف آپ کے حکم کی تعمیل میں ہے ورنہ غالب کی زبان میں 'جام و سبو' کب کا توڑ چکا تھا، آسماں سے 'بادۂ گلفام' بھی برستا تو خاطر میں نہ لاتا، لیکن کیا کیجیے۔ آسماں سے بادۂ گلفام برسے یا نہ برسے، آسماں سے برقِ بے اماں اکثر گرا کرتی ہے۔ 'روسیاہ' ہونے نہ ہونے کے علی الرغم 'روئے سخن' مشاعرہ کمیٹی کے کرتا دھرتا، آپ کے اور میرے مکرم، گوپی ناتھ امنؔ کی طرف ہے۔ موصوف خود تو امن سے رہتے ہیں، لیکن دوسروں کے لیے بے اماں ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ تعلقات عامہ کو خوش گوار و استوار رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے! بہر حال ستم ہو یا کرم: ''می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست''

حضرات! یہ جانتا ہوں کہ اس عظیم الشان مشاعرے میں شعرائے کرام کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ نے زحمت اٹھائی اور جلسے کو رونق بخشی ہے۔ ایسے میں میرا حائل ہو جانا کوئی قابل فخر بات نہیں، لیکن اُمید کرتا ہوں کہ جس طرح آپ ان دنوں ٹھنڈ اور مہنگائی برداشت کر رہے ہیں، مجھے بھی انگیز کرنے کی کوشش کریں گے۔ شکر سے نہیں تو صبر سے کام لیجیے، تفریح میں تکلیف بھی کبھی کبھی مزا دے جاتی ہے۔ پھر بھی آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جو فرض مجھے سونپا گیا ہے اس کی جلد سے جلد خانہ پُری کر کے، اربابِ شعر و سخن کے لیے جگہ خالی کر دوں گا لیکن ایسا کرنے میں کچھ دیر ہو جائے تو آپ آزردہ نہ ہوں، یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں کہ آپ کو ایسے شخص سے ایسا کلام سننے کی مشق ہو جائے گی جو پسند خاطر نہ ہو! یہ مشق آسان نہیں، آتے آتے آتی ہے لیکن جب آتی ہے تو جمہور اور جمہوریت کے درمیان جو تفاوت ہے (اور کبھی کبھی یہ بہت زیادہ ہوتا ہے) وہ رفتہ رفتہ کم ہونے لگتا ہے اور دل سوزی و دانش مندی، احتیاط و انتظار سے کام لیا جائے تو بالآخر دور ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ مشق ہر قیمت پر ارزاں ہے۔

صاحبو! یہ جشن جمہوریہ کا سالانہ اردو مشاعرہ ہے۔ احباب جمع ہیں۔ 'التفاتِ دل دوستاں' میسّر ہے، دردِ دل، نہ کہہ سکوں یا مناسب پیرائے میں نہ کہہ سکوں اور جمہور و جمہوریت کے مشابہ کا شکار ہو جاؤں تو قابل عفو ہوں۔ ذاتی طور پر جو بات صحیح اور مناسب سمجھتا ہوں اسے کہہ ضرور دیتا ہوں۔ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا اثر ہوا یا نہیں۔ البتہ اس کا اطمینان کر لیتا ہوں کہ پولیس یا پریس کی زد پر تو نہیں ہوں! تو کہنا یہ ہے کہ ہم جتنے جمہور ہیں، ہم میں ابھی اتنی جمہوریت نہیں آئی ہے!

حکومت یقیناً جمہور کی یا جمہور یہ ہے جس کے لیے ہم آپ قابلِ تہنیت ہیں لیکن حکومت کے ساتھ جمہور کا بھی، جمہوریت نہاد ہونا از بس ضروری ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آج کی اس مبارک تقریب میں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے جمہور میں جمہوریت کا تصور کیا اور کتنا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک یہ اجتماع اتنا مشاعرہ نہیں ہے جتنا آزمائش! SO BEWARE

صاحبو! اگر آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں تو امید ہے آج شب وہ آداب ملحوظ رکھے جائیں گے جو ایسی تقریبوں میں قلعۂ معلّٰی اور 'حضرت دہلی' میں کبھی رکھے جاتے تھے، جس کی بازیافت کے لیے ہم ہر سال اس موقع پر اکٹھا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کبھی یہ مشاعرے مخصوص حلقوں میں، مخصوص آداب کے ساتھ منعقد ہوتے تھے۔ شعرا اور سامعین بھی منتخب ہوتے تھے۔ یہ مشاعرے ایک طرح کی آموزگاہیں ہوتی تھیں جہاں ہم حفظِ مراتب سیکھتے اور برتتے تھے۔ ان سے ہماری علمی و تہذیبی وقعت و وقار میں قیمتی اضافہ ہوا۔ استادی شاگردی کے رشتے قائم ہوئے جو تمام عمر اور نسلاً بعد نسلٍ شرف و سعادت کا سرچشمہ بنے رہتے۔

لیکن دوستو اور بزرگو! 'زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد' اب 'سلطانیِ جمہور' کا زمانہ ہے۔ اس لیے مشاعرے بھی اسی انداز کے ہونے لگے۔ لیکن بات تو پھر وہیں پہنچ گئی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ یعنی مشاعرہ جمہور کا ہے تو مشاعرے میں جمہوریت کی فضا بھی قائم رکھنا پڑے گی۔ بات صاف صاف ہی کیوں نہ کہہ دی جائے کہ آپ کو ہر شاعر کا ہر طرح کا کلام تحمل سے سننا پڑے گا۔ چاہے وہ شاعر یا اس کا کلام آپ کو پسند آئے یا نہ آئے۔ دوسری طرف شعرائے عالی مقام سے عرض کروں گا کہ وہ 'بازارِ مصر' میں آئے ہیں تو اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ 'کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں'! یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے کلام کی تصنیف پر تو ریاض نہ کیا ہو اور حاضرین سے تحسین نہ پانے پر آزردہ بھی ہوں کھلے بازار میں متاع کاسد کو فروغ نہیں ہوتا۔ شعر و ادب میں نہ Fair Price Shops ہوتی ہیں نہ Black Market۔

حضرات! اب ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جو ذرا تلخ ہے۔ اس پر شکر بھی نہیں چڑھا سکتا۔ اس لیے کہ سنتا ہوں اس نواح میں ان دنوں شکر رنجی تک کے لیے شکر مشکل سے ملتی ہے! وہ بات یہ ہے کہ اتنا شان دار اردو مشاعرہ جیسا کہ چند برسوں سے اسی لال قلعے میں منعقد ہوتا ہے کسی اور جگہ

نہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت میرے تصور میں ماضی کے وہ تمام تاریخی، علمی، تہذیبی اور سماجی مناظر اُبھر رہے ہیں جن سے یقیناً آپ بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ کتنے حسین و حزیں مناظر، ان کا تقاضا ہے کہ اس تقریب کے شایانِ شان ہمارے شعرا اپنی بہترین اور تازہ ترین تخلیق شعری، جن پر پورا سال اور بہترین توجہ صرف کی گئی ہو پیش کیا کریں۔ آپ یقیناً مجھ سے زیادہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے کلام سے اردو شاعری کس درجہ وقیع ہو جائے گی اور شعر و ادب پر ان شعرا کا کتنا بڑا احسان ہوگا۔ دوسری طرف یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے معرکے اور آزمائش کی تقریب میں کوئی شاعر اپنا پرانا یا معمولی کلام سنانے کی جرأت کیوں کر کرتا ہے اور سامعین سننا کیسے گوارا کرتے ہیں۔ کیسے مان لوں اور خاموش رہوں کہ شاعر ہوتے ہوئے وہ ایسا کر سکتا ہے۔ شاعر تو ملک اور قوم کی حمیت و آبرو ہوتا ہے۔ آخر وہ موقع کب آئے گا جب وہ اپنی بہترین شخصی و شعوری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا۔ تکلف برطرف اگر اسے اس کا احساس نہیں ہے تو اس کی جگہ اس محفل میں نہیں۔

صاحبو! مجھے شاعر کی صحیح یا غلط شہرت سے شاعری کی منزلت زیادہ عزیز ہے۔ کوئی شاعر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، شاعری اور سامعین کے ساتھ بے تکلفی برتنے کا حق نہیں رکھتا۔ بالخصوص ایسے مشاعرے میں جیسا کہ آج منعقد ہے اور ہر سال ہوتا رہتا ہے۔ یہ اتنا مشاعرہ نہیں ہے جتنا معرکہ ہے۔ اگر شعرا نے اس موقع پر جی چرایا یا سہل انگاری سے کام لیا تو میرے نزدیک انھوں نے ہمارے اور ہمارے شعر و ادب کے ساتھ غدّاری کی جس کو نہ ہم کبھی معاف کر سکتے ہیں اور نہ آنے والی نسلیں۔ میری اس بے باکی کو معاف کر دیجیے۔ غلط آدمی کا ایسے موقع پر انتخاب کرنے سے اسی طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔

اب ایک بات جنابِ صدر سے بھی کہنی ہے وہ یہ کہ ان کے فرائض میں ایک ناقابلِ رشک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ شاعر کو سامعین کی اور سامعین کو شاعر کی بے تکلفی سے بچاتے رہیں، دونوں کو ایک لطیفہ بھی سنانا چاہتا ہوں۔ ایک مشہور لیکن کسی وقت غیر متمدّن ملک میں ایک قاعدہ سا بن گیا تھا کہ وہاں کوئی گانے والا ہنر جتانے اور روزی کمانے کے لیے آتا تو سامعین بڑے شوق سے اس کا گانا سننے آتے، لیکن گانا پسند نہ آتا یا اُکتا جاتے تو بے تکلف اسے گولی مار دیتے۔ بالآخر تقریب کے مہتمم کو جلی حرفوں میں یہ کتبہ ڈائس پر لگانا پڑا، جس کے پہلو میں کھڑا ہو کر گانے والا 'عرضِ ہنر' کرتا۔

GENTLEMEN, DON'T SHOOT THE SINGER: HE IS TRYING HIS BEST.

کتبہ تو اس وقت فراہم نہیں ہو سکتا۔ امید ہے کہ گذارش کا سامعین لحاظ فرمائیں گے!

صاحبو! کچھ ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپ اب تک مجھ سے اکتائے نہیں۔ اس سے اپنے اور آپ دونوں کے بارے میں کچھ شبہ میں پڑ گیا۔ بہر حال جب آپ کا عفو و کرم اس حد تک پہنچ چکا ہے تو مجھے مزید بے تکلف ہونے کے جرأت ہو رہی ہے، کسی اور سے اتنی نہیں جتنی بانیانِ مشاعرہ سے وہ یہ کہ یہ مشاعرہ ہمارے ملک میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس لیے ہم کو زیادہ سے زیادہ اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ تجویز یہ ہے کہ ہر سال کے مشاعرے کی سرگذشت نہایت معروضی طور پر، شرح و بسط سے کسی مستند اہلِ قلم سے مرتب کرالی جایا کرے۔ مثلاً کون کون سے شاعر کہاں کہاں سے آ کر شریک ہوئے، ان کا فوٹو ان کی زندگی کی مختصر روئداد، کلام کا نمونہ، اس پر تبصرہ، سامعین پر کلام کا ردِّ عمل اس کے علاوہ مقتدر ادبی شخصیتوں کا جو شریکِ بزم ہوئے ان کے اسمائے گرامی اور مناسب تعارف، محفلِ مشاعرہ کی ترتیب و تزئین، دوستانہ، منصفانہ طور پر، دلچسپ و ادبی رنگ میں مرتب اور محفوظ کر لیے جایا کریں۔ اس پر یقیناً دو چار ہزار روپے صرف ہوں گے جس کا فراہم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ لیکن اس کے مقابلے میں اس نفع کا اندازہ کیجیے جو امتدادِ زمانہ سے اردو شعر و ادب کے سمت و رفتار کے سمجھنے میں حاصل ہوگا۔ اردو کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اردو کے قدیم ناقص اور نامکمل تذکرے بھی آج کتنے کم یاب لیکن مفید ہیں۔ اس لیے اس مشاعرے کی مکمل یادداشت آئندہ ہمارے لیے بڑا قیمتی سرمایہ ثابت ہوگی۔ اس پروگرام پر مناسب ردّ و بدل کے ساتھ ضرور عمل کیا جائے۔ اس طرح کے دستاویزوں سے قوم، ملک اور شعر و ادب کی ساکھ قائم ہوتی ہے۔

آخر میں اس دعا کے ساتھ سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں کہ آئندہ میری وجہ سے آپ اس آزمائش میں نہ مبتلا ہوں جس میں مجھے بھی مبتلا ہونا پڑا۔ اس اعتذار و اعتراف کے بعد نہایت خوشی اور فخر کے ساتھ آپ کے حکم کی تعمیل میں اس مشاعرے کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں۔ خدا ہماری مدد فرمائے۔ آمین!

●●●

(مطبوعہ جامعہ دہلی، مارچ 1964)

عزیزانِ ندوہ کے نام

30/ستمبر 1967 کو دارالعلوم سلیمانیہ ہال،

ندوہ میں پڑھا گیا

جنابِ صدر اور عزیزانِ ندوہ!

آج کی تقریب میں آپ مجھے یہاں دیکھ کر جتنی حیرت میں ہوں گے اس سے کچھ زیادہ ہی سراسیمہ میں ہوں۔ لیکن اُمید کرتا ہوں کہ اس کے ختم ہونے پر ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے بیگانہ یا بدگمان نہ رہ جائیں گے جتنے کہ ہیں۔ بعض عزیزوں اور بزرگوں نے مجھے یہاں حاضر ہو کر آپ سے گفتگو کرنے کی دعوت دی تو میرا پہلا ردِّ عمل فخر و انبساط کا ہوا۔ ایسا ردِّ عمل یا غلط فہمی بالعموم ان معصوموں کو ہوا کرتی ہے جو سفر کی آزمائش سے گزرے بغیر منزلِ مقصود پر پہنچ جایا کرتے ہیں۔ لیکن جس شدید مہنگائی کا ان دنوں سامنا ہے اس سے آدمی فاقے میں چاہے جب تک مبتلا رہے غلط فہمی میں زیادہ دیر تک مبتلا نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اپنی غلط فہمی کی مکافات سے بچنے کے لیے پسپائی اور فرار کے راستے تلاش کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ وطنِ عزیز کی بساطِ سیاست پر جس پیمانے پر اور جس انداز سے پسپائی اور پیش قدمی ہوئی ہے اس کے سبب سے سارے معلوم راستے مسدود اور غیر محفوظ ہو گئے ہیں اور کچھ دن یہی نقشہ رہا تو عجب نہیں.....اس لیے جہاں کا تہاں رہ گیا۔ جہاں اکثر رہا کرتا ہوں۔

میں نے سوچا کہ آپ سے ملوں گا تو کہوں گا کیا۔ کوئی اور جگہ یا لوگ ہوتے تو کہتا کہ میرے یا کسی اور کے کہنے سے جو مجھ سے بھی زیادہ گیا گزرا ہو آپ جلوس نکالیں اور کسی پارٹی، شخص یا نظریہ کی آڑ لے کر سامانِ آرام و حفاظت، عمارات، یادگاریں، پرائی ملکیت، وسائلِ نقل و حمل اور دس پانچ معصوم جانیں تباہ و تلف کرا دیں۔ گولی چلتی، جیل خانے کی آبادی بڑھتی

اور میں یا وہ پھولوں کے انبار اور نعروں کی گونج میں عزّت اور نفع کے منصب پر فائز ہو کر ملک وقوم کا محسن قرار پاتا۔ اس طرح اعلیٰ اقدار و روایات کو جن کی تکریم و تحفظ کی سعادت و ذمہ داری شریف اور دلیر نوجوانوں پر آتی ہے رسوا کر دیجیے۔ یہ میرے لیے بڑا آسان تھا۔ اس لیے کہ ہمارے طلبا کا مزاج اور طرزِ عمل ان دنوں جیسا رہا ہے اس میں اس طرح کی تحریک و تلقین بڑی کارگر ہوتی ہے، اور طلبا ہی پر نہیں موقوف جن کا اکثر فعل جوش اور ناسمجھی پر مبنی، اس لیے قابلِ درگزر رہوتا ہے۔ ہمارے سادھو سنت، مدرّس و معلّم، پولیس، ڈاکٹر، سرکاری و غیر سرکاری عملہ غرض نارمل زندگی اور حکومت کے لیے جن صحت مند عناصر و عوامل کو لازمی قرار دیا جاتا ہے ان سب کے کارنامے عالم آشکار ہیں۔

آپ مجھ سے آزردہ یا بدگمان نہ ہوں۔ جو شخص علی گڑھ میں تقریباً تمام عمر طالب علموں ہی میں رہا بسا ہو، اور علی گڑھ کو ان اعلیٰ اقدار و روایات کا محافظ اور منا د سمجھتا ہو جن کو میری طرح آپ بھی ایک عظیم ورثہ اور عظیم ترین ذمہ داری جانتے اور مانتے ہیں وہ طالب علموں سے بالعموم اور آپ سے بالخصوص کس طرح اور کتنی دیر تک بدگمان رہ سکتا ہے۔ اس بنا پر میں خدا ہی نہیں آپ کو بھی حاضر ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ ان دنوں ہمارے نوجوان جس طرح رُسوا ہوئے ہیں اور مشکوک مقاصد کا وسیلۂ کار بنائے گئے ہیں وہ ہماری تاریخ اور تہذیب کا نہایت درجہ تاریک اور دردناک باب ہے۔ سیاست اور تجارت میں چاہے جس طرح کی ناگفتنی روا رکھی جاتی ہو طلبا اور تعلیم گاہوں میں ہرگز ایسا نہ ہونا چاہیے۔ آج کے نوجوان کل اپنی نسل کے نوجوانوں کا سامنا اسی میراث یا ریکارڈ سے کریں گے؟ ڈرتا ہوں کہ آج کے لیڈر آپ سے جو سلوک کر رہے ہیں کل آپ وہی سلوک ان طلبا سے کریں گے جو آپ کی لیڈری کی زد میں آئیں گے۔ اس کے بعد آپ ہی سوچ لیں نسلاً بعد نسلٍ ہمارے وطن اور عزیزانِ وطن اور خود آپ کی شبیہ مبارک بین الاقوامی بازارِ مصر میں کیا ہوگی۔

بچپن میں کہیں پڑھا تھا کہ عربوں نے ایران پر فوج کشی کی اور اہلِ ایران حملے کی تاب نہ لا کر صلح کی گفتگو کرنے کے خواہش مند ہوئے تو ان کا سفیر عرب کیمپ میں امیرِ لشکر سے ملنے آیا اور کہا کہ شہنشاہِ ایران سے گفتگو کرنے کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیجو۔ امیر نے ادھر اُدھر

نظر ڈالی ایک بدوی اپنے گھوڑے کی مالش کرر ہا تھا۔ بُلا کر حکم دیا کہ شہنشاہِ ایران نے گفتگو کے لیے ہمارا نمائندہ طلب کیا ہے تم چلے جاؤ اور بات کر کے آجاؤ۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے تامل کیا پھر روانہ ہو گیا۔ واپس آیا تو سارے کیمپ کو یہ سننے کے لیے مشتاق و منتظر پایا کہ ایک بدوی عرب اور شہنشاہِ ایران میں کس سطح پر کیا گفتگو ہوئی۔ اس صحرانشین اور بادیہ پیما نے بتایا کہ امیر نے یہ خدمت سونپی، تو تھوڑی دیر کے لیے حواس گم ہو گئے کہ میں جاہل، کم حیثیت کس طرح اور کیا گفتگو کروں گا لیکن جلد ہی سنبھل گیا اور سیدھا شہنشاہ کے دربار میں پہنچا۔ شہنشاہ نے پوچھا، 'تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟' میں نے کہا کہ صرف اس کا اقرار کہ'' خدا ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔''

یہاں اس پاک اور بے لاگ کلمہ پر کوئی طویل مذاکرہ مقصود نہیں ہے اس لیے کہ اس پر آپ کا ایمان و عمل دونوں میرے ایمان و عمل سے زیادہ قوی اور معتبر ہے۔ مجھے آپ کے سامنے حاضر ہونے کی جو ہمت ہوئی وہ مدرسہ یا معمل میں دریافت کیے ہوئے کسی نظریے یا تجربے کی خبر دینے یا اس کی وضاحت کرنے کے سلسلے میں نہیں ہے بلکہ اس کی بنا تمام تر اس اعرابی کے ایمان و ایقان کے طفیل ہے جس کے عملی ذہن نے زندگی کے مشکل سے مشکل چیلنج کو قبول کرنے کی ہم کو بشارت بھی دی ہے اور راستہ بھی دکھایا ہے۔ زندگی کی جن نامرادیوں میں آج ہم گرفتار ہیں اس کا سبب ان ہی دو حقیقتوں سے انحراف کے سبب ہے۔ سیاست کیوں خوار ہے۔ معیشت و معاشرے میں کیوں ابتری ہے، شعر و ادب میں انتشار و ابتذال کہاں سے آیا، نوجوان کیوں بددل اور برہم ہے، قومیں کیوں ایک دوسرے سے بدگمان اور برسرِ پُرخاش ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی جو ہم کو امانت اور انعام کے طور پر سپرد کی گئی تھی آج کیوں ناقابلِ برداشت بن گئی ہے۔ اس طرح کے مسائل پر مجھ سے بہتر بے شمار لوگوں نے سوچا ہے۔ اس کے اسباب اور علاج بھی بتائے ہیں۔ طرح طرح سے اور مختلف سطحوں پر اس کا ماتم بھی کیا ہے، لیکن کسر صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ آلام و آزار کے اسباب و عمل بتانے پر ہر شخص خطبۂ صدارت دینے کے لیے تیار ہے، انسداد کی تدابیر اور مریض کی دیکھ بھال کے لیے کوئی آمادہ نہیں۔ جیسے تائب ہونا ہمارا فرض ہو اور تجارت کرنا آپ کا حق۔ جمہوریۂ فلاطوں کے بارے میں پڑھا یا سُنا ہے کہ اس

میں ہر شہری کو آزادیٔ گفتار یا زبان درازی کا حق حاصل تھا۔ ہماری جمہوریہ میں زبان درازی کے علاوہ دست درازی سے بھی سابقہ ہے۔ اسی طرح شعروادب میں تنقید وتنقیص کے آلاتِ حرب وضرب سے ہر چھوٹا بڑا مسلّح ہے۔ بڑا کم چھوٹا زیادہ۔ لیکن تخلیق وتعمیر کی عبادت وریاضت سے مستغنی یا معذور۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمہ 1857ء کے بعد ہندوستان میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ جس کے آثار بہت پہلے سے نمودار تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں انگریزی حکومت اور مغربی فکر و نظر کی گرفت میں آئے۔ ہندوؤں نے اس مصلحت اندیشی اور عاقبت بینی سے کام لیا جس نے تاریخ کے ہر نازک یا سنگین موڑ پر ان کی دست گیری و رہنمائی کی تھی اور نفع پہنچایا تھا، دوسری طرف نئے دور کے لائے ہوئے قریب و بعید کے نہایت درجہ اہم امکانات سے مسلمان کلیتہً بیزار و بے اعتنا رہے۔ تقاضائے روزگار سے بالعموم اور جدید تعلیم سے بالخصوص بیگانہ رہ کر جس فلاکت ونکبت کے شکار ہوئے اس داستانِ عبرت والم کا اظہار حالؔی کے دو مصرعوں میں ہوتا ہے:

1۔ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے!

2۔ اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے!

ان میں جو بات جس کرب سے کہی گئی ہے اس کا احساس کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حالؔی کی منزلت اور ان کے غم کی عظمت سے واقف ہیں۔ ان ناسازگار و نازک حالات میں دیوبند، علی گڑھ اور ندوہ کا قیام عمل میں آیا، خدا ان عاشقانِ پاک طینت پر رحمت کرے جن کی ہمت، ہمدردی اور احساسِ ذمہ داری سے یہ ادارے وجود میں آئے۔ ان کی بیش بہا خدمات سے ہماری حالت سدھری، رسوائی اور کسم پرسی کے دن دور ہوئے اور ہم عزّت وآزادی سے زندگی بسر کرنے اور ملک وملّت کی خدمت بجالانے کے قابل ہوئے۔ ان اداروں اور ان کے عظیم المرتبت بانیوں کی بیش بہا خدمات کی تفصیل پیش نہیں کرنا چاہتا۔ ان کے آئندہ رول کو سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

دیوبند کا بنیادی مقصد دینی اور مذہبی تعلیم وتربیت رہا ہے۔ علم دین کی تحصیل میں طلبا کو حتی الوسع ہر ممکن سہولت فراہم کرنا اور شروع سے اب تک اپنی اس خصوصیت کو برقرار رکھنا دیوبند کا

ایسا کارنامہ ہے جو مسلمانوں کے عہد کی علمی و تعلیمی روایت کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ جو مقاصد اس کے پیشِ نظر رہے اور اب بھی ہیں ان کے مناسب و مبارک ہونے میں شک نہیں۔ کیسے کیسے جلیل القدر علما اور شخصیتوں کا اس پر سایہ رہا ہے اور اس کے ممتاز فارغ التحصیل طلبا نے ادارے کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ البتہ دنیوی علوم وفنون کی تعلیم کا انتظام اتنا اور ایسا نہیں ہے جن کو موجودہ حالات کے پیشِ نظر خاطر خواہ کہا جاسکے۔ اس سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہے، لیکن ضمناً یہ عرض کرنا بے سود یا بے محل نہ ہوگا کہ دیوبند جن حالات میں وجود میں آیا اب وہ بدل چکے ہیں۔ آج دینی تعلیم کا معیار و مقصد وہ نہیں ہے جو اب سے سو پچاس سال پہلے تھا۔ مذہبی تعلیم کی اہمیت مسلّم، لیکن آج جس دورِ حیات سے ہم گزر رہے ہیں اس میں مذہبی تعلیم اسی وقت مقبول اور مفید ہوگی جب اس سے ثواب پانے کے علاوہ معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے بھی مواقع حاصل ہوں۔ یعنی ثواب کمانے کے ساتھ روٹی کمانے کی بھی گنجائش نکلتی ہو اور روٹی بھی وہ نہیں جس کا لین دین محض ثوابِ دارین کے پیشِ نظر ہو۔ آج دیوبند کے طالب علم بھی کسی نہ کسی حد تک اس کے آرزومند ہوں تو عجب نہیں کہ دوسرے طلبا کی مانند ان کے رہن سہن کا، مستقبل کی توقعات کا، معاشرے میں پُرسش و التفات کا معیار یکساں نہیں تو اس تفاوت کا بھی نہ رہے جو اب تک رہا ہے۔ دیوبند میں دینی اور مذہبی تعلیم جن مقاصد کے پیشِ نظر دی گئی وہ آج بیش تر طلبا کو زندگی کے وسیع میدان میں دور تک نہیں لے جاتی۔ معاشرے میں بالعموم ان کی وہ منزلت نہیں جو کہ ہونی چاہیے۔ ان حالات میں وہ کوئی ایسی خدمت انجام نہیں دے سکتے جس کے صلے میں ان کو مناسب آرام و احترام کی زندگی بسر کرنے کے امکانات میسّر آئیں اور اس طرح وہ ہمارے معاشرے کے فروغ و استحکام میں معین ہوں۔

کسی ملک یا قوم کا اعتبار و اقتدار اس پر منحصر نہیں ہے کہ اس کے پیرو کس تعداد اور کتنے وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں یا اقوامِ متحدہ میں ان کی نمائندگی کتنی ہے۔ ان کا مدار اس پر ہے کہ اس کے افراد کی ذہنی و اخلاقی سطح کیا ہے اور زندگی کی تبدیلی اور تقاضوں سے دوچار ہونے اور ان کو گرفت میں لانے اور رکھنے کے لیے جس دلیری اور دانش مندی، نیز قومی سیرت و شعار کی

جس پختگی اور بلندی کی ضرورت ہے اس کی روایات کیسی ملتی ہیں۔ طاقت کا مدار تعداد پر اتنا نہیں رہ گیا ہے جتنا وزن اور وقعت پر، گو ایسی حکومتیں اور قومیں بھی ہو سکتی ہیں جو تعداد کو ہر بات پر ترجیح دیتی ہیں۔ یہ یا تو سادہ لوح ہوتی ہیں یا سفاک کبھی کبھی دونوں۔ دوسرے یہ کہ موجودہ زمانے میں جو روز بروز ہمہ گیر و سخت گیر ہوتا جاتا ہے ہم کو ہرگز یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ ہمارے طلبا کا معیار زندگی تو کرّیما اور بامقیماں کا ہو، لیکن کارنامے وہ انجام دیں۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے یا معیارِ زندگی کے بلند ہونے کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ جسم کی راحت و عافیت کا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ذہنی اور اخلاقی استواری و بلندی بھی نصیب ہو۔ بہ صورت دیگر معیار زندگی کا بڑھنا نہیں گھٹنا متصور ہوگا۔ یہ اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ ہم اپنی ترقی کے پچھلے بیس سال پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہماری معاشی زندگی کی عام سطح خاصی بلند ہوئی ہے لیکن اس کے اعتبار سے ہماری اخلاقی اور تہذیبی زندگی کا معیار قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ دیوبند کے بانیانِ کرام نے جو مقصد پیشِ نظر رکھا تھا اس پر نظرِ ثانی کی جائے یا نہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ حالات وہ نہ رہے جو پہلے کبھی تھے۔ علوم بدل ہی نہیں چکے ہیں بلکہ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ دن بدن بے شمار علوم کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے، نئے نئے علوم بڑی تیزی سے پرانے ہونے لگے ہیں۔ علوم بدلیں گے تو زندگی کس طرح ساکن رہے گی۔ طالب علم کا اوڑھنا بچھونا علم ہے اس لیے ان کو اچھا طالب علم اور حوصلہ مند نوجوان بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ان کی زندگی کو جہاں تک ہو سکے بہتر بنایا جائے۔ ہم کو پدر اور پسر کے اس نازک اور اہم رشتے کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا جس کی طرف غالبؔ نے اشارہ کیا ہے، یعنی ''ہر کس کہ شُد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد۔'' دیوبند علی گڑھ یا ندوہ اس صورت حال کو پسند کرتے ہوں یا نہیں علم و فن اور ان کے لائے ہوئے ذہن اور معاشرے کے مطالبات سے دور اور محفوظ نہیں رکھے جا سکتے۔ اس نازک اور آتش گیر موضوع پر جتنی اور جس طرح کی گفتگو کر چکا ہوں اگر بارِ خاطر ہوئی ہو تب بھی ذہن میں محفوظ رکھیے گا ممکن ہے اس صحبت میں اس طرح کی حادثے پیش آتے رہیں۔ میں آپ سے سب کی اکٹھی معافی مانگ لوں گا۔ آپ کو اس کا حق بہرحال رہے گا کہ آپ معاف نہ کریں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اصلاً ایک دنیوی ادارہ ہے۔ تعلیمی علمی اور تہذیبی زیادہ، دینی کم، بہت کم۔ سرسید نے مسلمانوں کی عبرت ناک پس ماندگی اور مسابقت کے رستاخیز کا سامنا کرنے کی ان میں کوئی سکت یا صلاحیت نہ پا کر نیز مستقبل میں ان کے لیے کوئی باعزت مقام نہ دیکھ کر تعلیم کو وسیلۂ نجات بنایا۔ سرسید کی وسعتِ نظر، دانش مندی، انسانیت دوستی اور بے پایاں عزم و استقامت نے اس ادارے کو ہندوستان میں مشرق و مغرب کی اعلیٰ روایات، اعلیٰ امکانات اور اعلیٰ عزائم کا سمبل یا نشان بنا دیا۔ علی گڑھ نے ہمارے اندازِ فکر اور طریقِ عمل کو جس طرح گذشتہ نوّے سال میں مسلمانوں اور ملک میں ساتھ رہنے، بسنے والوں کے بہترین مقاصد کو سامنے رکھ کر موڑا، سُدھارا اور سنوارا اور تعلیم و تہذیب کے تقاضوں کو پورا کیا ہے، ہندوستان کے کسی دوسرے ادارے نے نہیں کیا۔ سرسید کی واقعیت پسندی حیرت انگیز تھی۔ ایسی واقعیت پسندی جو ڈسپلن سے پیدا ہوتی ہے اور ڈسپلن میں معین ہوتی ہے۔ سرسید کے بارے میں اپنے اس خیال کا ایک موقع پر اظہار کر چکا ہوں کہ اگر وہ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں جب اقتدار و اعتبار کی جگہ بدبختی و بدنظمی نے لے لی تھی حکومت کو سنبھالنے کی ذمہ داری کسی نہ کسی حیثیت سے سرسید کے ہاتھ میں آجاتی تو کیا عجب اس کو یک بہ یک و یکسر وہ انجام نہ دیکھنا پڑتا جو ہمارے سامنے آیا۔ سرسید بادشاہِ دہلی کے مقتدر و محترم متوسلین میں تھے۔ چنانچہ عزلِ سلطنت کے بعد سرسید کے سامنے بادشاہِ دہلی یا قلعۂ معلیٰ کے بارے میں کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ذی حیثیت ہوتا، ذرا بھی ناسزا گفتگو کرتا تو غصہ و غیرت سے سرسید کا چہرہ سُرخ ہو جاتا اور یہ عالم دیکھ کر گفتگو کرنے والا نادم اور خاموش ہو جاتا۔

تعلیمی اور علمی اعتبار سے سرسید نے علی گڑھ کو مغرب کی اعلیٰ درس گاہوں کے نمونے پر قائم کیا۔ قومی اور تہذیبی مقاصد کے پیشِ نظر انھوں نے ہندوستان میں صدہا سال کے مسلم و غیر مسلم اتحاد و ارتباط کو ملحوظ رکھا اور اسے فروغ دیا۔ سیاست میں انھوں نے انگریزی حکومت سے توافق و تعاون کیا اس لیے کہ اس وقت کے عام حالات اور مسلمانوں کی خاص معذوریاں اس کی متقاضی تھیں۔ اس کے خلاف کرتے تو اس وقت کا حال دیکھتے ہوئے مسلمان اس نامرادی و درماندگی میں اور زیادہ مبتلا ہو جاتے اور معلوم نہیں کب تک رہتے جس سے نکال کر سرسید نے ان

کوعزت و اعتماد کے راستے پر کھڑا کر دیا تھا۔ انصاف سے دیکھیں تو ان لوگوں نے بھی جو کافی خوش حال تھے اور جن سے انگریز اور انگریزی حکومت کو مطلق کوئی پُرخاش نہ تھی۔ انھوں نے زندگی کے ہر کاروبار میں انگریز اور انگریزی حکومت اور انگریزی تجارت میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مذہب کی طرف سے سرسید کا کیا رویّہ تھا اس پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور زیادہ تر سخت وسُست کہا گیا ہے۔ مذہب کا میرا علم قابلِ اعتبار نہیں ہے اس بدوی کے مانند جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں صرف اللہ اور اس کے رسول کو جانتا ہوں ان پر بحث نہیں کر سکتا۔ ان کو سامنے رکھ کر کھوٹے کھرے میں تمیز کر سکتا ہوں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ سرسید نے مذہب کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ بلکہ وہی باتیں دُہرائی ہیں جن کو کسی نہ کسی پیرائے میں گذشتہ مفکرین اسلام بیان کر چکے ہیں۔ بایں ہمہ سرسید کی واقعیت پسندی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے مدرستہ العلوم کے اعلیٰ مقاصد کو خطرے میں پایا تو اس سلسلے کو ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کمیٹی کے ممبر تک نہ رہے جس کے سپرد شعبۂ دینیات کا انتظام تھا۔

سرسید نے مذہب کے بارے میں جو کچھ کہا یا کیا اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے مسلمان اپنی پستی و درماندگی پر غور کرنے اور مناسب تدابیر عمل میں لانے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ مذہب کے جامد تصور اور تقلید سے یہ یقین کرنے لگے تھے کہ مشیت الٰہی وہی اور اتنی ہی تھی جس میں وہ گرفتار تھے۔ انگریز سے ملنے اور انگریزی سیکھنے سے مذہب زندگی اور تہذیب تینوں کے زیاں کا اندیشہ تھا۔ سرسید نے کلامِ پاک کی تفسیر نیز دوسرے مضامین لکھ کر مسلمانوں کو غلط اور نقصان دہ تصورات سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ سرسید کی تحریریں ان کے فرمودات اور ان کا لائحۂ عمل جیسے رہے ہوں اس میں شک نہیں، انھوں نے مسلمانوں کو آئینۂ ایام میں ان کی صحیح تصویر دکھا دی اور اس طرح دکھائی کہ ان کی تقدیر بدل دی۔

ہر زمانے میں اس کے مخصوص تقاضوں کے پیشِ نظر علمائے ملّت کو یہ نازک اور دشوار ذمہ داری محسوس ہوئی ہے کہ وہ امور دین کو اس عہد کے ذہنی سطح کے مطابق لوگوں پر واضح کریں۔ ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور اس صورت حال میں اس طریقۂ کار کے صحیح و صائب ہونے میں کلام نہیں، اس سے کلامِ الٰہی اور فرمودات نبوی کے بنیادی تصورات میں کوئی فرق نہ آیا اور

اُمت مسلمہ تازہ دم وتازہ کار ہوتی رہی۔ پھر اسی عہد اور جماعت نے دوسرے عہد اور اُمت کے لیے جگہ خالی کی اور نئی تعبیر و توضیح کا وہی عمل بروئے کار آیا جو پہلے آیا تھا۔ اس طرح مذہب اور زندگی برابر ہم دوش و ہم عناں آگے بڑھتے رہے ہیں اور امور دین میں کوئی خلل نہ آیا۔ ہر آشوب و آزمائش سے مسلمانوں کے کامیاب و کامراں گزرنے کا یہی نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ سرسید کے عہد کے طلبا کا مذہب و مغرب کا تصور آج کے طلبا کے مذہب و مغرب کے تصور سے مختلف نظر آئے گا۔ لیکن یہ اختلاف نہ رجعت پسندی کا ہے نہ انتہا پسندی کا، بلکہ نارمل اور معاشرے کے تقاضے کے مطابق ہے۔ امور دین اور اس کے مصالح و مضمرات پر غور کرنے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش غیر مستحسن نہیں ہے۔ البتہ یہ انداز فکر کہ کلامِ پاک جب ہمارے لیے اُتارا گیا ہے تو ہماری رائے بھی کیوں نہیں لی گئی درست نہیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ کو اس کا اندیشہ رہا ہو کہ ایسا کیا گیا تو ہم اس میں اختلافی نوٹ کا اضافہ کرنے پر اصرار کریں گے۔ تاویل و تعبیر سے گھبرانا نہ چاہیے نیت بخیر رکھنا چاہیے۔

دین کی معرفت یا اس سے محبت یا اس کا سائنٹفک ہونا یا نہ ہونا اس کو نہیں کہتے کہ اس میں مصلحت و مفاہمت ابداع و اجتہاد یا انفرادی و شخصی تاویل اور مداخلت کی زیادہ سے زیادہ کتنی گنجائش نکالی جاسکتی ہے، اور اس انداز فکر یا طریقِ کار کا جواز یہ قرار دیا جائے کہ آپ یا میں موحد، صوفی یا سیکولر، عقلیت دوست، لبرل، روایت شکن یا کوئی عجوبۂ روزگار نیشنلسٹ ہیں۔ دین و مذہب یا کلام اللہ اور حدیث نبوی میں تفکر کے آداب اور ان پر عمل علوم و فنون میں تفکر کے انداز اور ان پر عمل کرنے سے قطعاً جدا ہیں جس پر گفتگو کو آگے بڑھانا یہاں مقصود نہیں ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ہر عہد کی ذہنی و اخلاقی سطح پر مذہب موضوعِ گفتگو رہا ہے۔ اس سے اس میں رخنہ کوئی نہیں پیدا ہوا استواری برابر آئی ہے۔ اسلام ہر طرح کے حالات و حوادث سے گزرا ہے اور برابر گزرتا رہتا ہے۔ اس امر خاص میں دنیا کا شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس کا مدِ مقابل ٹھہرے، لیکن بحیثیت مجموعی کلام پاک اور حدیثِ نبوی کے مستند اور موثر ہونے میں کوئی فرق نہ آیا۔ دین نہیں بدلتا زندگی بدلتی رہتی ہے۔ اسلام کی منزلت اس سے منسوب تہذیب و کلچر میں نہیں بلکہ اس کی تعلیم و تربیت کے اصول بالغہ یعنی اس کے اوامر و نواہی سے متعین ہوتی ہے۔ تہذیب و کلچر

زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں مذہب اپنے اوامر ونواہی میں ہمیشہ ثابت وسالم کارآفریں اور کارکشار ہتا ہے۔

قومی زندگی میں جب کوئی مشکل مقام آئے گا ہم کو سرسید کے صحیفۂ خدمات کی ورق گردانی کرنی پڑے گی اور سرسید کی خدمات کی سب سے کھلی ہوئی اور سب سے مستند کتاب علی گڑھ ہے۔

اس وقت دیوبند، علی گڑھ اور ندوہ پر اظہار خیال کرنے کا مقصد دراصل آپ کو اور آپ کے ادارے کو چند بڑے اہم تقاضوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔ میرے نزدیک ندوہ کی حیثیت دیوبند اور علی گڑھ کی خلیج پر ایک پُل کی ہے جس کے بغیر دونوں ایک دوسرے کے تعاون اور تعمیری صلاحیتوں نیز ایک دوسرے کے رنج وراحت یا نفع وضرر کے احساس سے بیگانہ رہے ہیں۔ اب تک دیوبند علی گڑھ اور ندوہ ایسے جزیروں کے مانند رہے ہیں جو کسی وسیع سمندر میں دور دراز فاصلے پر واقع ہوں اور دونوں کے رہنے بسنے والے آب وہوا اور گردوپیش ہی نہیں بلکہ ان کے آسمان وزمین تک مختلف ہوں۔ علمی تعلیمی اور تہذیبی اداروں میں جن کا ایک دوسرے سے رابطہ زیادہ سے زیادہ اور ہمہ وقت کا ہونا چاہیے۔ یہ دوری اور علاحدگی کسی طرح مناسب نہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی روز افزوں سے جغرافیائی دوری بڑی تیزی سے گھٹتی جارہی ہے۔ جغرافیائی بُعد کم ہوگا تو ذہنی، اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی فاصلے بھی کم سے کم تر ہوتے جائیں گے اور معیار زندگی میں زیادہ تفاوت باقی نہ رہے گا۔ اس انقلاب سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے اس لیے اور کہ آپ اور آپ کے ادارے کو ہماری ذہنی، اخلاقی اور مذہبی صلاح وفلاح کی قیادت سونپی گئی ہے۔ اب کتابوں ہی پر نہیں ہوا کے رُخ پر بھی نظر رکھنی پڑے گی تاکہ زندگی کے بحرِ طوفاں خیز میں تعلیم وتربیت کی کشتی کو آپ صحیح رُخ ورفتار دے بھی سکیں، اور چلا بھی سکیں۔ آپ کی حیثیت خیر سگالی کے اعلیٰ سفارت خانے کی ہے۔ دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان نہیں بلکہ دوسرے اداروں کے درمیان بھی جن کے سامنے کم وبیش وہی پروگرام ہے جو ان تینوں اداروں کے سامنے ہے اور رہا ہے۔

اس کے لیے چند باتیں ضروری ہوں گی، مثلاً علم وفن اور فکر ونظر کے اعلیٰ معیار کے ساتھ سیرت وشخصیت کی گراں مائیگی۔ یہ صفات موجود ہوں تو دنیوی اور ظاہری جاہ ومراتب کی

اہمیت نہیں رہ جاتی۔ ان صفات کی سطح پر آپ بڑے سے بڑے معرکوں میں ممتاز رہ سکتے ہیں۔ اس کی مثال علی گڑھ ہے جہاں معلوم نہیں کتنے 'چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہ' کے مناظر دیکھے جا چکے ہیں اور دیکھے جاتے رہتے ہیں، لیکن اس کے دل میں جو منزلت، اصحابِ فکر و فن اور اربابِ صدق و صفا کی ہے اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ علم متلاشی، اخلاق کا نمونہ اور تہذیب کے نمائندے کی حیثیت سے آپ کی پذیرائی علی گڑھ میں دونوں اداروں کی اعلیٰ روایات کے شایانِ شان ہوگی۔ ایسے اداروں کی اہمیت و فضیلت کی بنا پر ان کے طلبا اور اساتذہ کی ذہنی بلندی اور عقیدہ اور کردار کی محکمی پر رہی ہے۔ ندوہ کی شہرت اور ساکھ جتنی آج مسلّم اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اس سے پہلے نہ تھی۔ پہلے کے مقابلے میں موجودہ زمانہ کہیں زیادہ پیچیدہ، سخت گیر، گریز پا اور ناقابلِ تسخیر ہے اس لیے جب یہ دیکھتا ہوں کہ گذشتہ ندوہ کے مقابلے میں آج کا ندوہ باوجود ان تمام دشواریوں اور نزاکتوں کے جن کا آپ کو سامنا ہے، اپنے مشاغل و مقاصد سے مطمئن ان کی بجا آوری میں منہمک اور دور دور تک اربابِ علم و فضل کی نظروں میں معتبر و محترم ہے تو ہماری نظر ادارے کے موجودہ سردار و سفیر مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ موصوف ندوہ ہی کے نہیں بلکہ ملک کے عام مسلمانوں کے اخلاقی اور تہذیبی سفیر ہیں۔ بذاتِ خود میں ان کو ہندوستان کے مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر سمجھتا ہوں۔

علی گڑھ کو سامنے رکھ کر (اور کب وہ میرے سامنے نہیں رہتا!) میں کچھ اس طرح سوچنے اور سمجھنے لگا ہوں کہ جب تک سیادت یا لیڈرشپ اعلیٰ تعلیم گاہوں کے آزاد، آزمودہ کار، دردمند اور دلیر سربراہوں کے ہاتھ میں رہے گی ملک کے نوجوان کبھی بے راہ روی کی طرف مائل نہ ہوں گے۔ اس موضوع پر عالمانہ اور ماہرانہ گفتگو کرنے کی مجھ میں نہ صلاحیت ہے نہ خواہش صرف محسوس کرتا ہوں کہ طالب علم کی ذہنی اور اخلاقی تربیت معلّم ہی کر سکتا ہے اور جہاں طالب علم صحت مند ہے وہاں کا معاشرہ معتبر و مستحکم ہے۔ ایسے معاشرے سے ملک کی حکومت کا اعتبار قائم ہوتا ہے اور اس میں استحکام آتا ہے۔

تعلیم، مذہب اور اخلاق پر عالمانہ و ماہرانہ گفتگو کرنے کا میں اہل نہیں بالخصوص آپ عزیزوں اور بزرگوں کے سامنے۔ اس عذر کو میری کسرِ نفسی پر ہرگز نہیں میری دانش مندی پر محمول

کیجیے۔ لیکن یہ وہ مباحث ہیں جن پر عالم ہی نہیں عامی کے تجربات کو بھی قابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے عالم علمی حدود سے آگے نہ بڑھ سکے۔ عامی ان مسائل کو نہیں تو ان کے متعلقات کو زندگی کے ہر نیچ اونچ میں دیکھ اور برت چکا ہوتا ہے۔ میں پھر وہیں سے شروع کروں گا جہاں سے ابتدا کی تھی۔ یعنی تعلیم ہو یا مذہب و اخلاق ان سب کا محور اسی بدوی کا کہنا ہے جس کا ذکر آ چکا ہے یعنی اللہ اور اس کا رسول بالفاظ دیگر اعلیٰ ترین اقدار کے پیشِ نظر اعلیٰ ترین انسان کی پیروی، یوں بھی کہہ سکتے ہیں، اعلیٰ اقدار کی پیروی سے اعلیٰ انسان بننے کا عزم و عمل، اس لیے کہ صرف اعلیٰ انسان ہی اعلیٰ اقدار کا نمائندہ اور نمونہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ اقدار سمجھ ہی میں آتے ہیں، اعلیٰ انسانوں کے کردار سے۔ اس لیے مسلمانوں کے ہاں عبادت سے زیادہ اعمالِ حسنہ پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی عبادات سے سرِمُو انحراف کیا جائے۔ یہ تاکید اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ان صوفیوں، قلندروں یا فقیروں اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کو قابل احترام یا اعتنا نہیں سمجھتا جو مقررہ عبادات کی ڈسپلن میں اپنے لیے ڈھیل ڈالنا جائز سمجھتے ہیں۔ ایسے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ بخش دے تو اس کی مرضی، لیکن رسالت مآب کی چھوڑی ہوئی دنیا میں وہ کبھی نہ بخشے جائیں گے۔ تعلیم کا ماحصل اعمالِ حسنہ ہی تو ہیں اور اعمالِ حسنہ ڈھونڈنے چاہے جہاں جائیں، ملتے وہ انسانوں ہی میں ہیں۔ کیا تعجب دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو تمام زندگی وقفِ عبادت و ریاضت دیکھ کر اسلام نے عبادت کے بجائے نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق پر زور دیا ہو۔ خدمتِ خلق کے تحت وہ تمام انسانی افعال آ جاتے ہیں جن سے نہ صرف ہر شخص ایک دوسرے کے دکھ درد میں حسب مقدور شریک ہوتا ہے۔ بلکہ بحیثیت مجموعی وہ افعال انسان کی بہتری و برتری کے کاموں میں معین ہوتے ہیں۔ ہمارے آپ کے عقیدے کے مطابق اعمال حسنہ کا سب سے اعلیٰ اور عظیم نمونہ رسالت مآب کی ذات اقدس ہے۔ اقبالؔ کا یہ کہنا کہ ''اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی ست'' اسی حقیقت کا اظہار ہے جو عبادت خدمتِ خلق سے عاری ہو وہ عمر رائیگاں ہے۔

دنیا کا جتنا علم و فن ہے جس کے طرح طرح کے مظاہر ہمارے سامنے ہیں اور برابر آتے رہتے ہیں ان کا سرچشمہ براہِ راست یا بالواسطہ مذہب رہا ہے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے

جس کا مبلغ یا ہادی نمائندہ یا نمونہ انسان نہ ہو۔ اس سے بحث نہیں کہ ہم آپ اس مذہب کے بانی کو مانتے ہیں یا نہیں۔ اس بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ ہمارا فعل خواہ ذوق و ذہن کے کسی تقاضے سے تعلق رکھتا ہو، کچھ اور نہیں تو مذہب و اخلاق کی نفی یا اس کی تضحیک نہ کرتا ہو۔ اسے نیک نیتی یا دانش مندی یا خوش ذوقی پر محمول نہیں کیا جاسکتا، اگر آپ مذہب و اخلاق کا تجزیہ کرتے کرتے وہاں پہنچ جائیں جہاں انسان انسان نہیں رہ جاتا بلکہ عملاً بہائم میں شمار ہونے لگتا ہے جہاں سے ترقی کرکے پیغمبروں اور ہادیوں ہی کی مدد سے نہیں بلکہ خود سائنس کے تصرف سے انسانیت کی منزل تک پہنچا ہے۔ ارتقا کا نظریہ بھی تو سائنس ہی کا دیا ہوا ہے۔ مذہب سے یہاں مراد وہ اعتقاد اور عمل ہے جو ہم کو ادنیٰ اغراض کا بندہ نہیں اعلیٰ اقدار کا نمائندہ بنائے۔ اس امر کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ آج کل کے اکثر معیاری و معتبر تنقید نگار سائیکالوجی اور بائیلوجی کے دیے ہوئے نظریات اور اس سیاسی و سماجی ہلچل کے پیشِ نظر جس نے معیشت و معاشرت دونوں کو یکسر تہہ و بالا کر رکھا ہے، انسانی عقائد و اعمال کا کھوج لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس تلاش میں وہ انسان کی ابتدا یا اسفل ہی کی طرف سفر کرتے ہیں، جہاں انسان بہ مشکل جانور سے متمائز کیا جاسکتا ہے۔ گویا انسان کا ارفع ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس لیے کہ وہ اپنے اسفل میں گرفتار رہ چکا ہے، یا اس کا وہ مطلق لحاظ نہ کریں گے کہ کس ریاضت و عبادت سے انسان پستی سے سربلند ہوتے ہوتے بالآخر اشرف المخلوقات کے درجہ پر فائز ہوا ہے۔ اس بنا پر اس کے اسفل کو اہمیت نہ دینی چاہیے، کیوں کہ یہ اس کی بے چارگی اور درماندگی کا دور اور نتیجہ تھا۔ جس سے اس نے اپنے آپ کو بڑی محنت و انتظار کے بعد نجات دلائی ہے۔

عقائد اور امور دین پر اب تک جس کثرت سے بحثیں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں شاید ہی کسی اور موضوع پر ہوئی ہوں ایسا ہونا ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ اس لیے کہ ہمارا مذہب ہماری زندگی کے تمام کھلے چھپے چھوٹے بڑے امور پر حاوی ہے۔ ہم اس کے اوامر و نواہی سے کسی حال میں باہر نہیں ہوسکتے، ان اوامر و نواہی کے ہم پابند ہی نہیں بلکہ ان کے پہنچانے والے بھی ہیں۔ اسی لیے ہم کو خیر الامم اور ہمارے رسول کو افضل البشر کہا گیا ہے۔ جو امت خیر الامم ہوگی وہ اللہ اور رسول کے احکام میں ڈھیل نہ چاہے گی، بلکہ ان کے بجالانے کی سختیوں کو جھیلنے میں

اپنی بڑائی سمجھے گی۔ مذہب واخلاق کے فوائد اور فضائلِ مذہب واخلاق کے احکام کو خوشی اور فخر سے بجالانے میں ہیں۔ اپنے نفس یا نفع کی خاطر ان میں چور دروازے ڈھونڈنے یا بنانے میں ہرگز نہیں ہے۔ جہاں فرائض کا سوال ہو وہاں فوائد کے پہلو تلاش کرنا، مذہب، معاشرہ، حکومت، انسانیت سب سے غدّاری ہے۔ مسلمان کی زندگی فرائض کی زندگی ہے فوائد کی نہیں۔ مسلمان کے لیے آسائش نہیں آزمائش تقدیر ہو چکی ہے۔ مذہب، تعلیم اور اخلاق کی رو سے میرے نزدیک وہ مسلمان مرد، عورت، جوان، بوڑھا، امیر، غریب سب سے محبوب و معتبر ہے جس کے اعمال کو دیکھ کر دوسرے مذہب و مسلک کے پیرو یہ کہیں کاش یہ ہمارا ہوتا یا ہم اس کے ہوتے۔

مذہب سے آج جو بے گانگی، بے تعلقی یا بے زاری نظر آتی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ موجودہ دنیا جس عالم گیر ناصبوری، ناآسودگی یا ہراس و ہوس کے بھنور میں جا گری ہے، وہاں احتساب نفس کی اتنی گنجائش نہیں رہی، جتنی تحفظِ ذات اور ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی کی خواہش بڑھی ہوئی ہے۔ اس میں فرد، جماعت اور اربابِ اختیار و اقتدار سبھی کم و بیش مبتلا ہیں۔ ایسے میں اقدار نہیں اغراض پیشِ نظر ہوتے ہیں اور یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے جس کو کسی طرح نظر انداز کیا جا سکے۔ علوم وفنون کی بے اماں ترقی یعنی فطرت کی کھلی اور چھپی طاقتوں کو چاکری میں لینے سے زندگی کا ہر طرح کا کاروبار اتنا تند رَو، ہمہ جہت اور سخت گیر ہو گیا ہے کہ ان سے نپٹنا خود علوم وفنون کے بس میں نہ رہا۔ اس آشوب کا مداوا و مقابلہ صرف مذہب واخلاق کے اوامر و نواہی کی پابندی سے ممکن ہے۔ اس لیے کہ ظلم، جہالت، دکھ اور مایوسی کا تریاق مذہب و اخلاق ہی کے پاس ہے جو منصفی محبت اور اعلیٰ اور اچھے پر بھروسہ رکھنے پر زور دیتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے لائے ہوئے انتشار وفشار کا درماں سائنس اور ٹکنالوجی کے پاس نہیں ہے۔ بیش از بیش مادّی ترقی و طاقت کو بیش از بیش اخلاقی قوتوں کے بس میں لانا اور رکھنا انسان کا سب سے بڑا کارنامہ اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ایسا کرنا ہمارے فرائض میں ہے۔ ہم نے ان کا انکشاف کیا اور ہمیں نے ان کو بے قابو ہونے دیا، اس لیے ان کو قابو میں لانے اور متوازن رکھنے کی ذمہ داری بھی ہم پر عائد ہوتی ہے۔ یہ تو فخر کی کوئی بات نہیں کہ موجودہ عہد میں جو تہذیب و ترقی کا عظیم دور بتایا جاتا ہے۔ ہم فطرت اور نفس دونوں کی سرکشی سے مغلوب ہو کر

اس عہد میں چلے جائیں جہاں انسان جانور سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ زمانۂ سابق کے غار اور شکار کا دور آج کے روس اور امریکہ کے دور سے اگر ممتاز ہے تو صرف بعض خوش آہنگ اصطلاحات کی بنا پر ورنہ حال اور مستقبل دونوں کی طرف سے جو بے اطمینانی یا بے چینی جنگل کے آدمی کو تھی وہی آج کے مہذب آدمی کو ہے۔ اکثر یہ محسوس کرکے تعجب اور مایوسی ہوئی کہ مادّی ترقی کے جتنے بے پایاں ہونے کے ہم قائل ہیں اتنے اخلاقی قوتوں کے بیکراں اور موثر ہونے کے کیوں نہیں ہیں، جب کہ دونوں طاقتوں کا سرچشمہ انسان ہی ہے۔

مذہب کی دوسری دشواری یہ ہے کہ اتنی قیمتی متاع کو محفوظ اور فعال رکھنے کے لیے جیسی گراں مایہ ہستیوں کی ضرورت ہے وہ بہت کم رہ گئی ہے۔ مذہب کی توسیع وترقی کا فریضہ گردش روزگار یا حالات کی ستم ظریفی سے زیادہ تر ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں آ گیا جن کی پُرسش یا کفالت ہم صرف ثواب کی خاطر شادی اور غمی کے مواقع پر کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح کے مسجد یا دو رکعت کے اماموں کا ذکر اقبالؔ اپنے کلام میں ایک خاص انداز سے کرتے ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح کرنی پڑے گی، اور ہمارے ذہن مخلص، پاک نظر و پاک نہاد نوجوانوں کو اس طرف مائل ہونا پڑے گا۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے پہلے انگلستان کے بہترین دل ودماغ اور اعلیٰ خاندانوں کے نوجوان مسیحی تبلیغی مشن سے منسلک ہوتے یا افواج میں بھرتی ہو جاتے۔ ان کی اس شرکت و شعار سے انگریز قوم جس منزلت کو پہنچی وہ کون نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ مشنری لگن (Missionary Zeal) زبان وادب اور تہذیب ومعاشرت کی ایک بڑی مبارک ومقبول اصطلاح بن گئی۔ حکومتیں، اوقات اور دوسرے ادارے مشنری مبلغوں اور خدمت گزاروں کی کفالت نہایت فراخ دلی سے کرتے تھے۔ وہ سہولتیں ہم کو میسّر نہیں ہیں، لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان اور ان کے بزرگ بھی ہر طرح کی دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے یہ خدمت انجام دینے لگے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جو تھوڑی بہت آسانیاں ہم کو میسّر ہیں یا ہم نے فراہم کر لی ہیں اس میں ہم اتنا زیادہ اور اچھا کام کر رہے ہیں جن کی شاید فراغت اور فراوانی کے زمانے میں انجام دینے کی ہم کو توفیق نہ ہوتی۔ اس سے کام کی اہمیت اور کارکنوں کے حوصلے اور خلوص کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آپ کو تعجب ہوگا شاید بدگمانی بھی ہو رہی ہو کہ میں سارے کام اور ہر طرح کے کام بے تکلف آپ کے سپرد کیے جا رہا ہوں۔ یاد ہوگا ازل میں ایک بہت بڑی ذمہ داری! اللہ تعالیٰ نے آدم کو ظلوم وجہول سے متصف کرتے ہوئے سپرد کی تھی اور آدم میری طرح بوڑھے اور از کار رفتہ نہیں، آپ کی مانند نوجوان اور حوصلہ مند تھے۔ میں اسی مشیّتِ الٰہی کی پیروی کرتا ہوں اور اس فرق کے ساتھ کہ کھلّم کھلاّ آپ کو 'ظلوم وجہول' نہیں کہتا۔ لیکن ہر طرح کی ذمہ داری کے کام سونپنا چاہتا ہوں۔ دراصل اس وقت اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اور باتوں سے قطع نظر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا ہے جیسے علم دین پر جتنی اچھی اور مستند نظر ہندوستان کے علما اور مسلمان دانش وروں کی ہے اتنی شاید بلادِ اسلامیہ کے علما اور مسلمان دانش وروں کی نہیں رہی ہے۔ لیکن میری معلومات صرف ان تصانیف اور مضامین تک محدود ہیں جن کا ترجمہ اردو یا انگریزی میں ملتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی موضوعات پر اردو میں جتنی وقیع اور کثیر تصانیف ملیں گی، ہندوستان میں فارسی، عربی یا انگریزی میں نہ ملیں گی۔ مدت الایام سے ہر مذہب کا دوسرے مذہب کے میل جول سے جو کسر وانکسار ہوا، مسلمانوں نے اسے دیکھا۔ وہ ہندوستان میں نہیں مذاہب کے بازارِ مصر میں آگئے تھے جہاں کھوٹے کھرے کا پردہ چلن میں کھلتا ہے۔ اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے اسلام کی خوبیوں کو متعارف کرانے میں ان تمام اعلیٰ ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے کام لیا جو ان کے حصے میں آئی تھیں۔ وہ یہاں حاکم کی حیثیت سے رہے اور محکومی کی آزمائش سے بھی گزرے۔ ان کا سابقہ انگریزوں سے ہوا جو ہندوستان میں مغربی علم وحکمت کے معلم اوّل مانے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اسلام پر سب سے زیادہ نکتہ چینی کی تھی اور اس کو مٹانے اور مسخ کرنے میں تاریخی رول ادا کر چکے تھے۔ ہندستانی مسلمانوں کو ان مغربی دانش وروں کی سطح پر پہنچ کر مذہب کی حفاظت وحمایت کرنی تھی جو اپنے عہد میں جدید ترین علوم وفنون میں سرآمدِ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ ان حالات میں ظاہر ہے ہمارے علما اور دانش وروں نے اپنی تحریر وتصانیف کا پایہ بلند رکھنے میں کتنا اہتمام کیا ہوگا۔

یہاں پھر وہی قصۂ آدم اور شیطان کے لہو کا مرحلہ آ گیا۔ یعنی اسلام کو مغربی علم ودانش اور مسیحی مصنفوں کی زہر چکانی سے بچانے اور اس کی مسلمہ ومعتبر حیثیت کو برقرار رکھنے اور ترقی

دینے میں علی گڑھ سامنے آیا۔ مذہب کی حمایت میں سرسید نے جو کچھ کیا اور اس کی پاداش میں ہم نے جو سلوک سرسید سے کیا اسے کون نہیں جانتا، لیکن ہندوستان میں مذہب پر گفتگو کرنے کا جو انداز اور معیار سرسید نے اپنی تقریر اور تحریر میں پیش کیا ہے اسے کسی نہ کسی سطح پر قبول کر کے ہندستانی علما نے مذہبی تصانیف کا معیار شعوری یا غیر شعوری طور پر جتنا بلند کر دیا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ دَین سرسید اور علی گڑھ کی ہے۔

سرسیّد، چراغ علی، جسٹس امیر علی، شبلی اور اقبال نے اسلام، اسلامی تعلیم اور اسلامی روایات کو اپنے اپنے طور پر جس خوبی اور خوب صورتی سے پیش اور دل نشیں کیا ہے، پچھلے سو سال کے اندر شاید ہی مسلمانوں نے کہیں اور کیا ہو۔ اب آپ یہ طے فرمائیں کہ کس آدم کے قصے کو کس شیطان کے لہو نے رنگین کیا۔ معلوم نہیں آپ پناہ چاہیں گے یا آرزو کریں گے۔ اگر میں اپنے ایک گمان کا اظہار کر دوں کہ آئندہ کبھی ندوہ کے موجودہ سربراہ کو یہی قصۂ آدم پیش آیا تو کیا ہوگا۔ اے خوش آں روز!

بارے آموں کی طرح ڈسپلن کا کچھ بیاں ہو جائے۔ ڈسپلن کسے کہتے ہیں اس کا مجھے علم ہے اور کسے نہیں کہتے وہ آپ بتاتے رہتے ہیں۔ اس کا سیدھا سادا مفہوم میرے نزدیک ایک شائستہ اور صحت مند معاشرے میں باہم دگر زندگی بسر کرنے کے جو آداب مقرر اور ذمہ داری عائد ہے ان سے حتی الوسع خوبی اور خوش دلی سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ ڈسپلن ساز بھی ہے ستیز بھی، اور ساز و ستیز کے محل کو سمجھنے کے لیے بھی ڈسپلن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بار انگلستان پر دشمن کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ سارے انتظامات درہم برہم ہو گئے، ہر طرف شکستِ فاش کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ انگریز جنرل نے اپیل کی کہ اس وقت انگلستان اپنے ہر فرد سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے فرائض بجا لائے گا۔ ایسے نازک وقت میں ایسی مختصر اور ولولہ انگیز اپیل انگریز جنرل انگریزوں ہی سے کر سکتا تھا۔ اس اعلان نے آپ کے ندوہ کے بانی مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے قول کے مطابق، ''کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار'' مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ انگریز کرائس جیت گئے تھے۔ یہ ڈسپلن کا معجزہ تھا۔ ہر زندہ قوم کی تاریخ میں یہ معجزے ملتے ہیں۔ شرمندہ ہونے کی بات یہ ہے کہ آج کل ہم ڈسپلن کے نہیں 'اِن ڈسپلن' کے معجزے دیکھتے اور

دکھاتے رہتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ جن عناصر و عوامل پر مشتمل ہے ان سب کے 'اِن ڈسپلن' کے شرم ناک مظاہرے زیادہ دن نہیں گزرے ہم دیکھ چکے ہیں۔ کس منہ سے ان کا ذکر کروں اور کیسے کہوں کہ آپ ان پر فخر کریں۔

طالب علموں کے اِن ڈسپلن یا بے راہ روی کے اسباب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ عام حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ نوجوانوں پر نہ تو والدین کا قابو رہا ہے، نہ اساتذہ کا نہ معاشرے یا حکومت کا۔ والدین کو اولاد خاطر میں نہیں لاتی۔ طالب علم کو اساتذہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے، معاشرے کی کوئی ساکھ نہیں، اس لیے اس میں وہ کشش نہیں جو نوجوانوں کو اپنے سائے میں امید و عزّت کی جگہ دے سکے۔ حکومت کو اپنے مصائب و مکروہات سے کہاں فرصت کہ وہ نوجوانوں کے لیے اچھی تعلیم، مناسب روزگار یا اعلیٰ مشاغل کے سامان یا سہولت فراہم کرے۔ ان نوجوانوں کو دیکھ کر عظیم رپ وان ونکل کی اولاد کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جن کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی کی ملکیت نہ ہوں۔'' یہ حال یہیں کا نہیں ہے، دوسرے ملکوں کے نوجوان بھی اسی طرح کی بے اطمینانی اور ناآسودگی میں مبتلا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساری دنیا کا نظام معیشت و معاشرت اور اخلاق و مذہب متزلزل ہو چکا ہو۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک جگہ کی خوبی دوسری جگہ کی خوبی نہیں بنتی، لیکن ایک جگہ کی خرابی دور اور نزدیک تمام مقامات میں پھیل ہی نہیں بلکہ پائدار ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صورت حال زیادہ تر ناترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے جہاں افزائشِ نسل، افلاس، امراض اور جہالت کی لائی ہوئی شدید قباحتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن ترقی یافتہ ملک کے نوجوان بھی زندگی سے کچھ کم ناآسودہ اور برہم نہیں ہیں، بلکہ یہاں تک کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ نفس کی ناآسودگی کی وبا مغرب ہی سے مشرق کو آئی ہے۔ ممکن ہوا تو اس پر آئندہ گفتگو آئے گی۔ فی الحال یہ کہنا ہے کہ ڈسپلن کا تمام تر مدار فرائض کے احساس پر ہے اور یہ احساس پائدار و موثر اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی اساس کسی ''کلمۂ گیتی نورد'' پر ہو۔ اقبالؔ نے ملّت کی تعبیر و توثیق اسی کلمۂ گیتی نورد سے کی ہے جس کا اعلان ان سے پہلے ایک بدوی کر چکا تھا۔

ڈسپلن کے مسئلے پر گفتگو کرنے کا پہلو یا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبا کو ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں کتنا اور کیا حصہ لینا چاہیے۔ ایسا کرنا ان کے حق میں مفید ہوگا یا مضر۔ ماہرین تعلیم کا

محتاط مشورہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ طلبا کو عملی سیاست میں حصہ نہ لینا چاہیے۔ حالاں کہ جس سیاست کے پیش نظر یہ سوال کیا جاتا ہے وہ عملی ہی سیاست ہوتی ہے۔ ورنہ پولٹیکل سائنس پڑھانے اور سیاسی موضوعات پر قیل وقال کے ادارے اور کلب کس کالج اور یونیورسٹی میں نہیں ہوتے۔ میں تمام عمر سیاست کے میدان و مکائد سے دور ونفور اور طلبا کی 'خیر وعافیت' سے بہت قریب رہا۔ وہ بھی علی گڑھ کے طلبا سے، جو مجھے خاص طور پر عزیز رہے ہیں، لیکن یہ تعلق شاگرد اور استاد کا اتنا نہ تھا جتنا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اس سے مل کر یا اس کا خیال کر کے بے ارادہ بھی چوکنے رہتے کہ ایسی کوئی بات نہ ہونی چاہیے جو ہم کو ایک دوسرے کی نظر میں ہلکا کر دے۔ ایسا ہوا تو ہم علی گڑھ کی سبکی کا باعث ہوں گے جو ہماری آرزوؤں اور کارناموں کا امین اور آئینہ دار تھا۔

اس طریقِ فکر وعمل کے لیے ہم پارٹی بناتے، نہ نعرے لگاتے، نہ کوئی عبادت یا ورزش کرتے۔ بس ساتھ رہتے سہتے، کھاتے پیتے، کھیلتے اور ہنستے بولتے تھے۔ کسی میں کوئی ہنر دیکھتے تو اس طرح خوش ہوتے جیسے اس کے حصول میں ہم بھی معین رہے ہوں اور وہ ہمارے لیے بھی ہو۔ نقص پاتے تو اس طرح مذاق اڑاتے کہ وہ راہِ راست پر آ جاتا۔ طالب علم شوخی اور شرارت کرتے، لیکن استاد اور نگراں ان کو کبھی کبھی اس طرح نظر انداز کرتے یا چشم نمائی سے کام لیتے کہ شوخی اور شرارت کا بھی مزا آ جاتا اور منفعل بھی ہوتے۔ جس شخص نے ایسوں میں اس طرح زندگی گزاری ہو، لیکن آخر عمر میں مبروص و متعفن سیاست کو سر بازار برہنہ رقص کرتے دیکھا ہو وہ طالب علموں کو اور نوجوانوں کو ایسی سیاست میں شریک ہونے کا مشورہ یا اجازت کیوں کر دے سکتا ہے۔ زیادہ دن نہیں گزرے سیاست کے میدان میں جس لفنگے پن کا مظاہرہ کیا گیا، اس سے طالب علموں کی نیک نامی اور ان کی ذہنی یا اخلاقی نشو ونما کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اس کا احساس واعتراف کرنے میں طالب علموں کے خیر اندیش سہل انگاری یا خوش گمانی سے کام نہ لیں تو بہتر ہوگا۔ ایسی مسموم فضا میں نوجوانوں کو ڈھکیلنے کا نتیجہ بڑا اندوہ ناک ہوگا۔ ہم میں کیسے نالائق موجود ہیں جو طالب علموں کو نقصان پہنچا کر نفع کماتے ہیں۔ ایسوں کو یقیناً وہی سزا ملنی چاہیے جو ملک سے غداری کی مقرر ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ نوجوانوں کو مصنوعی ماحول میں رکھنا درست نہیں، بلکہ آئندہ جس زندگی سے وہ دوچار ہونے والے ہیں اس کو سنبھالنے اور اس طرح اپنے کو سنوارنے اور استوار کرنے کی آزادی اور موقع دینا چاہیے۔ یوں بھی بطخ کے بچوں کو مرغی کب تک سمندر آزمائی سے روک سکتی ہے۔ لیکن طالب علموں کو علم و ہنر اور تربیت اخلاق سے بہرہ مند کرنا بھی لازم آتا ہے۔ اس کے بغیر وہ زندگی کے جہاز کو طرح طرح کے طوفانوں سے کس طرح بچا کر لے جائیں گے۔ اعلیٰ اقدار کے سائے اور روشنی میں طالب علم کے سیرت اور شخصیت کی تربیت و استحکام، معاشرہ اور حکومت کے اوّلین فرائض میں سے ہے۔ سوسائٹی میں افراتفری راہ پا گئی ہو تو اچھی باتوں کی طرف دھیان بہت کم جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص کو یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ معلوم نہیں کب کیا حادثہ پیش آجائے۔ اس لیے جو ہاتھ لگے اسے سمیٹ لو وہ خطرناک سے خطرناک اور ناواجب سے ناواجب اقدام کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ زیادہ تر اس میں نوجوان مبتلا ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ حال کے قائل ہوتے ہیں۔ ماضی یا مستقبل پر کم نگاہ رکھتے ہیں۔ نوجوان جن کی نمائندگی بالعموم طالب علم کرتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے اطمینان اور عزت کی جگہ نہ معاشرے میں رہ گئی ہے نہ حکومت میں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حکومت ان کے مسائل نہیں حل کرتی۔ ان کو طرح طرح کی رشوت مختلف شکلوں میں دیا کرتی ہے۔ جس کا گوارا نام اس نے مراعات رکھ دیا۔ امتحان میں ہر طرح کی بدعنوانی میں رعایت، تاخت وتخریب میں ڈھیل، جنسی روابط اور تفریح و تماشا کی بے لگام آزادی، ایسے مسکرات یا منہیات ہیں جو نوجوانوں کی اچھی اور اعلیٰ صلاحیتوں کو معطّل اور مسخ کرتی جاتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل کے نوجوان والدین اپنے بچوں کو طرح طرح کے بہلاوے دے کر نوکروں یا محلّہ کے لڑکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود تفریح کرنے نکل جاتے ہیں۔ بچے اسے پورے طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ والدین کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ سیانے ہو کر وہ یہی سلوک مع سود پہلے والدین سے اس کے بعد دوسروں سے ہر سطح پر کرتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وقت ایسا آ گیا ہے کہ اس طریقۂ کار سے مفر نہیں، لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب ایمرجنسی (اندیشہ ناک صورت حال) کا اعلان کر دیا جاتا ہے تو وہ سب کرنا پڑتا ہے جو نارمل زندگی میں ناممکن (بلکہ ناواجب

تک) سمجھا جاتا ہے، اور کون نہیں جانتا کہ سیاسی اور ملکی ہی ایمر جنسی یا کرائسس نہیں ہوا کرتا۔ اخلاقی ایمر جنسی یا کرائسس بھی ایک حقیقت ہے۔

ڈسپلن کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ جہاں رہیں، جن میں رہیں، جس طرح رہیں اور جس لیے رہیں، وہ سب کسی اعلیٰ عقیدہ، مقصد یا تصور کی خاطر ہو۔ ذمہ داری کی زندگی بسر کرنا ڈسپلن ہے۔ اگر آپ مسلمان کی ذمہ داری سے واقف ہیں تو آپ کو ڈسپلن کا مفہوم و ماہیت سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔ مجردات سے ہٹ کر آپ کو چند معمولی اور موٹی باتوں کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ ان سب کا تعلق ڈسپلن یا آپ کی سیرت (کیرکٹر) کی پرداخت سے ہے۔ آپ پڑھنے لکھنے اور اچھی باتیں سیکھنے اور برتنے میں اس طرح کوشش کریں جیسے آپ وہ قرض اُتار رہے ہوں جو آپ کے سرپرست، عزیز یا دوست روپے یا پیسے سے شفقت یا محبت سے اور معلوم نہیں کتنی سختیاں جھیل کر آپ کو فراغت و عزّت سے زندگی بسر کرنے کے لیے سامان اور سہولتیں فراہم کرتے رہتے ہیں، جو موجودہ دور میں متوسط (بالعموم تنگ دست) مسلمان گھرانوں کے لیے بہت دشوار ہے۔ صحت کو برقرار اور حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھئے اور نارمل زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالیے۔ ستھرے سادے خوش قطع لباس پہنئے، خواہ ان میں پیوند ہی کیوں نہ لگے ہوں۔ آپ کے لیے کالج کی طرف سے کوئی مناسب یونی فارم مقرر کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ یونی فارم کا احترام آدمی کو بے راہ روی سے روکتا ہے، جس طرح باوضو رہنے سے مسلمان منہیات اور مُزخرفات سے بچا رہتا ہے۔ مقررہ وقت پر ستھرے، کشادہ، ہوادار، مناسب طور پر آراستہ، خوش منظر ڈائننگ ہال میں سادہ، صحت منداور خوش ذائقہ کھانا سب کے ساتھ بے داغ سفید برتنوں اور دسترخوانوں پر تناول کیجیے، اور ان آداب کو خاص طور پر ملحوظ رکھیے جو کھانے کے دوران میں مہذب لوگ برتتے ہیں۔ مثلاً خوش کلامی ایک دوسرے کا پاس خاطر، نوکروں سے نرمی اور عزّت کا سلوک۔ ایسا نہ ہو کہ کھانا پسند نہ آئے یا کوئی نیچ اونچ ہو جائے تو آپ کے ہاتھوں نہ آپ کی آبرو محفوظ رہے نہ دوسرے کی۔ ہاتھ یا زبان کو بے قابو ہو جانے دینے سے اپنا نقصان فی الفور اور یقیناً ہوتا ہے۔ دوسرے کا بالکل نہ ہوتا ہو تو عجب نہیں۔ علاوہ بریں اس کی احتیاط رکھنی چاہیے کہ کھانا کھانے اور غسل یا ورزش کرنے میں فرق ہے۔ کھانے میں پیٹ بھرنا ہی مقصود نہیں

ہوتا، شائستگی اور دل نوازی کا نمونہ بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ میز بان اور مہمان کے الگ الگ کچھ آداب مقرر ہیں جن کو کسی حال میں نظر انداز نہ کیجیے، اور آپ بُرا نہ مانیں تو نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ جان جوکھوں ہی کا معاملہ نہ ہو تو دستر خوان اور میز کے جدید آداب کو نظر انداز کیجیے۔ کہیں پڑھا تھا کہ شراب تنہا مت پیو، یہ طریقہ جمہور کا ہے۔ میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ممکن ہو تو کھانا بھی تنہا مت کھایئے، چاہے یہ شیوہ کسی کا ہو۔ مسلمانوں میں تنہا خوری یوں بھی پسند نہیں کی جاتی۔ آپ ہر روز دیکھتے ہوں گے کوئی مسلمان خواہ وہ کتنا ہی معمولی حیثیت کا کیوں نہ ہو، اپنے روکھے پھیکے کھانے کی مختصر پوٹلی کھولے گا تو حاضرین میں سے خواہ وہ منزلت کے کسی مقام پر ہوں، ماحضر میں شرکت کی دعوت ضرور دے گا، اور یہ روایت وادیٔ غیر ذی زرع کے ان خانماں بردوشوں کی قائم کی ہوئی ہے جن کو آسانی سے پیٹ بھر روٹی میسّر نہیں آتی تھی۔

کالج کی عمارتوں، میدانوں، باغات اور سبزہ زار کو زیادہ سے زیادہ کشادہ، صاف ستھرا اور خوش نما ہونا چاہیے۔ طلبا اور اساتذہ سے زیادہ اور کون ایسے پُر فضا اور صحت بخش گردوپیش کا مستحق ہوسکتا ہے۔ یہ ماحول اور فضا اہمیت میں اچھی کتابوں، اچھے لکچر، اچھے ساتھیوں اور اچھے اساتذہ سے کسی طرح کم نہیں۔ ماحول کا اثر براہِ راست اور غیر شعوری طور پر طلبا کے ذہن اور ذوق پر پڑتا ہے۔ ذمہ دار اصحاب کو یہ نکتہ برابر ذہن میں رکھنا چاہیے۔ آپ کا ادارہ اسلامی ہے، مسلمانوں کی مخصوص و ممتاز روایات سے آپ سے زیادہ اور کون واقف ہوگا۔ مسلمان جہاں گئے یا جائیں گے خوش نما عمارات، باغ، نہر، آبشار، سڑک اور سبزہ زار کے بغیر نہیں رہیں گے۔ مسلمانوں کی تمام کی تمام خدمات نظر انداز ہو جائیں یا کردی جائیں تو ان کے ذوق و ذہن کے اس رجحان سے ان کے تمام کارناموں کی ازسرِ نو بازیافت ہوسکتی ہے۔

اس سلسلے میں کچھ لطیفے سُنیے۔ جنگ عظیم میں جرمنی کو دوبارہ شکست ہوئی اور کیسی شکست۔ میر کے 'صحنِ چمن' کی طرح برلن 'نمونۂ یوم الحساب' تھا۔ ہر طرف شکست و ریخت، ہیبت و ہلاکت، عفت و عزّت، جان و مال، بچے بوڑھے، سب فاتحوں کے نفس کے بدترین تقاضوں کی آسودگی کے لیے ہر طرف بکھرے ہوئے، لیکن جہاں کہیں تعلیم گاہیں اور ان کے

اردگرد، خیاباں وسبزہ زار ملتے، وہاں سے ان کا گروہ گزرتا تو خاموشی سے کترا کر دوسری طرف نکل جاتا۔ کسی تعلیم گاہ اور اس کے سبزہ وچمن کی حُرمت شمہ برابر کہیں سے مجروح نہ ہوئی۔ یہ اس ڈسپلن کا اعجاز تھا جو تعلیم گاہ اور اس کا صحت مند، فرحت افزا اور دل آویز ماحول ہمارے آپ کے ارادے کے بغیر ہمارے دلوں میں راسخ کر دیتا ہے۔ دوسرا قصہ یوں ہے۔ آج سے 70-60 سال پہلے ڈاک کے تھیلے عموماً ہرکارے اپنے اپنے حلقوں میں پیدل لے جایا کرتے تھے۔ ان کی ایک لاٹھی ہوتی جس کے ایک سرے پر نیزے کا پھل لگا ہوتا۔ اس کے نیچے ایک گھنٹی آویزاں ہوتی۔ ہرکارہ چلتا رہتا گھنٹی بجتی رہتی، جیسے سفر کی تنہائی میں ایک دوسرے کی دلآوری کر رہے ہوں۔ جاپان میں چیری کے پھولنے کا موسم بڑا دلکش ہوتا ہے۔ وہاں کی زندگی میں اس کو تیوہار کی سی حیثیت حاصل ہے۔ متفرق مقامات کے علاوہ سڑک اور شاہراہوں کے دونوں طرف دور دور تک خوش نما پھولوں سے لدے ہوئے درخت ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے فطرت نے جاپان میں پھول والوں کی سیر منائی ہو۔ اس زمانے میں ایک ہرکارہ ڈاک کا تھیلا اپنی گھونگرودار لاٹھی پر آویزاں کیے ہوئے نیم ڈُلکی انداز ورفتار سے گھونگرو کی تال پر بے خبر چلا جا رہا تھا۔ سامنے چیری کی شاہراہ تھی۔ جسے پھولوں نے حسن کا تقدس یا تقدس کا حسن دے رکھا تھا۔ ہرکارہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ بڑی احتیاط سے کندھے پر سے لاٹھی اور تھیلا اُتارا، گھونگرو کو ہاتھ سے مضبوطی سے تھام لیا تا کہ چلنے میں آواز برآمد نہ ہو، پھر تھیلے کو دوسرے سرے پر لٹکا کر بڑے ادب سے دبے پاؤں آگے بڑھا اور جب تک 'چیری بلاسم' کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا اسی خاموشی اور عقیدت سے چلتا رہا۔ پوچھنے پر بتایا کہ اس اہتمام کی ضرورت یوں ہوئی کہ چیری کے اس فردوس میں دیوتاؤں کی عبادت و عافیت میں گھنٹی کی آواز مخل ہوتی! میرا عقیدہ ہے کہ خوب صورت قدرتی مناظر میں طالب علم کبھی بے راہ نہیں ہو سکتا۔

اُمید ہے کہ آپ مغربی کھیلوں مثلاً کرکٹ، ٹینس، ہاکی، فٹ بال کے حق میں ہوں گے۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ میں کشتی، کبڈی، گلی ڈنڈا، جمناسٹک وغیرہ کے حق میں نہیں ہوں۔ بالخصوص مشرقی علوم کی اعلیٰ درس گاہوں میں جیسی کہ آپ کی ہیں۔ مغربی کھیلوں کو مشرق کے اخلاقی پیمانوں سے نہ ناپیے، ان کو ان کے ضوابط، لوازم اور روایات کے ساتھ جلد اور پابندی

سے کھیلنا شروع کر دیجیے۔ ان میں کرکٹ کھیلوں کا بادشاہ مانا گیا ہے، لیکن بڑا سخت گیر اور مہنگا کھیل ہے۔ مال دار کلب یا اوّل درجے کے کالج اور یونیورسٹیاں ہی اس کے اخراجات کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ ضمناً یہ عرض کروں گا کہ کرکٹ اور عبادت میں جہاں مماثلت ملتی ہے وہاں ایک فرق بھی ہے اور کتنا اہم فرق۔ عبادت کے معاملے میں بہت ممکن ہے ہم آپ عوام اور خواص دونوں کو مدتوں دھوکے میں رکھ سکیں۔ کرکٹ میں کبھی نہیں رکھ سکتے۔ ان مغربی کھیلوں کا اصلی وصف اتنا وہ کھیل نہیں ہے جو ہم آپ کھیل کے میدانوں میں دیکھتے ہیں، بلکہ وہ ذہنی اور اخلاقی تربیت ہے جو عرف عام میں ڈسپلن کہلاتی ہے۔ عملاً ان کھیلوں سے زیادہ شاید ہی کوئی اور شغل یا ریاضت ہو جو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے سیرت کی تہذیب میں اس درجہ معین ہوتی ہو اور اس کے ساتھ دلچسپ اور فرحت فزا ہو۔ لیکن اس کا تردّد ہے کہ اب سارے کھیل اتنے ماہرانہ اور پیشہ ورانہ ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کی معنوی خوبیاں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، بتدریج زائل ہونے لگی ہیں۔ کرکٹ کا انتظام و انصرام نہ ہو سکے تو ہاکی، فٹ بال، ٹینس میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیجیے، لیکن اس کا ضرور خیال رکھیے کہ کھیل کا سامان اور کھیل کا میدان اوّل درجے کا ہو۔ کھیل مقررہ یونی فارم میں مقررہ وقت پر مقررہ آداب سے کھیلا جائے۔ اس کھیل کا کوچ بالضرور رکھا جائے۔ ہاکی یا فٹ بال کھیلتے ہوئے ایسا نہ معلوم ہو کہ آپ پولیس کا پیچھا کر رہے ہیں یا پولیس آپ کا۔

مشرقی علوم کی درس گاہوں میں مغربی میدانی کھیلوں کی اہمیت پر اس لیے زیادہ زور دینا چاہوں گا کہ دین و مذہب کی تعلیم جن روایات کے تحت جس طرح جن حالات اور ماحول میں دی جاتی ہے وہ طالب علم کی مناسب حال تربیت کے لیے ساز گار نہیں ہوتی۔ حالاں کہ اس نوعیت کی تعلیم کے لیے خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کہ طالب علم میں وسیع النظری، رواداری، ہمدردی اور حوصلہ مندی آئے اور وہ دوسرے کے نقطۂ نظر کے صحیح اور اپنے نقطۂ نظر کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرنے میں ہتک نہیں بڑائی محسوس کرے۔ یہ دو طرح سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایک ایسے کھیلوں سے جن میں کھیلنے والوں کی تعداد کافی ہو، کھیل اپنے آئین وضوابط اور روایات کے اعتبار سے مکمل ہو، نیز دیکھنے میں کھیل اور کھلاڑی دونوں شائستہ نظر آئیں۔ یہ شرائط صرف وہ مغربی کھیل پورا کرتے ہیں جن کا ذکر آ چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ طلبا اپنے درس

گاہوں سے نکل کر دور نزدیک کے دوسرے طلبا سے وقتاً فوقتاً ایک پارٹی کی شکل میں ملا کریں اور ایک دوسرے کی مدارات و مذاکرات سے مستفید اور لطف اندوز ہوں۔ میں تو یہاں تک چاہوں گا کہ آپ کے منتخب طلبا تنہا یا وفد کی شکل میں تعطیلوں میں مقررہ حلقوں کا دورہ کر کے اپنے نادار لیکن ہونہار ساتھیوں کے لیے اہلِ خیر سے عطیات حاصل کیا کریں۔ یہ طلبا اس مبارک خدمت کے علاوہ آپ کے ادارے کے بڑے اچھے سفیر ثابت ہوں گے۔ اس کا بالکل خیال نہ کیجیے کہ موجودہ حالات میں چندے کا ملنا دشوار ہے جو مل جائے وہی کافی ہے۔ زیادہ تر اس پر نظر رکھیے کہ اس طرح آپ کے ادارے کی نیک نامی پھیلے گی اور یہ کارنامہ آپ کے طلبا کا ہوگا جن کی گوناگوں تربیت کا یہ بڑا مبارک و موثر وسیلہ ہے۔ طلبا کے لیے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ وہ ذہنی خانقاہوں سے نکل کر کھلے میدانوں میں سانس لینے کا حوصلہ کریں، اور اس کا ان کو موقع دیا جائے۔ پہاڑوں پر زیادہ سے زیادہ بلندی تک پہنچنے کی جو سعی کی جاتی ہے وہ اس لیے ہوتی ہے کہ دیکھا جائے کہ ان بلندیوں تک پہنچنے کے لیے جس طاقت یا صلاحیت کی ضرورت ہے، وہ انسان میں کتنی ہے اور کس طرح اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

طلبا کے خیالات و جذبات کی صحت و صفائی کے لحاظ سے تعلیم گاہوں میں یونین کلب یا انجمن اتحاد کو میں وہی حیثیت دیتا ہوں جو انسانی جسم میں پھیپھڑے کو حاصل ہے طلبا کی نارمل زندگی میں یونین کلب کی ایسی ہی ضرورت ہے۔ جیسے کھانے پینے، نہانے دھونے، ورزش، تفریح اور سیر و سفر کی۔ اچھے یونین کلب کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ وہاں نوجوانوں کو جس جرأت اور وقار کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے، اسی طرح تحمل اور بردباری سے فریقِ مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی پابندی ہوتی ہے۔ اگر کوئی یونین یا اس کے اراکین اس خصوصیت کو پورا نہیں کرتے تو پھر وہ یونین، یونین نہیں ہے نااہلوں کا اژدہام ہے۔ یونین میں ہر موضوع پر اظہار خیال کی آزادی ہونا چاہیے۔ لیکن اس آزادی کو کسی حال میں ذمہ داری کے حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ اگر کسی وبا کے سبب یونین مباحثے کے بجائے مجادلے کو اپنا شعار یا مقصد بنا لے تو پھر اس کی حیثیت درس گاہ کے جسم میں Sceptic Spot (مرکز تعفن) کی ہو جاتی ہے اور اس کا تدارک لازم آ جائے گا۔ پچھلے دنوں

اس طرح کے سانحے کثرت سے دیکھنے میں آئے، لیکن اس صورت حال سے بددل نہ ہونا چاہیے۔ لعنت بھیجنے میں مضائقہ نہیں، اس لیے کہ اس میں اس فتنہ وفتور کو دخل ہے جو ان کے بزرگوں کے نامۂ اعمال میں کالے ہیرے کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

اردو شعروادب سے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں ہماری اعلیٰ اقدار و افکار کی ترجمانی بھی ملتی ہے اور دعوت بھی۔ مذہب و اخلاق کے بعد انسانی زندگی کو زیبائی اور آرزومندی بخشنے میں شعروادب کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ مذہب واخلاق کی فلسفیانہ، متکلمانہ یا معتقدانہ تفسیر وتعبیر سے زیادہ دل نشیں ہمارے سربرآوردہ شعرا کا وہ کلام رہا ہے جن میں انہی مسائل کو شاعری کے پیکر و پیرہن میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی نمایاں مثال اقبالؔ کے یہاں ملتی ہے۔ انھوں نے افکارِ اسلامی کی تشکیلِ نو کی جو وضاحت ووکالت اپنے مشہور خطبات میں کی ہے وہ باوجود غیر معمولی وزن و وقعت کے بعض دانش وروں کے نزدیک جہاں تہاں محلِ نظر بتائی گئی ہے۔ لیکن انہی مسائل نیز احکامِ الٰہی اور فرمودات نبوی کی تلقین وتوضیح جب وہ اپنے کلام کے مخصوص اور بے مثل ساز وآہنگ میں پیش کرتے ہیں تو ان کا بڑے سے بڑا نکتہ چیں بھی سپر ڈال دیتا ہے۔ عظیم شاعری کلامِ الٰہی سے کتنی قریب ہوتی ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کو اپنی شاعری کے اعتبار سے کس سطح پر ہونا چاہیے۔ لیکن دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ جس طرح ہر عاقل و بالغ کو جمہوری نظام حکومت میں ووٹ دینے کا آئینی حق حاصل ہے، اس طرح ہر کس و ناکس کو شاعر اور ادیب کہلائے جانے کا اختیار بہ زورِ مشت حاصل ہے۔ خواہ ووٹ دینے کے شرائط بھی پوری نہ کرتا ہو۔ اس طور سے اور اس پیمانے پر شعروادب کی خدمت یا مرمّت شاید ہی کبھی کی گئی ہو۔ جب انسان کو غلامی سے آزادی مل چکی ہو تو پابندی سے کیوں نہیں۔ مغرب میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز فتوحات اور وہاں کی تہذیب وتمدن کے عروج سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تہذیب وتمدن کے سب سے بڑے مرکز انگلستان میں جو کبھی 'لیڈیز اور جنٹل مین' کے آداب وتشریفات (Protocol) کا یروشلم کہلاتا تھا۔ کم سن نوجوان لڑکے لڑکیاں جو قوم کی برومندی کی بشارت ہوتی ہیں، جسم اور نفس کے جس شدید ہیجان میں مبتلا ملتی ہیں، اور جس وحشیانہ انداز سے اس کا برسرعام اظہار و

اعلان کرتی ہیں، اس کو دیکھ کر کون ہے جو غم و غصہ کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ ایسے لڑکے اور لڑکیوں کی ایک جماعت بن گئی ہے جن کو بٹلیس (Beatles) کہتے ہیں۔ ان کو معاشرہ نے تسلیم کرلیا ہے اور حکومت نے ان کو خطابات سے نوازا ہے۔ اسی ملک اور حکومت کی پارلیامنٹ نے جو تمام دنیا کی پارلیامنٹوں کی ماں بتائی اور مانی جاتی ہے۔ ہم جنسی کی غیر فطری نفرت انگیز اور شرم ناک تقاضے کی آسودگی کے لیے جو قانون پاس کیا ہے، وہ اس ملک، قوم، حکومت اور مصلحانِ اخلاق کے کس قدر شایانِ شان ہے اس کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ بٹلیس کے بارے میں ایک مضمون سے یہ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

> ''نوخیز لڑکے لڑکیوں کا اجتماعی ہسٹیریا، دبے ہوئے جذبات، ہجوم کا جنون، شور بھرے سنگیت..... وہ چیخ چلا رہی ہیں، اچھل کود رہے ہیں۔ مسرّت سے لبریز ہوکر ناچ رہے ہیں، شہر میں بٹیلز آئے ہیں۔ ڈرین پائپ پینٹ اور لیدر جیکٹ، بڑھے ہوئے بال، گونجتی ہوئی آوازیں اور شور مچاتے ہوئے ساز سنگیت لیے ہوئے، ہر جگہ ان کے گرد ہجوم جمع ہوگیا اور لوگ جنون کی حالت میں چلّانے لگے — یہ اجتماعی ہسٹیریا کس طرح نمو پاتی تہذیب کی نشان دہی کرتا ہے؟ جہاں جہاں بٹیلز کی موسیقی کا پروگرام طے ہوا، نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کی بھیڑ اُمنڈ پڑی۔ ہر عمر کے لوگ خواہ وہ سات برس کے بچے ہیں یا ستر برس کے بوڑھے، گھروں سے نکل پڑے۔ پولیس ان کو قابو میں لانے میں ناکام ہے، بانسوں، ڈنڈوں، اینٹوں، کانٹے دار تاروں اور لوہے کی سلاخوں کی دیواریں سب بیکار ہیں۔ بٹیلز کی کشش جادوئی ہے، ان کے قریب ہونے، ان کالمس محسوس کرنے، ان کے بال یادگار کے طور پر حاصل کرنے، ان کی ایک جھلک پانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ظاہر ہے۔ جب نوجوان لڑکے لڑکیاں گروہ یا ہجوم میں اپنے خام اور مشتعل جذبات کا اس طرح اظہار کریں گے تو ان کی رغبت خطرناک صورت اختیار کرسکتی ہے........ بٹیلز کی مقبولیت

نوخیز لڑکے لڑکیوں کے انقلاب کے باعث ہے۔ ان کا سنگیت بنیادی
طور پر شور انگیز ہے اور اونچے سروں میں گایا جاتا ہے۔ اس کی اپیل
صاف طور پر حواس کی تسکین پر مبنی ہے............ یہاں تک کہ یہ متعدی
مرض دلّی شہر میں پہنچ گیا۔ دلّی کے نو، دولیتے اور اونچے طبقے کے لوگ
پالم ہوائی اڈے پر ان کا جہاز اُترنے سے کئی گھنٹے پہلے ہی جمع ہو گئے اور
جب بٹیلز دکھائی دیے تو جذبات کا سیلاب اُمنڈ پڑا، نوجوان جسم تھرکنے
لگے اور ڈرین پائپ کے نقلی بٹیلز دورِ وحشت کے انسان کی طرح چیخنے
لگے........بٹیلز پروپیگنڈے کی لہروں پر سوار ہو کر آئے ہیں۔ وہ لوگ
جو اس تجارت کے ماہر ہیں، وہ نوعمر لڑکے لڑکیوں کی نفسیات سے بخوبی
واقف ہیں اور فنِ اشتہار بازی کے منجے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ وہ جدید
اشتہار بازی کے تمام اصولوں اور ذرائع، پریس، ریڈیو، سینما، اور ٹیلی
ویژن کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ جس سے ایک مخصوص ذہنی فضا تیار
کی جاسکتی ہے، اور ذہن کو اپنی ضرورت کے مطابق موڑا جا سکتا ہے۔
تجارتی اداروں کے منتظمین ان کے چہرے، ان کے خدوخال، بالوں کی
تراش خراش، لباس، مسکراہٹ، رنگ وروغن، آواز، ساز و سنگیت وغیرہ
سے ملی جلی ایک تصویر بناتے ہیں اور پھر اسے بیچ کر روپے کماتے
ہیں........بٹیلز کی مقبولیت کا باعث ہے، ان کے بارے میں کیا کیا
پوشیدہ اور ظاہر پروپیگنڈا ہنستے کھیلتے نوجوان، رومانے چہرے اور ڈرین
پائپ جیکٹ کا پہناوا اور اس پر ستم ڈھاتا ہوا بٹیل ہیر اسٹائل اور ان سب
میں سے چھن کر کومل دلوں اور جسموں کو چیرتی ہوئی جنسی کشش
ہے........الڈس ہکسلے نے تحریر کیا ہے۔ کوئی بھی انسان کتنا ہی مہذب
کیوں نہ ہو، افریقی ڈھولوں کے پیٹنے اور ہندستانی کیرتن اور ویلشن
گانے کو زیادہ دیر تک سن کر اپنی سوجھ بوجھ اور ہوش مندی کو قائم نہیں رکھ

سکتا۔ اگر وہ زیادہ دیر تک ٹام ٹام اور گانے سنتا رہے تو ہمارا ہر فلسفی آخر کار اُچھل کود کرنا اور چیخنا چلّانا شروع کردے گا۔''

اب ذرا ماہرینِ نفسیات کی بھی رائے ملاحظہ ہو:......نوجوان لڑکیوں کی یہ حالت کم یا زیادہ جنسی خواہش کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ہیجانی طرزِ عمل میں جنسی تسکین کی خواہش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس ذہنی کنٹرول کے کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ جسمانی کنٹرول بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں نے مشاہدہ کیا ہے کہ اس موسیقی آمیز چلّانے اور اُچھل کود کے باعث پیشاب نکل جاتا ہے۔ اکثر ایسا بچوں میں فرطِ ہیجان، خوف یا مسرّت کے باعث ہوتا ہے....... جن موسیقی یا تھیٹر اور سینما گھروں میں بٹیلز نے اپنا پروگرام پیش کیا، ان کے مالکوں نے سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا ہے کہ ان گھروں کی نشستوں کو کس طرح صاف رکھا جائے۔ ڈیوڈ بروک نے شاید اس لیے بٹیلز کے پروگرام کو 'گھٹیا قسم کی مشت زنی'' کے مترادف قرار دیا ہے:

''......لیکن پاپ سنگیت کی سب سے زیادہ افسوس ناک کیفیت یہ ہے کہ یہ نوخیز لڑکے لڑکیوں کے ذہنی اور جسمانی تناؤ کو دور کرنے کے لیے ظہور میں آیا ہے، لیکن یہ اس کو سلاتے ہوئے اور تیز کر دیتا ہے، اور پھر ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس میں نئے سے نئے اور زیادہ سے زیادہ ہیجان انگیز حرکتوں اور گانوں کو پیش کرنا لازمی ہے۔ جیسا کہ عام طور پر جنسی ناولوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہندستانی فلموں میں گانے کی مقبولیت کا باعث بھی یہ ہے کہ گانے 'جنسی فعل' کے بدل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کارنامے پر بٹیلز کے ہیروؤں کو برطانیہ کی ملکہ معظّمہ سے آرڈر آف برٹش امپائر کا اعزاز پیش کیا گیا، اور برطانیہ سنگیت میں قابل قدر اضافہ کرنے کے سلسلے میں آئیور نوویلو (Ivore Nevello) کے اعزازات میں اوّلین انعام دیا گیا۔''

(شب خون، الٰہ آباد، جولائی 67ء، بٹیل میڈیا اور پاپ سنگیت، دویوندر اسر)

اس گلستاں سے بہار کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے نوجوان اور مقبول عام افسانہ نگاروں کے سامنے انسان کے شرف وسعادت کا یہی نقشہ ہے۔ اس حمام میں جو جتنا برہنہ ہے اتنا ہی اپنے کوفن کو پاسبان اور زندگی کا ترجمان بتاتا ہے۔ جیسے فن کار کی ذمہ داری صرف ترجمانی یا تشہیر ہو۔ زندگی کی آبرو بچانے کے لیے کوئی آل پارٹیز کانفرنس علاحدہ سے بلائی جائے گی۔ کہتے ہیں دنیا کا یہی رنگ ہے اور زندگی کا یہی تقاضا ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ انسان صاحبِ شعور اور صاحبِ اختیار بھی ہے اور اس کا شمار شجر، حجر، حشرات الارض یا اجرام فلکی میں نہیں ہوتا، ادب اور زندگی لازم وملزوم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے ہمہ وقت اور ہر پہلو سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم، ہمارا معاشرہ اور ہمارا شعروادب، ذلت اور ضلالت کے کس سیلِ بے اماں کی گزرگاہ پر ہے۔ بٹلیز کا یہ قصہ بجائے خود کوئی سانحہ نہیں ہے۔ مرض کی بڑی واضح اور تشویش ناک علامت ہے۔ ایسے مرض کی جو ہر طرف پھیل چکا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں پیوست ہے۔ کیسی بے پناہ ناآسودگی، ناصبوری کی گرفت میں ہم سب ہیں جسے جتنا آسودہ کرتے ہیں اتنی ہی اس کی شدت بڑھتی ہے۔ فرد ہو یا جماعت، انصاف وحکومت کے ایوان ہوں یا تجارت کی منڈیاں، شعروادب ہو یا علم وحکمت، عشرت کدے ہوں یا عبادت گاہیں، کہیں نہ اماں ملتی ہے نہ ایمان داری۔ کیسا زہر، کیسا نشہ، کیسی ہلاکت، مایوسی اور نامرادی کی زندگی موجودہ انسان کے حصے میں آئی ہے۔ کس سے کس طرح کہیے کہ جسم کبھی جسم کے قابو میں نہیں آیا ہے۔ اس کو سیدھے راستے، سلامتی کے راستے اور نجات کے راستے پر صرف مذہب واخلاق لاسکتے ہیں۔ انسان کو نوامیس فطرت پر جو فتح نصیب ہوئی ہے اور آئندہ ہوتی رہے گی، اس کے پیشِ نظر اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس صلے میں اس کے سارے گناہ معاف کیے جاسکتے ہیں، اور کسی ذمہ داری کا پابند نہیں رہا۔ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اس کا جواز تلاش کرتا ہے جو بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ فیصلے تک پہنچنے کی دقتیں باقی نہیں رہیں، جس طرح مطلق العنان حکومتیں گولی پہلے ماردیتی ہیں، فیصلے بعد میں تصنیف کرتی ہیں۔ ہر بے راہ روی کی ایک ہی جواب دہی یعنی انسان حیوان رہا ہے۔ اس لیے حیوانیت میں حق بجانب ہے۔ آزار کا علاج نہیں کرتے، قانون سے اس کی توثیق کردیتے

ہیں۔مرض کے تدارک اور مریض کی تیمارداری کا آزار کون مول لے جب ان کی تجارت میں ہر طرح کا نفع ہو۔

یہ صورت حال مغرب کی پیدا کی ہوئی اور لائی ہوئی ہے جہاں کے امراض ہر تدبیر و تریاق کے خلاف اُمیت حاصل کرنے کے بعد سفر پر نکلتے ہیں۔ یہ وبایا امراض اجنبی یا گم گشتہ کے طور پر ہماری زندگی میں نہیں داخل ہوتے بلکہ ایک طبعی، سماجی حقیقت بن کر جاگزیں ہو جاتی ہیں، پھر ان سے نجات ناممکن ہو جاتی ہے۔ یوں بھی مدتوں محکومی میں رہنے کے بعد آزادی ملتی ہے تو سابق حاکموں کے گناہوں کو اپنانے میں نفس کو زیادہ لذت ملتی ہے، بہ نسبت اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو پہچاننے، پنپانے اور برسرکار لانے میں۔ دونوں عالمی جنگوں کے بعد مغرب جس اختلال و انتشار کا شکار ہوا، اس میں نوجوانوں کی ذہنی و اخلاقی قیادت ان کے بڑوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ایسا ہونا مقتضائے حال بھی تھا۔لڑائی میں نوجوان ہی مارے گئے جو رہ گئے، ان کو زندگی سے نبرد آزما ہونے کا تجربہ نہ تھا۔سکت بھی نہیں رہ گئی تھی۔حال کو ڈانواڈول اور مستقبل کو دھندلا پاتے تھے، اس لیے انھوں نے 'بابر بعیش کوش' پر عمل کیا۔یہ عیش کوشی 'عالم دوبارہ نیست' کے تصور سے ہوا پا کر نوجوانوں کو جس مدہوشی تک پہنچا سکتی ہے اس کے نتائج آج تک ہم دیکھ رہے ہیں، اور اس دیکھنے کا المیہ طربیہ یہ ہے کہ ہم اسی نسل کے باقیات الصالحات یا 'بقیہ نقیہ' بھی ہیں۔ نوجوان کیسے ہی رہے ہوں، ان کے بزرگوں بالخصوص شعروادب میں جوان کے بزرگ تھے اور ان پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ انھوں نے شعروادب میں اپنی نسل کی رہنمائی نہ کی۔ اکثر یہ بھی محسوس ہوا ہے جیسے بزرگوں کی یہ جماعت خود اس پائے کی نہ تھی کہ وہ عہد کے نوجوان کے رجحانات پر قابو پا کر مناسب و موزوں سمت و رفتار دے سکتی۔ممکن ہے وہ خود اس مزاج کا شکار ہو گئے ہوں جس میں نوجوان مبتلا تھے۔

اس کا اعتراف ہے کہ میں مغربی شعروادب سے اتنا واقف نہیں ہوں کہ اس پر کوئی قطعی حکم لگا سکوں، لیکن تھوڑے بہت مطالعے اور مغربی شعروادب کے واقف کاروں سے گفتگو کر کے کچھ ایسا سمجھنے لگا ہوں کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے شعروادب کے جیسے کاملین مغرب میں گزرے ہیں۔اس معیار و مرتبے کے اکابر ان کے بعد نظر نہیں آتے۔یعنی جس ذوق و ظرف

اور ریاضت سے عظیم ادب ظہور پاتا ہے، پچھلے کم و بیش پون صدی میں مغرب میں صورت پذیر نہیں ہوا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صنعتی سائنس اور ٹکنیکل ترقی کے آشوب نے اخلاق و ادب اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو پنپنے نہ دیا۔ بظاہر ایسا بھی معلوم ہوتا ہے جیسے اس بحران میں مغرب کے جدید شعر و ادب کا نامیاتی رشتہ اس کے قدیم سے بالکل منقطع ہوگیا ہو، اور بیسویں صدی کی مغربی شاعری 'گذشتہ سے پیوستہ' نہ رہی ہو بلکہ اس نے اپنا نیا بہی کھاتہ علاحدہ کھول دیا ہو۔ جہاں کاروبار تو کثرت سے ہوتا ہو، لیکن کھرے کھوٹے سے سروکار نہ ہو۔ اس زد میں آکر مغرب نے ایک حد تک شاعری کا مقصد اور محور بدل دیا۔ طے یہ پایا کہ نالۂ فریاد کی طرح شاعری کی مخصوص نہ کوئی نَے ہے نہ لَے۔ ہر شخص جس طرح چاہے اپنے خیالات، جذبات اور تاثرات کے لیے اپنے الفاظ، مفاہیم اور صنائع بدائع وضع کرے۔ اس کی کوئی شرط نہیں کہ ان الفاظ، مفاہیم اور صنائع بدائع کو دوسرے بھی سمجھتے ہیں یا نہیں، اور ایسا کیوں کر ممکن ہے جب فردِ واحد نے صرف اپنے تجربہ یا تاثر یا تخیل کو ادا کرنے کے لیے بطورِ خاص اپنے ہی لیے الفاظ اور فقرے مقرر کیے ہوں۔ ایسا کرنے کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ ہر فرد کے دل پر واردات کے طاری ہونے کی نوعیت یا شدت مختلف ہوتی ہے، جن کے اظہار کے لیے مروّجہ وسائل ناکافی ہوتے ہیں۔ اس لیے شاعر کو اختیار ہے کہ ان کے اور اپنے دونوں اظہار کے لیے نئے وسائل (الفاظ یا فقرے) وضع یا انتخاب کرے۔ سوال یہ ہے کہ شاعری گونگے کا گڑ یا مجذوب کی بڑ تو ہے نہیں کہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ 'من گفتگوئے می کنم' شاعری ذاتی عمل کے ساتھ اجتماعی ذمہ داری بھی ہے۔ فرد کی نری ہزیان سرائی نہیں ہے۔ سماج میں کوئی شخص محض اپنے لیے نہیں رہ سکتا۔ اس لیے شاعر کو بھی اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ شاعری صرف اپنے لیے کرے اور سماج کو نظر انداز کر دے۔ شاعر اور اس کے سامعین ذوق اور ذہن کے اعتبار سے مختلف سطح پر ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے نچلی سطح کی رسائی اونچی سطح تک نہ ہو، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ شاعر کوئی ایسی سطح اختیار کرے جو صرف اس کی اور اس کے لیے ہو، اور دوسروں کی وہاں تک پہنچ نہ ہو یا پہنچنے کا حق نہ ہو یا وہاں تک پہنچنے کے لیے مخصوص گائڈ یا گائڈ بک درکار ہو۔ ایسی شاعری کا کعبہ تک پہنچنا معلوم، ترکستان بھی نہ پہنچے تو کیا عجب۔

شکایت اس کی ہے کہ مغرب کے جدید دانش وروں نے شاعری کو سستا اور بے وقعت
کر دیا۔ انھوں نے اپنی تمام ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے ناساز گار حالات میں نئی نسل کے ذہن
کو آسان اور ادنیٰ طور پر طریقوں کو اختیار کر لینے دیا اور کسی قسم کا کوئی تعرض کیا نہ ان کی رہنمائی
میں جان کھپائی بلکہ گھٹیا گورنمنٹ کی طرح بداعمالی کو قابو میں لانے اور رکھنے کے بجائے اس کو
قانونی جواز دے دیا۔ سیاسی اور اقتصادی مصالح کی بنا پر زر کی قیمت گھٹا دینا بسا اوقات ناگزیر
ہو جاتا ہے، لیکن مذہب و اخلاق اور شعر و ادب کو کم عیار کرنا کسی بھی عذر کی بنا پر جائز نہیں قرار دیا
جا سکتا۔ اقدار کی قیمت کو کبھی نہیں گھٹاتے، ہمیشہ قائم رکھتے ہیں یا بڑھاتے رہتے ہیں۔ اجناس کی
قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اخلاق اور ادب میں ڈی ویلوایشن (Devaluation) دیوالیے
کا مترادف ہوتا ہے۔ حال میں مغرب کی شاعری میں جتنے ازم داخل ہوئے ہیں، ممکن ہے
تاویلات کے زور سے ان کو کسی نہ کسی حد تک گوارا کر لیا جائے۔ لیکن عملاً وہ شاعری میں بے راہ
روی اور درماندگی کی بڑی غم ناک غمازی کرتے ہیں جیسے شاعری کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ دریافت
یا قائم کر لیا گیا ہو، جس کے رو سے ہر کس و ناکس اس کے ساتھ مذاق کرنے میں حق بجانب ہو۔
انسان آزاد پیدا کیا گیا ہو یا نہیں، اردو میں جدید شاعری کو دیکھ یہ اندیشہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ
اردو کا شاعر، اس کی شاعری اور سامعین سب آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ وہ بھی جمہوریہ ہند میں نہیں،
قبائلی سرحدی ریاستوں میں۔ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کے طور طریقوں پر مشرق جتنا اور جس شدت
سے لعنت بھیجتا ہے، اتنا ہی جلد اور اسی شدت سے اس کو اختیار کرتا ہے۔ اس لیے کہ اصلاً ہم تقلید
کے بندے اور تمیز سے بیگانہ ہوتے ہیں۔

اردو میں جدید شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید زیادہ تر ناساز گار حالات سے بیزاری
اور برہمی کا اظہار ہے۔ اس بیزاری و برہمی نے اب تک جو ادبی سرمایہ اور نمونہ پیش کیا ہے وہ
مقدار کے اعتبار سے جتنا زیادہ ہے، معیار کے اعتبار سے اتنا ہی ہلکا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ
یہ بغاوت یا تو مخلصانہ نہ تھی یا اس کے علم برداروں میں شعر و ادب کو صحیح خطوط پر لے جانے اور
رکھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نیا شعر و ادب فی الجملہ پرانے شعر و ادب کے وزن و
وقعت کا نہ تھا۔ یہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ کرنل ہالرائڈ اور ان کے چند رفقائے کار نے

بہت کم عرصے میں اور آسمان سر پر اٹھائے بغیر جو کچھ کر دکھایا وہ ترقی پسند ادب 'زمیں شش شدو آسماں گشت ہشت' کے بعد بھی پیش نہ کر سکا۔ سرسری جائزے سے کچھ باتیں سامنے آتی ہیں، مثلاً یہ کہ جدیدیت کے علَم برداروں نے جن دعووں سے اپنی تحریک کا آغاز کیا وہ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی سطح پر اردو میں پہلے تسلیم کیے جا چکے تھے، اور ان کی تعمیل اور تکمیل میں ہالرائڈ سے لے کر علی گڑھ تحریک تک بہت سے مرحلے طے کیے جا چکے تھے۔ اس عہد میں نئی تحریک کو قبول کرنے اور اس کو آگے بڑھانے والوں میں اردو کے بڑے مستند و معتبر اہلِ فن اور اہلِ قلم تھے۔ انھوں نے جدیدیت کے ہیولیٰ اور ہیئت کو اتنی اہمیت نہ دی جتنی جدیدیت کی اساس یا روحِ عصر کو۔ ان کی ادبی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے جدید سے وہی چیزیں لیں جو اردو شعر و ادب اور اردو سماج دونوں کے مزاج یا جینیس کے مطابق تھیں۔ بڑی حد تک یہ اسی پیش بینی اور دور بینی کا نتیجہ تھا کہ اردو شعر و ادب کے افق پر ایسے ثوابت نمودار ہوئے جیسے کہ اکبر، حالی اور اقبال ہیں۔ ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی عمر 36-35 سال ہوگی۔ اس دوران میں ہندوستان کے دریاؤں کے پُل کے نیچے سے چاہے جتنا پانی گزر گیا ہو، عجم کے لالہ زاروں کی طرح ہندوستان کے لالہ زاروں سے بھی جہاں تک ترقی پسند ادب کا تعلق ہے کوئی رومی اٹھا نہ حالی، اکبر و اقبال۔ یہاں تک کہ کوئی نظیر اکبرآبادی یا پریم چند بھی نظر نہیں آتا۔ جن کو ترقی پسند اپنا سالار نہیں تو ہم سفر مانتے ہیں۔ پس رو جاننے لگے ہوں تو عجب نہیں ترقی پسند ادب نے اغراض و مقاصد معمولی اور وقتی رکھے اور اس کے لیے وسائل سستے اور ناپسندیدہ اختیار کیے۔ مقصد یہ کہ ماضی اور موجود میں جو کچھ ہے وہ بے کار اور نقصان دہ ہے۔ اس کو ختم کر دینا اور اشتراکی معیار و مسلک کو برسرِ کار لانا روحِ عصر کا تقاضا ہے۔ یہاں تک غنیمت تھا لیکن اس کے حصول کے لیے بدامنی اور بدکلامی اور آبروریزی کے جو طریقے اختیار کیے گئے یا جس طرح ان کا مظاہرہ کیا گیا وہ ہندوستان بالخصوص اردو اور اردو سماج کے لیے ناقابلِ قبول ہی نہیں ناقابلِ عفو تھا۔ مقصد بھلا ہو یا بُرا، اس کے حصول میں اگر مشتبہ وسائل اختیار کیے جائیں گے تو اچھا کو بھی اچھا کہنے والا کوئی نہ ملے گا۔ جدید شعر و ادب میں زندگی کی جس ناگفتنی کو جس طرح پیش کرنا چاہیے تھا اس کے لیے مخصوص لیاقت کے ساتھ جس انتظار اور تحمل کی ضرورت تھی وہ جدیدیت کے پرستاروں میں نہ

تھی۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ سیاست پر غلبہ پانے کے لیے جو وسائل کارگر ہوتے ہیں، شعروادب میں بار پانے کے لیے وہ بے کار ہی نہیں مضر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ترقی پسندی کو معقول پسندی سے ہم دوش و ہم عنان نہ رکھ سکے۔ انھوں نے اس کا لحاظ نہ کیا کہ شعروادب میں اصلاح، آبروریزی سے نہیں عرق ریزی، حسن کاری اور حسن آفرینی سے کی جاتی ہے۔ ترقی پسند یا جدید شاعری کو جو ہیئت یا رنگ و آہنگ دیا گیا، اس میں اردو شاعری کے مانے ہوئے ادا شناسوں کے لیے کشش کوئی نہ تھی۔ اس سے برکراں رہنے کے عذر کافی تھے۔ ان کے علاوہ اردو شاعری کو غزل نے اپنے طور پر اس درجہ ہمہ صفت موصوف اور خواص وعوام دونوں کے لیے اس درجہ مقبول کر دیا تھا کہ اس کے مقابلے میں جدید شاعری کے اسالیب، موضوع اور مضامین قابل اعتنا نہ ہوئے۔ ترقی پسند ادیبوں نے اس نورم کو بالکل اہمیت نہ دی کہ کوئی بھی اسلوب کسی دوسری زبان یا قوم میں کتنا ہی کامیاب اور مقبول کیوں نہ ہو، بہت ممکن ہے کسی دوسری زبان یا قوم کی Genius اس کو بالکل قبول نہ کرے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس طرح کے تجربے نہ کیے جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ تجربہ ناکامیاب رہے تو اس پر ضد کرنا ظلم اور جہالت ہے۔ معاملہ شعروادب کا ہے، سیاست اور سیاہ بازاری کا نہیں ہے۔ ورنہ ظلم و جہالت کو معرضِ بحث میں نہ لاتا۔

اردو شاعری سے معمولی دلچسپی رکھنے والے بھی اسے محسوس کرتے ہوں گے کہ نئی شاعری اتنی مقبول اور کارآمد کیوں نہیں ہے جتنی کہ پرانی۔ اس کے اشعار یا مصرعے تقریر یا تحریر میں اس روانی اور برجستگی کے ساتھ کیوں نہیں آتے۔ جیسے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ یا دوسرے شعرا کے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نئی شاعری ہماری مسرّت و ملال، فکر و تخیل، خوشی اور خوب صورتی کی یا تو شریک نہیں ہے یا ان امور کے مناسب اظہار کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔ اس طور پر وہ اس مقصد کو نہیں پورا کرتی جو شاعری کا اوّلین تقاضا ہے۔ نئی شاعری میں نفرت، غصہ، انتقام کے ساتھ یا اس کے نتیجہ کے طور پر جو بدکلامی اور مریضانہ لذتیت ملتی ہے، وہ تمام تر تخریبی ہے اور یہ شاعری اور سوسائٹی دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہے۔ اب تک یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ ترقی پسند اور جدید شاعری میں مثلاً ناسخؔ، رنگینؔ، جرأتؔ، میرؔ، غالبؔ، انیسؔ،

داغؔ، حالیؔ، اکبرؔ، حسرتؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، فانیؔ اور فراقؔ کون ہیں۔ اچھا اور بڑا شاعر وہ ہے جو زندگی کے گوناگوں حقائق کو سامع اور قاری کے دل میں اس خوبی اور خوب صورتی سے اتار دے کہ وہ بھی اپنے کو اچھا اور بڑا سمجھنے لگیں۔ ایسی شاعری کس مصرف کی جس سے ہم نہ شاعری کی بڑائی محسوس کریں، نہ شعر کی، نہ شاعر کی، نہ اپنی یا بحیثیت مجموعی زندگی کی۔ بیش تر ترقی پسند یا جدید شاعری اور افسانہ نگاری میں کھلا یا چھپا تصرف یا فضا بٹیلس کی ملتی ہے۔ ان میں میراجیؔ اور ان کی شاعری نمایاں نظر آتی ہے۔ ترقی پسند یا جدید شاعری کی جو روایت رہی ہے اور اس کا جو کینڈا نظر آتا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہوتا ہے کہ ان میں نہ کوئی بڑا شاعر پیدا ہوگا نہ ان میں بڑی شاعری کی صلاحیت ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان کے علَم برداروں کو سوچنا چاہیے کہ یہ ہم ہمہ اور طنطنہ کیوں اور کب تک؟ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا مغرب کے ان باکمالوں کی طرف کیوں نہیں مائل ہوتے، جنھوں نے اپنے فکر وفن سے اپنے شعر وادب نیز اپنی قوم اور ملک کو سر بلند کر دیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ان کاملوں کو پہنچانتے نہ ہوں، پھر وہ ان لوگوں کی نقل کیوں کرتے ہیں جو شعر وادب اور اس کے وسیلے سے زندگی کی قدر و قیمت بڑھاتے نہیں گھٹاتے ہوں۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ عظیم کو جانتے ہوئے حقیر پر اکتفا کرتے ہیں۔ طبیعت کا یہ رجحان بڑا مایوس کن ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشیں کر لیجیے کہ جدید تنقید نگاری کا بھی کچھ اسی طرح کا حال ہے جہاں ہر شخص اپنے ہی فرمودات کے راگ الاپتا ہے۔ تنقید نگاری دراصل ایمان داری اور جرأت سے کھوٹے کھرے کی پہچان ہے۔ اپنی تحسین اور پرائے کی تنقیص نہیں ہے۔ جہاں ہر مصنف ذاتی مسلک یا نقطۂ نظر یا قبیلے کے نفع وضرر کو ملحوظ رکھے گا، وہاں تنقید کے اصول کس طرح وضع ہوں گے یا ان کی تطبیق کیوں کر ہو سکے گی۔ جہاں جتنے ازم ہوں گے اتنی ہی وہاں کی تنقید نگاری غیر معتبر ہوگی۔ ترقی پسند شاعری کی بدنصیبی تھی کہ وہ ہندوستان میں ایسے وقت نازل ہوئی جب مہاتما گاندھی جیسے معلّم اخلاق و اخلاص کا سایہ عام ذہنوں پر پڑ رہا تھا اور ملک کی آزادی کی منزل بہت قریب آ گئی تھی۔ دوسری طرف حالیؔ، اکبرؔ و اقبالؔ کے علاوہ بیسویں صدی کے بہترین غزل گو اردو شعر وادب کو ایک نامعلوم طویل مدت تک کے لیے آراستہ اور استوار کر چکے تھے۔ غزل نے اردو زبان اور شعر وادب کو ہمسایہ زبانوں میں

ممتاز بنانے اور اس کو ناقابلِ تسخیر کر دینے میں جو حصہ لیا ہے اور ترقی پسند ادب کی یلغار کو پسپا کرنے اور ناکام بنانے میں جو رول ادا کیا ہے اس سے انکار کرنا سہل نہیں ہے۔ پھر اقبالؔ نے اپنے گراں بہا تصرف سے غزل کو جہاں پہنچا دیا، اس کا احساس و اعتراف ہم سے زیادہ غالبًا ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو ہوگا۔ کبھی بے اختیار محسوس ہوا ہے، اس لیے دلیل دینے کی ضرورت نہیں کہ جنگ ہو یا صلح ہر زمانے میں غزل اردو شعر و ادب کی سب سے بڑی محافظ، محسن اور محبوبہ رہی ہے اور شاید ہمیشہ رہے۔

جدید شاعری کے نمایاں کارناموں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس میں اردو شعر و ادب کی خامیوں، غیر ملکی تسلط، سرکاری دربار کے کرتوت، جاگیردارانہ استحصال اور دوسرے شامت اعمال کی جس طرح مذمت کی گئی ہے، وہ اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی۔ لیکن اکبرؔ کے کلام کا مطالعہ لیاقت اور ایمان داری سے کریں تو معلوم ہوگا کہ ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے اکبرؔ نے جو بات جس موقع پر جس طرح کہہ دی اور اس کا جیسا اثر جن نامساعد حالات کے باوجود ہوا، وہ اردو شاعری میں بے مثل ہے۔ مغرب کی سطوت اور انگریزی حکومت کے جبروت کا حصار جس دلیری اور چابک دستی سے اکبرؔ نے توڑا اور ہم کو طلسم ہیچ مقداری سے نکال کر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بر سر کار لانے کی ہمت دلائی، اس میں اکبرؔ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جس میں اس وقت تک کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نہ تھا۔ اکبری طنز و تفریح سے تشدد کو زیر کرنا، عدم تشدد کی معمولی مثال نہیں ہے۔

اردو شعر و ادب اور اردو سماج کو اکبرؔ، حالیؔ اور اقبالؔ نے جو منزلت بخشی، اس کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کی خدمات کو سامنے رکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دراصل کسی قوم، ملک اور شعر و ادب کو اہمیت و عظمت دینے والے اس کے اعلیٰ پائے کے شعرا ہوتے ہیں، نہ کہ اربابِ دولت و اقتدار۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ انگریز کیوں ایسا کہتے ہیں کہ وہ ملک دے دیں گے، شیکسپیئر کو نہ دیں گے۔ شیکسپیئر کو نہ دینے میں انگریزی شعر و ادب کی کیسی اور کتنی بڑائی انگریزوں کے دل میں مضمر ملتی ہے۔ کچھ اس طرح کی بات ہے کہ آج ہم اردو زبان و شعر و ادب کے تحفظ و ترقی میں ہر طرح سے کوشاں ہیں، لیکن کچھ کر نہیں پاتے۔ غالبًا ہم سے بھی زیادہ اس

رمز (اردو کی اہمیت) سے اردو کے مخالف واقف ہیں۔ زبان و بیان اور پیش پا افتادہ موضوعات کے انتخابات کے سبب سے ہم کو اکبر اتنے گھریلو معلوم ہوتے ہیں کہ ہمارا ذہن ان کے آفاقی اور دوامی شاعر ہونے کی طرف منتقل نہیں ہو پاتا، اور اس سخن فہمی کو کیا کہیے کہ ہم اکبر کے کلام کو تفریح سمجھتے ہیں، تازیانہ بالکل نہیں۔

طنز و مزاح کو مشکل بلکہ بہت مشکل اس لیے بتایا جاتا ہے کہ یہ جتنے وہبی ہوتے ہیں اس سے زیادہ مشق و مزاولت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ یہ بات ہر فن کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، لیکن طنز و مزاح کا معاملہ کچھ اس طرح کا ہے کہ اس میں کتابی باتیں بندھے ٹکے انداز سے نہ کہی جاتی ہیں، نہ ان کو سننے پر کوئی شخص آمادہ ہو سکتا ہے۔ تاوقتِ کہ قاری اور سامع میں 'وہ کہیں اور سنا کرے کوئی' کا کوئی نازک یا نامعقول رشتہ نہ ہو۔ دین و دنیا کے بڑے سے بڑے مسائل یا حقائق پر ہر شخص فاضلانہ، مشفقانہ، ورنہ منافقانہ گفتگو کر سکتا ہے۔ لیکن بات کتنی ہی بڑی یا معمولی یا بات کرنے والا بڑا یا معمولی ہو، طنز و مزاح کے تمام تقاضوں کو پورا کیے بغیر ان کا معتبر نمونہ نہیں پیش کر سکتا۔ تمام تقاضوں کی شرط اس لیے رکھی گئی کہ طنز و مزاح کی نماز میں فرائض ہی فرائض ہیں، نوافل بالکل نہیں۔ طنز و مزاح کے صوفیائے کرام سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جزو میں کُل اور کُل میں جزو دیکھنے کا مطالبہ اور تلقین کرتے ہیں۔ جس طرح طنز، نہ آبرو باختگی ہے، نہ آبروریزی، اسی طرح ظرافت مسخرگی ہے نہ پھکڑ پن، طنز و مزاح میں سب سے بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے جو بالعموم معذوری پر ختم ہو جاتی ہے کہ ان کے بنے بنائے سانچے نہیں ملتے۔ ہر بار حسب حال سانچے بنانے پڑتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ طنز و مزاح کی صنعت یا عبادت مشین نہیں دیتی ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر سطح پر طنز و ظرافت کے مطالبے پورے کرتے ہیں۔ خواہ وہ سطح 'طارم اعلیٰ' کی ہو، خواہ اپنے 'پشتِ پا' کی۔ امیر خسرو کی طرح وہ پنہارن اور ساقن کی بھی فرمائش پوری کر سکتے ہیں اور اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا علیہ الرحمتہ کی تعمیل ارشاد میں سخن سرا اور نغمہ سنج بھی ہو سکتے ہیں۔

سب سے جامع اعتراف اکبر کی جینیس اور شخصیت کا اقبال نے کیا، جب انھوں نے کہا:

سرِ قدوۂ طورِ معنی کلیمے — بہ بُت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
گہے گریۂ اُو چو ابر بہارے — گہے خندۂ اُو چو تیغ اصیلے!

اکبر ان شاعروں میں ہیں جن کے بغیر کسی زبان کی شاعری مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ اس اعتبار سے کہ طنز و مزاح شاعری کی سب سے نازک اور مشکل اصناف میں سے ہیں۔ اس صنف میں ہر سطح پر کامیاب شاعری اکبر ہی کے بس کی بات تھی۔ اقبالؔ کے بعد غالباً اکبر ہی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں اتنے بے شمار موضوعات پر اظہار خیال کیے ہوں گے۔

علی گڑھ کی تحریک کی کامیابی کا راز سرسید کی حیرت انگیز حقیقت پسندی، قوم کو اقبال مند دیکھنے کی آرزو، اس تاریخی رول کو انجام دینے کا شدید احساس، جس کا حالات و حادثات تقاضا کر رہے تھے اور مقصد کو حاصل کرنے کی ناقابلِ تسخیر لگن تھی۔ جس زمانے میں انھوں نے اپنے مشن کا آغاز کیا، اس میں مذہب جتنا روایتی ہوگیا تھا، اتنا ہی عوام پر اس کی گرفت بڑھی ہوئی تھی۔ سرسید اس کو صحیح خطوط پر لانا چاہتے تھے، لیکن مذہب کی جو تعبیر و تصویر وہ پیش کر رہے تھے، اس سے اس وقت کے علما اور عوام دونوں کو اتفاق نہ تھا۔ اس بارۂ خاص میں جو دشواریاں پیش آئیں، ان سے عہدہ برآ ہونے میں سرسید کو اپنے رفقا سے بھی تائید نہ ملی۔ یہاں تک کہ مذہب کے محاذ پر سرسید کو پسپا ہونا پڑا۔ ایسے وقت میں سرسید کو حالؔی نے سہارا دیا اور کم لوگوں کو اس کا احساس ہوگا کہ یہ سہارا کتنا بروقت اور کتنا قیمتی تھا۔ یعنی حالؔی نے مسدّس لکھی۔ اس مسدّس کے صلے میں آخرت میں حالؔی یا سرسید کو کیا اجر ملا ہوگا اس کا تو علم نہیں، لیکن اس نے اس دنیا میں سرسید اور ان کے مشن کو جو تقویت پہنچائی اور اقبالؔ کے پیام اور پروگرام کے لیے ہمارے ذہنوں کو جس طرح ہموار اور بیدار کیا، اس سے کون واقف نہ ہوگا۔ ایک تعلیمی تحریک جو زیادہ تر مغربی خطوط پر بروئے کار لائی گئی تھی اور مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اصلاح اور عام ترقی کا منشا جو اس تحریک میں مضمر تھا، اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا تھا اور اس میں محکمی نہیں آسکتی تھی، جب تک کہ مسلمانوں کو یہ نہ بتایا جاتا کہ مذہب اور اس کی اعلیٰ روایات سے بیگانہ ہونا قومی ذلت اور زوال کا باعث ہوتا ہے۔ حالؔی نے مسدّس سے سرسید کی تحریک پر مہر تصدیق نہ لگا دی ہوتی تو اس وقت

کے عام مسلمان جس حالت میں تھے، وہ علی گڑھ تحریک کو اس گرم جوشی سے لبیک نہ کہتے، جس کا غیر معمولی اظہار انھوں نے کیا۔

حالؔی میں غیر معمولی صفات جمع تھیں۔ ہماری تہذیبی زندگی میں حالؔی کی شخصیت اور شاعری بڑی اہم اور گراں مایہ ہے۔ وہ اردو شعروادب اور اردو سماج کے ضمیر ہیں۔ وہ ان اقدار عالیہ وعمل کا نمونہ ہیں جو ہمارے معاشرے اور شعروادب کو پاکیزگی، حسن اور آرزومندی بخشتے ہیں۔ جس نے ان کو ہم عصر معاشرے اور شعروادب میں بڑے اونچے درجے پر فائز کیا ہے۔ حالؔی کا گھرانہ مذہبی تھا، ماحول تہذیبی۔ وہ مائل بہ زوال تہذیب جو شام کے پھیلتے ہوئے سائے میں اور زیادہ حسین اور ناقابل تسخیر بن جاتی ہے۔ حالؔی کا جن لوگوں سے سابقہ ہوا وہ دہلی کے منتخب روزگار تھے۔ اس دہلی کے جو خود عالم میں انتخاب تھی۔ شیفتؔہ، غالبؔ، سرسیّد، حکیم محمودؔ علی خاں اپنے زمانے کے ذہن، ذوق اور انسانیت دوستی کے امام مانے جاتے تھے۔ حالؔی نے دہلی کی تہذیب کو ان میں جگمگاتے بھی دیکھا، بجھتے بھی۔ تائیدِ الٰہی نے بالآخر ان کو سرسید سے منسلک کردیا۔ پھر ایک ایسا معجزہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو دفعتاً اُچھال دیا جو سرسید کی ناخدائی میں علی گڑھ کے ساحل پر پہنچی۔

حالؔی، مذہب، اخلاق اور تہذیب کا نمونہ ہونے کے ساتھ غیر معمولی شاعر اور ادیب بھی تھے، نظم اور غزل دونوں کے۔ اس اعتبار سے کہ ان کی غزلوں میں غزل کی تمام خوبیاں ملتی ہیں، اس کی خامیاں کوئی نہیں۔ غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ کے عہد میں حالؔی کا غزل میں اپنی راہ علاحدہ نکالنا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ حالؔی سرتاسر مذہبی و اخلاقی ہوتے ہوئے غزل کو ایسا حسن، پاکیزگی، تاثر اور فکرانگیزی دیتے ہیں جو اردو کے دو ہی ایک اکابر شعرا میں ملتی ہے۔ غالبؔ سے شیفتگی ہوتے ہوئے حالؔی نے اپنی شاعری کو غالبؔ سے علاحدہ رکھا، اور غزل کو ایک نئی روایت دی۔ ایسی اعلیٰ روایت کہ اس پر عمل کرنے کی بہت کم شعرا نے ہمت کی۔ مسدّس اور مناجات بیوہ کو بیچ میں لاکر جو لوگ حالؔی کا مذاق اُڑاتے ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان نظموں کی روح سے اردو کے کتنے شعرا کو ذہنی تطہیر، بلند حوصلگی اور انسانیت دوستی نصیب ہوئی ہے۔

حالی کی مسدس کی منزلت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ خود ہندی شعر و ادب کے فاضلوں کو محسوس ہوا کہ قوم کو اپنے ماضی سے جوڑنے اور اس کی خفتہ اعلیٰ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے 'مسدسِ حالی' کے خطوط پر ہندی میں ایک مسدس لکھنی پڑے گی۔ سنتا ہوں ہندی میں ایسے مسدس کی داغ بیل ڈالی جا چکی ہے۔ ہم حالی کی غزل کے معترف ہیں، لیکن اس پر نہیں غور کرتے کہ حالی کی غزل کہاں سے کشید ہوئی ہے۔ نیت بخیر ہو اور ذوق صالح تو محسوس ہوگا کہ مسدس اور غزل میں ہیئت اور موضوع بدلے ہوئے ہیں، لیکن دونوں میں حالی کی قابلِ احترام جینیس یکساں طور پر اپنے حسن تاثر کے ساتھ سایہ فگن ہے۔ حالی نے اردو شعر و ادب کو جو برکت و ثروت بخشی اس کی مثال نہ ان سے پہلے ملتی ہے، نہ ان کے بعد۔

'مقدمہ شعر و شاعری' کے پیش نظر حالی کی تنقید نگاری کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، آئندہ بھی کہا جاتا رہے گا۔ اس کا سبب مقدمہ کی کوئی بنیادی خامی نہیں ہے بلکہ اس کا بنیادی اصول ہے۔ حالی پر عام اعتراض 'نزدعلاقاں' یہ کیا جاتا ہے کہ وہ شعر و ادب میں کھوٹے کھرے کا حکم اخلاقی قدروں سے کیوں لگاتے ہیں، سیاسی اور سماجی کیوں نہیں۔ یہ اس لیے کہ شعر و ادب شعر و ادب ہے۔ الیکشن کی بدعملی نہیں، جہاں موقع و محل سے صواب و ناصواب کا حکم لگاتے ہیں۔ اخلاقی قدریں سیاسی اور سماجی قدروں سے زیادہ دیرپا ہمہ جہت، صحت مند اور صحت بخش ہوتی ہیں۔ جدید تنقید نگاری، جو مغرب سے کسی کولمبو یا گندم گرفت پلان کے تحت ناترقی یافتہ ملکوں میں درآمد ہوئی ہے، اسی افراتفری کی غمازی کرتی ہے۔ جس کا ذکر اس سے پہلے مغربی شعر و ادب کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ یعنی کسی سبب سے کوئی بات کسی کے ذہن میں آئے، کسی نہ کسی موجودہ یا متوقع ازم کے تحت قبول کر لی جائے گی۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ جتنے ازم بڑھیں گے، اتنا ہی خلفشار زندگی میں، اس لیے شعر و ادب میں بڑھتا رہے گا۔ بالفاظ دیگر ازم کی جتنی کثرت ہوگی، شعر و ادب کا سکہ اتنا ہی کم عیار ہوتا جائے گا۔ حالی کی نظر میں بیش تر ابتری کا سبب اخلاقی ابتری تھی۔ ظاہر ہے ایسا شخص شعر و ادب کے عروج کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرے گا۔ اس لیے کہ اعلیٰ شعر و ادب مذہبی اور اخلاقی تقاضوں ہی کی تعمیل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کی تزئین و تاثیر کے مسائل عہد بہ عہد کے مذاق و مزاج کے مطابق طے پاتے رہتے ہیں۔ اکبر کی طرح حالی

اوران کی شاعری کے بارے میں بھی میرا خیال ہے کہ حالی کے بغیر کوئی شعر وادب مکمل نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوا ہے، جیسے اقبال کی بعثت کے بعد شاید رسول کبھی نہ آئیں، نبی آتے رہیں گے۔ حالی کے بارے میں جدید تنقید نگار کیا خیال رکھتے ہیں۔ ایک مضمون سے حسب ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''.........اس المیہ کا ذمہ دار میں اتنا جدید نقادوں کو بھی نہیں سمجھتا، جتنا مولانا حالی کو.........مولانا حالی نے سب سے پہلے شاعری کو نقدِ شعر سے زیادہ اپنے دور کے سماجی شعور کے پیمانے پر جانچا۔ اس میں مولانا حالی کی بدنیتی کا کتنا دخل تھا اس کو وہ خود ہی جانتے ہوں گے.........مولانا حالی نے شاعری کی پرکھ کا معیار صرف کسی مقصد یا نظریہ کو قرار دے کر یقیناً اردو تنقید کی پہلی ہی اینٹ کج رکھ دی.........حالی نے تنقیدِ ادب کا مفہوم ایک سرے سے سمجھا ہی نہیں اور ادب کے تخلیقی عمل اور قدر و قیمت پر محض نظریات اور مقاصد کو ترجیح دی۔ اس لیے حالی نے تخلیقی معیار کی عین اس وقت گردن مار دی، جب اردو تنقید کے پہلے اصول متعین ہو رہے تھے۔ حالی کو اپنی کج فہمی پر اتنا اصرار تھا کہ انھوں نے اپنے تنقیدی اصولوں پر جس شاعری کے نمونے تخلیق کیے، ان سب سے زیادہ بھدّے بھونڈے اور بدمذاقی کے شاہ کار آج تک دوبارہ نہیں پیدا ہوئے۔ اگر غزل گو حالی کے اشعار اور تنقید نگار حالی کے اشعار ایک ساتھ رکھ دیے جائیں تو ایک ناواقف شخص ساری زندگی یہ یقین نہیں کرسکتا کہ شاعری کے یہ دونوں نمونے ایک ہی شخص کے ہوسکتے ہیں۔ تنقید نگار حالی کا مطالعہ اس اعتبار سے بہت دلچسپ اور افسوس ناک حماقتوں کا سراغ مہیا کرے گا.........''

(نیا دور، کراچی، شمارہ: 42-41، تنقید کی کھڑاؤں، ص: 346، شمیم احمد)

تنقید شعر و ادب کی ہو یا کسی اور کی، نہ تخلیقی عمل کی پابند رکھی جا سکتی ہے۔ نہ نظریات کی، نہ سماجی شعور کی، نہ سیاسی تقاضوں کی۔ تاوقتِ کہ ان سب کا مقصد و منشا انسان اور معاشرے کی بڑائی اور بھلائی نہ ہو۔ بڑائی اور بھلائی میں پیوست اور برہنگی و بداعمالی میں تازگی دیکھنے اور پانے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ حسن اسی وقت تک حسن ہے جب تک وہ اخلاق و انسانیت کی چاکری میں ہے۔ ایسا نہیں ہے تو ایسے حسن کو کوئی اور نام اور کام دینا چاہیے۔ ضمناً یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تنقید کے صحیفۂ اخلاق میں بھی آیا ہے کہ جب زیر بحث کوئی مخلص اور شریف شخص ہو تو لب و لہجہ کا خاص طور پر لحاظ رکھتے ہیں۔ علی گڑھ کے حالؔی اور حالؔی کے علی گڑھ کی یہی روایت ہے۔

اردو ہندی سے برآمد ہوئی ہے۔ اس کی اساس ہندی پر ہے۔ وسعت، جامعیت اور محکمی کے لیے بڑی حد تک اس نے فارسی سے استفادہ کیا ہے۔ اس میں عربی کی بھی مشاطگی ملتی ہے۔ اردو کے سہل ممتنع اشعار، ہندی سے قریب ہی نہیں کہیں کہیں اس سے جا ملے ہیں، اور اشعار کا سہل ممتنع ہونا شعر کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اردو ہندی سے کتنا قابلِ قدر اور ترقی پذیر ربط رکھتی ہے۔ اس طرح وہ اس قرض یا فرض کو بڑے خلوص، خوب صورتی، فراخ حوصلگی اور پابندی سے ادا کرتی رہتی ہے، جو اس پر ہندی کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ دوسری طرف دقیق خیالات اور وارداتِ ذہنی کے کامیاب اظہار کے لیے وہ فارسی اور اس کے توسّل سے عربی کو بھی عقیدت کا خراج پیش کرتی رہتی ہے۔ موخر الذکر خصوصیت کے اعتبار سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں صرف اردو ایسی زبان ہے جو اپنے وطن کی ان تمام ملکوں میں نمائندگی کرتی ہے، جہاں فارسی اور اردو کا چلن ہے۔ بلکہ ان ملکوں کی جہاں فارسی اور عربی کا کاروبار ہے، اپنے وطن میں خیر سگالی کے فرائض انجام دیتی ہے۔ خیر منشی اور دل نوازی کے ایسے فریضے جو ختم کبھی نہ ہوں گے، نفع بخش ہمیشہ رہیں گے۔

اقبالؔ اور غالبؔ ہمارے وہ یگانۂ روزگار شعرا ہیں، جنھوں نے اردو زبان اور اردو شاعری کا حسب و نسب بلند کیا۔ غالبؔ نے فارسی کے سہارے سے اردو کے نسب کو ولیؔ اور ان کے چند پیش رووں سے آگے بڑھا کر رودکی سے ملا دیا۔ اس فارسی کے سہارے جو صدیوں پہلے

سے ہندوستان کی فضا میں نشوونما پارہی تھی اور اپنے نوک پلک اور آب و رنگ کے اعتبار سے سبک ہندی کہلائی۔ دوسری طرف اقبال نے فکر کی بلندی، جذبے کی طاقت وطہارت اور تخیل کی نادرہ کاری سے اس کو مثنویِ مولوئ معنوی تک پہنچا دیا۔ اقبال نے فارسی کو اردو سے ربط دے کر اس کو وہ حسن بیاں اور رزورِ بیاں دیا جو اعلیٰ بیانیہ شاعری کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ بیانیہ شاعری میں المیہ وطربیہ مثنویاں ہی نہیں، بلکہ وہ شاعری خاص طور پر آتی ہے جس کا نمونہ مولانا روم کی مثنوی ہے۔ اقبال کی مختلف چھوٹی بڑی نظموں میں اس صنفِ شاعری کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اردو میں جب کبھی مہابھارت یا ڈوائن کومیڈی کے انداز کی کوئی چیز لکھی گئی تو اس کی زبان، انداز اور سطح وہی ہوگی جو اقبال نے مقرر کر دی ہے۔ اس طور پر اقبال نے اردو اور اردو شاعری کو 'نسب' ہی نہیں 'حسب' بھی دیا۔

اردو میں فارسی آمیزی غالب اور اقبال دونوں نے کی۔ اس فرق کے ساتھ کہ اردو میں غالب کے لائے ہوئے فارسی الفاظ کھٹکتے ہیں۔ جیسے اردو میں امتزاج نہ پا سکے ہوں۔ اقبال کی اردو میں وہ اس خوبی سے ترکیب پا گئے ہیں جیسے وہ لفظ فقرہ یا عبارت اردو کے منجملہ اسبابِ حسن ہو، اور ظاہر ہے جو چیز اردو سے ربط پا جائے گی وہ 'بچشم مست ساقی وام کردن' کا کیا نمونہ پیش کرے گی۔ تعجب اس کا ہے کہ اردو اور فارسی سے غالب جتنے آشنا تھے اور زبان کی جس ٹکسال میں وہ رہتے تھے، اقبال کو نصیب نہ تھی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کی زبان اہلِ زبان نہیں بلکہ اعلیٰ موضوعات کا اعلیٰ شاعر متعین کرتا ہے۔ ایسے شاعر کم گزرے ہیں جنھوں نے اقبال کی مانند اپنی شاعری سے قوم کی تقدیر بدل دی ہو، اور اس قوم نے از سرِ نو اپنی بازیافت کی ہو۔ ظاہر ہے ایسی شاعری کی پرداخت میں شاعر نے فن، زبان، تاریخ، تہذیب اور زندگی کے کتنے اور کیسے کیسے معظمات کا لحاظ رکھا ہوگا۔ اقبال کا کلام حیرت انگیز حد تک ہر طرح کے حشو و زوائد اور رسمی و روایتی تکلفات سے پاک ہے۔ کہیں بھی کوئی لفظ، فقرہ یا عبارت یا مفہوم ایسا نہ ملے گا جو شاعر کے عجزِ بیان کی غمازی کرتا ہو، یا ضرورت شعری یا خانہ پری کے لیے لایا گیا ہو، اور کون سی سنجیدہ صنفِ شاعری ایسی ہے جس میں اقبال نے اردو کے بڑے سے بڑے شاعر سے کم تر درجے کا کوئی شعر کہا ہوگا۔ کم تر کا لفظ میں نے بر بنائے احتیاط استعمال کیا

ہے، ورنہ زیادہ صحیح لفظ کام میں لاتا۔ اقبالؔ نے اپنی اعلیٰ تخلیقات کے لیے 'عبارت، اشارت اور ادا' کے جیسے برمحل، حسین اور بے مثل پیکر تراشے ہیں، یا صوت و ساز وضع کیے ہیں۔ وہ بجائے خود اقبالؔ کے غیر معمولی حسن آفریں اور حسن کار جینیس (Genius) ہونے کی دلیل ہے۔ اس وادی میں بھی اقبالؔ کا ہم سر کوئی دوسرا اردو شاعر نہیں۔ خوب صورت الفاظ اور ترکیبیں، تشبیہ و استعارے بعض دوسرے شعرا کے یہاں بھی معمول سے زائد ملیں گے۔ لیکن موضوع و محل سے معنوی اور حسن کارانہ ربط نہ رکھنے کے سبب سے سامع پر اگر وہ سخن سنج ہے، اس کا اثر وقتی اور سطحی ہوگا۔ جیسے یہ الفاظ اور ترکیبیں وسیلے کے طور پر نہیں مقصد کے طور پر وہ بھی مشتبہ مقصد کے لیے کام میں لائی گئی ہوں۔ مقصد تاثیر نہیں، نمائش ہو اور شاعر کے پاس کہنے کو کچھ نہیں دکھانے کو سب کچھ ہو۔ شاعری میں کسی وقت مرصع کاری بہت مقبول تھی، اور اس کے لوازم میں سمجھی جاتی تھی، لیکن مرصع کاری دراصل زبان اور شاعری کے ابتدائی عہد کے تکلفات میں سے ہے جن سے دونوں بہت جلد نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ اب ٹیگوریت اور ادبِ لطیف اردو نثر اور مرصع کاری اردو نظم میں شاید ہی کہیں نظر آئے۔ حالیؔ کی انسانیت دوستی، حقیقت پسندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش نے اردو شاعری میں اس کے چلن کو معطل اور اقبالؔ کے

چہ باید مرد را طبعے بلندے، مشربے نابے
دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے!

نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ یہاں 'مرد' سے ہم سے آپ سے زیادہ شاعر مراد ہو تو عجب نہیں۔

اقبالؔ سے پہلے اردو میں حمد و نعت، معراج، معجزہ، مرثیہ و مناجات کی روایتی یا دین دارانہ شاعری ہوتی تھی، جس کا مقصد زیادہ تر ثواب حاصل کرنا ہوتا۔ محسنؔ کاکوروی کی 'چراغِ کعبہ' اور انیسؔ کے مراثی میں یہ انداز نمایاں طور پر ملتا ہے۔ جسے لکھنؤ اور لکھنویت نے مخصوص شان اور سطح دے دی تھی۔ اقبالؔ نے بھی ان موضوعات کو اپنایا، لیکن ان کا مقصد اور محور بدل دیا۔ اس لیے کہ وہ ملت کو مذلت سے نکال کر آزمائش و آرزومندی کے راستے پر لانا چاہتے تھے۔ تفصیل میں طوالت ہے۔ کچھ نزاکت بھی، اس لیے چاہتا ہوں کہ آپ خود کلامِ اقبالؔ کا مطالعہ کریں، اور غور فرمائیں کہ اگلوں نے مذکورہ صدر عنوانات پر جس طرح طبع آزمائی یا

دین داری کی ہے، اس کے مقابلے میں اقبالؔ نے فکر و عمل کی کیا دعوت دی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھیں کہ بحیثیت مجموعی ملّت کے کردار اور کارنامے نیز اردو شاعری کے وزن اور وقعت کے بڑھانے میں ایک طرف اقبالؔ اور دوسری طرف ان کے پیش روؤں کا کیا اور کیسا رول رہا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ملّت کی شاعری اور دین داری کی شاعری میں کیا تفاوت ہے، اور اس بارۂ خاص میں ہم آپ اور ہمارا شعر و ادب دوسروں کی نظر میں کتنے ارجمند، اس لیے اقبالؔ کے احسان مند ہیں۔

بعض حلقوں میں اقبالؔ کی شاعری اور اس کے تصرفات و فتوحات کو مذہبی، اسلامی یا ماضی (مطلق) کی شاعری قرار دے کر قابلِ اعتراض یا ناقابلِ التفات بتایا جاتا ہے۔ یہ تنقید نگاری کی وہ اونچی منزل ہے جہاں اس کی سرحد روشن ضمیری سے جا ملتی ہے۔ کسی قوم یا شعر و ادب کے مذہبی ہونے میں کیا قباحت ہے۔ اگر وہ قوم انسانیت دوست، اولوالعزم، علم و فن کی علَم بردار اور اقتدارِ جلیلہ کی حامل ہے اور اس کا شعر و ادب ان صفات کا آئینہ دار ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر بڑا شاعر خواہ اس کی نسبت کسی قوم و ملک، مذہب اور شعر و ادب سے کیوں نہ ہو، ہر قوم، ملک اور شعر و ادب کا یکساں بڑا شاعر ہے، اس لیے قابلِ تکریم ہوتا ہے۔ وہ جن عظیم اقدار اور حقائق کو پیش کرتا ہے وہ فی نفسہٖ ہر ملک و ملت اور شعر و ادب کے لیے بیش قرار اور قابلِ قبول ہوتے ہیں۔ صرف ان اقدار و حقائق کو پیش کرنے کا انداز اور سطح بدلی ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جتنے بڑے شاعر اور فن کار ہوتے ہیں، اکثر اس پائے کے تنقید نگار نہیں ہوتے۔ تاوقتِ کہ کوزہ، کوزہ گر اور گلِ کوزہ ایک ہی نہ ہوں۔ جیسا کہ ہمارے شعر و ادب میں اکثر نظر آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قارئین و ناظرین شاعر تک پہنچ نہیں پاتے۔ تنقید نگار کے ساتھ برخود غلط گمراہ و واماندۂ راہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اقبالؔ کے ایک شعر میں کبوتر پر شاہین کے جھپٹنے کا جو قصہ ہے، جس پر احتجاج کرنے کے لیے سیکورٹی کونسل سے درخواست کی جایا کرتی ہے کہ امن عالم کے تحفظ کے لیے وہ مسلسل 'بہ اجلاس کونسل' رہے۔ درحقیقت کسی کمزور پر زبردست آزاد کی تاخت و تباہ کاری کی دعوت یا اعلان نہیں ہے، بلکہ خطرے (ایمرجنسی) کے موقع پر اپنے آپ کو مستعد اور فعال (Alert and Active) رکھنے کی مصلحت ذہن نشیں کراتی ہے۔ جس طرح صلح کے

زمانے میں جنگ کے مطالبات کے پیشِ نظر فوج کے سپاہیوں کے خون کو گرم، اعصاب و عضلات کو فشار آزمودہ اور شہامت وشجاعت کو تازہ و تیز رکھنے کے لیے برّی اور بحری اور فضائی قواعد پریڈ بلکہ مصنوعی جنگ کراتے ہیں۔ مثال سے سراسیمہ نہیں شعروادب کا رمز شناس ہونے کا ذوق وظرف پیدا کرنا چاہیے۔ شاہین، کبوتر کی حکایت صرف تمثیل ہے، تبلیغ ہرگز نہیں۔

ہندوستان میں غالب، ٹیگور اور اقبال کا شمار کچھ اور نہیں تو انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں ہندوستان کے سرآمد شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی اہمیت وعظمت کو یہ کہہ کر محدود یا داغ دار نہیں کرنا چاہیے کہ یہ مسلم ہے یا وہ غیر مسلم۔ رومؔی کے قد وقامت کا شاعر رومؔی سے قبل یا ان کے بعد اقبال کے سوا مسلمانوں میں کہیں نہیں پیدا ہوا۔ یہاں اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ رومؔی کے زمانے اور زندگی کا موازنہ اقبال کے زمانے اور زندگی سے کریں تو آسمان اور زمین کا فرق نظر آئے گا۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں دنیا جس طرح زیروزبر ہوئی ہے، اور جدید نے قدیم پر جس سفاکی سے غلبہ پایا ہے اور جدید خود جس سرعت سے قدیم ہوتا رہتا ہے، اس کی مثال تہذیب وتمدن کے پچھلے پانچ ہزار برس میں نظر نہ آئے گی۔ اس اعتبار سے رومؔی اور اقبالؔ کے فکروفن کے حدود اربعہ، ابعادِ ثلاثہ اور کیف وکم کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اقبالؔ نے وہ زمانہ پایا جب سائنس، ٹیکنالوجی، سیاسیات، عمرانیات، ادب، الٰہیات، عقلیات اور دیگر علوم کے کسر وانکسار یا خانہ جنگی اور ان سے برآمد ہونے والے نت نئے اور پیچیدہ تر مسائل کا سامنا تھا۔ دنیا کی دو ہولناک ترین جنگوں نے سوچنے اور عمل کرنے کے معیار ومیزان کو یکسر بدل دیا تھا۔ نفس کے مطالبے روح کے تقاضوں پر تیزی سے غالب آرہے تھے۔ اسلام کی تائید، تحفظ اور ترقی کے جتنے بے شمار سنگین مسائل اور کافر ذہنوں کا اقبالؔ کو سامنا تھا، رومؔی کا دوران سے قطعاً خالی تھا۔ رومؔی نے اپنی مثنوی میں جو تکنیک اختیار کی وہ آسان تھی۔ اس کو تنقیدی نظر سے دیکھنے اور پرکھنے پر کسی کو کبھی اصرار نہ ہوا۔ اقبالؔ نے رومؔی سے کہیں زیادہ نازک، مشکل اور متنوع مسائل پر ان تمام لوازم کو پورا کرتے ہوئے واضح اور مکمل فیصلے صادر کیے ہیں، جن کا آج کل کے علوم وفنون اور کیسے سخت گیر علوم وفنون مطالبے کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کارنامے کو بھی نظر میں رکھیے کہ انھوں نے اپنے ذہن کی بے مثل ثروت سے اردو شعروادب کی ثروت میں گراں قدر

اضافہ ہی نہیں کیا، بلکہ اردو شاعری کو ایسا اسلوب و آہنگ دیا جو آج تک اردو کا کوئی شاعر یا فن کار نہ دے سکا تھا، اور معلوم نہیں کب تک اس کی خوبی اور خوب صورتی پر اضافہ کرنے والی جینیس (Genius) ظہور میں نہ آئے۔ اس بیان سے رومی یا غالب کو اقبال سے فروتر دکھانا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ کوئی بڑا شاعر اپنا درجہ کبھی نہیں کھوتا۔ بعد کے آنے والے شاعر نہ اس کو پیچھے ڈھکیلتے ہیں نہ اس کی جگہ لیتے ہیں۔ بلکہ شاعری میں ایک نئے حسب و نسب یا سطح اور سمت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اردو کی اعلیٰ شاعری میں اقبال وہ نابغہ (جینیس) ہیں جو نامعلوم مدت تک 'نابغۂ ممتنع' کی حیثیت رکھیں گے۔ (اس سے بحث نہیں کہ قواعد کی رو سے 'نابغۂ ممتنع' کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں۔ واقعہ صحیح ہو تو ترکیب بھی جلد یا بہ دیر صحیح ہو جاتی ہے) اور یہ اقبال برہمن زاد اور ہندوستان نژاد تھے۔ ہندوستان کا عالمِ اسلام کو اقبال کی پیش کش ہندوستان کے کسی شخص کو قابلِ فخر محسوس ہو یا نہیں، ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمیشہ رہے گی۔

اقبال پر یہ بھی اعتراض ہے کہ وہ مغرب کی ہر بات کے خلاف ہیں، خواہ وہ مناسب و معقول ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح کا اعتراض اقبال پر تو کیا ان کے کلاسیکی ملازم علی بخش پر بھی عائد نہیں ہوتا، جس سے خود ڈاکٹر اقبال بے تکلف تھے۔ مغرب کی بہت سی خوبیوں سے انکار اقبال کے بعض بنیادی تصورات سے انحراف کا موجب ہوگا۔ انھوں نے مغرب کی جن باتوں کو امنِ عالم اور عظمت انساں کے خلاف پایا انھی کی مذمت کی ہے۔ نکتہ چینوں میں کوئی ایسا ذوق و ظرف رکھنے والا نہیں ہے جو اس کی داد دے سکے۔ اقبال نے (بالفرض) بے جا اعتراض بھی کس بے مثل انداز اور الفاظ میں کیا ہے، کاش دو ایک مغرب اور ہوتے تاکہ اقبال کے کچھ اور زندہ جاوید اشعار کا ہمارے شعر و ادب میں اضافہ ہو جاتا۔ اقبال کو اس جہاں سے رخصت ہوئے کم و بیش تیس سال ہوئے۔ اس دوران میں مغربی طاقتوں اور ان کے چھوٹے بڑے حواری اور حلیفوں نے پس ماندہ و درماندہ اقوام اور ممالک سے جو سلوک کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں، اس کا مقابلہ اقبال کے عہد سے کریں تو بہ یک وقت بغاوت اور بے چارگی محسوس کرنے کے ساتھ دل بے اختیار چاہنے لگتا ہے۔ کاش! پرانا اقبال زندہ ہوتا یا نئے اقبال کا ظہور ہوتا۔ 'بالِ جبریل' میں اقبال نے جن غزلوں میں مغرب کی جن معاصی کا ذکر کیا ہے اور اکثر کیا ہے، وہی حاصلِ غزل

ہیں۔یوں بھی ہم جانتے ہیں کہ اقبالؔ ہی ایسے شاعر ہیں جن کی غزلوں کا ہر شعر حاصلِ غزل ہوتا ہے۔اشعار اور اعتراض کو نظر میں رکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ معترض نہ مغرب کے گناہوں کو جانتا ہے، نہ اقبال کی بصیرت کا قائل ہے، نہ ان کی غزلوں کا اداشناس ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا شمار عہد کے ممتاز مفکرین دانش وروں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔اقبالؔ کے معترف اوران کے کلام کے مانے ہوئے مبصر ہیں۔اردو ہفت روزہ چٹان، لاہور مورخہ 24/اپریل 1967ء میں اس کے مشہور و محترم ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری کے مضمون سے حسبِ ذیل اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

''اقبالؔ کے افکار کا ایک ثلث مغربی افکار و استیلا کے خلاف احتجاج پر مشتمل ہے۔خود حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ تقلید مغرب میں نہیں ہے، لیکن فکر اقبال کے مولف (خلیفہ عبدالحکیم مرحوم) کیا فرماتے ہیں، اس اقتباس سے ظاہر و باہر ہے۔''

''اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے اور یہ مخالفت اس کے رگ و پے میں اس قدر رچی ہوتی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔مجموعی طور پر اثر ہوتا ہے کہ اقبالؔ کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلّی ہے۔بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان تصوف اور ذوق و شوق کے اشعار کہتے کہتے یوں ہی ایک آدھ ضرب رسید کر دیتے ہیں۔ بالِ جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں۔اکثر اشعار میں حکمت اور عشق کی دل کش آمیزش ہے، لیکن اچھے شعر کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں، اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ عیوب سے لبریز سہی، لیکن اس کا ذکر ہی

نہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفا آب رواں کا لب جو بیٹھے لطف اُٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بہ یک ایک مردہ جانور کی لاش بھی تیرتی ہوئی سامنے آگئی۔ اگر کہیں ملاّ کو بُرا کہتا ہے جو تہذیبِ فرنگ کی طرح اقبالؔ کے طعن وطنز کے تیروں کا ایک مستقل ہدف ہے تو اس کے ساتھ ہی فرنگ کو بھی لپیٹ لیتا ہے۔ حالاں کہ غزل کے باقی اشعار نہایت حکیمانہ اور عارفانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً غزل کا مطلع ہے۔

اک دانش نورانی اک دانش برہانی

ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

باقی اشعار بھی اسی پائے کے ہیں، لیکن چلتے چلتے ایک شعر یہ بھی فرما دیا جس میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھی متّہم کیا ہے۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی

اس دور کے ملاّ ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

مگر افرنگ میں جو ظاہری پاکیزگی اور حسن و جمال ہے، اقبالؔ اس کا منکر نہیں۔ تمدنِ فرنگ کے اس پہلو کو جو اس کو ایشیا کی گندگی سے ممتاز کرتا ہے۔ اقبالؔ بھی قابلِ رشک سمجھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ مشرق میں بھی جنت ارض کے نمونے نظر آئیں۔

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا

افرنگ کا ہر قریہ ہے، فردوس کی مانند

اسی غزل کے ایک شعر میں پھر تہذیب جدید اور ملائیت پر ایک تازیانہ رسید کیا ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

........اور کئی غزلوں میں بھی یہی کیفیت ہے کہ بات کچھ بھی ہو رہی ہو،

لیکن ضرب لگانے کے لیے فرنگ کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

علاج، آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

.........افرنگی راج ختم ہوگیا اور باقی جاں بلب ہے۔ آئندہ نسلوں کے لیے افرنگی راج تاریخ کا ایک قصہ بن جائے گا۔ اس زمانے میں اس شعر سے کون لطف اٹھائے گا۔ پچاس یا سو سال کے بعد غالباً اس وجد آور غزل کو گانے والے اس شعر کو ساقط کر دیں گے، لیکن غلبۂ افرنگ نے بے چارے اقبالؔ کو اس قدر بیزار کر رکھا ہے کہ وہ ایسی غزل میں بھی اس کے ذکر سے باز نہیں آ سکتا.....''

''......علامہ اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس کا ذکر خلیفہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ ذرا غور کر لیجیے کہ خلیفہ صاحب کے قلم کی لغزیدہ پائی کیا گل کتر گئی ہے ایک محمدی کیفیت ان میں یہ بھی تھی کہ وہ (شیخ نور محمد) نبی اُمّی کی طرح نوشت خواند کے معاملہ میں اُمّی تھے۔

چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی ست''

(فکر اقبال۔ص:182، بزم اقبال، لاہور 1961ء)

یہ بیان اقبالؔ کے مانے ہوئے شارح کا ہے، لیکن اقبالؔ کے معمولی طالب علم کے نزدیک بھی کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ خلیفہ صاحب کے نزدیک تہذیب افرنگ پر اقبالؔ کی تنقید اس لیے بھی بے سود ہے کہ غلبۂ افرنگ کے ختم ہو جانے کے بعد اقبالؔ کے ان اشعار کی ساری اہمیت اور خوبی ختم ہو جائے گی، اور کوئی بھی ان کو قابلِ اعتنا نہ پائے گا۔ یہ دلیل کچھ اس طرح کی ہے جیسے چاند پر ہماری آمد و رفت ہو جائے گی، تو اس کا جمالیاتی تصور ہمارے شعر و ادب، ہمارے حسنِ خیال، حسن احساس اور حسنِ بیاں سے مفقود ہو جائے گا۔ حالاں کہ انسانی ذہن میں چاند حسن کا سمبل (نشان یا علامت) بن چکا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا کہ چاند کا حشر سادھوؤں اور طالب علموں کے ہاتھوں کیا ہوگا۔ افرنگ کا تسلط جلد یا بہ دیر ختم ہو کر رہے گا۔ یوں بھی کسی کا تسلط دوامی نہیں ہوتا، صرف اس دور اور اس کے زعما کو خیر و شر یا شامت و شادمانی کا سمبل قرار دیتے ہیں۔ فراعنہ، عاد و ثمود اور ان کے کید و کیا ئر کا عہد کب کا ختم ہو چکا۔ اس طرح معلوم نہیں کون سی دوسری قومیں اور حکومتیں جن کا ذکر مستند دستاویزوں میں ملتا ہے۔ صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، لیکن ان کے کارنامے یا کرتوت ہر زمانے میں یاد رکھے جاتے ہیں اور لوگ ان سے سبق سیکھتے ہیں۔ تعجب ہے خلیفہ صاحب جیسا ماہرِ نفسیات اس رمز کو نظر انداز کر دے کہ اعلیٰ شعر میں کوئی حال، حادثہ یا کردار بیان ہو جاتا ہے تو وہ انسان کے ذوق و ضمیر میں نقش ہو جاتا ہے، اور ہمیشہ فعال رہتا ہے۔ شعر کی ایک بہت بڑی صفت اور مصرف یہ بھی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسات میں خلیفہ صاحب نے ڈاکٹر اقبالؔ کو جس لب و لہجہ میں اور ان کے اشعار کو جس تشبیہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ بھی حفظِ مراتب کی اچھی مثال نہیں ہے۔

اقبالؔ کے کلام پر تنقید کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیے۔ یہ اقتباسات انجمن ترقی اردو، ہند کے ہفتہ وار اخبار ہماری زبان کے 22 / اپریل 1967ء کے اداریہ سے اخذ کیے گئے ہیں:

''........کبھی کبھار شاعر خود اپنے کلام کا بہترین نباض نہیں ہوتا۔ اقبالؔ نے جب یہ کہا کہ لوگ مجھ سے آب و رنگ شاعری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ میں انھیں شکوہِ خسروی دیتا ہوں، اور تختِ کسریٰ ان کے قدموں میں ڈال دیتا ہوں تو اقبالؔ نے بھی اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ شاعری اپنی قیمت آپ ہے۔ اگر وہ شکوہِ خسروی دیتی ہے یا نہیں، تو اس سے اس کی خوبی یا خامی نہیں دیکھی جاتی.....'' اقبالؔ اور ان کی شاعری پر بڑے مخلصانہ اور جامع انداز میں اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ اردو کا بہت بڑا شاعر ہے، اور میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ انھیں کے صف میں ہیں، مگر آج اقبالؔ کی شاعری کی تقلید نہ ممکن ہے نہ مناسب، زندگی بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اقبالؔ کا فکر و فن ہمارے لیے آج بھی بڑی مسرّت و بصیرت رکھتا ہے، مگر اس دور کے درد و داغ اور سوز و ساز کو شعر

میں ڈھالنے کے لیے اقبالؔ کا فن ہماری مدد نہیں کرسکتا۔ ہمیں اس کے لیے اور سادہ اور دھرتی سے قریب اور بول چال کے مطابق اور کنایاتی اور طنزیہ ہونا پڑے گا، اور خاص بے باک حقیقت نگاری کی ضرورت ہوگی۔ خطابت یا حکمت دونوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ کبھی سرگوشی کے انداز میں باتیں کرنی ہوں گی، کبھی خود کلامی کے لہجے میں، کبھی اپنے آپ سے کچھ سوال کرنے ہوں گے، کبھی دو یا تین لہجوں کو یک جا کرنا ہوگا۔ آدم کو آداب خداوندی سکھانے سے آدم کا اپنے آپ کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس دور میں سب سے اہم کام اس آدمی کی تلاش ہے جس کے پیچھے پانچ ہزار سال کی تہذیب کی تاریخ اور اس سے پہلے کے جانور کی لمبی کہانی ہے۔ اس کام میں میرؔ، نظیرؔ، غالبؔ، اقبالؔ سبھی سے ہم کو مدد ملے گی، اور ان سب کی مدد سے اردو شاعری کا نیا لہجہ اور نیا آہنگ متعین ہوگا۔ اقبالؔ اپنی زندگی میں ہی کلاسک کی عظمت کے حامل ہو چکے تھے، اور کسی کلاسک سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ مگر کلاسک کو پیر تسمہ پا نہیں ہونا چاہیے، وہ ہمیں فکر وفن کے چراغ دیتا ہے۔ جس کی مدد سے ہم اپنے چراغ روشن کر سکتے ہیں۔''

شعر و ادب کی منصفانہ ومخلصانہ تنقید سے انسان، معاشرہ، زندگی اور عقائد کی منصفانہ ومخلصانہ تنقید کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شعر و ادب زندگی ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ زندگی کے کاروبار میں مرنجاں ہونا کام دے جاتا ہے۔ تنقید میں یہ طریقہ خرابی لاتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی تمام تر عمل سے عبارت ہے، جس میں جہاں تہاں نیچ اونچ کا راہ پا جانا تعجب کی بات نہیں، لیکن تنقید، اصول ہے جہاں مفاہمت کو دخل دینا ناسمجھی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ اوپر جو اقتباسات دیے گئے ہیں وہ طرح طرح کی مفاہمت پر مبنی ہیں۔

اس نوع کی تنقید پر ایک لطیفہ یاد آیا۔

ایک مولوی صاحب نے کسی غیر مسلم کو مسلمان کرلیا، اس خیال سے کہ کہیں منحرف نہ ہو جائے۔ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے، کہیں جاتے تو اسے پیچھے پیچھے چلنا پڑتا۔ مولوی صاحب عقائد اور اعمال کی مسلسل تلقین کرتے رہتے۔ نومسلم کو تاکید تھی کہ ہوں ہاں کرتا رہے، تاکہ موصوف کو معلوم رہے کہ وہ متوجہ ہے۔ ایک مقام پر مولوی صاحب کو پس رَو کی آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک پیپل کے درخت کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا پایا۔ برافروختہ ہوکر جواب طلب کیا تو اس نے نہایت نرمی اور صلح جویانہ انداز سے عرض کیا۔ مولوی صاحب بگاڑ انھوں سے (ان سے بھی) اچھا نہیں۔

یہ بیانات اور مفروضات محلِ نظر ہیں۔ 'شاعری اپنی قیمت آپ ہے' صحیح نہیں ہے۔ شاعری ہی نہیں کوئی انسانی فعل اپنی قیمت آپ نہیں ہے۔ اگر وہ زندگی کو بہتر و برتر بنانے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ معین نہ ہو۔ جیسا کہ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے، شاعری سماجی ذمہ داری ہے۔ کسی فردِ واحد کے من کی موج یا ترنگ نہیں ہے۔ شاعری برائے شاعری اسی طرح فعلِ عبث ہے جس طرح شاعری برائے مقاصد مشتبہ مقاصد کے اعلیٰ یا ادنیٰ یا دوامی یا وقتی ہونے کی بنا پر شاعر اور اس کی شاعری کی سطح متعین کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے شکوہِ خسروی وتختِ کسریٰ سے مراد بجائے خود خسرو کا شکوہ اور کسریٰ کا تخت نہیں ہے۔ بلکہ وہ اعلیٰ مقاصد اور اقدار ہیں جن کے حصول اور پیروی کی تحریک اقبال کے کلام میں ملتی ہے۔ اعلیٰ شاعری ہمیشہ انسانی، آفاقی اور دوامی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہر دور کے 'درد وداغ اور سوز وساز' کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبالؔ نے ہم کو شکوہِ خسروی اور تختِ کسریٰ قسم کی کوئی چیز دی ضرور ہے جس کو محسوس کر کے ہم پہلے سے اپنے کو مختلف اور ممتاز سمجھنے لگے ہیں۔ نظیرؔ اکبر آبادی کو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی صف میں نہ رکھا جائے تو نظیرؔ کی اپنی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی، اور رکھا جائے تو ان کے قد وقامت میں مطلق کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ آخر یہ کیوں کہ جب تک کوئی شاعر میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ سے منسلک نہ کیا جائے۔ اس کی قدر و قیمت متعین نہ ہو سکے۔

نظیرؔ اکبر آبادی کا عوام کا مقبول ومحترم ترین شاعر ہونا ان کا سب سے بڑا انعام وامتیاز ہے۔ آج ترقی پسند یا جدید شاعری کا کوئی شاعر ان کا ہم سر نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ شاعری

اس کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ عوام کے دل کی دھڑکن ہے۔ سادہ اور دھرتی سے قریب ہے، بول چال کے مطابق ہے، کنایاتی اور طنزیہ ہے، خاص بے باک اور حقیقت نگار ہے، خطابت یا حکمت دونوں کو چھوڑ چکی ہے، کبھی سرگوشی کے انداز میں بات کرتی ہے، کبھی خود کلامی سے کام لیتی ہے، کبھی دو یا تین لہجوں کو یک جا کرتی ہے، آدم کو آدابِ خداوندی سکھانے کے بجائے آدم کو اپنے ہی کو سمجھنے کے علاوہ آدم کو دوسروں سے سمجھ لینے کے بھی آداب سکھاتی ہے۔ ایسے آدم کو اس نے تلاش کرلیا ہو یا نہیں، جس کے پیچھے پانچ ہزار سال کی تہذیب کی تاریخ ہو۔ اس نے اس آدمی کو ضرور دریافت کرلیا ہے جس سے پہلے صرف جانور کی لمبی کہانی ہے۔

ترقی پسند یا جدید شاعری نے پچھلے 35-30 سال میں اردو شاعری کا لہجہ و آہنگ ہی نہیں اس کے موضوع ہیئت اور خوب یا ناخوب کو جس طرح اور جس حد تک بدلا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلی کہاں تک صرف تبدیلی ہے اور کہاں تک ترقی یافتہ۔ اس سے اردو نظم کی مقدار اور انواع میں اضافہ ہوا ہے، لیکن معیار گرا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود ترقی پسند شاعری کے معیار سے اس شاعری کو پرکھا جائے تو بھی اس کو شاعری کا خاطر خواہ نمونہ نہ پائیں گے۔ تاوقت کہ معیار کا نہ ہونا ہی معیار ہو۔ شاعری کی ہیئت یا موضوع کچھ ہی کیوں نہ ہو، گو ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ فن، زبان، لہجہ، ماحول، روایات اور سامعین اور قارئین کی پسند و ناپسند کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ شاعری کرنی ہے تو شاعری کے آداب ملحوظ رکھنے پڑیں گے۔ ہفوات اور ہلڑ شاعری کی کوئی قسم نہیں ہے۔ رہا خواص پسند یا عوام پسند کا سوال، تو میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اعلیٰ انسانی صفات اور عمل مثلاً سچائی، شجاعت، نیکی، حمیت، خوب صورتی کی طرح شاعری کو بھی نیچے کی طرف لانے کی بجائے بلند سے بلند تر اور خوب سے خوب تر کی طرف لے جانا چاہیے اور اس کوشش میں عوام کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہیے، ان کے ساتھ نہ چلنا چاہیے۔ ترقی پسند نظیر اکبر آبادی کو شاعری میں اپنا امام مانتے ہیں، لیکن کیسی بوالعجبی ہے کہ نظیر کو بڑا بتانے اور بنانے کے لیے میر، غالب اور اقبال کی صف میں جگہ نکالنا چاہتے ہیں۔

دھرتی سے قریب ہونے اور جن دوسری صفات کی تنقید نگار نے فہرست دی ہے، غالباً وہ تمام کی تمام ترقی پسند یا جدید شاعری میں ملتی ہیں۔ دوسری طرف اقبال کی شاعری ان سے

معرّا ہے۔ ان حالات میں سوسائٹی اور شاعری کے وہ تقاضے کیوں نہیں پورے ہوتے، جن کی علَم بردار ترقی پسند یا جدید شاعری ہے۔ ان کو پورا کرنے کا تقاضا اقبالؔ کی شاعری سے کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا ضرور ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے ہم اپنے طور طریقوں کے بجائے کسی دوسرے کی ٹکنیک اور آہنگ اختیار کریں۔ خاص طور پر جب یہ معلوم ہو چکا ہو کہ وہ ٹکنیک اور آہنگ یکسر ناکامیاب ہو چکا ہے۔ اعلیٰ شاعری میں کاشت کاری کا اصول نہیں چلتا کہ زمین زید کی بیج عمر کے، آلات کشاورزی بکر کے، کھاد پانی خالد کا، پیداوار کھلیان میں پہنچی تو تو چار سے تقسیم کرکے اپنا اپنا حصہ قبضے میں لے لیا۔ سوال یہ ہے کہ نظیرؔ کی کون کون سی خصوصیات کو ترقی پسندوں نے اپنا کر یا فروغ دے کر نظیرؔ کا نام روشن کیا۔ نظیرؔ اور اقبالؔ کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی تلقین مصلحت اندیشی کی بنا پر چاہے جیسی ہو، ذوق اور ذہن کی رو سے قابلِ اعتنا نہیں۔

کالج میں تاریخی جغرافیہ کے لکچرار مراد آباد کے قاضی جلال الدین صاحب تھے۔ بڑے مخلص، ذکی اور ظریف الطبع، اس زمانے میں لکچرار کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ قاضی صاحب نے اپنا ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگے، وطن میں ایک بزرگ تھے، جن کا سب لوگ بڑا احترام کرتے۔ سب کے سامنے ایک دن سوال کر بیٹھے، کیوں جی قاضی علی گڑھ کالج میں تم کو مشاہرہ کیا ملتا ہے۔ عرض کیا، حضور اللہ دال دلیا کا انتظام کر دیتا ہے۔ میری اور ڈاکٹر ضیاالدین کی تنخواہ مل کر کوئی بارہ سو ماہ وار ہو جاتے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر ضیاالدین کے نام کو زیر لب اس روانی سے ادا کیا کہ کسی کو سنائی نہ دیا۔ زور بارہ سو ماہ وار پر رکھا، تمام لوگ مرحبا مرحبا کہنے لگے۔ نظیرؔ اکبرآبادی کو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ وابستہ کرنے میں کچھ اسی طرح کی مصلحت یا نقشہ نظر آتا ہے۔ کلاسکس کو چراغ بتاتے ہیں جس سے دوسرے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کو پیرِ تسمہ پا بھی قرار دیتے ہیں۔ ترقی پسند شعر و ادب نے کلاسکس سے نہ اپنا چراغ جلایا نہ اس کو پیرِ تسمہ پا بننے دیا، لیکن نتیجہ کیا رہا۔ اس میں چاہے جتنی صلاحیتیں پیدا ہوگئی ہوں، باقی رہنے اور کلاسک بننے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔ ترقی پسند شعر و ادب میں کچھ اور نہیں پچھلے 36-35 سال میں دو چار سو شاعر ضرور گزرے ہوں گے، لیکن اب تک ان کی Ranking (درجہ بندی) نہ کی جا سکی۔ یعنی

اوّل دوم سوم درجے کے کون کون سے شعرا ہیں۔ شواہد نہ ہونے کے سبب سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب ایک ہی سطح کے ہیں، یعنی ہر ایک اوّل درجے کا ہے یا دوسرے یا تیسرے درجے کا۔ اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند شاعر اور ادیب جب تک کلاسکس کے پیر تسمہ پا سے اپنی نسبت کا اظہار نہیں کرتے، خود اپنی نظر میں معتمد نہیں ٹھہرتے۔ نظیؔر کو میرؔ، غالبؔ اور اقباؔل سے وابستہ کرنے میں اور کیا مصلحت ہوسکتی ہے۔

حالؔی اور اقباؔل جو ہمارے شعروادب کی مایۂ افتخار شخصیتیں ہیں، ان کے بارے میں اردو کے یہ تنقید نگار کیا خیال رکھتے ہیں، اس کا اندازہ متذکرہ صدر اقتباسات سے کیا جاسکتا ہے۔ حالؔی اور اقباؔل کے رتبے میں اس طرح کے بیانات سے کوئی فرق نہیں آتا، لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ زندگی اور ذہن پر دور جدید کے ہیجان اور اختلال کی کیسی گرفت ہے اور تنقید نگار جن کو شعروادب اور ذہن کا ضمیر ہونا چاہیے، شعروادب اور اس کے برگزیدہ نمائندوں کی آبروریزی کس سفاکی سے کرتے ہیں۔ بہ ذاتِ خود میں کچھ اس طرح خیال کرتا ہوں کہ جس طرح قرآن پاک کا معجزہ سیرتِ رسول ہے، اسی طرح عشقِ رسول کا معجزہ کلام اقبال ہے۔

اردو شعروادب کے سلسلہ میں کچھ باتیں معرضِ بحث میں آئیں، لیکن سب سے مقدم اور مشکل مسئلہ خود اردو کے تحفظ اور ترقی کا ہے، جو تقسیم ملک کے بعد سے ہمارے سامنے ہے اور روز بہ روز ابتر اور سنگین تر ہوتا جارہا ہے۔ اردو کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرنے اور رکھنے میں جن عوامل وعناصر کا دخل رہا ہے، وہ حالات کو دیکھتے ہوئے ایسے نہیں معلوم ہوتے، جو شاید کبھی روبراہ ہوں۔ اردو کو مسلمانوں کی مادری، مذہبی، ادبی، علمی اور تہذیبی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں شک نہیں اور یہی اردو کا سب سے بڑا قصور ہے جس کو ہلکا کرنے میں اردو کی وہ تمام صفات وخدمات ناکام ہیں، جن کی تفصیل نہایت شرح وبسط اور شدّ ومد سے ہر موقع پر ہر سطح سے پیش کی جاتی رہی ہے، جن کا اعادہ ضروری نہیں ہے۔ اردو کی یہ صفات اردو ہی سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کی چودہ زبانوں میں سے ہر ایک میں پائی جاتی ہیں، اور ریاستی ہونے کے سبب سے ان میں ہر ایک محدود رقبے میں اکثریت کی زبان ہے۔ اردو کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ سب سے بڑی اقلیت کی زبان ہے اور ملک کی ہر ریاستی زبان کے رقبے سے

زیادہ رقبے میں کام میں لائی جاتی ہے۔ اس طور پر ہندوستان کے ہر لسانی رقبے میں بیش وکم رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنسکرت کے رشتے سے جدید ہندی ملک کی تمام زبانوں سے یگانگت رکھتی ہے۔ اسے تسلیم کرتے ہوئے اس امر کا بھی اظہار کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لسانی رشتہ معتبر اور کارآمد اسی وقت ہوتا ہے جب وہ رشتہ زندہ زبان سے ہو۔ ایسی زبان سے نہیں جس کا چلن موقوف ہو چکا ہو۔ یہی سبب ہے کہ نئی ہندی میں سنسکرت الفاظ مقبول نہیں ہیں، لیکن اس بحث سے قطع نظر یہ بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ نئی ہندی کا سنسکرت سے لسانی رشتہ اور حکومت کا اس کو اپنے فرمان سے ملک کی مشترک یا عام زبان قرار دے دینا اردو کے اس امتیاز کو کسی طرح کم نہیں کرتا کہ وہ نئی ہندی پر اس اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے کہ ملک میں سب سے زیادہ کام میں لائی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حسب ضرورت یا مصلحت اردو کو ہندی کے نام سے یاد کیا جائے، یا ہندی کو زبان کا نہیں ہندستانی نژاد ہونے کا مفہوم دے دیا جائے۔ اس وقت کہیں اور سے بحث نہیں یو پی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ پچھلے بیس سال میں اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے کہ کم و بیش تین نسلوں کے وہ بچے اور اب نوجوان جن کی اردو مادری زبان ہونے کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ سرکاری مدرسوں میں اس کی تعلیم سے محروم ہو چکے ہیں، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے وہ ایسے ہیں جن پر کوئی مہذب حکومت فخر نہیں کرسکتی۔ بشرطیکہ وہ جانتی ہو کہ حکومت کی ذمہ داری کیا ہے، مہذب ہونا کسے کہتے ہیں، اور فخر کرنے کا حق کب حاصل ہوتا ہے۔ کسی قوم، فرقہ یا جماعت کی زبان، شعروادب اور تہذیب کو مجروح کرنا یا مٹانا اس کو اس کے ماضی، حال اور مستقبل سے محروم و منقطع کرنا ہے۔ جس کے لیے تاریخ میں Vandal (تہذیب کا غارت گر) یا (Vandalism) (تہذیب کی غارت گری) کا فقرہ آیا ہے۔

لیکن اس سلوک سے مایوس یا مشتعل نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا کرنے سے حوصلہ پست ہوتا ہے، معاشرے میں ابتری پھیلتی ہے اور ساکھ گرنے لگتی ہے۔ جن دشواریوں اور نزاکتوں کا اس وقت سامنا ہے، اس میں اس صورت حال کو پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام دنیا کے مسلمان اس وقت طرح طرح کی جن آزمائشوں سے گزر رہے ہیں، وہ ان

ل چودہ سو سال کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن مسلمان بحیثیت مسلمان جن ضوابط اور
مہ داریوں کا خدا کی طرف سے امین اور اس کے رسول کی طرف سے عامل بنایا گیا ہے۔ ان
سے وہ کسی حال میں باہر نہیں ہوسکتا۔ ہماری تقدیر جہنم سے گزرتے رہنا ہے۔ جنت میں قیام
ہیں، یہ اُمت آزمائش کے لیے مبعوث ہوئی ہے۔ آرام کے لیے نہیں، خیر الامم ہونے کی
ثارت اسی میں دی گئی ہے۔ کاش یہ نکتہ آپ نوجوانوں کے ذہن نشیں ہو جائے۔

ہمارا سابقہ، اردو کے مخالفوں سے ہے تو ایسا کوئی مضائقہ نہیں، جب ہم کو اردو کے
یسے سچے دوستوں کی رفاقت حاصل ہے جن کے ساتھ کام کرنے میں شکست میں بھی افتخار کا
حساس ہوتا ہے۔ آزاد ہندوستان میں آج شاید ہی ایسی کوئی تحریک ہو، جس میں مسلمانوں کو
بر مسلموں کی اتنی اچھی اور پکّی تائید حاصل ہو، جتنی کہ اردو کے تحفظ و ترقی کی تحریک کو۔ اردو کا
سئلہ انصاف اور سچائی پر مبنی ہے۔ اس لیے اس کی حمایت میں ہر دشواری کا سامنا کرنا، احسان کسی
نہیں فرض ہر ایک کا ہے۔ حکومت کی تائید حاصل نہ ہونے سے کام میں یقیناً دشواریاں پیش آتی
ں، لیکن حق کی حمایت میں مصائب کا سامنا ہمیشہ لازم آیا ہے۔ اس کو جھیلنا اور جھیل جانا بجائے
ود ایک اعلیٰ کارنامہ ہے۔

حالیہ الیکشن کے بعد حکومت اور مخالف پارٹی (اپوزیشن) اس درجہ دوبدو اور قریب
گئے ہیں، اور منتخب شدہ اراکین میں مزاج بدلنے کا رجحان اتنا قوی ہوگیا ہے کہ حکومت کو اپنے
وگرام میں رفاہِ عام اور تحفظ ملک کے بہت سے منصوبوں کو نظر انداز کر کے مخالف جماعت سے
یادہ سے زیادہ سازگار رہنے کی گنجائش رکھنی پڑتی ہے جس میں مسافر و مہاجر اراکین کے
ناسب نان نفقہ کا انتظام شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایسی سیاسی و مذہبی جماعت کی
لادستی کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے جو اب تک حکومت پر براہِ راست فائز نہیں ہوئی ہے، لیکن
حکومت اور اپوزیشن (حزبِ مخالف) میں اس کی سطوت کا سکہ چلتا ہے۔ بظاہر حکومت کا نقشہ
کچھ اس طرح کا ہوگیا ہے کہ حکومت کسی پارٹی کی ہو، حکم اسی پارٹی کا چلتا ہے۔ غالبؔ کا مشہور
صرعہ آپ کو یاد ہوگا۔

نوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نہ کرد

اس طرح حکومت کانگریس کی ہو، خواہ مخالف متحدہ محاذ کی، جناب غالبؔ آج کل مصطفےٰ خاں سے باہر ہو کر کوئی شعر نہیں کہہ سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی آتا رہتا ہے کہ جس زمانے میں غالبؔ اسداللہم اور اسداللہیم دونوں تھے۔ اس وقت بھی جہاں تک اردو کا تعلق ہے ان پر ضعف غلبہ کچھ کم نہ تھا۔ اس لیے کانگریس حکومت اور حزبِ مخالف دونوں ہماری شکایت کی اتنی مستوجب نہیں ہیں، جتنی ہمدردی کی۔ دل ہی تو ہے، سیاست درباں سے ڈرتا رہتا ہے۔ چنانچہ کوئی ایسی حکومت نہ وجود میں آسکتی ہے نہ قائم رہ سکتی ہے، جو اردو یا اس طرح کے بعض دوسرے اقلیتی مسائل کو روبراہ کرنے کے لیے انصاف یا وسیع النظری سے کام لینے کی ہمت کر سکے۔ اقلیت کی خاطر کوئی حکومت اپنے کو کسی طرح کے خطرے میں ڈالنا پسند نہ کرے گی۔ بالخصوص جب اردو دوستوں جیسی اقلیت کا پاؤں درمیاں ہو۔ جس سیاسی و مذہبی جماعت کی بالادستی کا ذکر اوپر آیا ہے اس کے ناوک کی زد سے اب خود اسی کے آشیانے میں اسی کے مرغانِ قبلہ نما تڑپنے لگے ہیں۔ جس طرح گذشتہ الیکشن میں کانگریس کے خلاف ساری پارٹیاں متحد ہو گئی تھیں اور کانگریس کو ہزیمت نصیب ہوئی، تعجب نہیں۔ اگر اسی طرح حکومت کے استحکام کے پیش نظر آئندہ تمام سیاسی جماعتیں اس جماعت کے خلاف متحد ہو جائیں، اور اس یوسف کو بے کارواں ہونے کے دن دیکھنے پڑیں۔

اردو کے تحفظ و ترقی کے سلسلے میں جن مشکلات کا ذکر کیا گیا، ان کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں، اقلیتیں کبھی مغلوب نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ حق پر ہوتی ہیں۔ اکثریت مغلوب ہوتی رہتی ہے، اس لیے کہ وہ اقلیت کے حقوق تلف کرتی ہے۔ اردو کو بچانے کے لیے حکومت کا وسیلہ نہیں ملتا، تو ہم کو اپنا وسیلہ ڈھونڈنا اور آزمانا چاہیے۔ خواہ وہ کتنا ہی حقیر اور ناقابل التفات کیوں نہ معلوم ہوتا ہو۔ یعنی زیادہ سے زیادہ بچوں اور اَن پڑھ بالغوں کو کم سے کم اردو تھوڑی سی تھوڑی مدت میں کس طرح سکھا پڑھا سکتے ہیں۔ اپنے محدود ذرائع اور وسائل اور مخصوص دشواریوں کو پیش نظر رکھیں تو خرچیلے اور طویل المیعاد منصوبوں کی گنجائش نہیں نکلتی۔ مجھے یقین ہے یہ بچے اور ناخواندہ بالغ ایک دفعہ اردو کی کشش ثقل میں داخل ہو جانے کے بعد اس کے تصرف سے باہر نہ ہو سکیں گے، اور ہم سب جانتے ہیں

اردو کی کشش ثقل کس کس رنگ میں ہر چہار طرف کارفرما ہے۔ شائستہ گفتگو اور صحبتیں، شعر و ادب کے مذاکرے، اخبارات و رسائل، مشاعرے، سینما، تھیٹر، قوالی اور اس طرح کے دوسرے مشاغل اردو کو مقبول بنانے اور رکھنے میں ہمیشہ معین رہے ہیں۔ یہ وہ عوامل ہیں جن پر حکومت کی نہیں، معاشرے کی حکمرانی ہوتی ہے، اور معاشرہ بالعموم حکومت سے زیادہ معتبر و مستحکم ہوتا ہے۔ یوپی میں بڑے اہتمام سے اردو کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ اس لیے اردو کی بحالی اور آبادکاری کے لیے یہاں خاص طور پر کوشش کرنی پڑے گی، اور آبادکاری کا کام سُست رفتار، دیر طلب اور صبر آزما ہوتا ہے۔

آپ کے نواح میں دینی تعلیم کی جو تحریک چلائی جا رہی ہے، اس کی تفصیل سے اتنا واقف نہیں ہوں جتنا اس کی اہمیت اس کے حیرت انگیز کامیابی اور کارنامے اور اس کے بانیوں اور کارکنوں کے عزمِ محکم اور سعی پیہم کا معترف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دینی تعلیم کی اس تحریک کے ساتھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے تو بڑا اچھا ہوگا۔ اس منزل میں اردو کی تعلیم یقیناً معمولی ہوگی، لیکن اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آگے چل کر جب اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے کا موقع ملے گا، ہمارے طلبا اردو سے بیگانۂ محض نہ ہوں گے بلکہ تھوڑی توجہ سے اپنی گم شدہ متاع کو پا لیں گے۔ اردو کا حسب و نسب اس کی اجازت دیتا ہے، نہ اس کا رول اور روایت کہ اس کی جنگ اس محاذ یا مزبلے پر لڑی جائے، جس پر اس کے دشمن سب و شتم اور نقضِ امن کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔ اردو جن تاریخی و تہذیبی تقاضوں سے وجود میں آئی اور شرافت و شائستگی کی جس آب و ہوا میں پھولی پھلی، اس کا تقاضا ہے کہ اس کی حفاظت اور حمایت بھی انہی صحیح اور سیدھے خطوط پر کی جائے، جن کی نشان دہی یہ شروع سے کرتی آ رہی ہے۔ اردو کے ساتھ جیسا ناروا سلوک کیا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے اندیشہ ہوتا ہے، کہیں زبان کی حفاظت کا مسئلہ اقدار کی حمایت کا مسئلہ نہ بن جائے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ہیئت و حیثیت کا مسئلہ بھی اسی سلسلے کی بڑی اہم کڑی ہے۔ آخر میں اردو لکھنے اور بولنے والوں سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ اردو کی ہر صنف میں زبان کے ایسے پاکیزہ، خوب صورت، ولولہ انگیز، دل نشیں، سہل اور سارے نمونے پیش کریں کہ دوسرے جو اردو سے براہِ راست تعلق نہ رکھتے ہوں، وہ بھی

ان سے فائدہ اٹھانے اور لطف اندوز ہونے میں اپنے لیے امتیاز محسوس کریں۔ زبان اور کلام میں جن صفات کی میں نے وکالت کی ہے، وہ اردو میں نئے یا نادرالوجود نہیں ہیں، بلکہ عام طور پر ملتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہر محفل اور ہر طبقے میں اتنی ہر دل عزیز نہ ہوتی جتنی کہ ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا، جو لوگ اردو سے پورے طور پر واقف نہیں ہوتے وہ بھی ستھری صحبتوں میں یہی چاہتے ہیں کہ اردو کا کوئی موزوں، برجستہ فقرہ یا مصرعہ سمجھے بغیر نہ رہیں۔ نہیں سمجھتے تو چپکے سے پاس والے سے پوچھ لیتے ہیں اور داد دینے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اردو کی ادا و نوا سے ناآشنا ہونا کہیں نہ کہیں کسی خامی یا نارسائی کی علامت ہے۔

ایک بڑا اہم مسئلہ جس کے بارے میں ہمارا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ قومی زبان کے جاننے، بولنے اور لکھنے ہی نہیں، اس میں مہارت حاصل کرنے کا ہے۔ ہندی نہ صرف اُتر پردیش کی ریاستی سرکاری زبان ہے، بلکہ اس کو آئینِ ہند کے تحت قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ ملک میں تمام فیصلے جمہوری اکثریت کی رائے کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ فیصلے ہمیشہ صحیح ہوتے ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں اختلاف رائے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، اور نامناسب فیصلوں کے سلسلے میں اظہار رائے پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ جمہوری ریاست میں رائے کی آزادی کو ایک بنیادی اصول کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ قومی زندگی کے حقائق پر ہم سب کو سنجیدگی، دیانت اور دانش مندی سے غور کرنا چاہیے۔ ہندی ایک بنیادی، لسانی، سیاسی، علمی اور تہذیبی صورت حال کی نہ صرف نمائندگی کرتی ہے، بلکہ اس کی تشکیل و تعمیر سے بھی عبارت ہے۔ وہ لوگ جن کی وہ مادری زبان نہیں ہے، اس سے کسی حال میں روگردانی نہیں کر سکتے، اور سب سے غلط اور خطرناک بات یہ ہوگی کہ وہ اس سے متعلق کوئی منفی رویہ یا اندازِ فکر اختیار کریں۔ مادری زبان کی حمایت کرنا جتنا صحیح ہے، اتنا ہی غلط طرزِ عمل سرکاری قومی زبان کی مخالفت ہے۔ مثبت اور مفید نتائج حاصل کرنے کے لیے مثبت فکر و عمل کو کام میں لانا کتنا ضروری ہے، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ یہاں مثبت فکر اور عمل کا ذکر جس سیاق و سباق میں ہوا ہے اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ بعض حقیقتوں کے پیشِ نظر ابن الوقتی سرکار پرستی یا اکثریتی فیصلے سے مطابقت پیدا کرنا ہی مثبت فکر و عمل کا مترادف ہے، ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ میں تو صحیح بات کی خاطر

ہارنے والے کا ساتھ دینے کو اپنی سب سے بڑی جیت سمجھتا ہوں۔ بہر حال ہندی سے متعلق میں آپ سے جس اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا خواست گار ہوں، وہ تاریخی اور تہذیبی اصول اور حقائق پر مبنی ہے۔ گذشتہ صدی میں انگریزی سیکھنے کی طرف ہمارا جو رویّہ تھا، اس سے ہمیں جتنا شدید نقصان پہنچا وہ ہم بھولے نہیں ہیں۔ ایسا کرنے سے ہم نے اپنے اوپر جدید علوم نظریات و تحریکات کے دروازے بند کر دیے اور ان سے یکسر نابلد رہے۔ چنانچہ تاریخ نے ہم کو ناعاقبت اندیش اور بے لیاقت گردانا۔ ہندی نہ صرف سرکاری زبان ہے، بلکہ ابنائے وطن کی ایک کثیر تعداد کی روحانی، علمی اور تہذیبی اقدار سے واقفیت پیدا کرنے کی کنجی ہے۔ اس کنجی کو ہم کام میں نہ لائیں گے تو قفل کبھی کھلیں گے، اور ایک ہی خطّے میں ایسی آبادیاں دوش بدوش نظر آئیں گی، جو ایک دوسرے سے ناآشنا، بے پروا اور مشکوک رہ کر اپنی وہ تمام اعلیٰ صلاحیتیں کھو بیٹھیں گی۔ جن کو ملک کی بھلائی اور بڑائی میں صرف ہونا چاہیے۔

مجھے یقین ہے اس ریاست میں کوئی اردو بولنے والا ایسا نہ ہوگا جو ہندی نہ سیکھنا چاہتا ہو، خرابی کی جڑ دراصل یہ ہے کہ اردو کا حق مار کر اردو بولنے والوں کو ہندی سیکھنے پر مجبور کیا گیا۔ اس لیے وہ ہندی کو جبر کی علامت سمجھنے لگے ہیں۔ ہندی کے دوستوں کو کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے کہ ہندی کی اشاعت و مقبولیت کے راستے میں خود ان کا وہ منفی رویّہ مزاحم ہے، جو انھوں نے اردو کی طرف سے اختیار کر رکھا ہے، اور کون نہیں جانتا کہ منفی رویّے سے کیسے کیسے فتنے سر اٹھاتے ہیں۔ اس منفی یا معاندانہ رویّہ کو اسی ملک میں بعض مبصرین نے ہندی سامراجیت کی اصطلاح دے رکھی ہے۔ بایں ہمہ آپ یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ ہمارے ان نوجوانوں نے ہندی زبان میں قابلِ تعریف لیاقت اور استعداد پیدا کی ہے جن کی مادری زبان اردو تھی، لیکن اسکولوں اور کالجوں میں اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم اور اس طرح ہندی پڑھنے پر مجبور کیے گئے۔ اس بات سے بہر حال افسوس اور تکلیف ہوتی ہے کہ ان کی فطری صلاحیتوں کی فطری طور پر نشو و نما نہ ہو سکی۔ لیکن اس کا امید افزا پہلو یہ ہے کہ اب یہ نوجوان جب مباحثوں اور علمی مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں تو ہندی میں ان کی استعداد کے وہ بھی معترف ہوتے ہیں جن کی مادری زبان ہندی ہوتی ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ اگر لسانی یا قومی اقلیتوں

میں عقیدے کی مضبوطی اور علم کی فراوانی ہو تو وہ اکثریت کی زبان اور عقائد کو متاثر کرنے کی بے پناہ قوت رکھتے ہیں۔

مہذب دنیا میں جہاں کہیں اکثریت و اقلیت کے مسائل سے سابقہ ہے، وہاں نازی جرمنی کے انجام سے سبق سیکھنا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں ماضی قریب میں نازی جرمنی نے ملک میں یہودیوں کو ختم کر دینے کے لیے کیسے انسانیت سوز اور قابلِ نفریں پروگرام پر عمل کیا۔ جرمن زبان، ادب، شاعری، مصوری، فلسفہ بالفاظ دیگر پوری المانوی تہذیب کی تعمیر میں یہودی اہلِ قلم، دانش وروں اور فن کاروں کا بڑا گراں قدر حصہ ہے۔ نازیوں نے اپنے تہذیبی ورثے کی تطہیر کے لیے چن چن کر ان میں سے ان قیمتی عناصر کو علاحدہ کرنا چاہا جن پر صیہونی ہونے کا شبہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن ادب اور تہذیب کی مجموعی قدر و قیمت گر گئی اور نازیوں کے قائم کیے ہوئے نظام کو مردود قرار دیا گیا۔ اپنے اس عمل سے نازی عفریت نے پوری دنیا کو جنگ کے جہنم زار میں ڈھکیل تو دیا، لیکن بالآخر امن، انصاف اور انسانیت کی ادبی قوتوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ نازیوں کی اس بربریت کی پاداش میں پوری جرمن قوم کو جو تاوان ادا کرنا پڑا اور مہذب دنیا کی تاریخ میں جرمنی کے نازی دَور کو کس نظر سے دیکھا گیا، اس سے کون نہیں واقف ہے۔

ہر تعمیر سے مشکل سیرت کی تعمیر ہے۔ اس لیے کہ اس میں تعمیر کرنے والے ہی کے ارادہ، کوشش اور خیر خواہی کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ جس پر تعمیر کا عمل وارد ہوتا ہے، اس کی گوناگوں صلاحیتوں اور ان کی کسر و انکسار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ آپ جو عمارت جس طرح چاہیں، بنانی شروع کر دیں۔ وہ بے چُوں و چرا بنتی چلی جائے گی، لیکن کسی شخص کے مزاج اور اطوار کو کسی خاص نہج پر ترتیب دینا اور اس میں کامیاب ہونا آسان نہیں ہے۔ جامد اور بے جان اشیا کو آپ اپنی مرضی کے مطابق توڑ موڑ سکتے ہیں، لیکن باشعور شخص کے نفسیاتی و انفرادی میلانات کو بڑی دقّتوں ہی سے اپنی پسند کے کسی خاص سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ آپ نے اپنے کالج کی مسجد کو قبلہ رُخ بنایا۔ اس کو بننے کے سوا چارہ نہ تھا، لیکن آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نمازیوں میں سے ہر نمازی کا باطنی رُخ بھی مسجد کی طرح

قبلہ کی طرف رہتا ہوگا۔ وہ جس طرح قبلہ رُخ رہنے پر مجبور ہے، اسی طرح نہ رہنے میں بے بس ہے۔ ایک طرف وہ مذہب اور معاشرے کی ذمہ داریوں کا پابند ہے، دوسری طرف جسم و جان کے مطالبوں کا شکار۔ معلمانِ اخلاق و مذہب اور اربابِ حکومت و اقتدار اس فکر میں رہتے ہیں کہ انسان کے فطری میلان کو کیا رُخ اور رفتار دی جائے۔ اس رُخ و رفتار کے اعتبار سے افراد کی سیرت کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ اربابِ مذہب و اخلاق چاہتے ہیں کہ انسان اقدار کا پابند رہے، اربابِ حکومت اس فکر میں رہتے ہیں کہ آدمی کو کس طرح اغراض کا وسیلہ بنایا جائے۔ اغراض بھی وہ جو مطلق العنان حکومت کے ہوں، صالح و صحت مند معاشرے کے نہیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا، ایک خاص اندازِ فکر کی حکومت نے یہ اسکیم بنائی کہ سائنس اور سرجری کی مدد سے آدمی کی جبلّی خاصیتوں کو دور کر کے اس کے نظامِ اعصاب میں ایسا میلان پیدا کر دیا جائے جو ملک اور قوم کے مقاصد کو مشین کی مانند بغیر کسی چوں و چرا کے پورا کرے۔ مثلاً خوف، رحم، حیا، مآل اندیشی، انصاف دوستی وغیرہ کے میلانات یا تقاضوں کو اس کے اعصابی نظام سے اس طرح معدوم کر دینا چاہیے کہ وہ مارنے اور مر جانے کو ایسا ہی سمجھے، جیسے سانس لینا یا کھانا پینا۔ یعنی اس میں مرنے کا خوف یا احساس ہو نہ رحم دلی کی کوئی گنجائش باقی رہے، جیسا کہ نارمل حالات میں لازماً ہوتا ہے۔ اس طرح زندگی کے ہر شعبے اور شغل کے لیے اسی نوعیت کا انسانی ذہن تیار کیا جائے اور یہ سب اس لیے کہ ملک اور حکومت کے اغراض و مقاصد کا یہی تقاضا تھا۔ یہ پروگرام ایسی حکومت کا تھا، جو طبقات میں بٹے ہوئے معاشرے کو ایک ہی سطح پر لانا اور رکھنا چاہتی تھی۔ یہ مثال اس لیے دی گئی کہ ایسی حکومت یا معاشرے میں سیرت و شخصیت کی تشکیل یا تعمیر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں معمولی سے معمولی فرد کو بھی اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بر سرِ کار لانے اور اس سے فائدہ اٹھانے اور پہنچانے کا حق اور آزادی حاصل ہوتی ہے۔ پہلی صورت عظمتِ انسان سے انکار اور اس کی توہین ہے، اور دوسری اس کا اقرار اور تصدیق۔

سیرت اور شخصیت کی تعمیر کا تصور اس تصویر سے قطعاً مختلف ہے جو اوپر دی گئی ہے۔ یہ شبیہ انسان کی نہیں ہے، Robot کی ہے۔ (انسان کی شکل کی خود بخود حرکت کرنے والی کل)

سیرت و شخصیت کی تعمیر انسانی فضائل کے خطوط پر کی جاتی ہے، انسانی معصیت یا معذوری پر نہیں۔ ضمناً اس فرق کو بھی ملحوظ رکھیے کہ سائنس یا سائیکولوجی (علم النفس) کے اس عہد میں بچوں اور کم سن نوجوانوں کی تربیت ان کے خلقی رجحانات کے پیشِ نظر کرتے ہیں، دوسری طرف قدیم دبستاں کے پیروان کی پرداخت خلقی رجحانات نہیں، بلکہ اخلاقی اقدار کے ماتحت کرنے کی تائید میں ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان دبستانوں میں طریقۂ کار کا اتنا اختلاف نہیں ہے، جتنا اس کا کہ کس طریقۂ کار پر زیادہ زور دیا جائے۔ انسان میں فضائل اور رذائل دونوں ہوتے ہیں۔ رذائل کو نفسیاتی مرض قرار دے کر اس کی شناخت اور علاج تادیب گاہوں، اسپتالوں، جیل خانوں اور اس طرح کے دوسرے مقامات پر کرتے ہیں۔ فضائل کی ترقی اور استحکام کے لیے ساز و برگ اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں فراہم کیا جاتا ہے۔ اسی ساز و برگ سے سیرت و شخصیت کی نمود و نمو ہوتی ہے، اور یہ نہالِ برگ و بار لاتا ہے۔ جامع المتفرقین کا شکر ہے کہ ہم آپ کسی تادیب گاہ میں نہیں تعلیم گاہ میں ایک دوسرے سے مل کر شاد کام ہیں۔

ہر خیر کا سرچشمہ مذہب ہے، اور ہر وہ عمل خیر ہے جو انسان کی بھلائی اور برگزیدگی میں معین ہو۔ ایسی عمل خیر سے ہم مسلمان اپنے خدا اور رسول کی تصدیق اور ان کی بڑائی کا اقرار و اعلان کرتے ہیں۔ سیرت کی تشکیل میں سب سے اہم اور سب سے بڑا درجہ عقیدہ کا ہے، اس کے بعد عمل کا۔ ان پر گذشتہ اوراق میں گفتگو ہو چکی ہے۔ یاد یہ دلانا ہے کہ مسلمان کی سیرت کی تعمیر کا مسئلہ ہو یا کسی اور کی سیرت کا، سب سے بڑے خدا کا تصور اور سب سے بڑے انسان کا نمونہ سامنے رکھے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے بعد ہر شخص یا جماعت کو آزادی ہے کہ وہ اس کا انتخاب کرے کہ اس کا سب سے بڑا خدا اور سب سے بڑا انسان کون ہے، کیا ہے اور کہاں ہے۔ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اب اس کو سب سے بڑا خدا اور سب سے بڑا انسان ڈھونڈنے اور پالینے میں اتنی دقت ہرگز نہ ہوگی جتنی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ہوتی تھی۔

سیرت کی تشکیل میں یہ میرا بنیادی عقیدہ ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلے اس کا اعتراف کروں گا کہ اس موضوع پر میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ کسی ماہرین سے استفادہ

بھی نہیں کیا ہے، نہ سیر وسفر سے مدد لی ہے، نہ کسی کمیٹی یا کونسل سے منسلک رہا ہوں۔ میری تمام تر پونجی وہ تاثرات ہیں، جو کسی حادثہ ہی پر نہیں مسائل کے بارے میں بھی براہِ راست محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے میری عقل پر نہیں میرے خلوص پر بھروسہ کیجیے۔ عقل نے مجھے اکثر دھوکا دیا ہے۔ خلوص نے کبھی نہیں۔ لیکن اس کا بھی اعتراف ہے کہ وہ عقل میری ہی ہوتی کسی اور کی ہوتی تو شاید اس کو مایوس نہ ہونا پڑتا۔ اس سے آپ کو مطمئن ہونا چاہیے کہ میں عقل کی اہمیت کا ہرگز منکر نہیں ہوں۔

میں نے طالب علمی کا وہ زمانہ پایا جو غالباً مغلیہ سلطنت کے ختم ہونے کے فوراً بعد کا سب سے ممتاز تہذیبی عہد تھا۔ یعنی علی گڑھ کا۔ جو کچھ مجھے یہاں نصیب ہوا، اس کو اپنی بہترین متاع سمجھتا ہوں۔ زندگی اور زمانے کی بہت سی کروٹیں دیکھی ہیں۔ بلقان کی جنگ سے مغربی ایشیا (عرب ممالک) کے حال کے حادثے تک اسلام اور مسلمان جس تہلکے اور تباہی سے گزرے، ان کا بھی علم ہے۔ دو عظیم عالمی جنگوں کے نتائج جھیلے ہیں، اور تیسرے عالمی کید وکیں میں آپ کے ساتھ مبتلا ہوں۔ علی گڑھ کی رزم و بزم میں اس طرح رہنے کے بعد مجھے اس کا حق حاصل ہو گیا ہے اور کچھ عادت بھی پڑ گئی ہے کہ اپنے نوجوانوں کے سامنے زندگی کے مسائل و مطالبات کو علی گڑھ کے سیاق وسباق میں پیش کرتا رہوں۔ سیرت کی تعمیر میں روایت یا ماضی کی اہمیت مسلّم ہے، لیکن روایت سے مراد لکیر کا فقیر ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا شعور پیدا کرنا اور رکھنا ہے کہ زندگی کے سفر میں ہم کن منازل سے گزرے ہیں اور ان سے کیا رہبری ملی ہے۔ یہ سفر یک لخت مستقبل میں شروع نہیں ہو جاتا، بلکہ ایک مسلسل اور غیر منقطع ازلی اور ابدی سفر ہے، جانے پہچانے ماضی سے غیر معلوم مستقبل میں۔ جو شخص یا ملک ماضی سے آنکھ بند کر کے مستقبل میں جست لگا دیتا ہے اسے تقدیر الٰہی یا تمدن کے قوانین پھر ماضی کی طرف پھینک دیتے ہیں۔

آج سے پہلے طلبا اپنے اپنے گھروں سے مذہب اور تہذیب کا جو اثر و تصور لے کر آتے تھے، وہ ان کی جدید دنیوی تعلیم کی بعض خامیوں کا سدّ باب کرنے میں بہت موثر ہوتے تھے۔ لیکن عالم گیر اقتصادی فشار، اقدار کی شکست وریخت اور مسابقت کے شدید تقاضوں نے

مذہب اور تہذیب کی دیرینہ بندشوں کو یکسر ڈھیلا کر دیا ہے۔ طلبا میں خاندانی، تہذیبی روایات کا یہ تنزل طرح طرح کی ابتری کا باعث بنا ہوا ہے۔ ندوہ کے طلبا خوش قسمت ہیں کہ ان میں تہذیبی روایات اور مذہبی شعائر کا نسبتاً زیادہ احساس واحترام ہے، لیکن سیرت کی تشکیل اور شخصیت کی ہمہ جہتی، پرداخت میں روایات اور شعائر اسی وقت مفید ہوں گے جب ان کو احتیاط واعتماد کے ساتھ افہام وتفہیم کے اصول پر زندگی اور زمانے کے ناگزیر تقاضوں سے ہم دوش وہم عناں رکھا جا سکے گا، نہ کہ ان کے خلاف صف آرا کیا جائے۔ اس اصول پر حتی الوسع علی گڑھ میں کامیابی کے ساتھ عمل کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ ندوہ کے اساتذہ کرام کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ مثلاً جہاں دینی اور مذہبی علوم کی تعلیم بطورِ خاص دی جاتی ہے اور طلبا کے معیارِ زندگی کو اونچا رکھنے کا لحاظ نہیں کیا جاتا، وہاں اس کا بڑا خطرہ رہتا ہے کہ طلبا زندگی اور زمانے کے بہت سے ناگزیر تقاضوں سے ناآشنا رہ جائیں، اور ان کا شمار ایک خاص طرح کے افراد یا جماعت میں ہونے لگتا ہے۔ جن کو معاشرے میں کوئی قابلِ فخر حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ پہلے کبھی یہ صورت حال عام تھی اور نظر انداز کی گئی، جس کا خمیازہ بھی ہم بھگتتے آرہے ہیں۔

اس کی طرف توجہ نہ دینا ناقابلِ معافی اور ناقابلِ تلافی غلطی ہوگی۔ دینی اور مذہبی تعلیم کو حتی الوسع اتنا روزی کمانے کا نہیں جتنا اخلاق وعادات کو سنوارنے کا وسیلہ بنانا چاہیے۔ دراصل مذہب ومعاشرے میں علما کی اہمیت ہے پروہت کی نہیں۔ اس لیے فرصت کے لمحوں میں علما کو حکومت سے اور پروہت سے عوام کو محفوظ رہنے کی دعا مانگا کرتا ہوں۔ سیرت سازی کے منصوبے میں اس قباحت کا پورے طور پر لحاظ رکھنا چاہیے۔ ندوہ کے نوجوانوں کے سامنے تعلیم، تحقیق، تصنیف یا تبلیغ کا چاہے جیسا پروگرام ہو، ان کو اس قابل بھی بنانا پڑے گا کہ خیر وشر، ہار جیت اور عمل وردِ عمل کی اس عجیب لیکن عظیم دنیا میں وہ صرف عجیب نہ رہ جائیں، عظیم بھی بن سکیں۔ اس کے لیے آپ کو دارالعلوم کی تمام کھڑکیاں اور طلبا کے ذہنی دریچے کھلے رکھنے پڑیں گے۔ اساتذہ کے لیے یہ بڑی دشواری اور ذمہ داری کا کام ہے، لیکن نوجوانوں کی سیرت، تعمیر اور ان کی شخصیت کی تزئین میں اس سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔

ڈسپلن سیرت کی ماں ہے۔ صالح سیرت، صحیح ڈسپلن، سے نمو پاتی اور برگ و بار لاتی ہے۔ یہ ڈسپلن، عقیدہ اور عمل کے توافق سے ظہور پاتی ہے۔ یعنی عقیدہ، شرف وسعادت کا اور عمل ایثار و اخلاص کا۔ سیرت کی پرداخت میں جن عقائد پر کاربند ہونا ضروری ہے، ان کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد آپ ان امور کو ذہن میں رکھیں جن کا ذکر ڈسپلن کے تحت کیا گیا ہے۔ طالب علم کے لیے اس کی بھی بڑی ضرورت ہے کہ اس کے دل میں اساتذہ اور احباب کی منزلت و محبت کے واسطہ سے اپنی درس گاہ سے شغف ہو۔ درس گاہ ہی سے نہیں ان تمام چھوٹے بڑے اشخاص، اشیا اور حالات سے جن پر درس گاہ اور طالب علم کے شب و روز مشتمل ہوں۔ طالب علم کا یہ زمانہ اس کی زندگی کا سب سے مبارک اور خوش آئند لیکن نازک دور ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو اپنی ذہنی اور خارجی فضا دونوں کو اعلیٰ امیدوں اور آرزوؤں سے آباد و شاداب رکھنا چاہیے۔ اس زمانے میں طالب علم طرح طرح کے بڑے رنگین، گریزپا اور پُراسرار خواب دیکھتا رہتا ہے۔ خواب کی اس دنیا میں وہ کھویا جاتا ہے یا ان کو مناسب حال حقیقت کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ اس پر اس کی آئندہ زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اساتذہ کا سب سے مشکل اور مبارک کام طالب علم کے اس خواب میں حصہ لینا اور اس کو میدانِ عمل میں سمت و رفتار دینا ہے۔ یہی نہیں بلکہ طالب علم نے خواب نہ دیکھا ہو تو اساتذہ کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ اسے خواب دیکھنے پر آمادہ کریں۔ نوجوان خواب نہ دیکھے تو دنیا جوان ہونے سے اور میکدہ آباد ہونے سے محروم رہ جائے۔

یہ مواقع طالب علم کو اپنے کالج ہی کے فضا میں میسّر آئیں گے۔ اس نعمت کا قرض اس کو اپنی خدمات سے ادا کرنا پڑے گا۔ خدمات کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے، اس لیے یہ قرض یا احسان اس پر سے کبھی نہ اُترے گا۔ احسان چکانے کا زرمبادلہ اب تک دریافت نہیں ہوسکا ہے۔ یہ بات یہ جانتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔ بایں ہمہ خدا نے اپنے بندوں کو اس کا حوصلہ دیا ہے کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل ہی نہیں کرتے، بلکہ اس کی ہدایت و حکم کو ایک نئی سطح اور نیا زاویہ دے کر مزید فرو فروغ دیتے ہیں۔ جیسا کہ لازوال اقبالؔ نے خدا کے حضور میں اس کے بندوں کی وہ بڑائی بیان کی ہے جو مشیت الٰہی میں یقیناً مضمر تھی۔ پیامِ مشرق میں یہ نظم بعنوان 'محاورہ مابینِ خدا اور انسان' آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

کہنے کو یہ سب کہہ گیا لیکن اب یہ وسوسہ پیدا ہونے لگا ہے کہ آپ پر جو اتنا بار ڈال رہا ہوں، اس کا بالواسطہ جو فشار آپ کے اساتذہ اور کالج سے متعلق جتنے چھوٹے بڑے اور ہیں، ان پر پڑے گا تو وہ کیا کریں گے، اور مجھے کیا کہیں گے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اقامتی کالجوں میں طالب علم کی زندگی تنہائی اور ناآشنائی کی نہیں ہوتی، بلکہ یک جہت، مربوط اور مسلسل ہوتی ہے۔ اس میں جہاں کوئی خلل واقع ہوا، طالب علم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طبائع کی ساخت و پرداخت اور سوچنے اور عمل کرنے کے اعتبار سے ہر نوجوان ایک مستقل وحدت یا اکائی ہوتا ہے۔ اچھے معلّم اور اچھی تعلیم گاہ کا یہی کام ہے کہ وہ ان طبائع کو مشترک تہذیبی اقدار اور ملکی و معاشرے کے مفاد کا پابند اور پاسبان بنائے۔

سیرت کا اظہار شخصیت میں ہوتا ہے، اور شخصیت ہی شخص کی خودی یا اس کا طرّۂ امتیاز ہے۔ شخصیت نہیں تو شخص بھی نہیں۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ شخص کے حسب و نسب کا انحصار اس کے منصب، معاش و ملکیت اور خاندانی شجرہ پر اتنا نہیں ہوتا، جتنا اس کی شخصیت پر۔ اسی لیے اسلام میں شخص کی بڑائی کا مدار پیدائش پر نہیں تقویٰ پر ہے۔ تاکہ ہر شخص کو اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کا یکساں موقع ملے۔ تقویٰ سے سیرت کو نمود اور شخصیت کو نکھار ملتا ہے۔ اس سے انفرادیت کی تشکیل ہوتی ہے، جو شخصیت کی نگہداری اور نمائندگی کرتی ہے۔ شخصیت کا انحصار ایثار پر ہے، تن آسانی پر نہیں۔ فرائض کی بجا آوری پر ہے، فرائض کی خانہ پُری پر نہیں۔ آپ نے ایسے اشخاص دیکھے ہوں گے جو تمام عمر، مذہب، علم، اخلاق اور دوسرے اعمالِ فاضلہ سے وابستہ رہے ہوتے ہیں، لیکن ان میں ان مشاغل حسنہ کی کوئی خصوصیت یا امتیاز نہیں ملتا۔ آپ ان سے مل کر یہ نہ محسوس کریں گے کہ کسی مذہبی یا علمی شخصیت سے دوچار ہیں، جس کی روشنی دل آسائی اور گراں مائیگی آپ میں غیر شعوری طور پر نفوذ کر رہی ہے۔ کہیں پڑھا یا سُنا تھا کہ حضرت حسن بصریؒ خاموش بھی رہتے تھے تو اردگرد کے لوگ صرف ان کو دیکھ کر اپنے اپنے طور پر اخلاقی فضائل سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

آپ نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا، جن کے تمام اعضا فرداً فرداً سجل اور دیدار ہوتے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی وہ خوش شکل نظر نہیں آتے۔ جیسے اعضا میں وہ ہم آہنگی نہ ہو، جس کو حسن یا زیبائی کہتے ہیں۔ ایسا شخص کتنا بدنصیب ہوگا جس کو ہر عضو خوب صورت دیا گیا ہو، لیکن مجموعی طور پر نالائق یا غبی نظر آئے۔ اس کے برخلاف بعض اَن پڑھ فلاکت زدہ کسان اور محنت کش ایسے ملیں گے جن کا سابقہ تمام عمر مویشیوں، ناموافق موسموں اور فصلوں، نالائق زمینداروں، ناسازگار حالات اور ہم نفسانِ دیرینہ یعنی افلاس واد بار میں رہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں، چہرہ مہرہ بھی اسی کے مطابق ہوگا، لیکن ان کو دیکھ کر فی الفور اس کا احساس ہوگا کہ ان میں انسانیت، انفرادیت اور شخصیت ہے، اور ہم اپنی قیمتی متاع ان کی امانت میں دے سکتے ہیں۔ تعلیم وتربیت کا حقیقی مقصد بالخصوص ایسے ادارے میں جیسا کہ ندوہ ہے، اسی انسانیت، انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر وتزئین ہے۔

شخصیت کسی خاص طرز کی وضع قطع، لباس، چال ڈھال، حلیہ، فن، پیشہ، عبادت، تفریح یا ورزش نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ کردار کی زندگی ہے۔ حیا، سخاوت اور شجاعت کی زندگی جس سے شخصیت ظہور اور جلا پاتی ہے۔ یہی بات علمی شخصیت کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ علم وفضل کا معیار سند یافتہ یا بڑے علمی عہدوں پر فائز ہونا نہیں ہے۔ جیسے انتظامیہ میں کپتان اور کلکٹر ہوتے ہیں۔ علمی شخصیت وہ ہے جس کو دیکھ کر یا جس سے قریب رہ کر علم کی عظمت کا احساس ہو۔ سیرت اور شخصیت کی تشکیل میں مذہب اور علم کو خاص طور پر معرضِ گفتگو میں لانے کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں کا شمار زندگی کے معظّمات میں ہوتا ہے، اور معظّمات میں ابتری آنے سے معاشرے میں اختلال راہ پاتا ہے۔ ندوہ ایک علمی مذہبی اور تہذیبی ادارہ ہے۔ اس لیے یہاں کے طلبا کے ظاہر و باطن اور قول وفعل میں ان خصوصیات کی ہم آہنگی ملنی چاہیے۔ ان خوبیوں کا یک جا ہونا آسان نہیں ہے۔ ہم جس عہد سے گزر رہے ہیں اور زندگی کے خوب و زشت کی جس سرعت وسفاکی سے شکست وریخت ہو رہی ہے، ان میں تہذیبی اقدار کی تعین اور ان کی پیروی خاص طور پر بہت مشکل ہے۔ لیکن تہذیبی مسائل ایسے ہیں جو عام طور پر کسی نہ کسی حد تک تسلیم کیے گئے ہیں۔ ان کو نظر میں رکھنا بہرنوع مفید ہوگا، اس لیے کہ زمانہ کی سمت ورفتار

کچھ ہی کیوں نہ ہو، انسان اعلیٰ اقدار سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ہمارا اور ہمارے اداروں کا علمی اور مذہبی ہونا نسبتاً آسان ہے۔ تہذیبی ہونا مشکل ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی ایک صفت نہیں ہے، بلکہ بہت سی صفات کا مجموعہ ہے، اور بڑی دیر میں اور بڑے ریاض کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ تہذیبی صفت پر اس لیے زیادہ زور دیتا ہوں کہ یہ ہر قوم و ملک ہی سے نہیں ہر جماعت اور فرد سے یگانگت پیدا کرنے اور رکھنے کا سب سے موثر لیکن مشکل وسیلہ ہے۔ یہ تہذیب جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، حیا، سخاوت اور شجاعت کی زندگی سے ظہور میں آتی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ کے اساتذۂ کرام آپ کے لیے اپنی تمام خوبیاں وقف رکھیں اور آپ اپنی بہترین صلاحیتوں کو کام میں لاکر اساتذہ کی توجہ اور شفقت کا اپنے کو اہل ثابت کریں۔ اس کے علاوہ آپ کو اپنے ساتھیوں میں سے بھی ایسے دوستوں کو انتخاب کرنا پڑے گا جن کے ذہن کی بلندی اور اخلاق کی استواری اور پاکیزگی مسلّم ہو۔ طالب علمی کی زندگی کو سنوارنے یا بگاڑنے میں کالج کے ساتھیوں کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ والدین آپ کے ساتھ نہیں ہوتے، اساتذہ سے محدود و مخصوص اوقات میں سابقہ ہوتا ہے۔ ہر وقت کا اُٹھنا بیٹھنا، ہنسا بولنا، بحث مباحثہ، کھیل اور تفریح، ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شرکت، آرزوؤں کی فراوانی، کچھ کر دکھانے کا حوصلہ، اعتبار و اخلاص کی یہ زندگی، اچھے بورڈنگ ہاؤس، اچھی تعلیم گاہ اور ان کی اچھی روایات ہی میں نصیب ہوتی ہے، اور آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ آپ کی سیرت کے سنوارنے میں ان عوامل کا کتنا بڑا حصہ ہو سکتا ہے۔ خدا اور دوست کے انتخاب میں بڑی احتیاط، اخلاص و احترام سے کام لینا چاہیے۔ اس بیان میں بے باکی محسوس ہو تو معاف کر دیجیے، لیکن اس حقیقت کو کبھی نہ بھولیے گا کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر میں خدا پر یقین اور دوست کی رفاقت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

یہ باتیں تو آپ کی طالب علمی کی زندگی سے متعلق ہوئیں، جب آپ کی کفالت اور تعلیم و تربیت کا مدار آپ کے والدین، اساتذہ اور اس درس گاہ پر ہے۔ لیکن جلد یا بہ دیر شفقت و سعادت کی اس فضا سے نکل کر آپ کو زمانہ اور زندگی کے ناگزیر اور اکثر ناقابلِ پناہ تقاضوں سے سابقہ ہوگا۔ اس وقت آپ کو کوئی سہارا یا ہدایت نہ ملے گی، سوا ان اچھی عادتوں کے جو آپ نے یہاں اختیار کی ہوں گی۔ ناروا عادتوں اور طریقوں سے بھی لوگوں نے دولت اور منصب حاصل

کیے ہیں۔ان کی تعداد زیادہ بھی ہوسکتی ہے،لیکن اس طریقۂ کار یا شیوۂ زندگی کی ترغیب اس لیے نہیں دی جاسکتی کہ آج دنیا جس مصیبت اور معصیت میں مبتلا اور جس ہلاکت کے قریب ہے، وہ ان ہی بُری خصلتوں کا نتیجہ ہے۔جن سے آپ کو دور اور محفوظ رکھنے کے سارے جتن کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان تاریخ کے جن نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے اس وقت جہاں کھڑے نظر آتے ہیں وہ ان کی تقدیر کا معمولی مرحلہ نہیں ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا عبرت ہوگی کہ ان کی جان و مال، آبرو کی حفاظت کا انصرام، حکومت، عدالت یا انتظامیہ کے صواب دید پر نہیں بلکہ سیاسی مذہبی یا مذہبی سیاسی جماعتوں کے رحم وکرم پر ہو۔ دوسری طرف دنیا کی شاید ہی کوئی قوم، کمیونٹی ، جماعت یا اقلیت ایسی ہوگی جس نے بڑی سے بڑی آزمائش میں حکومت اور اکثریت سے اپنی بے لوث وفاداری کا ایسا واضح ثبوت دیا ہو، جیسا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے۔ گذشتہ بیس سال میں ان پر کیسے کیسے سانحے گزر گئے ،اور بے بنیاد واشتعال انگیز الزامات تراشے گئے ،لیکن ان کی طرف سے کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو ملک کی حفاظت، سالمیت اور نیک نامی یا کسی اچھے سے اچھے شہری کی فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری کا منافی ہوتا۔ جب کہ دوسروں نے جو اپنے آپ کو ملک اور وطن کی عفت وعظمت کا سب سے بڑا امین وعلم بردار سمجھتے ہیں، ملک ووطن کو اپنی مسلسل نازیبا اور خطرناک سرگرمیوں سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہو۔ بایں ہمہ ہمارا موقف یہ رہا ہے اور یہی رہے گا کہ جب تک ملک کا قانون اقلیتوں کی جان، مال، آبرو، مذہب، زبان، تہذیب اور آزاد مسابقت کے یکساں مواقع فراہم کرنے اور انسان وافراد کے بنیادی حقوق کی حفاظت کا اپنے کو ضامن اور ذمہ دار قرار دیتا رہے گا۔ ہم اپنے حقوق کا انصرام اور حق تلفیوں کا مداوا حکومت اور ملک کے قوانین سے چاہتے رہیں گے۔ وہ لوگ جو ہم سے عداوت یا نفرت رکھتے ہیں، ان کو ہم سے جھگڑنے کے بجائے ملک کا موجودہ قانون بدل دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ان کے منشاو مقصد کے راستے میں ہم نہیں ان کا اور ہمارا قبول کیا ہوا قانون حائل ہے۔ جب تک مسلمان اپنے خدا اور اپنے ملک کے قانون کے پابند اور پیرو ہیں، وہ اپنے آپ کو مایوس، بیزار یا تنہا نہیں سمجھتے۔اس طرح وہ آئین کے دیے ہوئے اپنے سارے حقوق کا آئین ہی کے دیے ہوئے وسائل سے مطالبہ کرتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ جن دشواریوں سے آج ہم گزر رہے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کی سبیل کیا ہوسکتی ہے؟ اس سلسلے میں جو باتیں ذہن میں آتی ہیں وہ نئی نہیں ہیں، صرف مشکل ہیں۔ اس لیے اندیشہ ہے کہ ہم ان پر عمل نہ کرسکیں گے۔ جیسا کہ ہم بالعموم کیا کرتے ہیں۔ ایک بہت معمولی سی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ جتنی بڑی مصیبت ہوگی، اس سے نجات پانے کے لیے اس سے کچھ زیادہ ہی سختی جھیلنی پڑے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ صرف رزولیوشن پاس کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں، اور اللہ تعالیٰ یا انجمن اقوامِ متحدہ ان دشواریوں کو فی الفور دور کردے۔ اقوامِ متحدہ کے بارے میں آپ خود بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں میری واقفیت یہ ہے کہ وہ سب کچھ ہونے کے علاوہ بڑا ہی سخت گیر آقا یا ٹاسک ماسٹر ہے۔ یہاں تک کہ اپنے حبیب اور ہمارے آپ کے آقا سے بھی جب تک اس نے اپنے سارے احکام کی ذرّہ ذرّہ تعمیل نہ کرالی، ان کو 'حبیبِ خدا اشرفِ انبیا' کے منصب عظمیٰ پر فائز نہ کیا۔ عام طور پر ہم سب صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ رسالت مآب کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص نوازشوں سے سرفراز فرمایا، لیکن جو لوگ کلامِ الٰہی اور سیرت نبویؐ کے معنوی ربط ورشتے کو پہچانتے ہیں، وہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ آیۂ رحمت کو تاعمر کیسا عظیم اور کتنا صبر آزما رول ادا کرنا پڑا تھا۔ نظر برآں اَلم و آزمائش کے ہر مرحلہ میں ہم کو وہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا، جس کو اللہ نے اپنے برگزیدہ رسول کے وسیلے سے ہم کو دکھایا اور بتایا ہے۔ یہ راستہ مشکل ہے، لیکن نجات ونصرت کا ہے۔ آپ ایسا نہیں چاہتے یا نہیں کرسکتے تو مسلمان کے خدا اور رسول سے آپ کو فلاح کی کوئی توقع نہ رکھنا چاہیے۔ رحمتِ عالم کے بارے میں لب کشائی کی جرأت نہیں کرسکتا، لیکن جہاں تک مشیت الٰہی کا تعلق ہے، یہ جانتا ہوں کہ آپ کا چاہنا یا نہ کرسکنا، آپ کو مواخذے سے نہیں بچا سکتا۔ یہ بات اس لیے کہنی پڑی کہ ہم کو اس غلط فہمی سے پناہ مانگنی چاہیے کہ ہم کتنے ہی نالائق اور نکمے کیوں نہ ہوں، خدا اور اس کے رسول ہمارے ساتھ ہیں۔ اگر ہم ایسا سمجھتے ہیں تو خدا اور رسول ہی کے تصور سے بیگانہ نہیں۔ مکافاتِ عمل کے قانون سے بھی نابلد ہیں۔ اسرائیل اور عرب کی جنگ میں جو عبرت سامنے آئی ہے، اس کا خوف مسلمانوں کو خاص طور پر ہونا چاہیے جو خدا کے وعدوں پر بھولے ہوئے ہیں، اور اس کی وعیدوں سے بےخبر یا بےپرواہ ہیں۔ خدا نے ایک مغضوب ومقہور قوم سے ایک محبوب وممتاز قوم

کو جو دن دکھلوا دیے اور جس حال کو پہنچا دیا، اس کی مثال اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ البتہ اس کی بڑی واضح وعیدیں اللہ کے کلام میں مل جائیں گی۔ ضعیف الاعتقاد یا غفلت شعار مسلمانوں کو احتیاطاً کلام الٰہی سے اس کی تصدیق کر لینا چاہیے۔

ہندوستان کے مسلمان طرح طرح کی جن معذوریوں اور مصیبتوں سے دوچار ہیں، اس میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ یک سُو اور یک دل ہو کر اپنی ضرورتوں اور ذمہ داریوں کے پیشِ نظر اپنے لیے ایک نیا دستور عمل مرتب کریں۔ ہوش مندی، ہمت اور ہمدردی سے۔ ہندوستان میں وہ حکمراں رہے تو ہندوؤں سے مل جل کر رہے۔ انگریزوں کی حکومت میں دونوں محکوم تھے، لیکن اس طرح شیر و شکر ہو کر رہے کہ آج ان دونوں کو دل کش قصہ کہانی کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اب جب کہ مسلمانوں کو سیکولر جمہوریۂ ہند میں اقلیت کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کو وطن اور ہم وطنوں میں اسی طرح بسر کرنا ہے جو ایک آزاد اور وفا شعار شہری کا حق بھی ہے، اور ذمہ داری و امتیاز بھی۔ اس کے لیے ہر مسلمان ہر قیمت پر نہیں، لیکن ہر ممکن و مناسب طریقے سے اپنی تمام اچھی صلاحیتوں کے ساتھ ملک کی بہتری و برتری کے کاموں میں مستعد اور پیش پیش رہے گا۔ حصولِ آزادی سے لے کر آج تک مسلسل جن ناگفتہ بہ حالات و حوادث کا شکار رہ کر اس نے شہریت کے دشوار اور نازک ترین فرائض جس استقامت اور وقار کے ساتھ ادا کیے ہیں، وہ ملک کے اس دور کی تاریخ میں فخر کے ساتھ یاد نہ بھی رکھے جائیں تو آسانی کے ساتھ بھلائے بھی نہیں جا سکتے۔ اس عہد میں مسلمانوں کی زبونی کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اثر و اقتدار اور دولت و دانش کے اعتبار سے ان کا اونچا طبقہ اپنے نچلے طبقے سے کٹ کر نہ صرف ذاتی ترقی و ترفّع کے حصول میں منہمک ہو گیا، بلکہ کسم پُرسی ساتھیوں کو اپنے قول و فعل سے بے وقعت اور درماندہ تر کرنے میں پیش پیش رہا۔ اونچے طبقے کی اس خصلت یا روایت کو جس وقت نچلے طبقے نے پہچان لیا، اور یاد رکھا تو پھر آئندہ کبھی نکبت اور نگوں ساری سے دوچار نہ ہوگا، لیکن کیا کیجیے:

عشق بے چارہ، نہ ملّا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

اس وقت اور یہاں آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ آئندہ زندگی، عزّت اور اطمینان سے گزارنی ہے تو اب تک ہم جس طرح بسر کرتے آئے ہیں، اس پر سختی سے نظر ثانی کرنی پڑے گی۔

ابتدا اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کرنی پڑے گی کہ ایک نامعلوم مدت تک بے منّت غیرے محن و مشقت کی زندگی ڈسپلن کے ساتھ ہنسی خوشی راضی بہ رضائے الٰہی رہ کر گزارنی ہے، جسے کوئی منظم اور بہادر قوم یا جماعت ایمرجنسی کا اعلان کر کے جنگ، قحط، وبا اور دیگر آفاتِ ارضی و سماوی سے عہدہ برآ ہونے پر آمادہ ہوئی ہو۔ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک طرف محنت، قابلیت، حوصلہ اور یگانگت سے کام لینا پڑے گا، تو دوسری طرف نہ صرف نامناسب عادتوں اور خواہشوں کو چھوڑنا پڑے گا، بلکہ طرب و تفریح کے بہت سے ایسے مشاغل کو بھی جو زندگی کے معمولات بن چکے ہیں، کلیتہً نہیں تو تقریباً ختم کرنا ہوگا۔ ملک کی عام فضا ہمارے ہی لیے ناسازگار نہیں ہے، بلکہ حکومتِ وقت اسے خود اپنے لیے مایۂ ناز یا قابلِ اعتبار نہیں محسوس کرتی اور کوئی نہیں جانتا اس فضا کی حرارت و برودت کس وقت کیا رنگ اختیار کر لے۔ عاشق ہی نہیں حکومت اور اقلیت دونوں کو 'بالائے غم ہائے دگر' بہت کچھ انگیز کرنا پڑتا ہے۔

تردّد اور تشویش کی اس گھڑی میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں سے جن کو شریف اور حزیں حالؔی نے قوموں کی عزّت بتایا ہے، درخواست کروں گا کہ ہماری مدد کریں جب کہ ہمارے وہ تمام گراں بہا امتیازات معرضِ خطر میں ہیں، جن کو ہم نے اعلیٰ اقدار کی حمایت و پیروی سے اپنایا اور پھیلایا۔ مثال کے طور پر عرض کروں گا، مسلمان طلبا اردو کے بعض مخصوص اور اہم الفاظ مثلاً ز، خ، ش، غ، ف، ق کے تلفظ سے ناآشنا ہو چکے ہیں۔ اردو کا خط اور الفاظ کا اِملا مسخ ہو چکا ہے۔ صحیح لب ولہجہ سے معذور ہیں۔ ان تہذیبی آداب و روایات اور ادبی ذوق سے بیگانہ ہو گئے ہیں، جن کے لیے اردو اور اردو داں طبقہ خاص طور پر ممتاز و مشہور تھا۔ ان محرومیوں کی تلافی اب صرف ماؤں اور معلّموں کے ہاتھ میں رہ گئی ہے۔ ماں ہی کے دودھ اور گود میں بچوں کو مذہب، زبان اور تہذیب کا اوّلین ذائقہ اور ذمہ داری ودیعت ہوتی ہے۔ جسے معلّم پروان چڑھاتا ہے، اور جسم و جان میں راسخ کر دیتا ہے۔ اعلیٰ اقدار کی حمایت و پیروی اور گھر کی زندگی کو بابرکت اور دل کش بنانے اور رکھنے میں خواتین کا بڑا اہم اور قیمتی حصہ ہے۔ اگر ہماری زندگی کا یہ محاذ محفوظ و مضبوط ہے تو حوادثِ روزگار ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، بلکہ ہر آزمائش مزید فتح یابی کا وسیلہ بنے گی۔ کارزارِ حیات میں مردوں کی آپس کی مسابقت خاندان اور معاشرے کے اقتصادی و اخلاقی تار و پود کو

بالعموم مستحکم کرتی اور رکھتی ہے، لیکن نمود و نمائش اور تفوق و تحسین کی خاطر خواتین کی آپس کی مسابقت جو اکثر رشک و رقابت تک پہنچ جاتی ہے۔ خاندان اور معاشرے کے اقتصادی و اخلاقی درو بست کو ڈھیلا کرتی رہتی ہے، اور بالآخر تار تار کر ڈالتی ہے۔

معاشرے کی اوّلین اور اہم ترین اکائی (یونٹ) خاندان ہے۔ جس کی خوش حالی اور احساسِ ذمہ داری پر ملک و قوم کی فراغت اور اقبال مندی کا انحصار ہے، اور خاندان کے سُکھ کا مدار خاندان کی ماں پر ہے۔ اس طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خدا، حکومت، معاشرت یا بحیثیت مجموعی انسانیت کی طرف سے ماں پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور وہ کس درجہ ہماری محبت اور عزّت کی مستحق ہے۔ وہ لائق اور فرض شناس اولاد فراہم نہ کرے گی تو اس دورِ ابتلا و آزمائش میں ہم کیا کریں گے، کدھر جائیں گے اور ہمارا کیا ہوگا؟ جنت میں عورت حوا تھی، دنیا میں وہ یکسر ماں ہے۔ خدا نے دنیا میں بھیج کر اس کو جو منزلت بخشی ہے، اس کا اسے نذرانہ ادا کرنا پڑے گا، اور اسی اعتبار سے وہ ہماری شکر گزاری اور احترام کی مستحق ہوگی۔ میں ان اندوہ ناک طور طریقوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، جن کی گرفت میں دنیا کی تقریباً تمام عورتیں کسی نہ کسی بہانے یا بنا پر زندگی کے موڑ اور سطح پر نظر آئیں گی۔ اس پر گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مجھے تو اس وقت اور یہاں اپنی خواتین سے صرف یہ درخواست کرنی ہے کہ ''ہم پر وقت عجب آن پڑا ہے'' چنانچہ جس طرح بدنصیب پس ماندہ قومیں آفاتِ ارضی و سماوی کی زد میں آکر بڑی بڑی حکومتوں سے سامانِ خورد و نوش مانگنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ہم ملّت کی ماؤں سے ایسے بیٹے بیٹیوں کے خواست گار ہیں، جو ہمارے مذہب، اخلاق، تہذیب، روایات اور شعر و ادب کی حفاظت کریں۔ ان کا نمونہ اور نمائندہ ہوں، ان کو مقبول بنائیں، خدا ترس، انسانیت دوست، غیور و جسور ہوں، ملک اور وطن کی بہتری اور بڑائی کے لیے اپنی تمام اچھی صلاحیتیں وقف رکھیں، اور کام میں لائیں۔ جن کو دیکھ اور برت کر ہر شخص ہماری عزّت و محبت کرے، اور بڑے سے بڑے خطرے میں ہماری دیانت، دلیری اور دردمندی پر بھروسہ کرے۔ یہ بات آسان نہیں ہے، جب تک مائیں اپنی اولاد میں یہ صفات پیدا یا بیدار کرنے کے لیے اسراف، خودنمائی، عیب چینی، حسد، تنگ نظری اور اس طرح کی دوسری نامبارک خصلتوں کو ترک نہ کردیں گی جو دوسروں کی

دیکھا دیکھی ان میں غیر شعوری طور پر راہ پا گئی ہیں، اور ان پاکیزہ عادات و اخلاق کو نہ اپنائیں گی جن کو وہ یقیناً عزیز رکھتی ہیں، لیکن ان کو حاصل کرنے کی ہمت نہیں کرتیں۔ اوپر جو عیب گنائے گئے ہیں، ان سے ہم بھی محروم نہیں ہیں، لیکن محسوس کچھ اس طرح کرتا ہوں کہ خواتین کا خاندان اور سماج سے اتنا اہم اور نازک رشتہ ہے کہ ان کی کمزوری جتنا اور جیسا نقصان پہنچا سکتی ہے، اتنا مردوں کے متعدد نقائص نہیں پہنچا سکتے۔ جن حالات کو ہم پہنچ گئے ہیں یا پہنچا دیے گئے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمارے ہر مرد، عورت، بچے، بوڑھے، امیر، غریب سب کو پیٹ پر پتھر باندھنا پڑے گا۔ تفریح و طرب سے منہ موڑ لینا ہوگا۔ علم و ہنر کو ہر قیمت پر حاصل کرنا پڑے گا، اور ہر سختی کو جو اس راستے میں پیش آئے گی اس کو صبر، شائستگی اور شگفتہ روئی کے ساتھ تائید الٰہی اور توفیقِ انسانی پر بھروسہ کر کے جھیلنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان تمام صحت مند، اُمید افزا اور ترقی پذیر عناصر و عوامل کا خیر مقدم کریں گے اور ان کو تقویت پہنچائیں گے، جو ہندوستان اور اس میں رہنے بسنے والوں کے بیش از بیش فروغ و فراغت کا باعث ہوں گے۔ مغرب نے عورت کو وسیلۂ نشاط بنایا، ملّت اس کو سرمایۂ نجات بنانا چاہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے طفیل ہم کو جو برگزیدگی بخشی ہے، اور جن اعلیٰ ذمہ داریوں سے نوازا ہے اور ہمارے عملِ صالح سے اس کی شہادتیں تاریخ اور عہد کے صفحات اور زندگی کے اوراق پر جہاں جہاں جس جس طرح سے ثبت ہیں، ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہم نے دنیا میں تباہی نہیں تہذیب پھیلائی ہے، اور انسانیت کو مسخ نہیں کیا، معظم بنایا ہے۔ ہماری انفرادی، اجتماعی اور حکومتی زندگی 'آئینِ ماست سینہ چو آئینہ داشتن' کی مصداق رہی ہے۔ یہ باتیں ہم اپنی زبان سے نہیں تاریخ و تہذیب کی زبان سے کہہ رہے ہیں۔ جن کی شہادتیں جھٹلائی نہیں جا سکتیں۔ تاوقتِ کہ تاریخ و تہذیب کی عالم آشکار اور مسلّمہ نشانیوں کو مضحکہ خیز گھریلو گھروندوں سے چھپانے یا ڈھک دینے کی طفلانہ کوشش نہ کی جائے۔ نوجوان و نوخیز نسل کی صحیح و صالح خطوط پر رہنمائی اور آبادکاری کی جو التماس میں نے ماؤں سے کی ہے وہی معلّموں سے کرتا ہوں۔ اس لیے کہ جس طرح بچے کی پرورش و پرداخت ماں کے پیٹ اور اس کی گود میں ہوتی ہے اسی طرح طالب علم کی تقدیر معلّم کے سایۂ شفقت میں بنتی اور سنورتی ہے۔

بزرگو، دوستو اور عزیزو!

رسمائیں صمیمِ قلب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ نے جس محبت کا اظہار کیا ہے اور جس طرح میری ہمت اور توقیر بڑھائی ہے، آج تک مجھے اور کہیں نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں تک خیال کرنے لگا ہوں کہ اس طرح کی نیائش ونوازش پھر کبھی میسّر آنے والی ہوئی تو وہ مجھے آپ ہی کی خدمت میں آپ ہی کی طرف سے نصیب ہوگی۔ آشوب وآزمائش کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس کا بار بار ذکر یا احساس کرنے سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ صبر، شرافت اور پامردی سے اس کا سامنا کیا جائے۔ میں تو ایسے میں متحد ومنظم اور پُر امن وامیدرہ کر عالمی ضمیر یا انسانیت کی فتح وفیروزی پر ایمان رکھتا ہوں۔ آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔ آیئے خدا سے یہ دعا مانگیں جو مدت ہوئی کسی انگریزی کتاب میں پڑھی تھی۔ مانگنے کی نوبت آج آئی ہے، کیا عجب قبول ہونے کی ساعت بھی آج ہی آنے والی ہو۔

> ''اے رب ہم کو طاقت دے کہ ہم ان اُمور کو سکون اور استقامت کے
> ساتھ قبول کر سکیں، جن کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس کی ہمت اور حوصلہ دے کہ
> ہم ان اُمور کو بدل سکیں جو بدلے جا سکتے ہیں، اور جن کو بدلنا چاہیے اور
> اے میرے مالک اس کی سمجھ دے کہ ہم ان میں امتیاز کر سکیں۔'' آمین!

(کتابچہ، مطبوعہ 2/اکتوبر 1967)

●●●

خطبہ

جلسۂ تقسیم اسناد

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

27/ اکتوبر 1968

جنابِ صدر، اربابِ جامعہ، خواتین و حضرات!

میرے لیے یہ بتانا مشکل ہے، گو آپ کے لیے دشوار نہیں کہ میں یہاں کیوں اور کیسے؟ اپنی اس جسارت پر خود متعجب ہوں۔ اربابِ علم و فضل سے شرمندہ اور آپ سے ہمدردی کرتا ہوں، اور جناب شیخ الجامعہ صاحب کا دل سے شکر گزار ہوں جن کے کرم یا ستم سے یہاں تک پہنچا۔ آگے دیکھیے آپ کو اور کیا دیکھنا پڑتا ہے!

تمام عمر معلمی کرنے کے بعد ایسا محسوس کرنے لگا ہوں جیسے معلموں سے اتنا مانوس نہ ہو سکا جتنا طالب علموں سے قریب رہا۔ معلموں سے یہ بے تکلفی معاف فرمائی جائے۔ در بان آشنا ہو تو غالبؔ نے ذلت کو ہنسی میں ٹالنے کا مشورہ دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ طلبا جن کی خدمت کر کے اور جن کی محبت پا کر زندگی کے کتنے ملال و مایوسیوں سے محفوظ اور کتنی برکتوں سے بہرہ مند ہوا۔ میں آج ان کو جس عالم گیر ہیجان میں مبتلا دیکھتا ہوں، اس سے دل دُکھتا ہے اور بڑی خواری محسوس ہوتی ہے۔ نوجوانوں کی بیزاری و برہمی سمجھ میں آتی ہے۔ ان کی رُسوائی اور در بدری نہیں دیکھی جاتی۔ ان کی بدحالی سے معاشرے میں ابتری آئی ہے، شعر و ادب کم عیار ہو گیا ہے اور زندگی میں نہ وقت باقی رہ گئی نہ وزن۔ دو عظیم جنگوں کی لائی ہوئی خرابیوں اور دشواریوں کے بھگتنے میں نوجوان سب سے زیادہ گھاٹے میں رہے۔ ان کا گھاٹے میں رہنا ایسا ہی ہے جیسے لہلہاتی ہوئی کھیتی مسلسل سوکھے کی نذر ہوتی رہی ہو۔ دنیا کی ترقی و فلاح کا مدار نوجوانوں کی آسودہ حالی اور آرزومندی پر ہے۔ وہ خسارہ میں رہیں گے تو فائدہ میں کون

رہے گا۔ نئی نسل کے اعمال و اخلاق کی دیکھ بھال اس کے حوصلے کو بڑھانے اور اس کو اپنے سے خوش رکھنے کا جو فرض و ذمہ داری والدین، معلّم اور حکومت پر عائد ہوتی تھی، وہ کم و بیش نصف صدی سے پوری نہ کی جا سکی۔ اس طور پر ہماری تین نسلیں ان قیمتی عوامل کی فیض بخشیوں سے محروم ہوتی رہیں، جن کے بغیر کسی نسل کی ایسی تربیت نہیں ہو سکتی کہ وہ دنیا کے بدلتے اور بڑھتے ہوئے تقاضوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس دنیا کا بالخصوص جو گذشتہ پچاس سال میں ہمارے سامنے آئی اور آئندہ اتنے ہی دنوں میں معلوم نہیں خود کہاں تک پہنچے اور ہم کو پہنچائے۔ اب تک ہمارا سابقہ پھیلتی ہوئی دنیا (Expanding World) سے تھا۔ ہم اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ اب جب کہ پھٹتی ہوئی دنیا (Exploding World) کا سامنا ہے، دیکھئے ہم کیا کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں غالباً فرانس میں کچھ دانش وروں کا اجتماع ہوا تھا۔ موضوعِ بحث نوجوانوں کی بھوک، برہمی و بے راہ روی تھا۔ گفتگو بہت کچھ ہوئی، صرف نوجوانوں کی شکایت جہاں کی تہاں رہی۔ نوجوانوں کا کہنا یہ تھا کہ ہم کو بھوکوں مر جانا گوارا ہے، بورڈم کی برداشت نہیں! بورڈم کا ترجمہ یا توضیح نہیں کرتا۔ یہ وہی ذہنی کیفیت یا موڈ ہے جس کا میں اس وقت مرتکب اور آپ موئید ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ بورڈم کیوں اور کیسے! وہ کون سی باتیں ہیں یا نہیں ہیں جن کی وجہ سے یہ بے کیفی یا اُکتاہٹ ہے۔ جسم و جنس کے جتنے اور جیسے تقاضے ہو سکتے ہیں وہ کھلم کھلا ہر جگہ بغیر کسی رُکاوٹ یا مواخذہ کے زیادہ سے زیادہ مقدار میں ادنیٰ سے ادنیٰ اشارے پر میسّر ہیں۔ پھر یہ بے اطمینانی و ناآسودگی کیوں؟ معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان صرف جسم اور جنس کے تقاضوں اور ان کی آسودگی کے سامان فراہم کر دینے سے مطمئن نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کو مختلف اور بہتر و برتر شے کی طلب اور تلاش ہے۔ ظاہر ہے وہ صرف ایثار، آرزومندی، سچائی اور خوب صورتی یعنی اقدارِ اعلیٰ ہی کی پیروی سے مل سکتی ہے، لیکن نوجوان ان کو کس طرح سمجھیں اور اپنائیں۔ جب ان کے چاروں طرف دور دور تک خوف، نفرت، خودغرضی اور شبہ کی وبا پھیلی ہوئی ہو اور اس میں مایوسی، جہالت، بیماری اور بھوک کا عفریت سرگرم کار ہو۔ کیسی ستم ظریفی ہے، کبھی اس اُمید پر جیتے تھے کہ وقت آنے والا ہے جب کوئی مہدئ موعود آ کر ساری خرابیاں دور اور تمام خوبیاں ہمارے اندر فراہم کر دے گا۔ آج دہشت میں مبتلا ہیں کہ معلوم نہیں کب کوئی

باؤلا ہائیڈروجن بم گرانے لگے اور دنیا کا وہ حال ہو جس کے بارے میں کہا گیا ہے، زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا۔

حضرات! دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ طالب علموں سے یا ان کے بارے میں جب کوئی شکایت یا شکایات اربابِ اختیار کو پہنچتی ہیں تو بجائے اس کے کہ ان نوجوانوں کے ذہنی، اخلاقی اور اقتصادی حالات کو سدھارنے کی وسیع پیمانے پر کسی طویل میعادی منصوبے کے تحت، مخلصانہ تدابیر عمل میں لائی جائیں، اس کا انتظام کیا جانے لگتا ہے کہ ان کی بے اطمینانی یا شورانگریزی کو کس طرح تفریح وطرب کی سرگرمیوں سے خاموش کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقۂ کار سے ڈسپلن کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ تعلیم وامتحان کا معیار گرنے اور بے اعتباری پھیلنے لگتی ہے یا پھر ہر درد کا درماں ایک کمیشن مقرر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا مسئلہ ایصالِ ثواب کا ہو جس سے فاتحہ خوانی، قوالی یا عرس منا کر فارغ ہو جاتے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ پچھلی نصف صدی میں خورد وکلاں کتنے بے شمار تعلیمی کمیشن مقرر ہوئے۔ ان سے کتنی خامیاں دور اور کتنے راستے صاف ہوئے۔ ہم کہاں تک پہنچے اور بحیثیت مجموعی ملک یا محکمے میں ان کو کیا وقعت دی گئی۔ تعلیم کے ماہر یا منجم کو خواہ مشرق کا ہو، خواہ مغرب کا۔ یہی کہتے سنا گیا کہ ہمارا نظام تعلیم ہماری زندگی کے مطابق نہیں، اور کیسے کہوں کہ ہماری زندگی بھی کسی تعلیم کے مطابق یا اس کی مستحق رہ گئی ہے یا نہیں، اس میں شک نہیں۔ بہت سے اسباب کی بنا پر زندگی اس تیزی سے منقلب ہونے لگی ہے جیسے مستقبل حال بنتے ہی ماضی میں پھسل جاتا ہو۔ زندگی کا نظم یہ ہو جائے تو نظامِ تعلیم کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ بایں ہمہ ایسا بھی نہیں ہے کہ زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں نظامِ تعلیم کوئی رول نہ ادا کر سکے۔ زندگی میں بھلا ہو یا بُرا انقلاب لانے والے ہم ہیں تو اس کو قابو میں لانے اور مفید مطلب بنانے کا منصب اور ذمہ داری بھی ہماری ہی ہوگی۔ البتہ اس امر کا واضح احساس ہونا چاہیے کہ نظامِ تعلیم بجائے خود تعلیم کو مفید یا موثر نہیں بناتا، وہ تو صرف ایک چارٹ ہے جو سمت راستہ اور منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یوسفِ گم گشتہ کی تلاش دیافت کا تمام تر مدار ہمارے خلوصِ نیت اور سعی عمل پر ہے اور کون جانے یہ صفات ہم میں کب سے ناپید ہیں۔

طلبا کی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ مطمئن اور حوصلہ مند رہ کر اپنے عہد کے نو بہ نو تقاضوں کا شکار رہنے کے بجائے جیسا کہ وہ رہنے لگے ہیں، ان تقاضوں کو قابو میں لا کر صحیح سمت و رفتار دے سکیں۔ طلبا اور اساتذہ دونوں کو یہ چیلنج قبول کرنا چاہیے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا مقصد و محور آرٹ اور انسانیت کے مقصد و محور سے علاحدہ اور دور سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر انسان اپنی تخلیق و تقدیر کے اعتبار سے ایک ہے تو یہ دولخت تعلیم کیسی؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے پرستاروں کے ہاتھ ایک دوسرے کے کندھے پر ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے گلے پر رہنے لگے ہیں۔ علم و تعلیم بے سود ہیں، خطرناک بھی، اگر وہ مذہب اور اخلاق کے تقاضے اور محاسبے سے علاحدہ رہیں یا رکھے جائیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی کے نظم کو جس طرح سے منقلب کیا ہے اور کرتی رہتی ہیں اس کا اقتضا ہے کہ دونوں کو مذہب و اخلاق سے قریب رکھا جائے۔ فطرت اور انسانیت کو اسی طرح سے ایک دوسرے سے سازگار اور ایک دوسرے کا معاون رکھ سکتے ہیں۔ ذات اور کائنات کے علوم اتنے وسیع اور پیچیدہ ہو گئے ہیں اور ہوتے رہیں گے کہ مخصوص صلاحیت و رجحانات کے طلبا ہی ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے علوم کی اختصاصی تعلیم ضروری ہے۔ لیکن خود اختصاصیین کو اپنے موضوعاتِ تحقیق کی مانند ایک دوسرے سے علاحدہ اور بے تعلق نہیں، بلکہ ذہنی اور اخلاقی سطح پر ایک دوسرے سے قریب اور قریب تر ہونا چاہیے۔ علوم بجائے خود کچھ ایسی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اہمیت ان اقدار، افراد، معاشرے اور حکومت یا ریاست کی ہوتی جن کو محفوظ، صحت مند، بامقصد اور راہِ راست پر رکھنے کے لیے علوم سیکھے اور ان کی نتائج نافذ کیے جاتے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم اور طالب علم کو کہاں تک حکومت کا ساتھ دینا چاہیے اور کہاں تک حکومت کو تعلیم کی اہمیت اور نوجوانوں کی آرزوؤں اور تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں معین بننا چاہیے۔ حکومت اور ریاست میں جو فرق ہے، اسے ملحوظ رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم اور ریاست دونوں کو ایک دوسرے کا حلیف ہونا چاہیے۔ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ حکومت کا مدار سیاسی جماعتوں کے گھٹتے بڑھتے اقتدار پر ہے، اس

لیے قابلِ اعتبار نہیں۔ اصل چیز ریاست ہے، جس کے اعتبار و اقتدار کی حفاظت اور اس کا استحکام ہر شہری کا فرض ہے۔ اس نظریے کے ماتحت نوجوانوں کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اس ریاست کی ساکھ اور سالمیت کا مدار تمام تر اس پر ہے کہ اس کے نوجوان اپنے سے کتنے مطمئن اور دوسروں کے لیے کتنے معتبر ہیں۔

حضرات! جدید اردو ادب کی تشکیل، تحفظ اور ہمہ جہتی ترقی میں علی گڑھ کی مانند، جامعہ ملیہ کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کو بھی اعتماد و افتخار کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اس لیے یہاں پر بعض متعلقہ مسائل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سنجیدہ اور دل کش شعر و ادب کا طلبا کی ڈسپلن سے گہرا اور دور رس تعلق ہے، جیسے صحت مند و خوب صورت ماحول اور اچھے رفقا اور اساتذہ کا۔ ایسے طلبا جن کا کوئی شائستہ شعر و ادب ہوگا، وہ بطورِ جماعت کبھی کسی بھی ایسی تحریک میں شریک نہ ہوں گے جس کا اظہار و ارتکاب، شور و شغب، شکست و ریخت، آبرو باختگی اور دہشت انگیزی سے ہوتا ہو۔ آج کل کے طرح طرح کے ہنگاموں میں بیش تر ایسے ہی نوجوان پائے گئے ہیں جن کا کوئی معتبر شعر و ادب نہیں۔

عوام اور عوامی طور طریقوں کے عالم گیر غلبے نے شعر و ادب کو زیر و زبر کر دیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس نے دنیا کے شعر و ادب کے معیار کو اونچا نہیں کیا ہے۔ دراصل عوامی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا شعر و ادب پر اُمید افزا اثر نہیں پڑتا۔ شعر و ادب اور دوسرے فنونِ عالیہ، قوم اور ملک کے اعلیٰ روایات، معتبر اور حسین افکار و احساسات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ فنونِ عالیہ اور مسائلِ مہمہ کا انصرام اعلیٰ تربیت یافتہ ذہنوں کا کام ہے۔ عوام ان کی پیروی کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ خود نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ان پر حکم چلانے کا حق یا اہلیت رکھتے ہیں۔ عوام تخریب جانتے ہیں، اس لیے کہ تخریب میں نہ قوتِ تمیز کی ضرورت ہوتی ہے، نہ ذوق و ذہن کی۔ تخلیق و تہذیب عوام کے بس کی بات نہیں۔

لیکن میں عوام اور عوام میں فرق کرتا ہوں۔ ایک وہ ہیں جو شروع سے تہذیب و شائستگی کے کارواں کے ساتھ اشراف یا خواص کے پیچھے پیچھے برابر چلے آ رہے ہیں۔ معاشرے میں ان کا نشو و نما خواص کے پہلو بہ پہلو اسی قدرتی طور پر ہوا ہے جیسے نباتات کا ہوتا ہے۔ تقریباً

ایک ہی قانون تخلیق، ترقی وتحفظ کے تحت۔ چنانچہ باوجود اس کے اصطلاحاً ان پر خواص واشراف کا اطلاق نہیں ہوتا، وہ اشراف کی خوبو سے آشنا ہوتے ہیں۔ ان کی پسند یا ناپسند کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ اقدار وروایات کا احترام کرتے ہیں اور اس مزاج وتقاضے کو پہچانتے ہیں جو معاشرے کا امتیاز ہوتا ہے۔ وہ معاشرہ کسی اور تہذیبی تقریب میں اکثر زبان، محاورہ، مذاقِ سخن اور آدابِ محفل سے ایسے برجستہ فقرے چست اور ایسی برمحل گرفت کرتے ہیں کہ بڑے بڑوں سے جواب نہیں بن پڑتا۔

دوسرے وہ عوام ہیں جن کی ابتدا حال کی ہے۔ یہ بیش تر صنعتی اور مشینی غلبہ اور سیاسی نعروں کی پیداوار ہیں۔ ان کا کوئی ماضی نہیں رہا ہے اور جس کا کوئی ماضی نہ ہو، اس کے مستقبل پر حکم لگانا آسان نہیں۔ یہ سیاسی لیڈروں کے جلسے جلوس میں کام آتے ہیں۔ ان سے بالعموم بدامنی، بے آبروئی اور نقصان رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ اس تہلکہ انگیزی میں لیڈر نے حکومت اور ملک کو جس طرح اور جس حد تک رُسوا کیا اور عوام نے لوٹ مار میں جو کچھ حاصل کیا، وہ علی الترتیب دونوں کا حق المحنت رہا۔ ایسے عوام کی مثال مغلیہ سلطنت کے زوال کے دوران میں ان مغربی تاجروں اور مہم جویوں کی ملیشیا (تیتر، بٹیر، لشکر) سے دی جا سکتی ہے، جو اپنی تاخت و تاراج سے حکومت کو کمزور سے کمزور تر کرتی رہتی اور معاوضہ یہ طے ہوتا کہ جو جس کے ہاتھ لگے، وہ اس کا۔ اس طرح میں، اس وقتی انبوہ کا شمار ان مستقل عوام میں نہیں کرتا جن کا ذکر کر چکا ہوں۔ جن کی وقعت کا احساس ہمیشہ میرے دل میں رہے گا۔ نئے انداز کی شاعری اپنے تمام کرامات یا بوالعجبیوں کے ساتھ اسی صنعتی اور مشینی انبوہ کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔ میرے نزدیک سنجیدہ شاعری اور شعر وادب میں ایسے عوام کی کوئی اہمیت یا مقام نہیں۔ شاعری میں ایسے عوام کی آڑ لینا شاعرانہ دیانت اور شعری صداقت دونوں کے خلاف ہے۔ شاعری کے کم عیار یا بیش قرار ہونے کا اندازہ اس سے بھی کرتے ہیں کہ اس کے سامعین کس سطح کے ہیں۔

عزیزو! خاصی طویل مدت تک ہونہار، حوصلہ مند اور روایات آشنا نوجوانوں کے ساتھ شعر وادب کے مطالعہ کرنے کا موقع ایسی دانش گاہ میں نصیب رہا ہے جس کے منفرد اور ممتاز ہونے کا ہمیشہ اعتراف کیا گیا۔ اس لیے یہ الزام قبول نہیں کر سکتا کہ شعر وادب میں نئے

تجربے، نئی ہیئت، نئے موضوع، نئے لب و لہجہ اور نئی فضا سے مجھے بیر یا بدگمانی ہے۔ میں شاعری کو نئے حلیے میں پیش کرنے کے ہرگز خلاف نہیں ہوں۔ صرف اس کا حلیہ بگاڑنے سے اتفاق نہیں کرتا۔ محض سر کے بال ترشوا لینے سے قلندری کے اسرار و معارف منکشف نہیں ہوتے۔ شاعری پرانی چال کی ہو، یا نئی چال کی، اور دونوں میں بھیڑ چال بھی شامل ہے۔ اس کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا کوئی متفقہ معیار ضرور ہونا چاہیے۔ شعر و ادب میں ابداع و اختراع جتنی نیک فال ہوتی ہے، اتنی ہی خطرناک اور مایوس کن ہو جاتی ہے، اگر اس کا حق نا اہلوں کو دے دیا جائے۔ شعر و ادب کے دیار میں شہریت عام نہیں ہوتی، بلکہ نہایت درجہ منتخب و مخصوص ہوتی ہے۔ شعر و ادب ہی میں نہیں، خود زندگی اور اس کی دوسری سرگرمیوں میں بھی قدیم اور جدید کی بحث نامعلوم مدت سے چلی آ رہی ہے۔ شاید اس وقت سے جب سب سے پہلے قدیم نے جدید کا ترکہ چھوڑا۔ لیکن جدید، جدید تر اور جدید ترین پر آج کل اسی طرح کے نوجوان شاعر تنقید نگار یا فن کار جس طرح گفتگو کرتے ہیں، اس سے کلام، منطق اور فلسفہ ان کے علما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جن کی بحث سے اتنے علم و فن کے مسائل طے نہیں ہو پاتے تھے جتنے نقضِ امن کے پیدا ہو جاتے تھے۔ حافظؔ نے بعضوں کے بارے میں کہا ہے کہ حقیقت تک پہنچ نہ پائے تو افسانے کے راستے پر ہو لیے۔ ان عزیزوں کو کیا کہیے جو حقیقت نگار اور افسانہ نگار دونوں ہو گئے۔

چاہتا ہوں کہ شاعری ہی نہیں گفتگو میں بھی نہ زبان بگڑے نہ ذہن۔ شاعر کسی ملک یا مسلک کا ہو، معیار صرف اوّل درجہ کے شاعر سے متعین ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ دوسرے درجہ تک کے شاعر کو تسلیم کر لینا چاہیے تاکہ بڑی شاعری اور اچھی شاعری میں امتیاز رکھا جا سکے۔ جدید انداز کی شاعری جو ہر روز نئی سے نئی یا جدید سے جدید تر ہوتی رہتی ہے، اب تک اوّل درجے کا کوئی شاعر نہیں پیدا کر سکی ہے۔ کبھی کبھی تو یہاں تک گمان ہونے لگتا ہے کہ جیسے اس کا مقصد اتنا اوّل درجہ کا شاعر پیدا کرنا نہ ہو، جتنا تیسرے درجہ کے سامعین۔ کسی ادب میں شاعروں کی بھرمار اس امر کی واضح دلیل ہے کہ شاعر اور شاعری کا بازار بہت مندا ہے اور اس ارزانی کو دور کرنے کے لیے نرخ بالا کرنے کی ضرورت ہے۔

عزیزو! ہر قوم ملک اور ان کے شعر و ادب کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ معیار اور روایت بھی جو عبارت ہوتا ہے، اس شعر و ادب کی ہیئت، رنگ و آہنگ، عبارت و اشارت اور مخصوص مانے ہوئے ذرائع اظہار و ابلاغ سے جن کے بغیر اس کا حسن، امتیاز و افادیت آشکار ہوتی ہے، نہ ذہن نشیں۔ ہر شاعری کو ہر حال میں مہذب، واضح، راست، بلند اور دل نشیں ہونا چاہیے۔ کوئی شاعری کامیاب نہیں ہو سکتی، اگر شاعر اور سامعین میں سوچنے سمجھنے اور پسند کرنے یا نہ کرنے کی زیادہ سے زیادہ باتیں مشترک نہ ہوں۔ فرداً فرداً ہر شاعر کی شاعری کے کوڈ لیٹرس (خفیہ لغت ہوں گے) تو دوسرے اس شاعر یا اس کی شاعری کو سمجھ کس طرح پائیں گے۔ شاعری میں اتنی رعایتیں نہ دینی چاہئیں جن سے شاعرانہ فکر و احساس اور مجرمانہ یا مریضانہ علتوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے، یا شاعر اور لایعقل میں تمیز نہ کر سکیں۔ شاعری انتہائی انفرادی عمل ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی سماجی ذمہ داری بھی ہے اور سماجی ذمہ داری سماج تک پہنچنا ہی نہیں ہے، اس کو تندرست اور تازہ کار رکھنا ہے۔ میں شاعر اسی کو مانتا ہوں جو زندگی کی عظمتوں اور ذمہ داریوں کو پہچانے اور پہچنوائے، ایسے طریقوں سے جو ایک بڑے شاعر اور ایک بڑے شخص کے شایانِ شان ہوں۔ بڑے شخص کو میں یوں بھی بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔

مجھے کسی سے کم اس امر کا احساس نہیں ہے کہ دنیا میں طرح طرح کی جیسی ابتری پھیلی ہوئی ہے، اس کا زہرِ غم نوجوانوں کے کام و دہن سے گزر کر ان کے رگ و پے میں اُتر چکا ہے۔ ان کے شاعر اسی زہرِ غم کا اظہار کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ رول قابل فخر نہیں ہے، قابلِ ہمدردی چاہے جتنا ہو اظہارِ غم کا جن طریقوں سے مسلسل اظہار کیا جاتا رہا ہے، وہ نوجوانوں کے لیے قابلِ تعریف نہیں ہے۔ شاعر اسی کو جاننا اور ماننا چاہیے جو خطرہ، مایوسی، نفاق و نفرت کی تاریکی و تلاطم میں روشنی دکھائے۔ اُمید دلائے اور حوصلہ بڑھائے۔ زندگی اور شاعری دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ مرض میں مبتلا ہو کر جس طرح مریض اپنی تکالیف کا اظہار کرتا ہے، اسی طرح ڈاکٹر یا شاعر متاثر ہوگا تو مریض کا خدا ہی حافظ ہے۔ نئے رنگ کی شاعری اور شاعر کی محرومی یہ ہے کہ وہ ابتری سے کام نکالنا چاہتا ہے، برتری و بہتری سے صورت حال کو برتر و بہتر بنانا یا تو جانتا نہیں یا چاہتا نہیں۔ مذکورہ شاعری میں شاعر کا دل نہ اچھے شاعر کا ہے نہ اچھے طبیب کا۔ اعلیٰ کو ادنیٰ اور

ادنیٰ کو اعلیٰ داد دینے سے فساد پھیلتا ہے اور فساد پھیلانے والے کو کوئی دوست نہیں رکھتا، بالخصوص اللہ!

صاحبو! نادم ہوں شعر وادب پر گفتگو طویل ہوگئی۔ اس تقریب میں اپنے اس خیال کو پیش کرنے سے باز نہ رہ سکا کہ نوجوانوں کو اعلیٰ اقدار سے وابستہ کرنے اور رکھنے میں ان کے معتبر شعر وادب سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی مذہب واخلاق سے بھی زیادہ۔ یوں بھی دراز نفسی معلّمی کی عادت ہے، وہ بھی عمر بھر کی عادت۔

حضرات! جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک نہایت پُر آشوب اور اتنے ہی پُر از امکانات زمانے میں وجود میں آئی۔ ایک طرف یہ قومی آزادی کی اس بڑی سیاسی تحریک کا پرتو تھی جس کی قیادت مہاتما جی اور علی برادران کر رہے تھے اور دوسری طرف ہمارے تعلیمی اداروں میں جو 'سستے غلام پیدا ہو رہے تھے' (خطبہ شیخ الہند) ان کے خلاف ردِّعمل تھا۔ اس ادارہ کی اساس اسلامیت اور قومیت کے آہنگ پر رکھی گئی تھی، جس کا مقصد ایک اچھا مسلمان اور ایک سچا ہندستانی پیدا کرنا تھا۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے جن کے احسانات سے ہم کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتے، اس کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبۂ صدارت میں جامعہ کے اس مقصد و منصب کی ان الفاظ میں ترجمانی کی ہے:

> ''ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہ راہ پر ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم وتربیت میں ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے، جہاں ہندو طلبا کے لیے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے، وہاں مسلمان طلبا بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب وتمدن سے نا آشنا نہ رہیں گے کہ ایک متحدہ ہندستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی تفہیم وتفہّم پر منحصر ہے۔''

جامعہ نے ان بنیادی مقاصد کے حصول کے لیے ایک ایسے نصابِ تعلیم کی تشکیل کی جو نہ مشرق سے بیزار تھا نہ مغرب سے حذر کرتا تھا۔ جس میں دینی اور اخلاقی تعلیم لازمی جزو کے طور پر شامل تھی اور مادری زبان یعنی اردو اصولی طور پر ذریعۂ تعلیم بنائی گئی۔ 1947ء کے بعد کے سیاسی حالات اور ردّ و بدل کے ساتھ ساتھ جامعہ کے منصب و مقاصد دونوں میں تبدیلی ناگزیر تھی۔ اب وطن آزاد تھا، اس لیے اس کا ہر ادارہ ایک قومی ادارہ تھا، اور اس کے تحفظ و ترقی کی ذمہ داری قومی حکومت پر تھی۔ بدیسی حکومت اور بدیسی نظامِ تعلیم کے خلاف جامعہ کا جو رول رہا تھا وہ ختم ہو گیا، اور ہندستانی قومیت کے مزاج و معیار کا مسئلہ سامنے آیا۔ آزادی کے بعد کی اُبھرتی ہوئی رجعت پسند طاقتیں اس کو جو مخصوص مزاج یا موڑ دینا چاہتی ہیں، ہندوستان کی بیش تر اقلیتیں ان کو اپنے لیے سازگار نہیں پاتیں۔ ان اقلیتوں کے سامنے ابھی وہی منزل مقصود ہے جس کی روشنی گاندھی جی نے دکھائی تھی، اور جس کے حصول کے لیے پنڈت نہرو آخری وقت تک کوشاں رہے۔ آزادی کے بعد اردو کے موقف میں جو بڑی تبدیلی ہوئی ہے، اس کا اثر جامعہ ملیہ جیسے اداروں پر خاص طور سے پڑا۔ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ جامعہ ملیہ اعلیٰ تعلیم کا تنہا ادارہ تھی، جہاں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ یہاں اعلیٰ نصاب کی تالیفات و تراجم کا کام کیا جا رہا تھا، اور اساتذہ کی ایک نسل تیار کی جا چکی تھی جو مختلف علوم پر اردو میں درس دینے کی اہل تھی۔ یہاں تک کہ یہ کہنے میں پس و پیش نہیں کیا جا سکتا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا جو تجربہ کیا گیا اس میں اردو کو جیسی ہمہ جہتی کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کی مثال آج تک ملک کی کوئی دوسری زبان پیش نہ کر سکی۔

اس پس منظر میں جامعہ پر اردو اور اردو پر جامعہ کا جو حق ہے، اس کو کسی طرح نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ ہندوستان کی غیر مذہبی ریاست میں جو لوگ اردو زبان کے تعلیمی اداروں کے قیام یا ان کی توسیع و ترقی کے مخالف ہیں وہ اس ملک کے ہرگز خیر اندیش نہیں ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ملک کا خیر اندیش نہ ہونا کسی شہری یا جماعت کا بدترین جُرم اور اس کی آخری توہین ہے۔ ملک کی لسانی اور تہذیبی صدرنگی کو یک رنگی میں تبدیل کرنے کی کوشش ملک کے اُمید افزا مستقبل کے حق میں بڑی بدشگونی ہے، جس کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ کوتاہ نظری اور خود مطلبی کی وجہ سے ملک کمزور اور بے اعتبار ہونے لگا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم سنبھل جائیں، اور اپنے ہی

دامن کو اپنے ہاتھوں سے تار تار کرنے سے باز رہیں۔ ایسی زبان جو ملک کے شائستہ لوگوں کی مادری، ادبی، علمی اور تہذیبی زبان ہو اور اپنے منفرد امتیازات کے سبب سے اندرون و بیرون ملک یگانگت اور یک جہتی کا بڑا موثر و مبارک وسیلہ ہو، اسے اس کے حق سے محروم کرنا اس کی خدمات کو نظر انداز کرنا اور اس سے اچھے کاموں میں مدد نہ لینا کیا کہوں کہ کیا ہے، اور کیا نہیں ہے۔ البتہ اپنے اور آپ دونوں کے اس عقیدہ کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر مادری زبان قومی زبان ہے اور کسی مادری زبان کو مٹایا نہیں جا سکتا کہ ماں ابدی اور لازوال ہے!

جامعہ کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے کارکنوں نے کبھی فرقہ پرستی کی سرد اصطلاحوں اور تنگ دائروں میں نہ سوچا ہے، نہ عمل کیا ہے۔ اس کی تاسیس میں مہاتما جی کا آدرش اور فکر و عمل کارفرما رہا ہے۔ ہر دور میں اس کے اساتذہ اور طلبا کی صف میں غیر مسلموں کی خاسی تعداد رہی ہے، اور یہ مسلم تعلیمی و تہذیبی اداروں کا ایسا نمایاں امتیاز اور خصوصی روایت رہی ہے جس کی نظیر ملک کے اس طرح کے دوسرے اداروں میں نہیں ملتی۔ جامعہ کی ان ممتاز، محبوب شخصیتوں کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ پروفیسر ای۔ جے۔ کیلاٹ، شری دیوداس گاندھی، پنڈت جوالا پرشاد، ایل۔ این۔ گپتا، ڈی۔ این۔ مکرجی، آر۔ این۔ سیلوم، شری اگروال، مسٹر جی۔ ڈی۔ ایسن، شری رام چندر وغیرہ۔ آج جو لوگ جامعہ کو اس بارے میں معتبر و مستند نہیں جانتے وہ اس کے ایک سابق طالب علم رانا جنگ بہادر کی زبانی اس جامعہ کی ابتدائی کہانی سنیں:

> ''اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ چاروں کوٹھیاں پھر رہی ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کا شان دار منظر دکھاتی تھیں.........ان میں دس پانچ نہیں، درجنوں ہندو طالب علم تھے.........آسام، بنگال، بہار، پنجاب، مدراس اور مہاراشٹر سبھی صوبوں کی قومیت کی پیاسی جوانی کا جامعہ کے پنگھٹ پر میلہ لگ گیا تھا.........جامعہ میں ہندو طالب علموں ہی کی نہیں ہندو استادوں کی بھی خاصی بڑی تعداد تھی۔''

جامعہ کے ہر فرقے اور مذہب کے رشتے کو ہم آہنگ و استوار کرنے والی طاقت ہندستانی قومیت اور اردو زبان تھی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ کو اپنے توسیعی پروگرام میں

زبان کو ایک مخصوص مرتبت دینی چاہیے۔ جامعہ میں اردو ذریعۂ تعلیم نہ رہے گی تو کہاں رہے گی، اور اردو کا اعلیٰ تنقیدی و تحقیقی کام اس درس گاہ میں نہیں ہوگا تو کہاں ہوگا۔ اس لیے جامعہ میں علوم والسنۂ اسلامی، تاریخ اور فلسفہ کے ساتھ ایک اعلیٰ اردو تحقیقاتی ادارے کا قیام اور ایم۔ اے کی کلاسوں کا فوری اجرا از بس ضروری ہے۔ جامعہ عثمانیہ مرحوم ہو چکی ہے۔ جامعہ کو جیتے جی مرحوم نہ ہونے دیجیے۔

اردو، تاریخ کے ایک سیلِ بے اماں کی زد پر ہے۔ جو لوگ اس زبان کے بولنے والے ہیں، یا اس سے علمی و ادبی دلچسپی رکھتے ہیں، جامعہ جیسے ادارے سے ان کو بڑی اُمیدیں ہیں۔ اگر ہم ہندوستان میں اردو کے دو چار اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی قائم نہیں کر سکتے تو ہمارے بین و بکا کے کوئی معنی نہیں اور کلیتاً بے معنی ہیں۔ اربابِ 'سیاست والجماعت' کے پیمانِ وفا جنھوں نے اقلیتوں کی رضاعت اپنے ذمہ لی ہے۔ اردو کی حفاظت اور ترقی کا کام اچھا اور بڑا کام ہے۔ اس لیے ہمت اور حوصلے سے کام کرنا چاہیے۔ کسی نے سوچ کر کہا ہے اور سچ کہا ہے کہ خدا اور خلق کے سامنے ہماری ہمت ہی کے مطابق ہمارا اعتبار کیا جاتا ہے۔

'حدیثِ دل کش افسانہ از افسانہ می خیزد' جامعہ کا یہ قافلہ کتنی منزلوں سے کیسے ساتھیوں کے ہمراہ کہاں سے کہاں پہنچا۔ کتنے اچھے اور بڑے لوگوں نے اس کو اچھا اور بڑا بنانے اور رکھنے میں فوتِ فرصتِ ہستی کا غم نہ کیا، اور عمرِ عزیز کو صرفِ عبادت رکھا۔ اس کے دیکھنے والے روز بہ روز کم ہوتے جا رہے ہیں، لیکن جامعہ سے فیض یاب ہونے اور اس پر فخر کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ بڑھتی رہے گی۔ ایسے ادارے نفع کمانے یا نقصان کے لیے نہیں قائم کیے جاتے۔ ان کا مقصد اعلیٰ اقدار سے اعلیٰ انسان پیدا کرنا اور اعلیٰ انسان کے کردار سے اعلیٰ اقدار کی تائید و تصدیق حاصل کرنی ہوتی ہے۔ جامعہ جن اقدار کی نمائندگی کرتی آئی ہے اور اس کے بنیادی عقائد و مقاصد ہیں، جن میں تبدیلی یا جن سے انحراف امانت میں خیانت ہوگی۔ جن لوگوں نے جامعہ کو قائم کیا، وہ ہندوستان کے مانے ہوئے مشترک اور معتبر ہندو مسلمان لیڈر تھے۔ انھوں نے جامعہ کی منزل اور رسم و راہ کو متعین کیا۔ جس کے مطابق یہ کارواں سرگرم سفر رہا، اور اب تک ہے۔ وہ اچھے اور بڑے لوگ بدیسی راج سے اتنے ہی دور اور نفور تھے جتنے ہندوستان

کے آرزو وعزائم سے قریب۔ ان ہی کی سرفروشی سے ہندوستان کو سربلندی حاصل ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں خوف نہ کھانا چاہیے کہ آزاد ہندوستان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ان اداروں میں ہے، اور اس کے خدمت گزار ایسے لوگوں میں سے ہیں جن پر بھروسہ اور جامعہ جس آزادی اور وفاداری سے اپنے نصب العین کو نگاہ میں رکھتی ہے، اس کا احترام کرنا چاہیے۔

حکومتوں کے بدلنے سے اقدار وعقائد نہیں بدلتے، بلکہ کام کرنے کے نئے نئے حوصلے اور نئے نئے میدان سامنے آتے ہیں۔ کسی ایسے ادارہ کے کردار اور کیرکٹر کو بدلنا جیسی کہ جامعہ اور اس قبیل کے دوسرے علمی، تعلیمی اور تہذیبی ادارے ہیں اچھی اور آزاد حکومت کا نہیں، مریض ذہنیت یا کھوٹی نیت کا شیوہ ہے۔ جامعہ نے اپنے کاموں کو پھیلایا ہے، اس کے کاموں میں برکت ہوئی ہے اور اس کے اعتبار و وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ اربابِ جامعہ ان عناصر وعوامل کو قوی اور فعال رکھنا چاہتے ہیں جو اس ادارے کی نیک نامی اور فیض رسانی میں معین رہی ہیں، اور ان رجحانات کے حق میں نہیں ہیں جو اس کے بنیادی اصول وعقیدے میں تحریف یا تبدیلی کے درپے ہیں۔ یہ بنیادی اصول وعقائد وہ ہیں جن کو ہمارے محسنوں نے علم و ہنر اور شائستگی کو پھیلانے اور تقویت پہنچانے کے لیے خدا کے گھر میں، اس کے نیک بندوں کی موجودگی میں، ان کی گواہی کے ساتھ آج سے کم وبیش 48 سال پہلے مانا اور مقرر کیا تھا۔ بلا شبہ آج بھی ہم اسی پیمان پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ سیاست اور جماعت کو جانتا ہوں، لیکن علم اور انسانیت پر ان کے غلبہ پانے کو نہیں مانتا۔

صاحبو! اگر یہ صحیح ہے کہ قوم اور ملک کی آزادی کا مدار یونیورسٹیوں کی آزادی پر ہے، اور معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے، اس لیے کہ نامعتبر اور اپنے سے خائف حکومتوں کی نظر میں نوجوانوں کی آزادیٔ افکار سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کھٹکتی ہے تو ایسی حکومت کے ہر ایسے اقدام کو کڑی نگاہ سے دیکھتے رہنا چاہیے، جو یونیورسٹیوں کے مسلمہ ایمان ویقین Articles of Faith میں تبدیلی کا مطالبہ کرتی ہو۔ یہ احتیاط اور التزام ان یونیورسٹیوں پر بطورِ فرض لازم آتا ہے جو مانے ہوئے تہذیبی اقدار وروایات کی امانت دار ہوں اور شروع سے ان پر کاربند چلی آتی ہوں۔ افراد، ماں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فطرت کا کرشمہ ہے جس پر ہم کو

قدرت نہیں، لیکن جماعت یونیورسٹیوں کے بطن سے برآمد ہوتی ہے، اور یہ انسان کا معجزہ ہے۔ جس کا منکر کم سے کم انسان کو تو نہ ہونا چاہیے۔ یونیورسٹیاں فطرت کے پیدا کیے ہوئے نا کردۂ عیب وصواب افراد کو، اعلیٰ مقاصد کے لیے تربیت دیتی ہیں اور تہذیب وانسانیت کی ترقی وتحفظ میں مدد دیتی ہیں۔ اس مقصد میں حائل ہونے والے عوامل کے مقابلہ وانسداد کا عمل، عمل نیک ہوگا۔ ایسے ادارے جو علوم وفنون کے ساتھ تہذیبی اقدار کے حامل ہوں، جیسی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ ان کے اساسی عقائد میں تحریف کرنے سے اس کے طلبا اور علما اقدار کے امین نہیں، جبر کا شکار بن کر رہ جائیں گے۔ یہ پوزیشن سیاست گری میں چاہے جتنی مباح ہو، ریاست کے لیے رُسوا کن اور انسانیت کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔

عزیزو! آج کی تقریب میں جامعہ کے بزرگ، اساتذہ، احباب اور دوسرے خیراندیش اپنی دعاؤں کے ساتھ کامیاب طلبا کو رخصت کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ خدا آپ کو زندگی کے طرح طرح کے تقاضوں سے بہتر سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ اور طاقت عطا فرمائے۔ میں بھی ایک اچھے ادارے کا طالب علم رہا ہوں۔ تمنا اور ترغیب کی اس وادی سے گزرا ہوں جو آپ کے سامنے ہے۔ بزرگوں اور دوستوں نے کس محبت سے خدا حافظ کہا تھا۔ اس کا دل پر کتنا گہرا نقش ہے۔ زندگی کے پیچ وخم اور نشیب وفراز میں اس نقش نے رہبری کی، حوصلہ بڑھایا اور منزل ومنزلت تک پہنچایا۔ آپ کی دنیا میری طالب علمی کی دنیا سے کہیں زیادہ پیچیدہ، سخت گیر، صبر آزما اور ناقابلِ تسخیر بن گئی ہے۔ آپ کو وہ آسانیاں نہیں نصیب ہیں جو میرے عہد میں تھی۔ اس لیے فکرمند ضرور ہوں، لیکن مایوس نہیں۔ اس لیے کہ جانتا ہوں کہ ہر دور اور ہر آزمائش مناسبِ حال نسل بھی پیدا کرتی ہے۔

مجھے معلوم نہیں جس زندگی سے کل آپ کا سابقہ ہوگا، وہ آپ کو کیا انعام دے گی یا انتقام لے گی۔ البتہ چاہتا یہ ہوں کہ دونوں حالتوں میں آپ اسے گوارا نہ کریں کہ انعام آپ کو خرید لے یا انتقام آپ کو پست کر دے۔ ہمارے بڑے خطروں میں سے ایک یہ ہے کہ یا تو اپنے اغراض کے ہاتھوں بک جاتے ہیں، یا خطرہ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ یہ انسان کی خلقی کمزوری ہے، لیکن لغزش کیسی ہی ہو اس کو سپر نہ بنائیے، شکست ہی تسلیم کیجیے۔ دنیا کی حالت پر

آپ کی نظر ہوگی۔ دیکھئے تو کیسا انتشار، کیسی ہوس، کتنا ہراس، کتنی بے اعتباری اور کیسی عداوت، نسلِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کیے ہوئے ہے۔ جیسے صلاح، سلامتی، اعتبار اور آرزومندی کے سارے دروازے بند اور چراغ گل کردیے گئے ہوں۔ نہ زیردست زبردست سے محفوظ، نہ زبردست زیردست سے مطمئن۔ یہاں تک کہ زبردست زبردست سے بھی مشکوک ہے۔ یہ کیسے بڑے لوگ اور بڑی حکومتیں ہیں جو ہر سازش میں شریک اور کسی سطح پر صلح وصفائی کی روادار نہیں۔ سیاست، تجارت، تہذیب، تعلیم، صحت اور سلامتی کی تدابیر میں سے کسی پر دیانت اور دلیری سے اتفاق نہیں، یہی کیا کم تھا کہ دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ نوجوان کو نسل کا نجات دہندہ نہیں، بلکہ ان کو نفرت اور دشمنی پھیلانے کا وسیلہ بنایا جارہا ہے۔ نوجوان نفرت پھیلائیں گے تو محبت کرنے والے کہاں سے آئیں گے۔ یاد رکھیے جس طرح حکومتوں کو عالم کے ضمیر نے منع کردیا ہے کہ وہ دورانِ جنگ میں حیاتِ انسانی کے لزوم سے ہوا، پانی اور خوراک مسموم نہ کریں گے۔ اسی طرح ایسا بھی وقت آکر رہے گا جب خود نوجوان کا ضمیر اس پر بغاوت کرے گا کہ زمانہ زندگی اور انسان نے اس کو کیا مقام دیا تھا، لیکن مذہب اور سیاست کے مطلب پرستوں اور فتنہ پردازوں نے اس کو کس خواری تک پہنچادیا۔ نوجوانوں کو بہکانے اور رسوا کرنے والوں کو اس دن سے ڈرنا چاہیے۔

عزیزو! کوئی ادنیٰ درجہ کا کام کرنا چاہیں یا ایسی لغزش سرزد ہوجائے تو اس خیال سے نفس کو دھوکا نہ دیجیے کہ 'بشر ہے کیا کہیے' سب سے بڑا دھوکا جس کا ہم سب سے زیادہ سہارا لیتے ہیں، یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کی مثال پیش کی جائے کہ یہ لغزش اس سے بھی سرزد ہوچکی ہے۔ سند میں بڑے آدمی کی بڑائی پیش کی جاتی ہے اس کی کمزوری نہیں۔ اپنی کمزوری یا گناہ کو بہ اختیار خود معاف کرنا نالائقی نہیں تو ناسمجھی کی بات ہے۔ جس میں آج کل کے صاحبِ اختیار واقتدار سب سے زیادہ مبتلا ہیں جو اپنے کو سوسائٹی کا نہیں، بلکہ سوسائٹی کو اپنا جواب دہ سمجھتے ہیں۔ یہ عذر تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ خرابیاں تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، اور ان کا دور کرنا اس درجہ ناممکن ہوگیا ہے کہ ان کو خرابی نہیں بلکہ معمولاتِ زندگی قرار دے کر قبول کرلینا چاہیے۔ آپ جامعہ کے سفیر بن کر جارہے ہیں، دنیا کے لکیر کے فقیر ہونے پر مامور نہیں کیے گئے ہیں۔ مغرب میں بعض شنیع اعمال کو قانونی جواز دے دیا گیا ہے۔ اسی ایک بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خرابی کے عالم گیر

ہونے یا مغرب کو اس کو قبول کر لینے سے وہ چیز مستحسن نہیں ہو جاتی۔ خرابیاں اس لیے عام ہو گئی ہیں کہ ان سے بچنے یا بچانے کے لیے جس حوصلے اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے، ہم اس سے کتراتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ادنیٰ سی لطف اندوزی کے لیے بڑے سے بڑے اقدار کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

حضرات! میں تاریخ کا طالب علم نہیں رہا ہوں، لیکن داستانیں سننے کا شائق ہوں۔ کبھی کبھی سنانے بھی لگتا ہوں۔ یونان، روما، اٹلی اور مصر وغیرہ کی بڑائی کے خوب خوب قصے سُنے اور پڑھے ہیں۔ لیکن آج ان ملکوں کی جو حیثیت رہ گئی ہے، اس سے بھی ناواقف نہیں ہوں۔ ان کے مقابلے میں نوخیز ملکوں اور اقوام کے کارناموں کو دیکھیے۔ جن کے ایسے کوئی اسلاف یا افسانے نہ تھے لیکن آج ہم اپنی ہر ضرورت میں ان کے رحم و کرم کے محتاج ہیں۔ تاریخ کے صفحات میں مندرج ہونے یا ایسے افسانوں سے رشتے جوڑنے سے اسلاف زندہ نہیں رہتے۔ بلکہ اخلاف کی شجاعت و سخاوت اور ہنر کے کارناموں میں زندۂ جاوید رہتے ہیں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ آپ اسلاف کے نام لے کر بھیک نہ مانگتے پھریں۔ ان کا نام لے کر حمیت، حوصلہ اور ہمدردی کے کام کریں۔ 'گدیہ نہ کردم سجودٗ' میں بظاہر جو نقصان ہے اعلیٰ افراد اور اقوام کا کبھی کبھی وہی سب سے بڑا کارنامہ رہا ہے۔

مذہب کی تاریخ اور فلسفہ سے واقف نہیں ہوں۔ آج کل زندگی کے محراب و منبر سے مذہب کا ذکر خیر دانش مندی ہی نہیں ذوقِ سلیم کا بھی منافی ہو تو عجب نہیں۔ باوجود اس کے اپنے یا دوسرے کو کسی دشواری میں مبتلا پاتا ہوں تو فال، مذہب و اخلاق ہی کے صحیفوں سے نکالتا ہوں۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو بد دلی یا بیزاری نہیں پیدا ہوتی، تسکین و توانائی اکثر ملی ہے۔ دنیا جہاں کے عالی منش اور پاک نہاد لوگوں نے اس کا مشورہ دیا ہے اور کوئی مثال اب تک ایسی نہیں ملی ہے جہاں یہ مشورہ غلط ثابت ہوا ہو۔ مذہب و اخلاق کے ذکر سے اُکتانا یا پہلو بدلنے لگنا روشن خیالی نہیں ہے۔ ذوق و ظرف، فکر و تخیل، عزم و آرزو سب سے محروم ہونے یا ان کے مسخ ہونے کی نشانی ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں آپ بدحظ نہ ہو گئے ہوں۔ اچھا، میرا ایک اعتراف سُن لیجیے۔ ایک طویل مدت تک نام کا معلّم رہنے سے کسی قدر توہم پرست ہو گیا ہوں

یعنی جس طرح کوئی ماں، چاہے وہ کتنی ہی خدا کی منکر اور مذہب سے بے گانہ کیوں نہ ہو، اپنے بچے کو کسی سخت بیماری میں مبتلا پائے گی تو ساری روشن خیالی چھوڑ کر کسی نہ کسی خدا یا غیبی طاقت سے بچے کی صحت کے لیے دعا مانگے بغیر نہ رہے گی۔ اسی طرح میرے جیسا معلّم بھی اپنے معنوی اولاد کو کسی آزمائش میں مبتلا پائے گا تو وہ مذہب اور اخلاق کا راستہ دکھائے اور اس پر چلائے بغیر نہ رہے گا۔ چنانچہ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جن کا عقیدہ ہے کہ ماں کبھی خدا سے بے گانہ نہیں ہوسکتی۔ کم سے کم ہندوستان کے معلّم اور ماں کے بارے میں میرا عقیدہ یہی ہے۔

عزیز و نوجوانو! ایک مدت سے جن نامساعد حالات وحوادث اور ڈگمگاتے گردوپیش میں آپ نوجوان گرفتار ہیں، وہ یقیناً ایسے نہیں ہیں جن میں آپ کی اچھی صلاحیتیں آسانی سے بروئے کار آسکیں۔ عزت، آسودگی، دیانت داری، نیکی اور حوصلہ مندی کی زندگی بسر کرنے کے جتنے مواقع ہو سکتے ہیں، وہ سب مجروح ومسخ ہو چکے ہیں۔ اس وقت ہم سیاسی غارت گروں اور اجناس کے بیوپاریوں کے Pincer Movement یا شکنجے میں آچکے ہیں۔ یہ کاروبار مقامی اور بین الاقوامی سطحوں پر جس بے دردی سے ہو رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اس وقت مرشد[1] کی تقریر کا ایک فقرہ یاد آ رہا ہے جو آج سے تقریباً 35-34 سال قبل اسی جگہ پر کہا گیا تھا کہ ''ہم اس ریگ زار میں کب تک ہل چلاتے رہیں گے۔'' آج وہ فقرہ جوں کا توں اور جہاں کا تہاں ہے اور غالباً زیادہ شدت سے صادق آ رہا ہے۔ ریگ زار کتنا وسیع اور ناقابلِ تسخیر ہو گیا ہے اور ہل چلانے کا مشغلہ کتنا عبرت ناک ہے۔

فارسی کے ایک شاعر نے کہا ہے کہ منعم کوہ و بیاباں میں کہیں بھی اجنبی نہیں رہتا۔ جہاں جاتا ہے خیمہ لگا دیتا ہے، اور بارگاہ قائم کر لیتا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بازار میں کوئی چیز لینے جایئے تو مشہور و معتبر ملک یا کارخانہ کی مصنوعات بڑے اعتبار اور شوق سے مہنگے داموں بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ شے ہو یا شخص اگر اس پر اعتبار کی مہر لگی ہو تو اس کی قدر و قیمت ہر وقت ہر جگہ رہے گی۔ جامعہ نے آپ کو اپنے نعائم سے منعم بنا دیا ہے۔ آپ پر جامعہ کی کھری متاع ہونے کی مہر لگا دی گئی ہے۔ اس امتیاز کو آپ نے بڑی ریاضت سے حاصل اور

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم صدر جمہوریہ ہند

بڑی خوشی اور فخر سے قبول کیا ہے۔ اس لیے آپ چاہے جس مذہب یا مسلک کے پیرو ہوں، اسی مذہب یا مسلک کے احترام میں اور اسی کا واسطہ دلا کر، آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ جامعہ کے نام کو اونچا کرنا اور رکھنا آج سے آپ کے فرائض میں داخل ہو گیا ہے جس سے آپ کبھی اور کسی حال میں منہ نہیں موڑ سکتے۔ جو شخص اپنی درس گاہ کی حرمت کرنا نہیں جانتا اس کے ہاتھ میں کسی کی آبرو محفوظ نہیں۔

اے صاحبو! جو باتیں آج اور یہاں کہی گئی ہیں وہ ہرگز نئی نہیں ہیں۔ ان سے بہتر طور پر مجھ سے کہیں اچھے لوگوں نے مختلف موقعوں پر اس سے بھی بہتر باتیں آپ سے کہی ہیں اور کہی جاتی رہیں گی، لیکن آپ ہی سے دریافت کروں گا کہ یہ کہنا سننا بے اثر اور بے کار کیوں ہو گیا ہے۔ کیا کہنے والے میں خلوص و دردمندی نہیں رہی، یا آپ میں اُمید کی روشنی اور آرزو کی گرمی باقی نہیں رہی۔ زندگی میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے آدمی زندہ رہنے اور جان دینے دونوں میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ایسے لوگ زندہ بھی رہتے ہیں، دوسروں کے لیے اور جان بھی دیتے ہیں۔ دوسروں کے لیے یہ ادنیٰ لوگوں کی طرح بڑے کہے نہیں جاتے، بلکہ واقعتاً بڑے ہونے سے بڑے مانے جاتے ہیں۔ آپ کن لوگوں میں ہیں، یہ آپ مجھے بتائیں یا نہیں۔ آپ کو خود طے کرنا پڑے گا۔ سوسائٹی یا سیاست کتنی ہی کیوں نہ گر گئی ہو، نوجوانوں کو گرنے اور گرے رہنے کا بالکل اختیار نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ان کو زیب نہیں دیتا۔ آپ پسند کرتے ہوں یا نہیں، رول وہی اختیار کرنا پڑے گا، جو میدانِ جنگ میں سپاہی کا ہوتا ہے۔ سپاہی کتنا ہی ڈرپوک کیوں نہ ہو، بہادروں کے ساتھ اسے کام بہادری ہی کا کرنا پڑے گا۔ جب تک ہماری سوسائٹی یہ گرفت اپنے نوجوانوں پر نہیں رکھ سکتی یا نوجوان اپنے عمل کے جواب دہ سوسائٹی کے سامنے نہ ہوں گے، کام نہ بنے گا۔ آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمر زنجیر میں جکڑا ہوتا ہے۔ رُوسو کا یہ انکشاف آدمی کا المیہ ہو لیکن اسے یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن انسان تمام عمر ذمہ داریوں کو قبول اور ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ آدمی اور انسان میں یہی فرق ہے۔ دوستو، آج کا دن ایک نئے عہد و پیمان کا دن ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ان ذمہ داریوں کو سنبھالنے اور پورا کرنے کا عہد کریں جو آپ پر بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت

لازم آتی ہیں۔ بہت دنوں سے ایسا نہیں ہوا ہے، اس لیے بہت دنوں سے ہماری آپ کی زندگی ذمہ داریوں کے شرف سے محروم چلی آرہی ہے اور اس محرومی کی سب سے کاری زد میں آپ نوجوان ہیں۔

دعا کرتا ہوں کہ آپ جس دنیا میں داخل ہورہے ہیں، وہ آپ کو بگاڑ نہ سکے۔ آپ اسے بنا سکیں۔ آپ کو دیکھ کر اور پاکر لوگ یہ کہیں کہ مصیبت و معصیت کی دنیا میں ایک اچھا آدمی موجود ہے اور جب اس دنیا کو خیر باد کہیں تو لوگ اس کا اقرار کریں کہ ایک اچھا آدمی اُٹھ گیا۔

اللہ آپ کی مدد فرمائے۔ آمین!

(مطبوعہ جامعہ، دہلی۔ مارچ 1964)

●●●

غالبؔ مشاعرے کا افتتاحی خطبہ
22؍فروری 1969 کولال قلعہ، دہلی میں 9؍بجے
شب پڑھا گیا۔

جناب صدر، خواتین، اراکین مشاعرہ، بزرگو، دوستو، عزیزو ––– اللہ واکبر - اس وقت محسوس ہو رہا ہے۔ کتنی آسانی ہوتی ہو گی، ایسی تقریبوں میں جہاں صرف کامریڈ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہوں گے۔

میں اپنے کو یہاں پا کر بہت متعجب ہوں، آپ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ میں مسرور بھی ہوں، آپ فکر مند ہوں تو عجب نہیں۔ وجوہ ظاہر ہیں۔ مجھے سرفرازی بخشی گئی ہے۔ آپ کو ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ کاش ایسا بھی ہو جائے کہ میں سرفرازی کی ذمہ داری اور آپ ذمہ داری کی سرفرازی محسوس کریں۔ شاعروں کی محفل ہے اور نوجوانوں کا اجتماع۔ حسن و عشق، یزدان واہرمن، قدیم و جدید، کمزور اور قوی، فاقہ اور فراغت کا ذکر چھڑے گا۔ پھر کیا معلوم دامن کے چاک میں اور گریباں کے چاک میں فاصلہ باقی رہے یا نہیں۔

کچھ دنوں سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ مشاعرے اپنی اہمیت و افادیت کھو چکے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بدمذاقی اور بدنظمی کا باعث ہو رہے ہیں۔ جس طرح حکومت کبھی صحیح اکثر غلط یہ الزام لگاتی ہے کہ فلاں شخص یا ادارہ بدگمانی نفرت یا بدامنی پھیلا رہا ہے۔ اسی طرح اب یہ الزام لگایا جانے لگا ہے کہ فلاں شخص یا ادارہ مشاعرہ پھیلا رہا ہے۔ اس لیے مشاعروں کو ختم کر دینا چاہیے۔ واقعہ صحیح ہو یا نہیں، منطق غلط ہے۔ جیسے ایک ماں اپنی بہت چھوٹی بچی کے ساتھ ایک پارک سے گزر رہی تھی، ہوا تند تھی، لڑکی اور خود اپنے کو بار بار سنبھالنے میں ماں کو جو زحمت اٹھانی پڑتی تھی اس سے اُکتا کر بچی نے کہا۔ ”ماں ان درختوں کو کاٹ کیوں نہیں ڈالتے کہ ہوا چلنی بند ہو جائے۔“

صاحبو، قصور مشاعروں کا نہیں ہے، سامعین اور شاعروں کا ہے۔ شراب کے بارے میں آپ نے غالبؔ کی رائے سُنی ہوگی۔

پیانہ برآں رند حرام است کہ غالبؔ
در بے خودی اندازۂ گفتا رند اند

یعنی شراب اس شخص پر حرام ہے جو بے خودی یا بدمستی میں گفتار کے آداب و انداز بھلا دے۔ شراب بجائے خود بدنام نہیں ہے، بہت کچھ شراب پینے والوں بقیہ محتسب کی وجہ سے رُسوا ہے۔ مشاعرے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جس رکھ رکھاؤ اور وزن و وقار کی ضرورت ہے اس کی نہ ہم میں صلاحیت باقی رہی نہ حوصلہ۔ مشاعروں کو مضر یا بے سود قرار دینے کی منطق ایسی ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ طلبا میں بے راہ روی آ گئی ہے، اس لیے تعلیم گاہوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس طرح کی باتیں وہی لوگ کہتے یا کرتے ہیں جو بڑی باتوں اور بڑے کاموں کی ذمہ داری کو نہ سمجھتے ہیں نہ سنبھال سکتے ہیں۔

دوستو! ہوا کچھ اس طرح چلی ہے کہ ہم ذاتی نفع کو اجتماعی نقصان پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ فرد اپنے کو سماج کی چاکری میں دینے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہے، اور اس کے درپے رہنے لگا ہے کہ سماج اس کی چاکری میں رہے، یہی حال شاعر اور سامعین کا ہے۔ ہم سامعین کو جو کچھ دیتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ان سے وصول کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ ہم بھگت رہے ہیں، لیکن آج کے اجتماع میں ہم نتیجہ بھگتنے کے لیے نہیں آئے ہیں، ایک اچھی لیکن کھوئی اور بھلائی ہوئی روایت کو از سر نو زندہ کرنے اور یاد دلانے کے ارادے سے آئے ہیں۔ یعنی آج شب کے اس مشاعرے میں قلعہ معلّٰی کے مشاعروں کی روایت اور آداب ملحوظ رکھیں گے اور غالبؔ کی دہلی کے شعر و ادب کی محفلوں کی یاد تازہ کریں گے۔

شاعروں اور مشاعروں نے قوم، ملک اور شعر و ادب کو نام ور اور ممتاز کرنے میں کسی اچھے سے اچھے ادارے سے کم خدمات انجام نہیں دی ہیں۔ ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا ہے، اس لیے میرے اس کہنے کو شاعری پر محمول نہ فرمائیے۔ جو کہہ رہا ہوں پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں، اس لیے سچ کہہ رہا ہوں۔

مشاعروں کا معیار اور قدر و قیمت شاعروں کے کلام کے معیار اور قدر و قیمت پر منحصر ہے۔ اس کے بعد سامعین کے ظرف و ذوق پر۔ اگر شعرائے عظام اچھے شعر پیش کریں گے تو سامعین کرام داد دیے بغیر نہیں رہیں گے۔ یہ بات میں نے موجودہ شعرا اور سامعین کی خوشامد یا تالیف قلب میں نہیں کہی ہے۔ میں اردو شاعری اور اردو کے اداشناسوں کو جانتا ہوں اور بہتوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ ان اداشناسوں کو آپ دھوکا نہیں دے سکتے۔ اردو کے گنہ گاروں کو آپ دوسرے اور تیسرے درجے کے اشعار سے ثواب نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے ایسے مشاعرے دیکھے ہیں جہاں زیادہ سے زیادہ شور و شغب اور بدنظمی رہی ہے۔ اس کے باوجود کسی معمولی سے معمولی شاعر نے بھی کوئی اچھا شعر پڑھ دیا تو مجمع نے بے اختیار داد دی ہے اور فضا کا رنگ یک لخت بدل گیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں کیسا جادو ہے کہ وہ کسی کے سر پر تو نہیں چڑھ جاتا، لیکن دل میں اُتر جاتا ہے۔

دہلی کے نظم و نسق کی ذمہ داری پولیس کی ہو، یہ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن دلّی میں اردو مشاعروں کا حسنِ انتظام تمام تر شاعروں اور سامعین کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ یہ ان کا حق اختیار، ذمہ داری ہے۔ کوئی مجمع یا محفل تو ایسی ہو جہاں پولیس کو بدنام ہونے کی بجائے نیک سرانجام اور خوش وقت ہونے کا موقع ملے۔ آپ ہی نے یہ مشاعرہ منعقد کیا۔ آپ ہی کے لیے منعقد کیا گیا۔ آپ ہی کے لیے جناب صدر اور یہ خاکسار منعقد ہیں۔ ظاہر ہے اس انتظام کے لیے نہ آسمان سے فرشتے اتریں گے نہ ہیڈ کوارٹرس سے پولیس یا فائر بریگیڈ طلب کیا جائے گا۔ اس مشاعرے کو کامیاب بنانے کے لیے سب کچھ ہمیں آپ کو کرنا ہے۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بدنظمی پھیلانے والے ہم میں ہی سے ہوتے ہیں، جن کو نہ بانیانِ مشاعرہ قابو میں رکھ سکتے ہیں، نہ پولیس، نہ جناب صدر، نہ یہ ہیچ مقدار۔ یہ صرف حاضرین کے بس کی بات ہے۔ درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے اس حق اختیار اور ذمہ داری کو ضرور کام میں لائیں، اور آج کی شب کی فضا کو دہلی کی دیرینہ تہذیبی روایات کے مطابق رکھیں۔ اس طور پر کیا تعجب اگر دہلی پولیس اپنے ہیڈ کوارٹرس کو ہمارے آپ کے بارے میں کوئی کلمۂ خیر پہنچانے کے بجائے وہاں سے ہماری آپ کی خدمت میں شب بخیر گزار دینے کی تہنیت کا ایک ریزولیوشن بھیجے۔

صاحبو! ایسی تقریب کس کام کی جس کے بانیوں کو حفظِ ماتقدم کے طور پر سب کچھ کرنا پڑے، اور جس کے حاضرین حفظِ مراتب کا بالکل لحاظ نہ کریں۔ مجھے شاعری، شاعر، مشاعرہ، سامعین، سب عزیز ہیں۔ سب کی اہمیت کا معترف ہوں، لیکن ان سے کہیں زیادہ عزیز تہذیب اور شعروادب کی وہ روایت ہے جسے دلّی، اردو اور غالبؔ کہتے ہیں۔ جن کے نمائندے ہم سب ہیں۔ اسی روایت کی وفاداری میں آج ہماری آپ کی آزمائش ہے۔ دلّی کی آبادی اور رقبہ بڑھ گیا ہے، کاروبار بڑھ گیا ہے، کارخانہ اور ادارے بڑھ گئے ہیں۔ امن، آسودگی اور اقتدار کے مسائل اور پیچیدگیاں بڑھ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ فتنہ وشر کے اکابر اپنے اپنے شہ پاروں کی مہورت کے لیے بے تکلف دہلی آتے رہتے ہیں۔ شامت اعمال کسی کی ہو، کہیں کی ہو، 'صورت نادر' اختیار کرنے کے لیے دہلی ہی کا انتخاب کرتی ہے۔ ان دشواریوں میں مشاعرے کی بدنظمی کا اضافہ نہ ہونے دیجیے۔ اس سے تہذیب اور شعروادب کے خدمت گزاروں کی رُسوائی ہوتی ہے۔ مشاعرہ ایک تہذیبی تقریب ہے، اس کے تقاضے پورے کیجیے اور ہر اچھے آدمی کو خوش ہونے اور فخر کرنے کا موقع دیجیے۔ دہلی کا ہر مشاعرہ 'دہلی کے آخری مشاعرے' سے بہتر نہیں تو اس کے برابر کیوں نہ ہو۔ حالات کے بدلے ہونے کے معنی حالات کے بدتر ہونے کے کیوں لیے جائیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا احساسِ ذمہ داری اس وقت کمزور ہوا ہے جب اس کے قوی ہونے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ دلّی ہی نہیں شاید ساری دنیا کا المیہ یہی ہے، لیکن یہ شب مشاعرہ ہے، شب مناجات نہیں۔ اب اس گفتگو کو یہیں ختم کر دیتا ہوں، لیکن متشابہ لگنے کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔

اپنا اور آپ کا ایک خاصّہ بتاؤں۔ ہم اکیلے ہوتے ہیں تو اونگھتے یا شعر کہتے ہوتے ہیں۔ اکثر دونوں بیک وقت اور مجمع میں ہوتے ہیں تو آبرو باختہ ہو جاتے ہیں۔ سوسائٹی کا نقشہ کچھ اس طرح کا ہو گیا ہے کہ افراد جماعت سے کٹ گئے ہیں اور جماعت افراد کی قدر و قیمت سے بے خبر و بے نیاز ہو گئی ہے۔ کسی کا کسی پر نہ اثر، نہ گرفت۔ لیکن کیجیے کچھ، یہ ضرور یاد رکھیے کہ سوسائٹی کا نظم و نظام ستاروں اور سیاروں کے نظام کی مانند ہے، جو فرداً فرداً اور مجموعی حیثیت سے بھی ایک دوسرے سے مربوط و مستحکم ہے۔ ان میں شمہ برابر بھی کہیں خلل پڑ جائے تو سارا نظام

فلکی درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی رشتہ سوسائٹی میں افراد و جماعت کا ہے۔ تعمیری و تہذیبی تقریبیں اس لیے بھی منعقد کی جاتی ہیں کہ افراد و جماعت ایک دوسرے کی ذمہ داری کو سمجھیں اور مانیں۔ ان میں ایک تقریب مشاعرے کی بھی ہے جس کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری ہم سب نے فرداً فرداً اور اکٹھا قبول کی ہے۔

صاحبو! شاعری کو اس طرح نہ تقسیم کیجیے کہ یہ شیخ ہے، وہ برہمن۔ یہ نئی ہے، وہ پرانی۔ یہ دیسی ہے، وہ بدیسی ہے۔ شاعری اور شخص کی درجہ بندی ہونی چاہیے، صرف اوّل اور دوم میں۔ شاعری ذاتی نہیں سماجی یعنی اقدار و اخلاق کا مسئلہ ہے۔ شاعر ہو یا کوئی اور صرف اپنی تسکین کی خاطر سماج کے اوامر و نواہی یعنی Do یا Dont سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ یہ میں شاعر ہی کی بھلائی اور بڑائی کو پیشِ نظر رکھ کر عرض کرتا ہوں کہ اسے ایسی رعایات نہ مانگنا چاہیے نہ ملنا چاہیے، نہ قبول کرنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی بھی غیر شاعر نہ رہ جائے۔ مجھے یقین ہے اس تقریب میں جتنے شعرائے کرام اور ان کے عقل مند دوست موجود ہیں مجھ سے اتفاق کریں گے۔ نہیں تو

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

حضرات! آیئے اس وقت ایک بات پر اتفاق کر ہی لیں۔ اسی دہلی میں ہر روز ہر پُرسکون و پُر فضا ماحول میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو زندگی کے ہر ہراس اور ہلچل سے بے نیاز و بے خبر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے، دور سے آتے یا دور جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ کیا تعجب یہاں بھی دیکھ رہے ہوں۔ یہ سرگوشی یا پیمانِ مہر و وفا ازل سے چلا آرہا ہے اور ابد تک چلا جائے گا۔ انسان کے شرف و سعادت کی بشارت اسی سرگوشی میں ملتی ہے، اسی کی صدائے بازگشت شاعر کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔ اس سے آپ شاعر کی عظمت اور شاعری کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

معافی کا خواستگار ہوں کہ اتنی دیر تک آپ اور شعرائے کرام کے درمیان حائل رہا۔ اب جناب صدر کی اجازت اور آپ کی ایما سے اس تقریب کے افتتاح کا اعلان اس دعا سے کرتا ہوں کہ ہم سب جن بہترین توقعات کے ساتھ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے آئے ہیں وہ پوری ہوں۔ خدا حافظ! (مطبوعہ نیا دور، کراچی۔ شمارہ: 67-68 خاص نمبر)

●●●

علی گڑھ — ماضی وحال

سرسید میموریل لیکچرز

17/ اکتوبر 1970

جناب چانسلر، جناب وائس چانسلر، جناب پرو وائس چانسلر، خواتین و حضرات!

آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آج کی تقریب کے لیے آپ نے اصحاب کہف میں سے ایک کا انتخاب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ان کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن ان کا مصرف نہیں بتایا تھا۔ یہ قطعاً آپ کا انکشاف ہے۔ یوں بھی جو بات ٹکسٹ میں نہیں ہوتی، اُسے تفسیر میں جگہ دے دیتے ہیں!

کچھ دن ہوئے ملک کے ایک ممتاز صحافی اور دانش ور نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اگر آپ کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جو (Grumbler) (بڑبڑانے والا) ہو تو آپ بلا تکلف کسی ہندستانی کو منتخب کر سکتے ہیں! بشرطیکہ اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو آپ نے اس سال سر سیّد میموریل لیکچر دینے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کر کے جو پچاس سال کی حد سے تقریباً ایک رُبع صدی آگے نکل گیا ہے، خود کو ایک آزمائش میں مبتلا کر لیا ہے۔ اس آزمائش سے اس طور پر عہدہ برآ ہونا کہ صورت حال زیادہ نہ بگڑنے پائے، یہ ہے کہ آپ ماہرینِ نفسیات کے اس مشورہ پر عمل کریں کہ جب حادثہ سخت ہو اور جان عزیز اور فرار کے راستے مسدود ہوں تو بہتر یہ ہے کہ اس میں کوئی تفریحی پہلو ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے۔ اگر آپ اس مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوں تو آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کی مجلس میری آزمائش اور آپ کی تفریح کا باعث ہوگی۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کی گفتگو کا موضوع علی گڑھ کا ماضی اور حال ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں مستقبل کا اور اضافہ کر لیں۔ میں ماضی، حال اور مستقبل کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں نہیں تقسیم کر سکتا۔ میرے نزدیک حیاتِ انسانی کا ارتقا زمان و مکاں کے مسلسل اور غیر منقطع عمل اور ردِ عمل سے عبارت ہے، جس کی بنا پر انسانی تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں جو عناصر پوشیدہ ہوتے ہیں ان کی ساخت و پرداخت، ترتیب و عدم ترتیب بنیادی طور پر ایک ایسے لامتناہی کائناتی عمل کا حصہ ہیں جن کا مطالعہ، مشاہدہ، احساس، تنظیم و تسخیر، انسانی شعور اور عمل میں ظاہر ہوا ہے، ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اسی کی آسان تعبیر ماضی، حال اور مستقبل کی شکل میں ہم کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مطلق اور اضافی تعبیریں بھی اسی سے متعلق ہیں جس قطعیت سے یہ بات میں نے کہی ہے، ضروری نہیں کہ آپ بلاتوقف اسے تسلیم کر لیں۔ دراصل ہم کو اس کا احساس ہونا چاہیے کہ آج کا اجتماع اس نامیاتی تعلق کا اظہار ہے جو ماضی، حال اور مستقبل میں جاری و ساری ہے۔ اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ ایک حد تک علی گڑھ کے ماضی کا خاکہ یہ خاکسار، اس کے حال کی تصویر آپ اساتذہ اور اس کے مستقبل کا نقشہ، آپ نوجوان طالب علم پیش کرتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اچھی بات اور بڑے کام کے تذکرہ کے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا ہے۔

علی گڑھ کے ماضی و حال کے بارے میں بات کی جائے تو اس کی ابتدا علی گڑھ کے اس مردِ دانا کے تذکرے سے ہوگی جس کے یومِ پیدائش کی تقریبات کا آج انعقاد ہو رہا ہے۔ سرسید کی پیدائش کو آج ڈیڑھ سو برس سے کچھ اوپر مدت ہوئی اور ان کی وفات کو تقریباً بہتر سال ہوئے۔ اس مدت میں قومی زندگی جن نشیب و فراز سے گزری، کیسے نشیب اور کیسے فراز، ان کی نشان دہی کی کوشش کیجیے تو سرسید کی خدمات اور کارناموں کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جس طرح قدیم یونان کا ذکر کرتے وقت پرکلیز اور اس کے عہد کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے علی گڑھ اور ہندوستان کی تاریخ کا ذکر ہو تو سرسید اور ان کے عہد کو بھلانا ممکن نہیں، سرسید کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا جب قومی زندگی 'شبِ تاریک بیمِ موج و گرداب چنیں حائل' کی زد میں تھی۔ یاس و ہراس کے اس دور کا اندازہ اور ان شخصیتوں کا تصور کرتا ہوں

جنھوں نے اس عالمِ ابتلا و آزمائش میں انسانیت، آزادی، انصاف، علم اور شائستگی کے چراغ جلائے تو سرسید کا وجود قومی اُفق پر اُمید، عزم اور یقین کے ایک روشن ستارے کی مانند نظر آتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیتوں میں اس اعتبار سے سب سے نمایاں ہیں۔ انھوں نے قومی زندگی کے شدید بُحران کو جس شدت سے محسوس کیا اتنی ہی گہری دل سوزی، دیانت اور دلیری سے قومی تعمیر و ترقی کی ایک عظیم الشان جمہوری تحریک کی قیادت کے فریضے کو انجام دینے کی ایسی شان دار روایت کا آغاز کیا جس کی مثال ان سے پہلے ہمارے ملک کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

سرسید کو میں نے قومی تعمیر و ترقی کی ایک عظیم الشان جمہوری تحریک کا بانی اور رہنما قرار دینے میں نہ خوش عقیدگی سے کام لیا ہے نہ مبالغے سے۔ اس رائے کے قائم کرنے میں اصلاً اس مطالعے اور مشاہدے کو دخل ہے جو مجھے اس درس گاہ میں طویل قیام کے دوران میں میسّر آئے۔ مجھے یقین ہے میری اس رائے سے وہ لوگ اختلاف نہیں کریں گے جنھوں نے سرسید کی تصانیف اور کاموں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ قومی زندگی کے بے شمار شعبے ہیں مگر یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ ان میں سے تقریباً ہر اہم شعبہ ان کی گہری توجہ کا مرکز بنا۔ انھوں نے ان کو سمجھنے سمجھانے اور نافذ کرنے میں غیر معمولی پیش بینی، دانش مندی اور دردمندی سے کام لیا اور کامیابی حاصل کی۔ وہ زمانے اور سوسائٹی کی جانب ایجابی میلان رکھتے تھے، اور عملیت پسند اندازِ فکر کی حمایت کرتے تھے۔ وہ اس رمز سے خوب واقف تھے کہ 'قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا ہے منتظر زمانہ'۔ ان کا یہ طرزِ فکر و عمل نہ صرف انیسویں صدی کے ہندوستان کے معاشی اور تمدنی احوال میں انقلاب آفریں اہمیت رکھتا تھا، بلکہ آج بھی ہم ان کی ضرورت اور اہمیت کا لحاظ کرنے پر مجبور ہیں۔ بڑے آدمی اور بڑے ذہن کی ایک پہچان یہ ہے کہ انسانی فکر و عمل کے ارتقا کے حقیقی محرکات کے بارے میں ایسی بصیرت حاصل کرنے میں مدد دے جو اس پورے ارتقائی عمل کو ایک بامقصد، بامعنی، اخلاقی و تہذیبی کارآفرینی میں تبدیل کر دے۔

سرسید ازمنہ وسطیٰ کی اس ہند اسلامی تہذیب کی پیداوار تھے جو اس وقت ایک ہمہ گیر سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی جمود و زوال کی شکار تھی۔ سرسید نے اس صورت حال کا وسیع مشاہدہ

اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے انھوں نے بعض نتائج اخذ کیے جن سے انھوں نے اپنی قوم اور وطن کو آشنا کرایا، اور نہایت فکر انگیز اور قابلِ عمل تجاویز پیش کیں اور عام دعوت دی کہ وہ قومی تعمیر و ترقی کے پروگرام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں اور مثبت فکر و عمل کا آغاز کریں۔ سرسید نے اس کام کے لیے سستے یا منفی طریقوں کے استعمال کو یکسر غلط قرار دیا۔ انھوں نے قوم کی تعلیم و تربیت میں بے غرض جماعتی کام کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہ شاید ہمارے ملک میں پہلے شخص ہیں جس نے تہذیب و تمدن کی ترقی میں ایک حرکی نظام تعلیم کو کلیدی حیثیت دی اور علوم کی ترقی کو دوسری تمام سرگرمیوں پر ترجیح دی۔ انھوں نے تہذیب کے جملہ خارجی مظاہر کو جو اشخاص، اشیا اور اداروں کی شکل میں پائے جاتے ہیں، انسان کی ذہنی و عملی صلاحیتوں کا ثمرہ قرار دیا اور اپنے تمام ہم وطنوں کو دعوت دی کہ وہ اپنی جملہ تعمیری صلاحیتوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول پر مرکوز کر دیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان خیالات کے دوسرے بڑے لوگ بھی ملک میں موجود تھے اور وہ اس طرح کی اصلاحات اپنے اپنے حلقوں میں عام کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ لیکن سرسید کا اصلاحی پروگرام ان سے زیادہ مشکل اور جامع تھا، اور وہ اس کو وسیع تر پیمانے پر نافذ کرنا چاہتے تھے۔ سرسید جن لوگوں میں بھیجے گئے تھے، وہ اپنے ہم عصروں سے زیادہ آئینِ نو سے ڈرتے اور طرزِ کہن پر اڑتے تھے۔ اس لیے کہ وہ حال ہی میں حکومت سے معزول ہوئے تھے، اس حکومت اور سوسائٹی سے جو عرصہ سے کہنگی اور بے عملی کے تصرف میں آ چکی تھی۔ نظر بر آں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایک جامع تہذیبی و تعلیمی تحریک کی جیسی قیادت سرسید نے کی، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اتنے بڑے ملک میں اتنے بُرے دنوں میں ایسے بدحال اور کسم پرس لوگوں میں جتنے اچھے اور بڑے کام جن دشواریوں میں سرسید نے جس خوبی اور کامیابی سے انجام دیے وہ نہ صرف ان کا عظیم ذاتی کارنامہ ہے، بلکہ ہماری تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ جو رول (Role) یورپ میں ازمنہ وسطیٰ کی مجہول اور متعصب ذہنیت سے نجات دلانے میں ریفریشن اور رینا سنس کی عظیم شخصیتوں نے ادا کیا ویسا ہی رول ہماری تاریخ و تہذیب میں سرسید نے انجام دیا۔ کتنا صحیح ہے ان کی لوحِ تربت کا یہ کتبہ (شعر) کہ حضرت موسیٰ

اور کوہِ طور ایک جلوے کی تاب نہ لا سکے۔ ایک میرا دل ہے جس نے اس طرح کے کتنے بے شمار جلوے دیکھے اور سہے ہیں! مبالغے میں بات کرنا بد مذاقی ہے، لیکن جب بھی سرسید کے مزار کی طرف سے گزرتا ہوں اور فاتحہ نہیں پڑھ سکتا۔ سرسید کا یہ شعر ان کے مزار پر نظر سے ضرور گزر جاتا ہے اور یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے ایسا شعر کہا ہو اور اس کا مصداق بھی ہو!

مجھے اس امر کا احساس ہے کہ علی گڑھ کے عزیزوں اور دوستوں کے سامنے سرسید کی خدمات اور کارناموں کی تفصیل پیش کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ آپ ان سے واقف ہیں۔ یہاں اور اس وقت ان چند اہم مسائل کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو سرسید کو درپیش تھے، اور جن سے اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی آج ہم آپ دوچار ہیں۔ اس سے آپ کو اس بات کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ سرسید نے ہماری زندگی میں پیوست ان منفی اور مثبت عناصر کو سمجھنے اور قابو میں لانے میں کتنی اور کیسی کوشش کی جن کے عمل اور ردِّعمل کے نتائج سے ہم ایک طور پر مستقلاً متاثر ہوئے ہیں اور کچھ تعجب نہیں، اگر ایک نامعلوم مدت تک متاثر ہوتے رہیں۔ وہ مسائل کیا ہیں؟ میرے نزدیک یہ ہیں، ہندستانی انسانیت کا اتحاد ہندی مسلمانوں کا تہذیبی و تعلیمی خود ارادیت کا حق، اور مذہب اور سائنس کے حدود اور حقوق کو سمجھنا۔ بالفاظ دیگر ایک منصفانہ، ترقی پذیر، روشن خیال، باعزّت اور امن پسند معاشرہ کا قیام و استحکام۔ آیئے دیکھیں کہ ان مسائل کی افہام و تفہیم میں ہمیں سرسید سے کیسی، کتنی اور کہاں کہاں روشنی ملتی ہے۔ ایسا کرتے وقت تھوڑی دیر کے لیے ہم کو بھول جانا چاہیے کہ سرسید کی سواری گھوڑا گاڑی تھی، اور آپ کی جمبو جٹ یا سرسید اپنا سارا کام اور حساب کتاب محض اپنے دو ہاتھوں سے انجام دیتے تھے، اور آپ کے لیے بجلی کے ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر موجود ہیں یا یہ کہ سرسید نے صرف سات سمندر پار کیے اور آپ خلائی فضا پار کر کے چاند پر جا پہنچے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ چاند سے تو صحیح سلامت زمین پر واپس آ گئے لیکن خود زمین کو صحیح سلامت نہیں پاتے۔ سرسید چاند پر تو نہیں پہنچ سکے، لیکن انھوں نے جس زمین پر بیج بکھیرے ان میں آج بھی پھول کھلتے رہتے ہیں، اور بہار آتی رہتی ہے۔ بات کہاں کی تھی کہاں جا پہنچی۔ اس کے لیے میری معذرت بھی شاید قابلِ قبول

نہ ہو، اس لیے کہ اس فن میں عادی مجرم کا درجہ بہت پہلے سے مل چکا ہے جس کا مداوا یونیورسٹی تو نہ کر سکی جیل خانہ شاید کر سکے۔

سرسید کے زمانے میں بدیسی استعمار کی گرفت میں ہندستانی، انسانی، انسانیت کا اتحاد کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا اور ہمارا ملک سیاسی آویزش کے نامبارک دور میں داخل ہونے لگا تھا۔ اس دور کی سیاسی صورتِ حال کو سامنے رکھیں تو ہندوستان ایک سہ طاقتی کشاکش و کش مکش سے دوچار نظر آتا ہے۔ ان طاقتوں کی نمائندگی انگریز، ہندو اور مسلمان کرتے تھے۔ ان میں واضح طور پر سب سے کمزور اور درماندہ مسلمان تھے۔ اس سہ طاقتی مقابلے میں سب سے کمزور طاقت کا کیا انجام ہوسکتا تھا، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ جب یہ معلوم ہو کہ اکثریت اقلیت کے اخلاقی وتہذیبی توازن کو اہمیت دینے کے بجائے عددی تناسب پر زور دیے جانے کا امکان بڑھ رہا تھا۔ اس صورت میں اقلیت ایسے حال کو پہنچ جاتی کہ اس کی تخلیقی اور ترقی پذیر صلاحیتیں یکسر مفقود نہیں تو معطّل ہو جاتیں۔ اس پیچیدہ اور خطرناک پوزیشن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرسید کو سامنے آنا پڑا۔ انھوں نے نہایت صفائی، ایمان داری اور دلیری سے اس امر کا اظہار کیا کہ وہ اس صورت حال کو پُر خطر اور بے ثمر سمجھتے تھے، اس لیے کہ وہ ایک شان دار اور قابلِ فخر ورثے کے امین تھے۔ جس کے تحفظ اور ترقی کو وہ قومی اور ملکی ترقی اور نام وری کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ہمیشہ سے مختلف اور متنوع تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اس بنا پر کسی ایک تہذیب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسری تہذیبوں کی نفی کرے۔ وہ کسی ایسے سیاسی تصفیے کو تسلیم نہ کریں گے جن سے ان تہذیبوں کی بقا اور ترقی کو خطرہ ہو۔ انھوں نے ہندستانی انسانیت کے اتحاد کو تہذیب کا مسئلہ قرار دیا اور اس طور پر اس وقت کی سیاست کو تہذیب کا تابع کیا۔ انھوں نے انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے صلح اور دوستی کا رشتہ قائم کیا اور ہر سطح پر اس رشتے کو استوار کرنے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کو اس مشن میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ سرسید نے انگریزوں اور جملہ ابنائے وطن کا جیسا سچا اور پکا اعتماد حاصل کیا، اس کی بنا پر اس عہد میں ان کی قیادت کو کل ہند قیادت کا درجہ حاصل ہوا۔ جو ان سے پہلے کسی ہندستانی کے حصہ میں نہیں آیا تھا۔

سر سید، حکومت اور ابنائے وطن کو اپنا ہم خیال بنانے میں جس قدر کامیاب ہوئے اس میں ان کی شخصیت کا اعجاز سمجھتا ہوں۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنی اکتسابی خوبیوں سے اس طور پر مربوط و محکم کیا تھا کہ ان کی ذات میں مقناطیس اور پارس پتھر کی صفات پیدا ہو گئی تھی۔ لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچتے تھے اور جو چھو گیا وہ زرِ خالص بن گیا۔ ان صفات سے خود انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ اپنے آپ کو کلیۃً ملک اور قوم کی خدمت کے لیے وقف رکھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی وفات پر ان کا بینک بیلنس صفر تھا، لیکن قوم کے خزانے میں اتنا اثاثہ ضرور تھا جو اس کے خوش آئند مستقبل کی ضمانت کے لیے کافی تھا۔ وہ لوگ جو آج قومی اتحاد و یگانگت کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں وہ سر سید کے طرز فکر و عمل سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس مطالعہ میں نہ صرف عقیدت مندی سے کام لیں، نہ نری نکتہ چینی سے، جو ہماری قومی زندگی کا مزاج بن گیا ہے۔

سر سید کے سامنے دوسرا بڑا مسئلہ ہندی مسلمانوں کی تہذیبی و تعلیمی خود ارادیت کے حق کو ملک کی عام تہذیب اور اس کے تعلیمی نظام میں متیقن و مستحکم کرنے کا تھا۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی 'دامانِ باغبان و کفِ گل فروش' تہذیب کی نمو اور نمود اس پر منحصر تھی کہ اس کی تہذیبی اقلیتیں آزادی اور انصاف کی فضا میں سانس لینے پر قدرت رکھتی ہوں تاکہ وہ نہ صرف اپنی تہذیب کے قیمتی عناصر کا تحفظ کر سکیں بلکہ اپنی اعلیٰ تعمیری سرگرمیوں سے قومی تمدن کی سیرابی میں مسلسل مدد دے سکیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک کسی تہذیب کا بجائے خود منفرد ہونا یا کسی کا اس سے منسلک ہونا نہ اس تہذیب کی خامی تھی، نہ اس شخص کا گناہ۔ جب تک کسی تہذیب کے اقدار ایک اعلیٰ معاشرے اور انسانی تخلیق و تعمیر سے عبارت ہیں، انسانیت کے لیے اس تہذیب کی قدر و قیمت مسلّم ہے۔ حقیقی تہذیب کا مقصود و منتہا اچھے اور بڑے انسان کو ظہور میں لانا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سر سید کی تہذیبی و تعلیمی تحریک، ہندستانی زندگی کے ایک اہم تہذیبی عنصر، ہندی مسلمانوں کی بقا و بالیدگی کے لیے تہذیب و دانش کے اعلیٰ اور مسلمہ معیاروں کے مطابق تھی۔ اس لیے میرے نزدیک اس بارے میں ان کی خدمات ان تمام لوگوں کے لیے قابلِ توجہ و تکریم ہیں، جو ایسے کام کی قدر کرنے کو ایک اعلیٰ انسانی فریضہ سمجھتے ہیں۔

اس طور پر سرسید اور ان کے رفقا کے افکار و عمل نے جو پیرایہ اختیار کیا، وہ عام طور سے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے موسوم ہے۔ اس کا مرکز ایم۔اے۔او۔ کالج کی شکل میں قائم ہوا، جس نے بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا درجہ حاصل کیا۔ ہماری قومی تعلیمی تحریک نے اس سرزمین اور اسی فضا میں پرورش پائی اور پروان چڑھتی رہی ہے۔ اس ادارے کے بانیوں نے اس کے جو مقاصد متعین کیے تھے، اس سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ پھر بھی بعض ان باتوں کو دُہرانے کا جی چاہتا ہے جن سے ہم کو غالباً آج کے حالات میں بھی اتنی ہی مستند رہنمائی مل سکتی ہے جو کوشش کے باوجود اس وقت کہیں اور سے ملتی نظر نہیں آتی۔ (سرسید نے کہا: ''دوستو، ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی...... ہم آدمی جبھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔'') ان الفاظ میں تعلیم کے مسئلہ پر حق خود ارادیت کی کتنی واضح اور پُرزور وکالت ملتی ہے۔ انگریزی حکومت نے جن شرائط کے ساتھ یونیورسٹیاں قائم کی تھیں، سرسید کے نزدیک وہ قومی مزاج اور تہذیب کی فطری اور اعلیٰ نشو ونما کے لیے بڑی حد تک ناسازگار تھیں۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ حکومت کی سیاسی مصلحتوں کے پروردہ تعلیمی ادارے ان بنیادی قومی مقاصد کو پورا کرنے میں ناکام رہتے ہیں جن کی تکمیل سے ملکی تہذیب کی فی الواقع توسیع و ترقی ہوتی ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں انھوں نے تعلیم کو سیاست کی وقتی مصلحتوں کا پابند پایا اور انگریزی دور میں اس کا مشاہدہ کیا، انھوں نے اس کے غیر صحت مند پہلو کو بے نقاب کرنے میں تامّل نہیں کیا۔ انھوں نے ہمیشہ ایک ایسے علمی پروگرام کو وضع کرنے پر زور دیا جس کا مقصد قومی ترقی، قومی عزّت اور جس کی حقیقت وہ تاریخی تجربات اور مشاہدات ہوں جو قوم کو اجتماعی طور پر حاصل ہوئے ہوں۔ اس طور پر سرسید کے تعلیمی تصورات میں شخصی احساسات یا ذاتی پسند یا ناپسند کا اتنا اظہار نہیں ملتا جتنا قوم اور معاشرہ کے اجتماعی تجربات اور افکار کی ترجمانی ملتی ہے۔ بالفاظِ دیگر قومی زندگی کے حقائق کے اجتماعی شعور کو سرسید کی شخصیت میں ذاتی عرفان کا درجہ حاصل ہوگیا۔

ہر چند کہ یہ ادارہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب کی غرض سے کلیۃً مسلم انتظام کے تحت قائم ہوا، لیکن ابتدا ہی سے اس کی پالیسی تمام ہم وطنوں کے لیے خیر سگالی

اور ہمدردی کی تھی۔ اس کی تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو پورے مواقع اور سہولتیں حاصل رہیں۔ کالج کی طرف سے ایک ایڈرس میں جو وائسرائے گورنر جنرل ہند کو 18رنومبر 1884ء کو دیا گیا۔ اس پالیسی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''...........کبھی یہ خیال نہیں کیا گیا تھا کہ ہندو یا عیسائی یا یہودی اس جگہ تعلیم نہ پاویں گے........... بانیوں نے ابتدا سے ارادہ کیا تھا کہ مثل قرطبہ اور غرناطہ کی مسلمان یونیورسٹیوں کے سب قوم کے لوگوں کو بلاتعصب اس میں تعلیم دی جائے۔ چنانچہ موجودہ کالج میں ہندستانی پارسی سب تعلیم پاتے ہیں، اور سب کو تعلیم کے باب میں برابر استحقاق دیے جاتے ہیں۔''

کالج کے بانیوں نے اپنے اس ارادے کی تعمیل جس خلوص اور ایمان داری سے کی، اس کی تصدیق اس ادارے کے ریکارڈ سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے جو بحیثیت پریسیڈنٹ ایجوکیشن برائے ہند، 8راگست 1882 کو کالج میں آئے تھے، کہا:

''اس کے بانیوں نے جو ٹھیک ٹھیک ایک مسلمانی مدرسہ ہے، اپنا دروازہ تمام اقوام اور مذہب کے لڑکوں کے واسطے کھول دیا ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ 259 طالب علموں کے 57 ہندو یا کل میں سے تقریباً ایک چہارم ہندو ہیں۔ عیسائیوں اور پارسیوں کے لڑکوں نے بھی اس کے اندر فیاضانہ تعلیم حاصل کی ہے۔''

کالج کے ابتدائی زمانہ کے ایک نام ور طالب علم سید طفیل احمد منگلوری کا بیان ہے کہ:

''ہندو اور مسلمان طلبا بھی اس زمانے میں یگانگت کے ساتھ کالج کے بورڈنگ ہاؤسوں میں رہتے اور ایک دوسرے کے رنج و راحت میں یکساں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں ایک نمایاں بات یہ ہوئی کہ علی گڑھ کالج سے سب سے اوّل ایک ہندو طالب علم بابو ایشری پرشاد نے بی۔ اے کیا۔ انھیں 1882ء کے سالانہ جلسہ میں سرسید نے اپنے

ہاتھ سے تمغہ پہنایا تھا۔ مختلف فرقوں کے درمیان باہمی رواداری اور یگانگت کے اصول کو جس طرح عملی طور پر کالج نے اپنایا اور فروغ دیا، اس کی مثال اس وقت کے کسی دوسرے ادارے میں مشکل سے ملے گی۔''

اس طور پر ایم۔اے۔او۔کالج میں مختلف عقائد رکھنے والے اساتذہ اور طلبا کی آزاد اور متفقہ کوششوں سے جو تہذیبی فضا قائم ہوئی، اسے میں علی گڑھ تحریک کا بڑا دل کش اور قابلِ قدر کارنامہ قرار دیتا ہوں۔ جس نے ہندوستان میں ایک ہم آہنگ تہذیبی زندگی کی روایات کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اقلیت کی تہذیبی و تعلیمی خود ارادیت سے ملکی تہذیب کی سالمیت کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور اس کے باشندوں کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ میں بیش بہا مدد ملتی ہے۔ اس نکتہ کی عملی تفسیر علی گڑھ نے پیش کی۔ آپ کو یاد ہوگا آزادی کے بعد ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہمارے نام ور ترین اولڈ بوائے اور ہندوستان کے سابق صدر ذاکر صاحب مغفور نے راشٹر پتی راجندر پرشاد کی یونیورسٹی کنووکیشن میں تشریف آوری کے موقع پر جب یہ کہا تھا کہ ''مستقبل میں ہماری آزاد جمہوری ریاست کی انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر جو تعمیر ہوگی وہ بڑی حد تک اس پر مبنی ہوگی کہ ہندوستان، علی گڑھ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا اور خود علی گڑھ ہندوستان کو کیا پیش کرے گا۔'' انھوں نے ہماری طرف سے ضمانت دی تھی کہ ''علی گڑھ ایک عظیم اور دل کش ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں ہمیشہ دل و جان سے شریک رہے گا۔'' جدید ہندوستان میں ذاکر صاحب کا یہ فرمانا سرسید اور علی گڑھ کے اس لازوال اساسی عقیدے کا ایک مستحکم اور معتبر اعلان تھا جس کا اعادہ ہم ہمیشہ ہر دور میں کرتے رہیں گے۔

میں خیال کرتا ہوں اور کیا عجب آپ کے خیال کی ترجمانی کر رہا ہوں کہ ہمارے تہذیبی موقف سے کس درجہ وابستہ اردو کا مسئلہ ہے جو سرسید کے عہد سے اب تک طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ اردو کو علی گڑھ سے جدا نہیں کر سکتے۔ دونوں کی سرحدیں نہیں، قلم رو ایک ہے۔ دونوں کا مزاج و معیار یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی تاریخی اور سماجی تقاضے کی پیداوار ہیں۔ ہندوستان میں اردو کا مسئلہ زبان ہی کا نہیں، تہذیب، معاشرت،

مساوات، علم لسان اور بول چال اور لین دین کی کل ہند زبان کا بھی مسئلہ ہے۔ اس لیے علی گڑھ ہمیشہ اردو کی اور اردو علی گڑھ کی ''خیر و عافیت درگاہِ خداوند کریم سے نیک چاہتا رہے گا۔''

اردو کی پہل کہاں ہوئی اور کہاں یا کہاں کہاں اس کے نشانات ملتے ہیں۔ ایک ایسی بحث ہے جس سے آپ اُکتائیں گے، اس لیے کہ ان سے واقف ہیں۔ میں خود بھی اس سے بچنا چاہتا ہوں اور آپ کو بھی بچانا چاہتا ہوں۔ سرسید ابتدا میں اردو کو وسیلۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھے، لیکن جلد ہی اس ارادے کو ترک کر دیا اور ہندوستان کی دوسری اعلیٰ تعلیم گاہوں کی طرح تعلیم اور دوسرے کاروبار کا وسیلہ انگریزی کو رکھا۔ بعض عزیزوں کا خیال ہے کہ سرسید سے یہ غلطی نہ ہوئی ہوتی تو موجودہ مسلم یونیورسٹی آج ایک مکمل اردو یونیورسٹی ہوتی، اور وہ دشواریاں پیش نہ آتیں جن کا اس وقت سامنا ہے۔ بعض تلخ حقائق کی بنا پر یہ خیال نہ پہلے قابلِ قبول تھا نہ آج ہے۔ اس لیے کہ اس ادارے کو اردو ادارہ قرار دے دینے سے مسلمان ان تمام فوائد سے محروم رہ جاتے جو انگریزی حکومت میں چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں، مغربی علوم و فنون سے شناسائی اور مغربی طور طریقوں کو اختیار کرنے سے میسّر آ سکتے تھے۔ سرسید کے عہد میں مسلمان جس عبرت ناک اور قابلِ رحم حالت کو پہنچ گئے تھے اور ہر شعبۂ زندگی میں جس سفاک مسابقت کا سامنا تھا، اس میں لازم آتا تھا کہ مسلمانوں کی ایک مکمل اور معیاری تعلیم گاہ ہوتی، جو کسی سرکاری یا غیر سرکاری تعلیم سے کم تر درجہ کی نہ ہوتی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ مسلمانوں کا کوئی دوسرے اور تیسرے درجے کا بھی ایسا ادارہ تمام ہندوستان میں کہیں نہ تھا۔ درآں حال کہ ایک سے ایک اچھے ادارے، سرکاری اور غیر مسلم ادارے تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے جہاں مسلمان طلبا کا داخلہ عملاً ناممکن تھا۔ کم و بیش آج بھی صورت حال وہی ہے۔ مسلمانوں کے پاس صرف ایک علی گڑھ تھا۔ اس میں ذرا بھی آمیزش کسی دوسرے عنصر کی ہوتی تو اس کے مخالف اس کو رسوا کرنے اور ناکامیاب بنانے میں کامیاب ہو جاتے اور وہ ساری تعمیر مسمار ہو جاتی جو ہماری کیسی کیسی کوششوں اور اُمیدوں کا مرکز تھی۔

سرسید کے سامنے مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب اور ملک کے بڑے کاموں میں حصہ لینے اور پانے کا مسئلہ تھا، اردو کو وسیلۂ تعلیم بنانے کا تھا۔ اس بارے میں ایک قانونی نکتہ یہ بھی

تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت ایک کل ہند ادارے کی تھی۔ اس میں ایسے طلبا کو بھی داخلے کا حق تھا جو ملک کے دور افتادہ حصوں کے باشندے تھے اور ان کی زبان اردو نہ تھی، لیکن وہ انگریزی سے بخوبی واقف تھے۔ اس بنا پر علی گڑھ کو 'اردو بردار' رکھنے میں نہ صرف حکومت کی طرف سے اعتراض کا اندیشہ تھا بلکہ خود مسلمانوں کو کچھ کم نقصان نہ پہنچتا۔ اس سلسلے میں ایک بہت ہی معمولی واقعہ عرض کروں گا، جس سے صورت حال کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد قائم نہیں ہوئی تھی، اس وقت بھی اس ادارے کو رُسوا کرنے کے لیے اغیار یہ کہتے تھے کہ علی گڑھ کا کیا ذکر وہ تو اردو ہے! حالاں کہ علی گڑھ کا یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم میں، ڈسپلن میں، یونین کی سرگرمیاں، کھیل کے میدانوں، رہن سہن اور رکھ رکھاؤ میں، اور علمی و تہذیبی خدمات میں ہمارا کوئی ثانی نہ تھا۔ سرسید کی بے مثل دور اندیشی، دانش مندی اور حقیقت پسندی کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے اردو کے بارے میں رائے بدل دی اور علی گڑھ کو اردو ادارہ رکھنے کے بجائے اعلیٰ تعلیم کا معیاری ادارہ رکھنے پر زور دیا۔ بایں ہمہ سرسید نے اردو کے تحفظ و ترقی اور اس سے متعلق وسائل اور مسائل کے موقف کو نہیں بدلا۔ بلکہ ان کو بروئے کار لانے میں اپنی سعی و شغف کو تیز تر، موثر تر اور ہمہ گیر تر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ ایک طرف معیاری اعلیٰ تعلیم گاہ ہونے کے اعتبار سے ہندوستان اور بیرون ہندوستان ممتاز رہا۔ دوسری طرف انھوں نے مذہب، اخلاق، تہذیب اور زبان (اردو) کی بنیادوں کو چوڑا اور مضبوط کیا۔ ان کی محرابوں کو بلند، ان کی دیوار و در کو کشادہ اور ہوادار کیا۔ مخلف اور حوصلہ مند رفقا اور مردانِ کار پیدا کیے۔ ایسے مردانِ کار جن کا سلسلہ اس ادارے سے آج تک منقطع نہیں ہوا، میری مراد اولڈ بوائز سے ہے۔ کیسی کیسی آزمائشوں کا سامنا ہوا اور ہوتا رہتا ہے، لیکن بقول حسرتؔ اسی کوچے کا ایک رُسوا ''نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری۔''

جدید اردو سے متعلق جب بھی اور جہاں بھی کوئی ذکر آئے گا، جون گلکرسٹ، فورٹ ولیم کالج، ماسٹر رام چندر، دہلی کالج اور شمس الامرا امیر فخر الدین (حیدرآباد) کے نام نامی ہمیشہ شکریہ کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ تفصیلات سے قطعِ نظر، ان اداروں کے پیچھے کوئی ایسا عزم و اعتقاد اور عظیم شخصیت نہ تھی جو کسی بڑے مقصد اور مشن کو تکمیل کے لیے قوتِ محرکہ کا کام دیتی

ہے۔ یہ امتیاز نہایت واضح طور پر سرسید کے حصے میں آیا۔ اگر سرسید نے علی گڑھ تحریک کو اپنی اردو نثر سے اور اردو نثر کو علی گڑھ تحریک سے مقصد و محکمی نہ دی ہوتی تو جدید اردو کو وہ پر و بال نصیب نہ ہوتے جس کی بدولت وہ بہت جلد اعلیٰ زبانوں کی صف میں داخل ہوگئی، یہ سرسید کی کھری اور کھڑی نثر تھی۔ جس نے اردو کو ان مخصوص دبستانوں (مثلاً دہلی، لکھنؤ وغیرہ) سے نکال کر عام کیا، جن میں وہ اس طرح اسیر ہوگئی تھی۔ جس طرح ملک کے باشندے ذات پات کے زندانوں میں مجبور و مقید تھے۔ سرسید کی دی ہوئی اردو کا منشور یہ تھا۔ اب سے اردو کا دبستاں جغرافیائی حدود یا صنائع و بدائع کا مینا بازار نہیں بلکہ زندگی، زمانہ اور علم و ادب کے تقاضوں اور تکملوں کا کھلا ہوا بازارِ مصر ہوگا۔

غالب سے پہلے کسی نے اردو نثر کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ہر لکھنے والے کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کی نثر کہاں تک شاعری سے قریب تھی۔ سرسید نے اردو نثر کی اہمیت اور اس کے مقصد و معیار کو بغیر کسی قسم کا اعلان یا اظہار کیے اس طرح واضح کیا، اور اس کے نمونے پیش کیے کہ بیش تر لکھنے والے علمی، سماجی، قومی اور ملکی مسائل کو سادہ، دل نشیں اور پُر زور نثر میں پیش کرنے اور ہر طبقہ کو متاثر کرنے کا بڑا قوی اور موثر آلہ سمجھنے لگے۔ پہلے انشا پردازی مقصد تھی، سرسید نے اس کو وسیلہ قرار دیا۔ سرسید نے جتنے اہم موضوعات پر جس قابلیت، حقیقت پسندی اور موثر انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، شاید ہی اردو کے کسی اور مصنف نے کیا ہو۔ کتنا زرخیز ان کا ذہن تھا، کتنے دُھن کے پکّے۔ خلوص کے پیکر اور عزم و عمل کے وہ انسان تھے کہ انھوں نے ہماری ویران زندگی اور سنسان مستقبل کو تقدیر کے صحت مند اور روشن امکانات سے بدل دیا۔ جبر و قہر، جزع و فزع سے نہیں بلکہ سب سے صبر آزما وسیلہ یعنی اعلیٰ تعلیم و تربیت اور اعلیٰ تصانیف و تالیف سے۔ سرسید نے اردو کو محض زبان نہیں بلکہ اس کو ہندوستان کے مختلف عناصر میں اتحاد پیدا کرنے کا ایک تہذیبی رشتہ اور وسیلہ سمجھا۔ عرصے تک وہ ایسا ہی خیال کرتے رہے اور اس رشتے کو قوی کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ لیکن جب ہندی اور اردو، ہندو اور مسلمانوں کا مسئلہ بنائی جانے لگی تو وہ بہت دل گرفتہ ہوئے، اور اس فکر میں رہنے لگے کہ یہ تحریک اس بدگمانی اور بے اطمینانی کا سبب نہ بن جائے جو ملک کی یک جہتی اور سالمیت کی منافی تھی، لیکن اس میں ان کو کامیابی نہیں

ہوئی۔ چنانچہ ایک موقع پر ان کو اس کا بڑے دُکھ سے اعتراف کرنا پڑا کہ ہندی اردو کا مسئلہ ہندو مسلمانوں میں نزاع و نفاق کا باعث ہوگا اور کیسی دردناک یہ پیشن گوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی۔

سرسید نے علی گڑھ کالج میں اردو کو وسیلۂ تعلیم نہیں بنایا، لیکن انھوں نے تہذیب الاخلاق، سائنٹفک سوسائٹی اور اپنی تصانیف اور تالیف سے اردو کو جس طرح مالا مال کیا اور یہ پروگرام جس وسیع پیمانے پر مقبول ہوا، اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ سرسید ہی کے بنائے اور بتائے ہوئے خطوط پر ملک کے دور دراز گوشوں میں اردو تصنیف اور نشر و اشاعت کے علاحدہ علاحدہ ادارے کھلے اور کام ہونے لگا۔ صحافت، مذہب، اخلاق، اصلاحِ معاشرت، سیاست اور دوسرے علوم و فنون پر جس شوق اور کامیابی سے آج تک کام ہو رہا ہے ان سب کی منظم ابتدا سرسید کی علی گڑھ تحریک سے ہوئی۔ وہ سوادِ اعظم جسے ہم علی گڑھ کہتے ہیں جو اپنوں کے لیے ایک عظیم ذمہ داری اور دوسروں کے لیے ایک دعوت اور بشارت ہے، سرسید کا دیا ہوا ہے۔ صرف ایک شخص کا ہیبت اور ہلاکت کے ایسے دور میں جو اس وقت تک مسلمانوں پر ہندوستان میں کبھی نہیں گزرا تھا!

تیسرا بڑا مسئلہ جو سرسید کو درپیش تھا، وہ مذہب اور سائنس میں ایک بامعنی رشتہ کی تلاش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں حالی نے جس رائے کا اظہار کیا ہے، وہ قابلِ غور ہے۔ یعنی سرسید کو سائنس اور مذہب میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت مذہب اور سائنس کا مسئلہ مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان تضاد و افتراق کی شکل میں بھی رونما ہو رہا تھا۔ روحِ عصر سے واقفیت رکھنے میں سرسید اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب و دانش کے فعال، مثبت اور مفید عناصر سے گہرا اثر قبول کیا تھا اور علوم اور سائنس کی ترقی کو اس دور کا سب سے اہم واقعہ قرار دیا۔ بقول اقبالؔ ''وہ دورِ جدید کے پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی'' انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب بین الاقوامی عناصر رکھتی ہے، اور ایک ترقی پذیر تحریک ہونے کی حیثیت سے عالم گیر ہونے کی وہی صلاحیت رکھتی ہے، جو صدیوں پہلے اسلامی تہذیب کو حاصل تھی، اور جس بنا پر اس تہذیب کا اثر و اقتدار ایک وسیع رقبے پر پھیلا، اور متمدن دنیا کے لیے

ایک نمونہ بن گئی تھی۔ سرسید جانتے تھے کہ صلیبی جنگوں میں اسلام و عیسائیت کا ایک زبردست تصادم ہوا تھا اور اس معرکے میں اسلام کی فتح مسلمانوں کے مضبوط عقیدے، علوم و فنون میں ان کی دست گاہ اور مجموعی حیثیت سے یورپ سے زیادہ منظم ترقی یافتہ اور ترقی پذیر معاشرے کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس تصادم سے عرصے تک شکست و ریخت کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور عیسائیت کے اس تصادم نے مثبت حرکی تہذیبی عمل کو جنم دیا۔

مغرب میں سائنس کی ترقی سے جو ذہنی انقلاب آیا اور جس طرح علمی ترقی اور مادّی کامرانی کے دروازے کھلے، سرسید نے ان کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ وہ اپنے ملک میں بھی ایک سائنسی ذہن پیدا کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی قوم میں جامد مذہبی خیالات و توہمات کے خلاف بڑی صبر آزما جدوجہد کی، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سائنس کی ترقی مذہب کی منافی نہ تھی۔ اوہام پرستی اور قدامت پرستی کو مذہب کا دشمن بتایا اور سائنس کو اصلاً ایک ناطرف دار عمل قرار دیا۔ جس کے امکانات لامحدود ہیں اور انسانی معاشرے کی مستقل اور مسلسل ترقی پر منتج ہوتا ہے۔ انھوں نے سائنس کی واضح حدود کی بھی نشان دہی کی، جب انھوں نے کہا کہ سائنس کی دریافت کی ہوئی حقیقتیں اور انکشافات، مسلسل تحقیق و جستجو اور ان کے نتائج کی بنا پر صداقت کی لازمی مگر عارضی شکلیں متصور ہوتی ہیں۔ لیکن انسان اور کائنات کی تفہیم اور تسخیر کے لیے سائنسی طرزِ فکر و عمل ناگزیر ہے۔ مذہب کی بتائی ہوئی صداقت کا سرچشمہ وہ برتر و بلند ہستی ہے جو زمان و مکاں میں جاری و ساری بھی ہے۔ ان پر محیط ہے، اور ان سے ماورئی بھی ہے۔ ابدی صداقت سنت اللہ ہے جو کبھی نہیں بدلتی اسی لیے سائنس کی دی ہوئی جزوی اور عارضی صداقت اس کلی صداقت سے نہ متصادم ہے نہ اس کی نفی کرتی ہے، جسے مذہب پیش کرتا ہے۔ دقّت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے دست و گریباں ہونے کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ خود مذاہب عالم میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کے پیشِ نظر سرسید نے تقابلی مطالعہ کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کوشش کی اس سے ہم سب آشنا ہیں۔ ان امور کے پیش نظر مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے جس کا اظہار حال ہی میں ایک دانش وردوست نے کیا ہے کہ اسلام کے بارے میں سرسید کا رویّہ رومانی و اعتذاری

تھا۔ رومان اور اعتذار ایک حقیقت گریز، مجہول اور منفعل ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ سرسید کا معمولی طالب علم بھی اس سے واقف ہوگا کہ ہماری قوم میں ان سے زیادہ حقیقت شناس، عملیت پسند اور مثبت اندازِ فکر ونظر رکھنے والا دوسرا شخص مشکل سے ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس کام کی اہمیت آج اور بھی زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ مجوزہ سرسید اکیڈمی کے مقاصد متعین کرتے وقت ان دو باتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے۔ ایک یہ کہ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کو اکیڈمی اپنے پروگرام میں جگہ دے، دوسرے یہ کہ جدید علوم کو اردو میں اعلیٰ سطح پر منتقل کرنے کے لیے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا انتظام کرے۔

خواتین وحضرات! اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ علی گڑھ کے ماضی سے متعلق تھا۔ ایسے ماضی سے جس کی اہمیت ومعنویت حال میں پورے طور پر آشکار رہی ہے۔ میں نے اس ماضی کے صرف مثبت پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے اس ماضی کے کچھ منفی پہلو بھی ہوں جن کے بارے میں مجھ سے بہتر معلومات رکھنے والے موجود ہوں تو عجب نہیں۔ یہ میں ان کے لیے چھوڑتا ہوں اور تھوڑی دیر کے لیے علی گڑھ کے حال کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، لیکن ابتدا ہی میں اس کا اعتراف بھی کر لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں حال کے ان پہلوؤں کو زیادہ قابلِ توجہ خیال کرتا ہوں جو معلوم نہیں مثبت ہیں یا منفی، لیکن ہیں ہماری گہری توجہ کے مستحق۔ حال کا ایک رُخ تو یہ ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مستقبل میں اس کو بحیثیت ماضی کے کیا درجہ حاصل ہوگا؟ تیسرے یہ کہ حال کے بدحال یا نیک فال ہونے کے فی الوقت کیا امکانات ہیں؟ اس موضوع پر کہنے کو بہت کچھ ہے بشرطیکہ آپ سننے کی زحمت اُٹھانے سے زیادہ ہمت نہ ہارنے پر آمادہ ہوں۔

آج ایک بڑا سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہندوستان کی آزاد سیکولر جمہوری ریاست میں اس ادارے کا مستقبل بحیثیت ایک مخصوص تہذیب یعنی ہندی مسلمانوں کی تہذیب کے نمائندہ تعلیمی ادارے کے کیا ہوگا۔ میرا جواب یہ ہے کہ مبارک اور حوصلہ افزا ہوگا۔ اس طرح سوچنے کا سبب یہ ہے کہ مسلمان ہوں اور جمہوریت پر یقین رکھتا ہوں، مسلمان ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ پر یقین رکھتا ہوں اور جمہوریت پر یقین رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ

اکثریت کی انسانیت پر بھروسہ کرتا ہوں۔ انسان کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اس کی تہذیب کو برومندی اور برگزیدگی اسی وقت نصیب ہوئی ہے جب وہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف مائل ہوا ہے۔ اعلیٰ سے اسفل کی جانب مراجعت اس کے کمال کی شکل میں کبھی نہیں، لیکن اس کے زوال کی صورت میں ہمیشہ رونما ہوئی ہے۔ جب کبھی اور جس کسی نے اعلیٰ انسانی اقدار سے روگردانی کر کے دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بالآخر خود انھیں آفتوں کا شکار ہوا ہے جن کا ارتکاب اس نے دوسروں کے لیے روا رکھا تھا۔ جبر و قہر ایسا وائرس ہے جو طبقات، طاقت ور اور کمزور کسی میں امتیاز نہیں کرتا۔ جب وہ پھیلتا ہے تو جلد یا بہ دیر کسی نہ کسی شکل میں ہر ایک سے تاوان وصول کرتا ہے۔ وہ ریاست و جماعت جو محض وقتی مصلحتوں، عارضی و نامبارک اتحاد، مفاد یا طاقت و تعدی کو مدنظر رکھتی ہے۔ ایسے سماج کو وجود میں لاتی ہے جو بالآخر اسی حکومت یا جماعت کی رُسوائی و تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ ثبات و دوام صرف ایسی ریاست اور تہذیب کو حاصل ہوتا ہے جو فرد اور معاشرے کی بہترین صفات کو برسرِ کار لانے میں معین ہو اور تازہ کار رکھے۔ ہندستانی ریاست اخلاق اور تہذیب کے جن بلند آدرشوں پر قائم ہے، وہ ہندستانی قوم کی اعلیٰ تمناؤں اور حوصلوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اس لیے ہر ہندستانی کا یہ فرض ہے کہ ان عظیم مقاصد اور اہم مسائل کی ترقی اور تکمیل کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ ہمارا آپ کا یا کسی اور کا ہر وہ عمل جو ان عزائم کی نفی کرتا ہو، ریاست کی جڑیں کاٹتا ہے۔

ہمارا مقصد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں تعلیم، تربیت اور تہذیب کا ایسا مناسب و موثر انتظام کرنا ہے جو ملک میں ایسے لائق اور حوصلہ مند نوجوان پیدا کرنے میں معین ہو، جو اس کی ترقی اور نام وری کا باعث ہوں۔ بالفاظ دیگر وہ اچھے مسلمان اور اچھے ہندستانی ہوں۔ یہ کام جتنا بڑا اور اچھا ہے اتنا ہی زیادہ مشکل، یعنی احساسِ ذمہ داری اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا ہے۔ اس کے لیے اس درس گاہ کے اربابِ اختیار، اساتذہ، اولڈ بوائز اور طلبا کو بڑے انہماک و اتحاد سے کام کرنا ہے۔ اس طرح وہ حکومت، ملک اور ساتھ رہنے بسنے والوں کا مکمل اعتبار اور تعاون حاصل کر سکیں گے۔ اس کامیابی کی شرط یہ ہے کہ ہم میں سے ہر فرد خلوص کے ساتھ اس کا تہیہ کر لے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو کام میں لائے گا۔ اپنے

سے شاکی، دوسرے سے شاکی، زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب سے شاکی، کرنا کچھ نہیں، کوسنا سب کو، کبھی گرجنا، اکثر گڑ گڑانا یہ سب چھوڑنا پڑے گا۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ایسی سوسائٹی جو مسائل سے بری ہو، کہیں اور کبھی بھی وجود میں آئی ہے؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ مختلف اوقات وحالات میں مسائل کی نوعیت تعداد اور مقدار میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

بیسویں صدی کی دنیا اور ہندوستان کے مسائل پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل نظر آتے ہیں، اس لیے ایک نئے عزم اور عظیم جدوجہد کے طلب گار ہیں۔ اس انقلاب آفریں مہم کو کامیابی سے نزدیک اور نزدیک تر کرنے کے لیے ایسے طرزِ فکر وعمل کی ضرورت ہے جو صرف ایک ہمہ جہت و ہمہ گیر انسانی اتحاد و مساوات کی مدد سے حاصل ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قوم اور ملک اپنے داخلی معاملات میں حق پسندی، معدلت ومفاہمت کے اصولوں کو خوشی اور اعتماد کے ساتھ برتنے پر آمادہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آج ہندستانی ریاست چھوٹے پیمانے پر مستقبل کی اس عالمی ریاست کا نقشہ پیش کرسکتی ہے جو دنیا کے اچھے اور بڑے ذہنوں میں اُبھرتی رہتی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے مشکل مسائل کی تفہیم وتعبیر میں عالمی نقطۂ نظر کو اپنانے میں تامّل نہ کرنا چاہیے۔ مشکل اور بڑے مسائل سے نمٹنے کے لیے جتنے ہی محدود اور عارضی اغراض پیشِ نظر رکھے جائیں گے اتنے ہی وہ مسائل مشکل تر اور خطرناک تر بنتے چلے جائیں گے۔ اس عالمی سیاق وسباق میں اگر آپ ہندی مسلمانوں کے اس تہذیبی ادارے کے کردار کو متعین کرنا چاہیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہندوستان کے لیے ہندی مسلمانوں کی تہذیب، تمدن اور خیر سگالی کو جس حد تک علی گڑھ قابلِ قبول اور بابرکت بنانے میں کامیاب ہوگا وہ ایک نمونہ ہوگا۔ باہر کے تمام مسلم ممالک اور مسلمانوں کے لیے اس بات کا کہ وہ دیگر اقوام عالم کے درمیان کس طرح ایک باعزّت مقام حاصل کرکے عالمی انسانی برادری کی تعمیر میں مدد دے سکتے ہیں۔

ان مقاصد کی بجا آوری کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہم یونیورسٹی میں ایسی فضا قائم کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں، جس میں مل جل کر کام کرنے کی ترغیب اور تقویت ملے۔ ہم اس وقت خاصے ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں، جس سے ہمارے قوائے عمل مضمحل ہونے

لگے ہیں۔ اس کے اسباب بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا احساس و اعتراف ہم سب کو ہے۔ اس سلسلے میں موٹی سی ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ آزمائش کے ایسے وقت میں ہم کو اپنے اختلافات پر زور دینے کے بجائے متفقہ فیصلوں پر پہنچنے اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس فتنہ سے خاص طور پر بچنا چاہیے کہ کون امام ہوگا؟ اور کون مقتدی؟۔ ورنہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ ہم میں سے کوئی امام رہے گا نہ مقتدی، بلکہ سب کے سب اپنے اپنے اغراض یا ہم سب کا بُرا چاہنے والوں کا ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت پر غلام ہو جائیں گے۔ یہ کوئی شعر یا مقولہ نہیں تصنیف کر رہا ہوں بلکہ ''ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے'' آپ کے بھی آگے!

میرا خیال ہے کہ اربابِ اختیار، اسٹاف، اولڈ بوائز اور طلبا میں آزاد اور بامقصد تبادلۂ خیال کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کے لیے ہم کو ایک مستقل باضابطہ ادارہ قائم کرنا چاہیے۔ غلط فہمی، مایوسی، بیزاری اور خود غرضی کو دور کرنے اور تازہ دم ہو کر کام کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ متعلقہ اصحاب مناسب ماحول میں، منتخب حیثیت سے، باضابطہ طور پر، خلوص اور عزمِ صمیم کے ساتھ اکٹھا ہوں۔ کمیٹی یا کانفرنس کے طریقوں کی پابندی کرتے ہوئے اعلیٰ سطح پر بحث مباحثہ کی مدد سے متفقہ فیصلوں پر پہنچنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے لیے خاص طور پر اس نوعیت کے ایک نمائندہ ادارے یا سلیکٹ کمیٹی کا قیام مفید اور مناسب ہوگا۔ اس سے ہم کو اپنے مسائل پر آزادی اور اعتماد کی فضا میں صحیح خطوط پر سوچنے اور عمل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح کی کمیٹی ہماری رہنمائی کرنے کے علاوہ ہماری ہمت افزائی کا بھی موجب ہوگی اور وہ خلوص اور حوصلہ پیدا کرنے میں معاون ہوگی جو اس ادارے کے لیے اس وقت ازبس ضروری ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ فرد یا جماعت اپنے مقاصد میں اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب وہ اپنے روزمرہ کے فرائض کو دلچسپی اور ایمان داری کے ساتھ، اعلیٰ کارکردگی کے مطابق انجام دینے کی اہلیت پیدا کر لیتی ہے۔ اس اہلیت کے پیدا کرنے کے لیے مسلسل محاسبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد اور اقوام کی زندگی میں انقلاب اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کے قول اور فعل میں مطابقت ہوتی ہے جس کا عام فہم تصور یہ ہے کہ ہم ان عادتوں کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں جو

ہماری ترقی کے راستہ میں مزاحم ہوں اور ان کی جگہ بہتر عادات و خصائل کو اپنانے کی کوشش کریں۔ صحت مند اور تعمیری انقلاب کی ایک پہچان یہ ہے کہ مہملات و مزخرفات سے رشتہ توڑا جائے اور معظمات سے جوڑا جائے۔ اعلیٰ ذہنی انقلاب، بہتر تبدیلیوں کے امکانات کو روشن کرنے سے عبارت ہے مگر وہ بے ثمر رہتا ہے۔ اگر وہ خارجی احوال میں بہتر تبدیلیوں کی شکل میں رونما نہیں ہوتا، غالباً آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ ہمارے آج کے حالات جو تصویر پیش کرتے ہیں، وہ کسی بڑے ذہنی انقلاب کی نشان دہی نہیں کرتے۔ آفاقی ذہن صرف ادعا سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا وجود آفاق میں سب سے اہم مخلوق، آدمی اور اس کے احوال کی درستی اور عمدگی سے ثابت ہوتا ہے۔ یونیورسٹی اعلیٰ اقدار کا سر چشمہ ہوتی ہے۔ جس کے اساتذہ اور طلبا کے اعلیٰ فکر و عمل سے تہذیب اور تمدن کی آبیاری ہوتی ہے۔ ہماری تہذیبی زندگی کی بہار میں ہمارے آپ ہی کے خونِ جگر کی نمود ہوگی۔ آپ کی علمی دسترس، آپ کے سوچنے کا انداز، آپ کے رہنے سہنے اور چال ڈھال اور میل جول کے ڈھنگ، ان سب کا ہماری تہذیبی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان میں سے کسی میں ذرا بھی لغزش یا فروگذاشت دوررس اور اندیشہ ناک نتائج کا باعث ہوگی۔ خوب یاد رکھیے ہماری آپ کی قوم ہماری شاعری کے روایتی عاشق کا دل نہیں رکھتی جو محبوب کی لغزش پا پر سر دُھننے کی قائل ہو۔

آپ اساتذہ سے بہتر یہ بات کون جانتا ہے کہ معلّمی جتنا بڑا شرف ہے اتنی ہی بڑی آزمائش بھی ہے۔ ہر عہد خصوصاً جدید عہد میں جس طرح علوم کی مسلسل توسیع و ترقی عمل میں آرہی ہے، اس کے پیشِ نظر معلّم کے فرائض میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اس کی ذمہ داری کے حدود وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑے عالم کو ہر لمحے اور ہر قدم پر اس کا احساس ہوتا ہے اور اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ نت نئے چیلنجوں کا مقابلہ درپیش رہتا ہے اور اسے اپنی ساری صلاحیتوں کو بر سر کار لانے اور امتحان دیتے رہنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ معلّم کی تقدیر لا متناہی آزمائشوں سے گزرتے رہنا ہے، اور اس کا شرف یہ ہے کہ وہ اپنی خدمت اور ریاضت سے نوخیز نسلوں کو تعلیم و تہذیب نفس کے جملہ مدارج سے بخیر و خوبی گزرنے میں مدد دے، جوان کو نہ صرف کاروانِ علم و فن سے ہم عناں رکھنے میں معین ہو، بلکہ اس کی رہنمائی کرنے

کے قابل بنائے۔ طالب علموں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح کا دوسرا مفہوم خود معلّم کی تعلیم وتربیت اور اصلاح ہے۔ عام طور پر معلّم اور طالب علم کے رشتے کو چھوٹے اور بڑے کے رشتے سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن دراصل یہ رشتہ باہمی عزّت، رفاقت ومساوات کا رشتہ ہے۔ حفظِ مراتب کا لحاظ چھوٹے اور بڑے ہی کے درمیان نہیں رکھا جاتا، بلکہ ان ساتھیوں کے درمیان بھی قائم ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے مساوی سطح پر ملتے ہیں۔ یونیورسٹی میں نسلوں کے درمیان خلیج (Generation Gap) کو تنگ سے تنگ تر کرتے ہیں جو وسیلہ ہوتا ہے، بالآخر اس کو پاٹ دینے کا۔ یونیورسٹی میں اس رشتہ کو استواری اسی وقت حاصل ہوگی جب ہم ہر لمحہ ہر جگہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہیں گے۔ یونیورسٹی کے حدود میں خوب سے خوب تر فضا قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی فیکلٹیوں اور شعبوں میں، اقامت گاہوں میں، کلبوں میں، کھیل کے میدانوں، باغوں اور شاہراہوں میں، گھروں میں، دفتروں میں زیادہ دل سوزی، تندہی اور پابندی سے کام کریں۔ ہماری تہذیبی ریاست میں سب سے بڑا درجہ اس کا ہونا چاہیے جو متعلقہ فرائض اور ذمہ داریوں کی بجا آوری میں سب سے زیادہ وقت اور محنت صرف کرے، اور جان کھپائے۔ سرسید کے علی گڑھ میں سب سے بڑا امتیاز واعزاز وہ ہے جو بے غیرتی سے نہیں بلکہ خدمت اور ریاضت سے حاصل کیا جائے۔

ہمارے لیے اردو کا مسئلہ جتنا بنیادی ہے، اتنا ہی مشکل اس کا بنیادی حل تلاش کرنا ہے۔ انفرادی اور جماعتی دونوں اعتبار سے ہم برابر اس کے لیے کوشاں رہے ہیں، اور رہیں گے کہ اس کے مستقبل کو کس مستحکم بنیاد پر قائم کریں یا کرسکتے ہیں۔ ہمارے بہترین ذہنوں نے اس مسئلے کے تجزیے اور تفہیم میں اپنی اعلیٰ صلاحیتیں صرف کی ہیں اور مختلف تجاویز سامنے آئی ہیں۔ ہم نے جماعتی سطح پر بھی مختلف تحریکیں بروئے کار لانے اور پروگرام بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب تک کوئی ایسا راستہ نہیں دریافت کرسکے ہیں جو ہماری رہنمائی منزلِ مقصود تک کرسکے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن حالات میں اچانک اور یک لخت تبدیلیاں عمل میں آئیں، ان کا نہ ہم کو اندازہ تھا، نہ ہم ان پر قابو پاسکے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برق وبلا مسلسل اردو کے تعاقب میں ہوں، لیکن اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ اردو اور اردو والے اتنے سخت جان اور سخت کوش ہیں کہ جب کبھی اور

جہاں کہیں طوفانِ آمد آمد، آمدِ فصل بہار ہوتا ہے یہ بحرآشیاں ایک کفِ خس لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ انسانیت کا ارتقا یا اردو کی بقا دونوں کا مستقبل تخلیق و تعمیر کے اسی ایک کفِ خس بحرِ آشیاں میں مضمر ہے۔ انسانیت کا ارتقا اسی دم ختم ہو جائے گا جس دم آدمی نے ایٹم یا ہائیڈروجن یا کسی جہنمی بم سے ہار مان لی۔ اسی طرح اردو کی پوری تعمیر منہدم ہو جائے گی جس لمحہ اردو والوں نے تہذیب کشی کی پالیسی کے آگے سرخم کر دیا۔ ہندوستان میں اردو اور تہذیب ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ایک کا اقرار دوسرے سے فرار ایک دوسرے کی نفی کرتا ہے۔

علی گڑھ کی نسبت سے اردو کے مستقبل کے بارے میں سوچیے تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ہمارا موجودہ لسانی رویّہ صحیح ہے۔ یعنی ہم ایک نامعلوم مدت تک، اردو، انگریزی اور ہندی میں جو تناسب و توازن برقرار رکھنے کی کوشش کررہے ہیں، وہ نہ صرف ایک قابل عمل پروگرام کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ مستقبل کے ان امکانات کا بھی لحاظ رکھتی ہے جو عالمی تہذیب میں ہندوستان کی مختلف اللسان اور مختلف الاعوان تہذیب کو ایک فعال حرکی رول دلانے میں غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ اکثر یہ بات بھی ذہن میں آتی رہتی ہے کہ مستقبل میں ہندوستان کی قومی زبان ہندی یا ملک کی علاقائی زبانوں میں سے کوئی ایک یہ درجہ حاصل کرنے کا امکان نہیں رکھتی کہ وہ بیک وقت وسیلہ بن جائے۔ ہندوستان کے علوم وفنون کو باہر کی دنیا سے روشناس کرانے کا اور باہر کے علوم وفنون کو ہندوستان سے آشنا کرانے کا آج کی دنیا میں کوئی ملک خاص طور پر ہندوستان جیسا ملک، چھوت چھات کی پالیسی نہ اپنانا چاہے نہ اپنا سکتا ہے۔ دم بہ دم دگرگوں ہونے والے حالات و حوادث کے کارواں میں عزم و اعتقاد کے ساتھ شریک نہ ہونے سے پس ماندہ یا درماندۂ راہ رہ جانے کا اندیشہ ہی نہیں ہے، بلکہ کچلے جانے کا یقین رکھنا چاہیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی یلغار سے دنیا سمٹ کر ایک شہر بن گئی ہے۔ ہمارے آپ کے علی گڑھ سے بھی چھوٹا شہر سوچتا ہوں زمین اور زندگی کے سمٹنے کی یہی رفتار رہی تو جس بستی یا بسنے والوں کا نقشہ سامنے آئے گا اس کی 'اردو' کیا ہوگی؟ ایسا تو نہیں کہ میں نے یہ بحث قبل از وقت چھیڑ دی ہو اور مستقبل شناسوں کے حدود میں مداخلت بے جا کا مرتکب ہوا ہوں! کہنا دراصل یہ ہے کہ مستقبل کے ہندوستان میں انگریزی زبان کی اہمیت کم نہ ہوگی، بڑھتی رہے تو عجب نہیں۔ کیوں کہ وہ

ہمارے لیے عالمی رابطہ کی زبان ہوگی۔ علم، ادب، زندگی، تہذیب، سائنس، ٹیکنالوجی، تجارت، مواصلات سب کے اعتبار سے اور ہر ایک سطح پر۔ اس بنا پر میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں اس لسانی گروپ یا جماعت کی ذہنی اور مادی ترقی کے امکانات بہتر ہوں گے جو اپنے نظام تعلیم میں انگریزی کو نسبتاً زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کرے گی۔ مستقبل کی تہذیب، صنعتی سائنسی تہذیب ہوگی، اور وہ معاشرہ جو اسے اپنانے میں تامل کرے گا وہ تاریخ اور ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔ چاہتا ہوں کہ علی گڑھ اور اردو کے دوست انگریزی کی اہمیت کا لحاظ رکھیں۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ عشق اور عقل کی جس کشاکش پیہم سے آپ دوچار ہیں اس میں میں بھی گرفتار ہوں۔ اس سے نجات پائیں تو کیوں کر؟ اس طرح کے لیکن اس سے زیادہ دلچسپ موقع پر غالب نے کہا تھا کہ:

''گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو!''

اس کا صحیح جواب علی گڑھ کی تاریخ اور روایات کے مطالعہ سے حاصل ہوگا، جو میرے نزدیک عشق اور عقل کے درمیان مسلسل اور مستقل توازن قائم کرنے اور رکھنے کی کوششوں سے عبارت ہے۔ ان ہی کوششوں کی بدولت ہم نے بدلے ہوئے حالات میں سخت سے سخت مشکلات پر قابو پایا ہے اور بڑے سے بڑے معرکے سر کیے ہیں، اور کبھی شکست بھی کھائی ہے تو عزت قائم رکھی ہے۔ لیکن عشق اور عقل کے درمیان ترازو کی 'ڈنڈی کو سیدھا' رکھنے میں علی گڑھ اسی وقت کامیاب ہوا ہے جب اس کے دیوانوں اور فرزانوں نے اپنی صفوں کو سیدھا اور استوار رکھا ہے، اور کامل اتحاد کا ثبوت دیا ہے۔ علی گڑھ کے لیے یہ گھڑی محشر کی ہے اور ہم سب عرصۂ محشر میں ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے لیے وقت کی پکار یہ ہے:

پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

علی گڑھ کی جواب دہی میری آپ کی جواب دہی ہے۔ آیئے مل کر بیٹھیں، مل کر سوچیں، مل کر فیصلہ کریں اور مل کر اس فیصلے پر قائم رہیں اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ نتیجہ اور انجام کو خدا نے محکمہ منتقلہ (Transferred Subject) نہیں بلکہ مستقلہ یعنی Imperial Subject رکھا ہے جہاں ہمارا آپ کا دخل دور دور نہیں!

ہمارے ملک اور ہماری یونیورسٹی کی تاریخ میں آزادی ایک ایسے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے جس نے قومی زندگی کے کارواں کو ایک نئی راہ سے آشنا کیا۔ وہ راہ جمہوریت، مساوات اور اتفاق واتحاد کی راہ تھی جو بنی بنائی پہلے سے موجود نہ تھی جس پر یہ کارواں سرگرم سفر ہو جاتا۔ یہ جتنی خوب صورت اور عظیم منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کی بشارت دیتی ہے، اتنی ہی دشوار اور پُرخطر مراحل سے گزرنے کی دعوت اور چیلنج بھی دیتی ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ قافلہ اور سالار قافلہ طرح طرح کی موانع ومصائب کے باوجود کسی طرح کی پسپائی یا پس ماندگی کا خیال دل میں لائے بغیر سوئے منزل رواں دواں ہیں۔ ہم آپ بھولے نہ ہوں گے کہ آزادی کے وقت بعض ناگزیر اور تکلیف دہ اسباب کی بنا پر ہماری اس درس گاہ کا وجود شدید خطرے سے دوچار تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس کو ان اسباب کے مہلک نتائج سے بچانے کا تھا جو اسے کسی آن اپنی لپیٹ میں لے سکتے تھے۔ اس وقت جن شرفائے ملک اور حکومت نے صورت حال کو سنبھالنے میں بے لاگ سہارا دیا اور دست گیری فرمائی ان کے احترام میں ہماری گردنیں ہمیشہ جھکی رہیں گی، اور ان کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ناشکر گزاری ہوگی اگر میں اس وقت ان بلند و برگزیدہ شخصیتوں کے نام نامی نہ لوں جن کی انسانیت، علم دوستی اور عالی منشی کے طفیل ہمارا ادارہ نہ صرف محفوظ رہا، بلکہ آج ترقی اور نیک نامی کے اعلیٰ مدارج طے کرتا نظر آرہا ہے۔ مہاتما جی، پنڈت جواہر لال نہرو، نواب محمد اسمٰعیل خاں، شری راج گوپال اچاریہ، راجندر پرشاد جی، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر رادھا کرشنن، یہ سب ہمیں احترام اور شکر گزاری کے ساتھ یاد ہیں۔ ہندوستان اور اس ادارے کو ہمدم وہم عناں رکھنے اور مربوط ومستحکم کرنے میں ان کی بے مثل قیادت اور خدمت اس امر کا سب سے واضح اعلان اور سب سے بڑی شہادت ہے کہ ہماری سیکولر جمہوریہ کا بنیادی پتھر پکی اور سچی طرح رکھا گیا ہے۔ آج کے علی گڑھ کا بڑا کام یہ ہوگا کہ ان بزرگانِ قوم اور ملک کے بڑے اور نیک کام کو اعتماد، انکسار اور جاں فشانی کے ساتھ آگے بڑھائے۔

آج ہم کو جن مسائل کا سامنا ہے ان کے مدنظر ان بزرگوں کے خیالات اور خدمات کا اعتراف خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آپ جانتے ہیں اس وقت حکومت اور علی گڑھ کے درمیان

نئے رول کے بارے میں گفت وشنید جاری ہے۔ جس کا مقصد کسی ایسے متفقہ جمہوری فیصلے پر پہنچنا ہے جو سب کو اطمینان اور خوشی کا باعث ہو۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ اس درس گاہ کے تاریخی، اقلیتی اور اقامتی کردار کو محفوظ رکھا اور مضبوط بنایا جائے اور اسے واضح شکل دی جائے۔ بظاہر حکومت کا منشا بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئے بل میں ایسی دفعات شامل کی جائیں جو ہمارے متذکرہ مقاصد کے حصول میں معین ہوں۔ اگر ایسا ہے تو حکومت اور وابستگانِ علی گڑھ کے درمیان کوئی اصولی فرق نہیں پایا جاتا۔ صرف ذرائع اور وسائل کے بارے میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے، اور وہ اختلاف رائے موجود بھی ہے۔ ایک بدیہی بات کو دُہرانے کے جرم کا مرتکب ہوتے ہوئے اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمیں مقصد اور وسیلے میں فرق کرنا چاہیے۔ اگر اپنے مقصد کی صحت وصداقت پر یقین ہے اور ہم اسے حاصل کرنے کا پکا عزم رکھتے ہیں تو یہ بات نہایت درجہ اہم ہے کہ ہم ذرائع کے انتخاب میں احتیاط، سلامت روی اور دانش مندی سے کام لیں۔ اچھے اور بڑے مقاصد کے حصول کے لیے موثر لیکن معقول ذرائع کا انتخاب ایک لازمی شرط ہے۔ اس لیے حکومت اور علی گڑھ دونوں سے یکساں درخواست یہ ہے کہ وہ ان ذرائع سے ہرگز کام نہ لیں جو ڈرانے، دھمکانے یا مغلوب کرنے کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں اور ہمیشہ شک، شبہ، بدگمانی اور بدمزگی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ ایسی فضا میں ہر وہ چیز اُگتی، پھیلتی اور پھولتی ہے جو احتیاط، میانہ روی اور عقل و امن کے خلاف ہوتی ہے۔ اپنے مطالبات وضع کرتے وقت اور ان کو منوانے کے لیے سوجھ بوجھ، معقولیت اور شرافت کے مسلمہ معیاروں کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ مہذب افراد اور سوسائٹی کا ہمیشہ یہی طریقۂ کار رہا ہے۔ حکومت اور ملک کی رائے عامہ کو ہم خیال بنانے کے لیے ہم جس جدوجہد میں مصروف ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ ہم منفی اور مضر طریقوں کو اپنانے سے بچیں۔ علی گڑھ، ملک میں ایک مہذب، شائستہ، تعلیم یافتہ اور علم دوست سماج کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے لازم آتا ہے کہ وہ حق پسندی اور اصول پسندی پر قائم رہے۔ اعلیٰ تہذیبی مفادات کی حفاظت کرنا ہماری ایک ایسی ذمہ داری ہے جسے ہم ہر حال میں عزیز رکھیں گے۔ ہم کو اس کا یقین ہے کہ ہمارا ملک اس سے ہمیشہ ممتاز و مفتخر رہے گا۔

میں اس دلیل میں کوئی وزن نہیں پاتا جو اکثر دُہرائی جاتی رہتی ہے۔ یعنی چوں کہ اس ادارے کے بیش تر اخراجات کو پورا کرنے کے لیے حکومت روپے دیتی ہے۔ اس لیے یہ تقریباً سرکاری تحول میں ہے، اس لیے اس کی پالیسی کے تعین کا بھی حق سرکار کو مل چکا ہے۔ یہ جتنا غلط مفروضہ ہے۔ اتنا ہی ناروا مطالبہ بھی ہے۔ اس کے پیچھے وہ قوت کام کر رہی ہے جو حکومت کو دولت واقتدار سے حاصل ہے یا ہوتی ہے۔ قومی حکومت کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس پالیسی کو اپنانے کی طرف مائل ہو جو اکثر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک پس ماندہ اور مفلوک الحال حکومتوں کو امداد دیتے وقت اختیار کرتے ہیں۔ یعنی معاشی امداد دے کر سیاسی دباؤ ڈالنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ باعزّت اور باغیرت ملک کی حکومتوں کو ان مکروہ عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بیرونی امداد ایک قرض ہے جسے امداد پانے والا ملک بالآخر واپس کر دیتا ہے۔ حکومت سے یونیورسٹی کو جو امداد ملتی ہے، وہ قرض نہیں گرانٹ ہے۔ جس کو یونیورسٹی وصول کرتی ہے، واپس نہیں کرتی۔ مجھے اس منطق سے بھی اتفاق نہیں، اس لیے کہ حکومت سے ہمیں جو امداد ملتی ہے۔ اس کو ہم جس طرح اور جس شکل میں واپس کرتے ہیں۔ اس سے قومی زندگی کا خزانہ مالا مال ہوتا ہے۔ حکومت سے یونیورسٹی کو جو رقم موصول ہوتی ہے، وہ ملک کے انسانی سرمایہ میں اضافہ کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کی تہذیب یافتہ افرادی طاقت (Civilized Man Power) ہے اور یونیورسٹی ہی وہ ادارہ ہے جو اس طاقت کے صحیح اور موثر استعمال کی ضمانت دیتی ہے۔ یونیورسٹیاں تعلیم وتہذیب کا کاروبار کرتی ہے۔ روپے کا بیوپار نہیں کرتیں، اس لیے مہاجن کا سود ادا کرنے پر مجبور نہیں کی جاسکتیں۔ سب سے بُرا سود یا سودا وہ ہے جو حکومتیں یونیورسٹیوں پر اپنا حکم چلانے اور اقتدار قائم کرنے کی شکل میں وصول کرتی ہیں۔ یونیورسٹیاں مہاجن کو سود نہیں ادا کرتیں۔ اس کی تہذیب واصلاح کو پیشِ نظر رکھتی ہیں۔ اگر وہ مہاجن سے محاسبہ بھی کرنے لگیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

یہ درس گاہ ہندی مسلمانوں کی تہذیبی وتعلیمی آرزوؤں کا مرکز ہے۔ اس لیے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کے انتظامی امور سے متعلق جو تجاویز زیرِ غور عمل آئیں، ان کے بارے

میں ان کے مستند اور نمائندہ اشخاص اور جماعتوں سے مشورہ کیا جائے۔ جمہوری نظام میں مستند نمائندگی کا حق ان ہی کو حاصل ہونا چاہیے جو متعلقہ جماعت کا اعتبار رکھتے ہوں۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب قوم کی نمائندگی کا فریضہ ادا کرنے کے لیے حکومت اپنی مصالح اور منشا کے مدّ نظر ایسے لوگوں کو منتخب اور مقرر کرتی تھی جو قوم کے دکھ درد کو نہیں حکومت کے چشم و آبرو کو دیکھتے تھے۔ ہندستانی جمہوریت میں نمائندگی کا حق قربِ سلطانی سے نہیں قوم کی چاکری سے حاصل ہونا چاہیے۔ جمہوریت میں قوم کا سردار وہ ہوتا ہے جو قوم کا سب سے بڑا خادم ہو۔ اس معیار کو سامنے رکھیں تو صورت حال زیادہ امید افزا نہیں معلوم ہوتی۔ وہ لوگ جو محض حکومت کی مصلحت یا تائید سے منظر عام پر آئیں یا لائے جائیں، وہ قوم کی ضرورتوں اور امنگوں کو بھی پورا کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے ہیں اور رہیں گے۔ قیادت وہ نہیں جو باہر سے مسلط کی جائے بلکہ وہ ہے جو قوم کے اندر سے ابھرے اور اس کی رہبری و وکالت اور حفاظت کر سکے۔ کسی جماعت سے تاوان وصول کرنے کا اس سے زیادہ نامبارک طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی قیادت کو تسلیم کرنے پر مجبور کی جائے جو اپنوں کی خدمت کرنے کے بجائے دوسروں کی غلامی کو ترجیح دے۔ حکومت اور قوم دونوں کا نہایت اہم فرض ہے کہ وہ اس بارے میں موجودہ حالات کا جائزہ لے کر صورت حال کو بہتر بنانے کی فکر کریں۔ ضرورت اس کی ہے کہ حکومت قصیدہ خوانوں، سودا کرنے والوں اور موقع پرستوں کو اپنے سے دور رکھے اور قوم کے بے لوث، دانش مند، نڈر اور خیر مَنش افراد کی نمائندہ حیثیت کا احترام کرے۔ جان بوجھ کر غلط گھوڑے پر بازی لگانا یوں بھی حماقت ہے، لیکن سیاست کے میدان میں پہنچ کر یہ بے ایمانی کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ حکومت بعض تجاویز کو مناسب سمجھتے ہوئے کچھ ٹکنیکل موانع یا اکثریت کے رجحان یا رائے سے خائف ہو کر ان کو عمل میں لانے سے قاصر رہتی ہے۔ آئین سے پیدا ہونے والی دشواریاں ہمیشہ درپیش ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ دشواریاں دور بھی کی جایا کرتی ہیں اس لیے کہ قانون جامد ہوتا ہے۔ دشواریاں جان دار ہوتی ہیں یعنی حرکت میں ہوتی ہے اور حرکت میں لانے والی بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ حکومت نے ضرورت کے پیشِ نظر، آئین ہی کے کسی پہلو سے کام لے کر ٹکنیکل موانع کو دور

کردیا ہے۔ یہ موانع ایسے نہ تھے جہاں اختلاف رائے نہ پایا جاتا ہو، لیکن چوں کہ حکومت کو ان تجاویز کی صحت پر اعتماد تھا، اس لیے ملک کو اس سے باخبر کیا اور رائے عامہ کی تائید حاصل کرلی۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندستانی مسلمان علی گڑھ کے بارے میں حکومت سے اس رویّہ کو کام میں لانے کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے جو اس نے دوسرے اہم قومی مسائل کے حل کرنے میں اختیار کیے یا کرتی ہے۔ آئین یا رائے عامہ کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اگر یہ دونوں اعلیٰ تہذیبی امور اور اعلیٰ اقدار کے تحفظ و تعمیل سے قاصرہ رہتے ہوں تو حکومت پر ان کو بدلنے یا اعتدال پر لانے کی ذمہ داری یقیناً عائد ہوتی ہے۔ جمہوریت میں اکثریت رکھنے والی پارٹی یا پارٹیاں حکومت بناتی ہیں، لیکن جب حکومت بن جاتی ہے تو اسے قومی حکومت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور اس پر اکثریت اور اقلیت دونوں کا حق ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور حکومت صرف پارٹی کی حکومت ہوتی تو ملک کے شہریوں کے لیے ایک بڑا اخلاقی مسئلہ پیدا ہوجاتا۔ یعنی یہ کہ وہ جو برسراقتدار پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے، وہ اس کی حکومت کے احکام کے کیوں پابند ہوں۔ چنانچہ ہم کو اپنی حکومت سے یہ شکایت ہے کہ وہ ہمارے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہوئے ہماری مدد کرنے میں اس سعیٔ بلیغ سے اغماض کرتی ہے جو وہ دوسرے معاملات میں روا رکھتی ہے۔ یہ بات اس لیے اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم نہ تہذیب کے اعتبار سے نہ تعداد کے اعتبار سے نہ ملک کا خیرخواہ ہونے کے اعتبار سے اتنے حقیر، فقیر اور پُرتقصیر ہیں کہ ہماری سنی اَن سنی ایک کردی جائے۔

علی گڑھ کے ماضی اور حال کے شب و روز کو سامنے رکھ کر اس کے مستقبل کی دھوپ چھاؤں کے بارے میں سوچتا ہوں تو موجودہ نم ناک، کہر آلود اور سونی فضا تحلیل ہوتی دکھائی دیتی ہے اور دور اُفق پر صبح نو کی روشنی پھوٹتی، پھیلتی معلوم ہوتی ہے۔ جسے میں نئے ہندوستان کے لیے ایک نئی بشارت سمجھتا ہوں نئے ہندوستان کی عمارت کی بنیاد جمہوریت اور انصاف پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے اس میں ہندوستان کے ہر شہری کے لیے جگہ ہوگی۔ جمہوریت میں صدر و پائین کا امتیاز نہیں ہوتا۔ خواجگی کی گنجائش یوں نہیں ہوتی کہ ختمِ خواجگاں ہو چکا ہوتا ہے۔ جمہوریت کے کارواں کی محنت، محبت اور مساوات اس کا مقصد، اس کی متاع اور اس کی منزل ہوتی ہے۔ اس

طور پر مستقبل کی تعمیر میں ہندستانی مسلمانوں کا جو حصہ ہوگا اور ان کی اہلیت و خدمت سے ملک کو سیراب و شاداب کرنے میں جو مدد ملے گی، اس میں علی گڑھ کو مرکزی و محوری کردار ادا کرنا ہوگا۔ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات و تصورات سے خود مسلمانوں اور ملک کو سربلند کرنے اور رکھنے کے لیے علی گڑھ کو عبادت سے زیادہ عبدیت کے نمونے پیش کرنے ہوں گے۔ آپ اساتذہ اور طلبا کو اپنی اس عظیم ذمہ داری کا احساس اور افتخار ہونا چاہیے۔ اس کی بڑی آرزو ہے کہ آپ کی گفتار اور کردار سے ان اعلیٰ اسلامی عالمی روایات کی تائید و تصدیق ہو جو حوادث کے طوفان اور طلاطم میں زندگی کی کشتی کو صحیح اور سیدھے راستے پر چلاتی اور رکھتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اور خوش ہوتا ہوں کہ اس کام میں آپ کو قیمت وصول کرنے کے بجائے قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اس خدمت یا کارنامے کو بجالانے میں آپ کو اس منزل اور منزلت کی آرزو اور یافت یا نایافت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست''! اس وقت میرا دل جن جذبات سے لبریز ہے ان کے اظہار کے لیے امریکہ کے نوجوان اور جواں مرگ صدر جون۔ ایف۔ کینڈی کے الفاظ کا سہارا لیتا ہوں جو انھوں نے اپنی صدارت کے آغاز کے وقت امریکی قوم سے کہے تھے۔ وہ اس وقت ذرا بدلے ہوئے الفاظ میں نہایت امید اور آرزو کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ آپ یہ دریافت نہ کیجیے کہ علی گڑھ آپ کے لیے کیا کرسکتا ہے۔ آپ اپنے سے یہ دریافت کیجیے کہ آپ خود علی گڑھ کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔

تقریر کا مقررہ وقت ختم ہو چکا ہے۔ سفینہ کنارے آلگا ہے۔ سفر طویل اور صبر آزما تھا۔ معلوم نہیں سفینہ کا ناخدا کون تھا، اور مسافر کون۔ لیکن اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو کسی کے ستم و جور کا شکوہ نہیں۔ خدا دونوں کو اجر نیک دے، لیکن ایسی آزمائش میں پھر کبھی مبتلا نہ کرے۔ چاہتا ہوں کہ اس کا اختتام سرسید کی اس تقریر کے اقتباس سے کروں جو انھوں نے مدرسۃ العلوم کے قیام کے ایک سال بعد علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد، عمائدین اور 'اہالیان' شہر علی گڑھ کی طرف سے دیے گئے ایڈرس کے جواب میں کی۔ انھوں نے فرمایا:

''......... میں نے یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت

درست ہو، دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق
تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی،
جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں
دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب
کبھی کھیل کود، عیش و آرام دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب
صورت شخص کو دیکھا، ہم کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت
رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہوسکا ہر موقع پر
میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اوّل یہی تدبیر سوجھی
کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جاوے
جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے۔''

خواتین و حضرات! ہم میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے غالبؔ کے اس شعر کو کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں نہ سنا ہو۔

بیا ورید گر ایں جابود زباں دانے
غریبِ شہرِ سخن ہائے گفتنی دارد!

چاہتا ہوں کہ آج آپ اپنے اپنے گھروں کو جائیں تو سرسید کی تقریر کے اس اقتباس کو اس شعر کے ساتھ ذہن میں گردش دیتے جائیں۔ (خدا حافظ)

(کتابچہ، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ 1970)

●●●

اردو رسم الخط

خطبۂ افتتاحیہ اردو رسم الخط سمینار

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

19/20/دسمبر 1970

اردو خوش نویسی کے بہت سے اقسام ہیں مثلاً کوفی، نسخ، نستعلیق، ریحان، شفیعہ، ثلث، طغرا وغیرہ۔ معلوم نہیں اس کے کون کون اور کیسے کیسے نمونے یا نمائندے اس وقت یہاں موجود ہیں۔ داعیان مذاکرہ کی نظر انتخاب کا معترف ہوں کہ انھوں نے اردو رسم الخط کے ترک یا قبول کی وکالت کے لیے مجھ جیسے خطِ شکست یا خط غبار کو منتخب فرمایا۔ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو۔

ایک بات جو آخر میں کہنے کی تھی وہ پہلے ہی کہہ دینا مناسب خیال کرتا ہوں، اس لیے کہ گفتگو کے دوران یا بحران میں وہی بات کہنے سے رہ جاتی ہے جو کہی جانی چاہیے تھی۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ جو نہیں کہنا چاہیے تھا وہ کہہ ڈالا ہے۔ اس طرح کے سانحوں کا ذکر محض احتیاط کے خیال سے کر دیا ہے ورنہ اب تک نیت و حواس دونوں بخیر ہیں۔ اس لیے امید ہے آخر میں وہی عرض کروں گا جن سے آپ آسانی سے اختلاف یا انحراف نہ کر سکیں گے۔ گو وہ کوئی بدیہی بات نہ ہو تو عجب نہیں۔

بہت دن ہوئے غالباً کسی مغربی دانش مند نے کہا تھا کہ گھوڑے پر سوار کوئی دریا پار کر رہے ہو تو منجدھار میں کبھی راہوار نہ بدلنا۔ اس مشورہ یا تنبیہ کے مطابق جس سیاسی دھارے میں آج ہم آپ، اردو سماج، اردو زبان و ادب اور رسم الخط رواں دواں یا کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔ اس میں راہوار بدلنے کا سوال ہی نہیں بلکہ اس پر خوب جم کر بیٹھنا چاہیے۔

---

[1] خطبۂ افتتاحیہ اردو رسم الخط سمینار، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

یہاں تک کہ سفینہ کنارے پر آ لگے۔ پھر ہم سب کو اختیار ہوگا کہ ناخدا کے ستم و جور کا ذکر یا خدا کا شکر ادا کریں۔

اردو رسم الخط کی طرف سے میرا رویہ کبھی بے تکلفی کا نہیں رہا ہے۔ جن عزیزوں اور دوستوں کا رہا ہے یا اب ہے ان سے جواب طلبی کا نہیں ہے، اپنی جواب دہی کا ہے۔ اس میں کسر نفسی کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا تحفظ جسم و جان کو۔ بوڑھے جسمانی ہی نہیں ذہنی اعتبار سے بھی لچکنے میں احتیاط کرتے ہیں۔ کبھی اپنی تندرستی، اکثر اپنی آبرو کے خیال سے بڑھاپے کے ساتھ پندار بھی بڑھتا رہتا ہے۔ طرح طرح کا پندار، ان کی بھی دل جوئی مدنظر ہوتی ہے۔ بایں ہمہ یونیورسٹی میں تقریباً تمام عمر گزارنے کے بعد اور آپ دوستوں کو قریب پا کر کچھ تقویت بھی محسوس کرتا ہوں۔ چنانچہ شامتِ اعمال کی طرف سے تھوڑی دیر کے لیے بے فکر ہو کر عرض کروں گا کہ رسم الخط کی تبدیلی چاہنے والے احباب ملک کے لسانی حقائق اور لسانی عصبیت کے درمیان جو فرق ہے، اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوئے۔ ان کے مقاصد، نقطۂ نظر اور ان کی وکالت میں ایک طرح کا ادعائی رنگ جھلکتا ہے۔ صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ لسانی عصبیت اور لسانی حقیقت دونوں کو نظر میں رکھا جائے۔ لسانی حقائق زبان کے فطری عمل ارتقا سے متعلق ہوتے ہیں اور زبان و ادب کے ماہرین کی مسلسل توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف لسانی عصبیت کے عوامل ان کی سطح اور سمت اکثر و بیش تر سیاسی ہوتے ہیں۔ ان کا پلیٹ فارم جدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب سے بھی پورے طور پر باخبر اور چوکنا رہنا چاہیے۔

جس طرح معاشی و سیاسی عصبیت نے قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی درجہ (امپیریلزم) کا رنگ اختیار کیا، اسی طرح آج کل نو آزاد ملکوں میں خاص طور پر، مختلف لسانی عصبیتیں ملکی درجہ پر ایک نئی امپیریلزم کو ظہور میں لا رہی ہیں۔ پرانی امپیریلزم، کمزور اور چھوٹی قوموں اور ملکوں کو زیر کرنے اور رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربوں کو کام میں لاتی تھی۔ نئی امپیریلزم بھی اس نوع کے حربے کام میں لاتی ہے۔ ایک مختلف اللسان ملک میں قومی زبان کے انتخاب کا اصول بالعموم یہ ہوتا ہے کہ باشندوں کی اکثریت اس سے واقف ہو اور وہ مختلف لسانی علاقوں اور جماعتوں میں رابطہ کی زبان کی حیثیت سے استعمال کیے جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

ہمارے ملک میں ہندی کا انتخاب قومی زبان کی حیثیت سے اسی اصول کے تحت ہوا۔ اس طور پر ہر ہندستانی کے لیے لازمی قرار پایا کہ وہ ہندی سے قابل لحاظ واقفیت پیدا کرے۔ تا کہ قومی زبان کو مقبول اور مالا مال کرنے میں تمام لسانی علاقے زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں۔ یہ فیصلہ سب کی مرضی سے ہوا اور سب نے اسے تسلیم کیا۔ آئین میں ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیتے وقت آئین بنانے والوں نے یہ کہا تھا کہ سرکاری زبان کی تشکیل ترکیب اور ترویج میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ وہ عام بول چال کی زبان سے بہت قریب ہو اور رہے، لیکن عملاً نہ ایسا ہوا نہ ہو رہا ہے۔ عام فہم ہندی کے بجائے بہت زیادہ سنسکرت آمیز ہندی ہمارے سامنے آئی اور اور لائی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ اگر سرکاری ہندی کو نئی سنسکرت کہیں تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وضع اصطلاحات کے پیش نظر ہندی کے لیے سنسکرت کا سہارا لینا نہ صرف ایک فطری امر ہے، بلکہ ایک لازمی علمی ضرورت بھی ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان کی بیش تر زبانوں کے لیے باستثنائے کشمیری، تامل اور اردو، اصطلاح سازی کے لیے سنسکرت ماخذ زبان کی حیثیت رکھتی ہے، ملک نے اسے بھی تسلیم کرلیا۔ اس سے آگے بڑھ کر اب اس پر اصرار ہے کہ چوں کہ ہندی راشٹر بھاشا ہے، اس لیے راشٹریہ ساہتیہ کی نمائندگی کا جتنا اور جیسا حق یا اختیار اس کو ہے وہ کسی دوسری زبان کو نہیں، اور نمائندگی کا مقصد اس وقت پورا ہوگا جب وہ زبانیں ہندی اور اس کے رسم الخط سے دور ہیں، ان دونوں کو اپنانے پر آمادہ یا مجبور کی جائیں۔ اس پس منظر میں میرے نزدیک اردو رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ ملک میں جس مخصوص ذہنیت رکھنے والوں کا پتہ دیتا ہے اس سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دو زبانوں کو خاص طور پر دیا جاتا ہے۔ ایک اردو دوسری سندھی۔ اس کا ایک سبب بظاہر یہ ہوسکتا ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں میں ایسی کوئی قوت موجود نہیں ہے جو کسی سیاسی دباؤ کی شکل اختیار کر سکے جس کا لحاظ کرنے پر ارباب اختیار قائل یا مجبور ہوں۔ دوسرے یہ کہ اردو اور سندھی رسم الخط بدیسی زبانوں یعنی فارسی اور عربی سے مستعار ہیں، اس لیے ان کو قومیانے کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر کلچر کے معیار اور مقاصد کے تعین میں عالم گیریت کے اصول کو اپنانے اور برتنے کے بجائے دیسی اور

بدیسی کی تخصیص پر زور دیا جائے گا تو یہ ہماری ہی نہیں کسی تہذیبی مستقبل کے بارے میں کوئی امید افزا علامت نہیں ہے۔ انصاف اور مصلحت اندیشی کا تقاضا یہ تھا کہ ناگری لپی کو اختیار کرنے کا مشورہ پہلے ان علاقائی زبانوں کو دیا جاتا جن کی لپیاں ناگری کے مماثل یا قریب تر ہیں اور جن کی معیاری لغت بیش تر سنسکرت سے اخذ کی گئی ہے یا کی جائے گی۔ ان زبانوں کے ناگری لپی اختیار کرنے سے ملک میں تہذیبی ہم آہنگی اور یگانگت کو جس کا سیاسی نام قومی یک جہتی ہے، زیادہ محکمی نصیب ہوتی۔ یہ اقدام اس مقصد کے اصول میں زیادہ مدد دے سکتا تھا جو ملک کے بعض بہی خواہوں کو بہت عزیز ہے، یعنی ایک مختلف اللسان ماحول میں صرف ایک رسم الخط ہو جو سب زبانوں کے لیے کفایت کرے۔ رسم الخط کے اعتبار سے، اردو اور سندھی بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناگری لپی اختیار کرنے کے بعد ان کا بین الاقوامی رشتہ ٹوٹ جائے گا اور آئندہ ان کو صرف ہندوستان کی مقامی زبانوں کی حیثیت حاصل رہے گی اور یہ حیثیت بھی اندیشے سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ ناگری لپی اختیار کرنے کے بعد شاید بنگالی اپنی امتیازی خصوصیات قائم رکھ سکے، چوں کہ وہ انڈین یونین کی ایک ریاست کی باقاعدہ زبان ہے۔ برخلاف اس کے اردو اور سندھی ناگری لپی اختیار کرنے کے بعد اپنی امتیازی خصوصیات کا تحفظ تو کجا اپنے وجود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ اس لیے کہ نہ ان کا کوئی متعین علاقہ ہے نہ ان کو وہ آئینی تحفظات عملاً حاصل ہیں جن کا ذکر ایسے کثیر المعنی الفاظ و انداز میں آئین ہند میں موجود ہے جن کی تفسیر تو ملتی ہے تعبیر کی اب تک تلاش ہے۔

اتر پردیش کے ایک دانش ور نے جن کو بڑی اہم سرکاری و سیاسی حیثیت حاصل تھی اور ایک فاضل ادیب بھی تھے۔ اردو ہندی کے قصے یا قضیے کا حل اس فارمولے میں پیش کیا تھا کہ ان کو اردو سے کوئی اختلاف نہ ہوگا اگر وہ ناگری رسم الخط قبول کر لے اور اپنے ذخیرہ سے بدیسی الفاظ، تشبیہ، استعارے، تلمیحات وغیرہ خارج کر دے۔ یہ مشورہ یا مطالبہ علمی، ادبی یا لسانی نہیں بلکہ سیاسی جبر و طاقت کا ہے اور سیاسی جبر و طاقت، صلح صفائی اور امن و اتحاد کی معین کبھی نہیں منافی ہمیشہ رہی ہے۔ دانش ور موصوف نے اس نیک مشورہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قول کو عمل کے مطابق رکھنے کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس پر ایک ہمہ گیر وسیع اور منظم پیمانے پر عمل بھی

شروع کر دیا، وہ بھی اس طور پر کہ قول اور عمل کا رشتہ تطابق سے آگے بڑھ کر تجاوز تک جا پہنچا۔ غالباً وہ جانتے تھے کہ تطابق اگر تجاوز تک پہنچ جائے تو جنگ میں جہاد کا ثواب ملنے لگتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اور ان کے جانشینوں اور معاصرین نے ایسا کیا کہ اردو جن کی مادری زبان تھی اس سے وہ ناآشنا ہوتے ہوتے محروم ہو گئے۔ چنانچہ موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ اولاد اپنی ماں کی ہیں اور زبان دوسرے کی ماں کی ہے۔

اردو کے حمایتی اس وقت دوگونہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف وہ ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اپنے بچوں کی اردو تعلیم کی فکر میں بھاگتے پھرتے ہیں، دوسری طرف اس کی تگ ودَو میں گرفتار ہیں کہ کالج اور یونیورسٹی کے منازل میں اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست کس طرح کیا اور رکھا جائے۔ ان کی اس دوادوش اور پریشانی کو دیکھ کر حضرت اسماعیل کی ولادت کا واقعہ یاد آتا ہے۔ خدا کے حکم سے حضرت ابراہیم، اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہ کو ہمراہ لیے ہوئے وادیِ غیر ذی زرع میں داخل ہوئے تو حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ پینے کا پانی نایاب تھا، اس کی تلاش میں حضرت ہاجرہ دور نکل جاتیں۔ حضرت اسماعیل کا خیال آتا تو بھاگتی ہوئی واپس آتیں۔ اسی طرح بار بار جاتی آتی رہیں، لیکن پانی میسّر نہیں آتا تھا۔ آخری بار تلاش سے مایوس پھریں تو دیکھا کہ تکلیف میں مبتلا، جہاں حضرت اسماعیل ایڑیاں رگڑتے تھے وہاں سے پانی کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ یہ آبِ زمزم کی شانِ نزول ہے اور حضرت ہاجرہ کی تگ ودَو حج کا ایک رُکن، سعی صفا و مروہ قرار پائی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو والوں کی سعیِ صفا و مروہ سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے یا نہیں۔

اردو رسم الخط میں جو نقائص بتائے جاتے ہیں وہ اتنے بنیادی نہیں ہیں جتنے فروعی، جو ماہرین فن اور شعر و ادب کے مبصرین کی توجہ اور تعاون سے دور کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کے نقائص سے دنیا کی کوئی زبان خالی نہیں ہے، لیکن اس سے ان کی افادیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ آخر کچھ اور زبانیں بھی ہیں جن کا رسم الخط وہی ہے جو اردو کا ہے۔ لیکن وہ زبانیں نہ مردہ سمجھی جاتی ہیں نہ معطل یا معذور۔ ان سے کام لینے والے کسی احساسِ کمتری میں بھی کبھی مبتلا نہیں پائے گئے۔ ان زبانوں کے شاعر اور مصنف اور ان کا شعر و ادب دنیا کی کسی ترقی یافتہ

قوم یا اس کی زبان سے ہر سطح پر ہمدمی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ان زبانوں کے سربراہ رسم الخط کی خلش میں کیوں نہیں مبتلا ہیں اور ان سے رسم الخط بدلنے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس میں شک نہیں کہ مخلوط یا مرکب رسم الخط میں نقطوں اور اعراب کی بے ترتیبی، کاتبوں کی عدم استعداد اور کبھی کبھی مولفین لغت کی بے احتیاطی، لغات میں بعض بے معنی الفاظ کو وجود میں لانے کا باعث ہوئی ہے، جس کو کچھ نہ کچھ معنی دے کر قبول کرنا پڑا۔ اس طرح کا حادثہ شاید ہی کسی اور زبان کی لغت کو پیش آیا ہو، لیکن اس کے مقابلے میں اس رسم الخط کی جو خوبیاں ہیں، ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان خوبیوں کا ذکر اس کثرت سے ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ ان کو دُہرانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ اس ڈر سے بھی کہ ان میں سے کچھ بیان کرنے سے رہ نہ جائیں۔ اردو کا رسم الخط دنیا کے ان چند قدیم و عظیم زبانوں کے رسم الخط کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے جن پر اپنے اپنے عہد کے کاملین فن اور ارباب علم و فضل نے اپنے ذوق، ہنر اور احساس تقدیس و تکریم کو بہ وجوہ احسن صرف کیا ہے۔ معلوم نہیں فن خطاطی کی یہ محرومی ہے یا منزلت کہ اس پر تجریدی ہنر کا عمل اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ ایک پرانا شعر یاد آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بادِ صبا کی شوخی چل نہ سکی، اس لیے کہ اس نے محبوب کی زلف کو جتنا بگاڑنے کی کوشش کی اتنا ہی وہ بنتی (سنورتی) گئی۔ شعر اس وجہ سے نہیں لکھتا کہ ممکن ہے شاعر نے غیر موزوں کہا ہو اور اسی طور پر مجھے یاد ہو گیا ہو۔ معلوم نہیں اب اس طرح کی بادصبا چلتی اور محبوب ہوتے ہیں یا نہیں، لیکن یہ شعر اردو رسم الخط کے خط شکست پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔ شاید ہی کہیں اور کوئی رسم الخط ایسا ہو جس کا گھسیٹ لکھنا بھی باقاعدہ ایک فن ہو۔ وہ بھی فن برائے فن نہیں بلکہ فن برائے افادہ۔ خط شکست کا بڑا اہم، عجیب اور افادی پہلو یہ ہے کہ لکھنا تیز تر ہو گیا اور پڑھنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ کہتے ہیں، اردو رسم الخط کا سیکھنا مشکل ہے۔ اردو کا صحیح تلفظ بھی آسان نہیں ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اعلیٰ ہنر یوں بھی سہل الحصول نہیں ہوتا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے، ورنہ نئے ڈھنگ کی فی بطن الشاعر، شاعری اور 'وراء الورا' مصوری کی مانند جن کو ہرزہ نوردی یا ہرزہ نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں، ہنر کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی۔ اردو رسم الخط کو سمجھنے سیکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے پہنچانے اور لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ اسی طرح کے ذوق

استعداد اور توفیق کی ضرورت ہے جو اردو اور اردو غزل سے بہرہ مند اور لذت یاب ہونے کے لیے لازم آتی ہے۔ یہ کچھ اردو ہی کے رسم الخط پر منحصر نہیں ہے۔ ہر زبان کے شعر وادب اور اس کی جینیس (Genius) سے واقف اور مستفید ہونے کے لیے لازم آتا ہے کہ اس کا مطالعہ اسی رسم الخط اور اسی زبان میں کیا جائے۔ اگر مجھے اردو شعر وادب کا مطالعہ اردو خط کے بجائے کسی اور رسم الخط میں کرنا پڑے تو میرا ذوق میری عافیت اور میری بینائی سب تھوڑی دیر کے لیے جواب دے جائیں گی۔

انگریزی اخبارات میں کبھی کوئی معروف اردو شعر رومن رسم الخط (اتالکس) میں چھپا ہوا پڑھتا ہوں تو بڑی دیر اور دقت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کیا شعر تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعر، شاعر، موقع ومحل، معنی ومفہوم سب کا جو مناسب اور معقول اثر پڑنا چاہیے تھا وہ غارت ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر تک ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس شعر کا کہا جانا اور اس موقع پر پیش کیا جانا سب تضیع اوقات تھا۔ میرے اس اعتراف گناہ سے اگر آپ برہم یا بدحظ نہ ہو چکے ہوں اور اعتراف گناہ سننے کے بعد برہم یا آزردہ ہونا کوئی اچھی علامت بھی نہیں ہے تو یہ عرض کروں گا کہ اگر کسی سے میں اقبالؔ کو بھی اکبال کہتا سن لوں (خواہ وہ اقبالؔ ہی کیوں نہ ہوں) یا ایسا لکھا ہوا دیکھ لوں تو شاعر کے کلام کے جلال و جمال سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے کو محروم محسوس کرنے لگوں۔ اب اسے آپ میرے ایمان اور اعصاب کی کمزوری سمجھئے یا تبدیلی اور اصلاح سے تعصب یا رسم الخط سے صوت اور صورت کا ظاہری اور معنوی تعلق کا احساس، میں تو اسی طرح محسوس کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر اعلیٰ ادب کی مانند اردو کا اس کے شائقین کے ساتھ بڑا قوی اور دل کش رابطہ اس کا رسم الخط ہے۔ اردو کوئی نیم مہذب قبائلی بولی نہیں ہے جس کا نہ کوئی رسم الخط ہوتا ہے نہ شعر وادب۔ شاید اس پر مرنے اور ماتم کرنے والے بھی زیادہ نہیں ہوتے۔

میں اردو رسم الخط کو ترک کر دینے کے حق میں نہیں ہوں، لیکن اس کی پُر زور تائید کروں گا کہ اردو کی قابلِ قدر تصانیف ہندوستان کی دیسی بدیسی زبانوں میں احتیاط اور اہتمام سے شائع کی جائیں۔ اس سے ایک طرف اردو کا رشتہ عربی فارسی سے بدستور قائم رہے گا،

دوسری طرف ملک کی تمام قابلِ لحاظ زبانوں سے اس کا رشتہ استوار ہوگا۔ اس طرح اردو کا ملکی زبانوں سے آشنا ہونے اور رہنے اور دوسری زبانوں کو اردو سے آشنا ہونے اور رہنے کا جو حق ہے وہ بہ طریقِ احسن پورا ہوگا۔ کیا اس سے وہ تعمیری و تہذیبی مقصد نہیں پورا ہوتا جو اردو رسم الخط کو یکسر ترک کر دینے اور دوسرے کسی رسم خط کو اختیار کر لینے سے متوقع ہے؟ اردو رسم الخط کو بالضرور ترک کیا جائے اور دوسرا رسم الخط بالضرور اختیار کیا جائے۔ یہ منطق تو اسی کی ہو سکتی ہے جو منطق اور عقل سلیم دونوں سے بے بہرہ ہو۔

اردو رسم الخط، کاملینِ ادب اور شرفائے فن کے بڑے طویل مسلسل اور مقدس ریاض شوق اور شغف کا نتیجہ ہے۔ بذات خود میں ہر مدت الایام مروج اور مقبول رسم الخط کو یہی درجہ دیتا ہوں۔ بے سوچے سمجھے کسی رسم الخط کو ترک کرنے کا مشورہ دینا یا اس کا مرتکب ہونا یا اس سے کھیلنا ایک بڑے ہی قیمتی ورثہ اور تعمیر کو تاراج کرنا ہوگا۔ رسم الخط زبان کا لباس نہیں ہوا کرتا کہ جب جی چاہا اُتار دیا اور دوسرا اختیار کر لیا۔ یہ زبان کی مخصوص ہیئت، حسن، مزاج اور اس کا نشانِ امتیاز ہوتا ہے جس کو اس کی 'شخصیت' یا 'ذات' سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کا بدلنا نہ آسان نہ عقل مندی، اس کے بدلنے سے اردو زبان و شعر و ادب اور اس کے پیچھے جو تاریخ و تہذیب ہے وہ ایک گورستان بن کر رہ جائے گی۔ یہاں اقبالؔ کا ایک مقولہ یاد آتا ہے جو کہیں سنا یا پڑھا تھا کہ رسم الخط زبان کی عزّتِ نفس (Self Respect) ہوتا ہے، اس کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ اقبالؔ نے اس نکتہ میں اپنے مخصوص عارفانہ شاعرانہ انداز میں حرفِ آخر بھی کہہ دیا ہے۔ بایں ہمہ اس طرح کے مسائل میں اصلاح اجتہاد اور اجماع کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش اسی طرح ممکن ہے۔ یہ تلاش و تجسّس انسان کا بہت بڑا شرف اور بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ خوب سے خوب تر ہم تک اسی طرح پہنچا ہے اور ہم نے دوسروں تک پہنچایا ہے۔

زبان، رسم الخط اور ادبی سرمایہ کے اعتبار سے اردو قطعاً آزاد حیثیت کی مالک اور بلند مقام پر فائز ہے۔ اس کی طبعی نشو و نما اور تہذیبی ساخت پرداخت میں ہندستانی تمدن کی مشترک دل کش اور گراں بہا عناصر کے ساتھ، عرب و عجم کی شگوفہ کاری کی بڑی مبارک اور واضح جھلک

ملتی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر وہ ایک مخصوص و منفرد تہذیبی مزاج اور روایت کی نمائندگی کرتی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم عہد حکومت بالخصوص مغل عہد میں جب کم و بیش کل ہند پیمانے پر ملک کی ہمہ جہتی تنظیم عمل میں آئی تو نہ صرف ملک کے مختلف حصوں کے درمیان آمد و رفت کے بڑھنے سے تہذیبی واقفیت اور یگانگت پیدا ہوئی، بلکہ ایران و عرب کے بے شمار علما، فضلا، صوفیا، شعرا، تجار، اہلِ فن و حرفہ نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ ہندوستان کی طبعی حکومتی، سماجی اور تہذیبی فضا نے ان کو اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد دی اور انھوں نے ان صلاحیتوں سے ہندوستان کا نام روشن اور بلند کیا اور یہیں کے ہو رہے۔ تاریخ اور تاریخی آثار یہی کہتے ہیں۔ ان کو مٹانے یا مسخ کرنے والے چاہے جو کہیں یا کریں۔

مغل دور کے معاشی اور سیاسی کوائف سے قطع نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس زمانے میں ہندوستان کو جس صحت مند اور وسیع پیمانے پر آزاد تہذیبی ارتباط کے جیسے سازگار مواقع میسّر آئے، وہ ہماری تاریخ کے کسی اور دور میں شاید ہی نظر آئیں۔ اس عہد میں تہذیبوں کے اتصال سے جو 'سنگینی' تہذیب برآمد ہوئی، اردو اس کا نغمہ و نشید ہے۔ اس طور پر وہ اس تہذیب و شائستگی کی نمائندگی کرتی اور دعوت دیتی ہے جو ہر اچھی تہذیبی قدر کو خواہ وہ کسی کی ہو یا کہیں سے آئی ہو، عزیز رکھتی ہے۔ اردو کو یہ درجہ میرے آپ کے کہنے سے نہیں ملا ہے، اسے یہ درجہ حاصل ہوا ہے۔ اس کردار کی بنا پر جو اس نے ہماری تہذیبی تاریخ میں ادا کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اردو ہندی کی شیلی ہے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا تو ہرگز نہیں ہے، مبتلا کرنے کا شوق فضول ضرور ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اردو زبان اور رسم الخط اپنا مستقل اور آزاد وجود رکھتے ہیں۔ اس زبان کے بولنے اور لکھنے والے قومی ہم آہنگی کے دل کش خواب کو اقلیتی انہدام اور انضمام کی تبدیلی اور تعبیر میں دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ان کا مستقبل صرف اس صورت میں متعین ہو سکتا ہے جب اردو کو ہندی کی شیلی کی حیثیت دی جائے اور وہ ناگری کی لپی اختیار کرے۔ صورت حال یہ ہوگی تو ظاہر ہے اردو کے بہی خواہ کس طرح اور کیا سوچنے پر مجبور ہوں گے۔

جانتے ہم دونوں ہیں، میں کم آپ زیادہ کہ بعض ملکوں اور قوموں نے اپنی زبان کے رسم الخط میں بہتر تبدیلی لانے کی خاطر نہایت اہم اقدامات کیے ہیں یعنی پرانے رسم الخط کی جگہ

نئے رسم الخط اختیار کر لیے ہیں۔ان تجربات اور تبدیلیوں کے بارے میں میرا مطالعہ محدود ہے۔ ممکن ہے ناقص بھی ہو، اس لیے تفصیلی بحث کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ تاہم ان تجربوں اور تبدیلیوں کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو میری سمجھ میں آئے۔اس میں دو فائدے ہیں۔ایک یہ کہ اگر میری سمجھ میں صحیح آئے ہیں تو آپ کو زیر بحث مسئلہ سے دلچسپی پیدا ہوگی۔غلط آئے ہیں تو آپ کو مجھ سے ہمدردی ہوگی۔ایک میں مجھ کو ثواب ملے گا، دوسرے میں آپ کو، برابر کا ایسا سودا آج کل کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ بالخصوص اصحاب علم وفن کی محفل میں۔

آپ جانتے ہیں اس صدی میں چند ملکوں مثلاً ترکی، جرمنی اور انڈونیشیا نے اپنے روایتی رسم الخط کی جگہ نیا رسم الخط اپنایا ہے۔ترکی کا پرانا رسم الخط تقریباً عربی یا تمام تر عربی خط سے ماخوذ تھا۔اس لیے اس کو ترک کر کے بالکل نیا یعنی رومن رسم الخط اختیار کیا۔ جرمن زبان کا اپنا ایک قدیم روایتی رسم الخط تھا اور ہے، جسے برقرار رکھتے ہوئے اس کی کوشش کی گئی کہ رومن رسم الخط کو عام طور پر قبول کرلیا جائے ....ایسا ہو بھی گیا، لیکن جرمن زبان کا پرانا رسم الخط ختم نہیں ہوا ہے۔ ہر جرمن لازمی طور پر اپنے روایتی رسم الخط سے واقف ہوتا ہے، اس لیے کہ اسکول میں زبان کی تعلیم دیتے وقت بچے کو اس رسم الخط سے واقفیت پیدا کرادی جاتی ہے۔انڈونیشیا میں کوئی ایسا قدیم معیاری رسم الخط موجود نہ تھا جو ملک کے ہر حصہ یعنی جاوا سماترا دو بڑے جزیروں کے ساتھ بے شمار دوسرے جزائر میں بھی یکساں طور پر رائج ہوتا۔ بالفاظ دیگر ملک کی کوئی مشترک معیاری زبان نہ تھی۔آزادی کے بعد ملک کا قومی زبان کے انتخاب کا وقت آیا تو قوم نے اس زبان کے حق میں فیصلہ کیا جس کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ (Vacabulary) ملک کی مختلف بولیوں کے مشترک عناصر واقدار سے مستعار ہو، اس زبان کا رسم الخط رومن قرار پایا۔اس طور پر یہ زبان جو بھاشا انڈونیشیا کہلاتی ہے۔ ذرا بدلی ہوئی شکل میں گاندھی جی کی ہندستانی کی تصور کی عملی تعبیر ہے۔گاندھی جی کا قومی زبان کا تصور کم وبیش یہ تھا کہ یہ ایک ایسی زبان ہوگی جس کا ذخیرۂ الفاظ ملک کی تمام زبانوں سے ماخوذ ہوگا اور یہ ایک عام فہم زبان ہوگی، جسے ناگری اور فارسی دونوں لپیوں میں لکھنے کی اجازت ہوگی۔تاکہ قومی زبان کو ہر ہندستانی خوشی سے سیکھے اور کام میں لائے۔

گاندھی جی، قومی زبان اور اس کے رسم الخط کو دلوں کے جوڑنے اور ذہنوں کو کشادہ اور صحت مند رکھنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ ان کو زور اور زیادتی کا بہانہ بنانے پر کبھی آمادہ نہ کیے جا سکے اور نہ کیے جا سکتے تھے۔

ان ممالک کے رسم الخط میں متذکرہ تبدیلیوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تینوں ملکوں میں مختلف اسباب و محرکات کارفرما تھے جنھوں نے ان تبدیلیوں کو ایک خاص شکل اور ہیئت دی۔ ترکی میں رسم الخط کی تبدیلی ایک عظیم سیاسی انقلاب کا نتیجہ تھی۔ جدید ترکی کے سربراہوں نے صحیح یا غلط مگر پوری قوت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ ترک قوم اپنی تقدیر کی نئی تعمیر کی خاطر ہر اس چیز کو ترک کر دے گی جو ان کو اپنی کلفت اور ہزیمت کی یاد دلاتی ہو، اور ہر وہ بات اختیار کرے گی جو ان کے نزدیک انھیں اقوام عالم میں سربلند کرنے اور رکھنے میں مدد پہنچائے گی۔ یہ فکری رویّہ اور ملّی جذبہ تھا جو سبب تھا۔ ان کے عربی رسم الخط کو ترک کر دینے اور رومن رسم خط اختیار کرنے کا۔ اس وقت یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ زبان و ادب اور تہذیب و تمدن پر رسم الخط کی اس تبدیلی کا کیا اور کتنا اثر پڑا۔ صرف اتنا واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اردو والوں کے نہ ایسے حالات ہیں، نہ ایسے محرکات ذہنی جو مماثلت رکھتے ہوں۔ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی ترکی اور ترکوں کے حالات و حرکات سے۔

جرمن زبان کے لیے رومن رسم الخط کے عام استعمال کی تحریک کا زیادہ تر مقصد ایسا رسم الخط اختیار کرنے میں مدد دینا تھا جو بین الاقوامی سطح پر عالم گیر حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کی بیش تر زبانوں نے رومن خط کو بطور قومی رسم الخط اختیار کر لیا تھا۔ ان حالات میں جرمن قوم کو اس کا احساس ہوا کہ ایک بین الاقوامی رسم خط کے عام استعمال سے اس کی تہذیب، تمدن، تجارت اور مواصلات کو فروغ دینے میں مدد ملے گی۔ یورپ میں جرمن بولنے والے علاقے جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے نہایت واضح مخصوص اور منظم شکل میں پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان علاقوں میں کسی اور زبان یا رسم الخط کی عدم موجودگی کی بنا پر ایک بین الاقوامی رسم الخط کا استعمال ان کے لیے کسی اُلجھن یا پیچیدگی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے جرمنی میں رومن رسم الخط کے عام استعمال کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ اردو سے تعلق

رکھنے والے بالکل مختلف صورت حال سے دوچار ہیں۔ اس لیے جرمنی کی مثال کو سامنے رکھ کر اردو رسم الخط کو بدلنے کا مشورہ نہ قرین منطق ہے نہ قرین مصلحت۔

انڈونیشیا نے رومن رسم الخط اختیار کرتے وقت جن مقاصد کو پیش نظر رکھا اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس نے قومی زبان کی تعمیر و ترقی میں جس لسانی پالیسی کو اپنایا ہے، وہ دانش مندانہ اور قابل ستائش ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ وقت گیا اور وہ قیادت رخصت ہوگئی جو قومی لسانی پالیسی کو ہندستانی تہذیب کے موقف و معیار کے مطابق تشکیل دینے کی اہل بھی تھی اور خواہش مند بھی۔ اردو والوں کے لیے انڈونیشیا کے رسم الخط کی پالیسی کو اپنانا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اردو قومی سرکاری زبان کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ ایک ایسی تہذیبی اقلیت کی نمائندگی کرتی ہے جو ایک ناروا لسانی پالیسی کی شکار ہے اور دفاعی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کردی گئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس کو جان و آبرو کی پڑی ہو اس کو 'شور سودائے خط و خال کہاں'۔

ماضی قریب میں رسم الخط کی ان نئی تبدیلیوں کے علاوہ اس کی اصلاح، کمی بیشی یا تنظیم نو سے متعلق متعدد مثالیں سامنے آئیں ہیں۔ ان کو سائنٹفک تبدیلیوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ان کو عمل میں لانے سے قبل مناسب ماحول میں نہایت معروضی اور ماہرانہ انداز میں مطالعے اور تجربے کیے گئے۔ مثال کے طور پر چینی رسم الخط میں کیے گئے تجربے کو لے لیجیے۔ چین کا قدیم روایتی رسم الخط اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی مخصوص خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ حرف تہجی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ علامتوں سے تشکیل پایا ہے یا ان سے مرکب ہے۔ تہجاتی (Alphabatical) اور علامتی تصوراتی (Drographic) لکھاوٹیں قطعاً مختلف چیزیں ہیں۔ زبان نویسی کے تہجاتی طرز میں ہر حرف کسی لفظ یا صوت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ علامتی طرز میں علامت یا نشان کسی لفظ یا صوت کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ براہ راست شے یا اشیا کے لیے استعمال میں آتا ہے۔ میرا ان میں سے کسی ایک کا بھی تخصیصی مطالعہ نہیں ہے۔ اس لیے کوئی اندازہ نہیں کہ دونوں کے عیب و ہنر کیا ہیں۔ البتہ اتنا عرض کردینا بے محل نہ ہوگا کہ اس سلسلے میں جدید چین میں ایک نہایت انقلابی تجربہ کیا گیا ہے۔ یعنی چینی زبان کے قدیم علامتی طرز کے رسم الخط کا ایک متبادل تہجاتی طرز دریافت کرلیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ قدیم علامتی طرز سے

واقف ہونے کے لیے تقریباً ساڑھے چار سو علامتوں یا نشانات کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اب جو نیا تہجاتی طرز دریافت ہوا ہے، وہ کم وبیش صرف پینتالیس حروف تہجی پر مشتمل ہے۔ جدید عہد میں رسم الخط کے متعلق سائنٹفک تجربات کے سلسلوں میں غالباً یہ سب سے بڑا تجربہ ہے، اور مثالیں بھی سننے میں آئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جدید روسی زبان کے صوتی اور لفظی نظام کو زیادہ جامع اور سائنٹفک بنانے کی غرض سے اس کے حروف تہجی میں اصلاح یعنی قطع بُرید کی گئی ہے۔ رسم الخط میں ان بنیادی تجربات کے علاوہ ہر اہم اور ترقی یافتہ زبان میں اِملا اور تلفظ کی اصلاحات سے متعلق مسلسل تحقیقات اور تجربات ہوتے رہتے ہیں جن سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

رسم الخط سے متعلق ان تبدیلیوں کی غایت اور اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ اردو رسم الخط نہ علامتی ہے نہ ہماری زبان کے صوتی نظام کی نوتنظیم کا کوئی فوری مسئلہ ہمارے سامنے ہے کہ ایک بےضرورت بحث میں آپ کو حصہ لینے یا اُلجھنے کی دعوت دی جائے۔ موجودہ بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ احباب جو ہم کو ناگری رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، انھوں نے فارسی اور ناگری رسم الخط کے مطالعہ اور موازنے میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں دی ہے نہ وہ ایسے نتائج نکالنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن کی روشنی میں ان کا یہ مطالعہ قابلِ لحاظ ہوتا۔ رسم الخط کی تبدیلی کی ایسی بےسوچی سمجھی تجویز آج تک مشکل ہی سے کہیں اور پیش کی گئی ہوگی۔ اردو کے لیے ناگری رسم الخط کی تائید کرنے والوں کو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنؤ) کی اس رائے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے:

> ''ناگری کے طرف دار اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہر زبان کی تمام آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔ یہ دعویٰ حقیقت سے بہت دور ہے۔ دوسری زبانوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے لفظوں پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ........(اس زبان کے) معمولی لفظوں کا تلفظ بھی ناگری حرفوں سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ عربی اور فارسی لفظوں کے معاملے میں بھی ناگری حرفوں کا یہی حال ہے۔ دوسری زبانوں کا کیا ذکر، خود ہندی کے بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا صحیح تلفظ ناگری حرفوں سے نہیں ادا

ہوسکتا......ان حالات میں یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ ہر زبان
کے الفاظ ناگری حرفوں میں لکھے جاسکتے ہیں۔ اردو رسم الخط کے لیے بھی
یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اتنا تو بے خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اردو
حرفوں میں ناگری حرفوں سے کہیں زیادہ آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔''

مذاکرے کے طور پر اردو رسم الخط کے بدلنے یا بدلنے کے لیے وقتاً فوقتاً ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن یہ خیال کرنا کہ اس سے جو اصحاب اردو یا اردو رسم الخط سے بدگمان یا الرجک ہیں وہ اس کے عاشق زار بن جائیں گے، صحیح نہیں ہے۔ اردو رسم الخط کی حمایت اور اس کو زیادہ سے زیادہ مقبول اور مستحکم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اردو رسم الخط کے کینڈے یا ہیئت اور نوک پلک میں درک یا اس کا ذوق رکھتے ہوں وہ اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاکر موجودہ رسم الخط کو زیادہ کارآمد اور خوش نما بنانے کی تجاویز پیش کریں، اور وہ مناسب و معقول تسلیم کی جائیں تو ان کو برسرِ کار لانے اور مقبول بنانے کی کوشش کریں۔ ان سے کچھ کم کارگر مساعی ان دوستوں اور بزرگوں کی نہ ہوگی جو اردو زبان اور رسم الخط میں شعر و ادب کے خوب سے خوب تر نمونے مسلسل پیش کرتے ہیں جن سے فائدہ اور لطف اٹھانے کے لیے دوسری زبانوں کے اعلیٰ شاعر و ادیب اور فن کار اردو ادب اور اس کے رسم الخط کی طرف بے اختیار مائل ہوں گے۔ کرنے کی یہ مفید لیکن نہایت صبر آزما اور ریاض طلب باتیں ہیں۔ ویسے اکبر کے مقولے کے مطابق پلاؤ کھانے کے لیے نہ فوتی کی کمی ہے نہ فاتحہ کی، اور آپ کہیں تو اس میں 'فتنے' کو بھی شامل کردوں۔

زبان اور رسم الخط کی طرف بہرصورت ہمارا رویّہ مثبت اور حقیقت پسندانہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں عرض کروں گا کہ اردو رسم الخط سے متعلق بنیادی تحقیق اور رہنمائی کے کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مرکزی ادارہ قائم کرنا چاہیے جہاں زبان اور رسم الخط کے ماہرین مناسب ماحول میں ضروری وسائل کے ساتھ مستقلاً تحقیق و تدقیق کے کاموں میں مصروف رہ سکیں۔ اس کام کے لیے میرے نزدیک دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کا انتخاب بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ ان اداروں میں یکسوئی کے ساتھ موزوں

ماحول میں، تمام وسائل کی مدد سے فن و ادب کے کاملین کی نگرانی اور رہبری میں اعلیٰ سطح پر کام کرنے کی جو سہولت ہوگی وہ شاید کہیں اور آسانی سے میسّر نہ آئے۔

یہ قصہ تو اپنی جگہ پر رہا، لیکن اردو کا مستقبل ہندوستان پاکستان یا کہیں اور کتنا ہی یاس افزا کیوں نہ معلوم ہوتا ہو اور اس کی تصدیق اصحاب اختیار اغراض و اقتدار کے ناروا سلوک اور اس کے المناک نتائج سے کیسی ہی ہوتی ہو، یا اربابِ علم و ماہرین فن کے بیانات اور شمار و اعداد اس کی کیسی ہی تاریک تصویر بیان کرتے ہوں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ افراد و جماعت میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے جس کو جینے اور جیتے رہنے کا نہیں بلکہ عزّت سے جینے اور اس سے زیادہ عزّت سے مر جانے کا عزم کہتے ہیں۔ یہ چیز نہ شمار و اعداد کو خاطر میں لاتی ہے نہ سیاسی اور جماعتی جبر و اقتدار کو۔ اعلیٰ مقاصد کی حفاظت اور حصول میں اس عزم پر بھروسہ کرنا چاہیے، حق کی حمایت کا حصول ہے۔ میزائلس اور تسخیر قمر کا دور چاہے جو کہے یا کرے، ہوگا وہی جو مردانِ حق چاہیں اور کریں گے۔ انسان کی تاریخ اور تقدیر یہی رہی ہے اور رہے گی۔

تعجب نہیں، لیکن افسوس ضرور ہوتا ہے کہ بعض ایسے ادیب اور شاعر جن کا شمار اردو کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔ ایسے نازک مسئلے میں یا مواقع پر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح ان کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔ آزمائش کا سامنا ہو تو سچے اور پکے لوگ خطرے کا مقابلہ کرتے ہیں، منافع نہیں کماتے۔ یہ تو سیاست کے دستر خوان پر ہوتا ہے جہاں حرام و حلال نہیں دیکھتے، شکم سیر ہونے، رہنے یا کچھ لے بھاگنے کی فکر کرتے ہیں۔ ادب تہذیب اور اقدار کی حفاظت اور حمایت کا معرکہ ہو تو رُخ کربلا کی طرف رکھتے ہیں، کوفے کی جانب نہیں۔

(مطبوعہ فکر و نظر، علی گڑھ، اپریل 1971)

●●●

خطبہ جلسۂ تقسیم اسناد

جامعہ اردو، علی گڑھ

15/ستمبر 1973

محترم امیرِ جامعہ، جناب شیخ الجامعہ، خواتین وحضرات!

کچھ دنوں سے میرا مشغلہ یا مصرف یہ رہ گیا ہے کہ آس پاس کے نوجوانوں کو یہ سناتا بتاتا رہوں کہ وہ کیا تھے اور کیا رہ گئے۔ ضمناً یہ بے محل اور دور از کار بات بھی کہ ان کو کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہے۔ بے محل اور دور از کار اس لیے کہ پہلے کبھی کسی بات کو چھوڑنے یا اختیار کرنے کی صلاح نوجوانوں کو بوڑھوں سے ملتی تھی، اب یہ احکام بوڑھوں کو نوجوانوں سے ملنے لگے ہیں۔ بوڑھوں کی تعداد بڑھنے اور مصرف گھٹنے لگا ہے۔ اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کی قسمت میں نوجوانوں کی طرف سے کس طرح کی پلاننگ لکھی ہوئی ہے۔ بوڑھوں کی نامرادی کا اظہار اپنے خاص انداز میں اکبر آج سے بہت پہلے کر چکے ہیں، یعنی

بوڑھے بھی مرنہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

بایں ہمہ آپ کتنے اچھے ہیں کہ پہلے زمانہ کے خلاف آج کل کوئی خدا کا نام لیتا ہے تو آپ رپٹ لکھوانے تھانے نہیں پہنچتے، بلکہ سمینار منعقد کرتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے نئے پیچ وخم اور شعروادب کے نئے نشیب وفراز دریافت کرتے ہیں اور ہم کو مذہب و اخلاق کے تصورات اور تاویلوں سے آشنا کراتے ہیں۔ اکثر صلح و عافیت کی تبلیغ میں جلوس نکالتے ہیں، جس کا اختتام مشاعرے ورنہ انجام لاٹھی چارج پر ہوتا ہے۔ جس معاشرے کے شب و روز نوجوانوں کی شورانگیزی اور پولیس کے لاٹھی چارج میں گزرتے ہوں اس پر آنسو گیس بہانے کا نتیجہ کیا۔

کلیتہً علی گڑھ سے وابستہ رہ کر اردو کا میرا کاروبار بہت پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ آج اردو کا پرانے سے پرانا گناہ گار بھی اس کی تردید نہیں کرسکتا۔ 1915ء سے آج 1973ء تک۔ ''بتاؤ یہ سب گئے دن ہوئے؟'' کیا عجب اسی امتیاز کے احترام میں آپ نے آج کی اس تقریب میں Lay of the Last Ministral (آخری مغنّی کا نغمہ) کا رول ادا کرنے کے لیے مجھے یاد فرمایا ہو۔ یہ رول کتنا شان دار اور کیسا خصوصی ہے جو ایک بوڑھے مغنی ہی کے حصہ میں آسکتا تھا۔ کیسے کیسے نغمے جن کی بازیافت صرف مغنی اور اس کا بوڑھا ساز ہی کرسکتا ہے۔ وہ نغمے جن کے سننے کی نئی نسل میں شاید تاب نہ توفیق۔ تاریخ کی سنگیت پر تقدیر کے نغموں کو پہچاننا اور اپنانا ان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن بوڑھا مغنی اپنے نغمے جگاتا رہے گا۔ اس لیے کہ وقت آنے پر انھیں نغموں سے مطربِ خوش نوا برآمد ہوگا اور اس کے ''تازہ بہ تازہ نو بہ نو'' نغمے ہم سب کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بیدار اور بالیدہ کریں گے اور رکھیں گے۔

علی گڑھ سے جو طویل غیر منقطع اور بامقصد وابستگی اور وارفتگی رہی ہے شاید یہ اسی کا فیضان ہے کہ میں اس کو 1857 کے سانحۂ عظیم کی سب سے معتبر، مبارک اور محکم تلافی سمجھنے لگا ہوں۔ اردو کو علی گڑھ سے علاحدہ نہ رکھتا ہوں نہ چاہتا ہوں۔ دونوں میں ایک واضح تاریخی، تہذیبی اور جذباتی ربط محسوس کرتا ہوں جن کو مسخ کر دینے یا مٹا دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کیسی تکلیف دہ یہ صورت حال ہے کہ ہم اپنی جن چیزوں کو سب سے عزیز و محترم جانتے اور مانتے آئے ہیں وہی دوسروں کی بدگمانی اور بیزاری کا باعث ہیں، ایسے ہی کسی موقع پر شاعر نے کہا تھا:

ملک الموت کو کد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں

سر بہ سجدہ ہے مسیحا، کہ میری بات رہے!

شعر اچھا ہے باوجود اس کے کہ شعر اور شاعر دونوں پرانے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پہلے مسیحا کی تلاش مسیحائی کے لیے کی جاتی تھی اب مصلوب کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔

انگریزی زبان اور ادب سے جیسا سلوک کیا جارہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کیسے کہوں کہ ہماری نوخیز نسلیں، سر والٹر اسکاٹ کی مشہور نظم Lay of the Last Ministral (آخری مغنّی کا نغمہ) یا دوسرے پرانے انگریزی شعرا کی نظموں سے آشنا ہوں گے اور نہیں ہیں تو

یہ کیسی بڑی محرومی ہے! سولھویں صدی میں انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے سرحدی علاقوں میں چھوٹے بڑے قبائلی سرداروں کی رزم و بزم، حسن و عشق اور آن بان کی وارداتوں کو شاعر نے زندگی اور زمانے کے جن اقدار اعلیٰ سے جہاں تہاں ربط روانی دی ہے، جس طرح چھوا اور چھیڑا ہے اس کا پورا اندازہ اس کے مطالعے ہی سے ہوسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے قرونِ وسطیٰ کی پوری تصویر اپنے تمام شیڈز اور شباہتوں کے ساتھ نظم کے منقش اور رنگین فانوس میں گردش کررہی ہو۔ 'آخری مغنی کے نغمہ' کی محفل جیسا کہ ذکر آچکا ہے، انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کی سولھویں صدی اور قرونِ وسطیٰ کے دُھندلکے میں سورماؤں کے افسانہ ہائے سپہ گری سے آباد و آراستہ نظر آتی ہے اور کیا اس وقت آپ کو اپنے سب سے زیادہ سنے جانے والے مغنی اقبالؔ کی آواز نہیں سنائی دیتی جو ساقی کو 'قانونِ پیشیں' کی بازگشت و بازیافت کی دعوت دیتے ہیں۔

سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں سازدہ ساقی!

ہمارے اس مغنی کے سامنے وہ سوادِ اعظم ہے جس کی تعمیر ہمارے عہد سعادت و اقبال کے عروج کی پوری تاریخ اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ ہر تعصب و تلبیس کو چیلنج کرتی ہوئی جلوہ گر ملے گی۔ علم کی ہماری بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم نے تاریخ کو افسانہ بننے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا۔ اس لیے اردو اور اردو تاریخ و تہذیب کا مغنی کسی افسانہ کا مغنی نہیں بن سکتا۔ یہ اور بات ہے اردو کی تاریخ بجائے خود کسی افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔ اس کا یقین نہ ہوتا تو آپ کا سامنا کرنے میں اس آسانی اور فخر سے تیار نہ ہوجاتا، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

نیک شگون اور اظہارِ شادمانی دونوں کے پیشِ نظر، آج کی تقریب میں جامعۂ اردو کی مختصر کائنات لیکن گراں قدر خدمات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ آپ بھی کریں گے۔ داستان مختصر ہے، لیکن اس میں جو بصیرت و بشارت ملتی ہے اس کا احساس اور اظہار کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ یوں بھی کم و بیش 25 سال تک اس سے وابستہ رہ کر اگر اس کے لیے کلمات خیر بار بار اور بے اختیار زبان پر آتے رہیں تو اس کی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ جامعہ اردو 1939ء میں آگرہ میں قائم ہوئی اور 1948ء میں علی گڑھ منتقل ہوئی۔ یہ زمانہ بڑی

یاس و ہراس کا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب کیا پیش آ جائے گا۔ اردو کے بڑے بڑے ایوان گرنے اور شبستانیں بے چراغ ہونے لگی تھیں، لیکن اس کا علی گڑھ آ جانا بہت کامیاب رہا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور اصحابِ کرم اس کی دست گیری کے لیے مل گئے۔ اس سے جامعہ کی ساکھ قائم ہوئی اور اس کی شہرت وسیع تر اور محکم تر ہوتی گئی۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائے کار میں اس کے مراکز کی تعداد سولہ اور امیدواروں کی 138 تھی۔ آج مراکز کی تعداد کشمیر سے موریشس تک 283 اور امیدوار کی دس ہزار سے اوپر ہے۔ سرسید بک ڈپو کی ابتدا 450/ روپے سے کی گئی تھی آج اثاثہ 60 ہزار سے اوپر کا ہے۔ جامعہ کی اپنی کوئی زمین اور عمارت نہ تھی، اس کے اپنے شرکا امتحان اور ممتحن صاحبان سے 'کفِ خس بہر آشیاں' کی درخواست کر کے ساٹھ ہزار روپیہ اکٹھا کیے اس سے آراضی خریدی گئی اور عمارت کا نچلا حصہ تیار ہوا۔ جموں کشمیر کے چیف منسٹر بخشی غلام محمد مرحوم کے 55 ہزار روپیہ کے عطیہ سے بالائی منزل 'کشمیر ہال' تعمیر ہوا۔ جامعہ کے امتحانات کو 13 یونیورسٹیوں کے سکنڈری ایجوکیشن بورڈز اور تین ایجوکیشن بورڈز نے تسلیم کیے ہیں۔ سالِ رواں کا اس کی آمدنی کا بجٹ ایک لاکھ باسٹھ ہزار سات سو اور اخراجات کا ایک لاکھ پینتالیس ہزار چار سو چون روپے ہے۔ جامعہ کی بیرونی آمدنی کوئی نہیں ہے، یہ قطعاً اور کلیتہً خود کفالتی ہے۔ آمدنی کا وسیلہ صرف امیدواروں سے امتحانات کی فیس ہے۔ جامعۂ اردو نے گجرال کمیٹی کی خدمت میں جو یادداشت پیش کی ہے اس میں زیرِ نظر تعمیری منصوبوں کے لیے پانچ لاکھ روپیہ کے عطیہ کی درخواست کی ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ 'تماشائے اہلِ کرم' دیکھنے کے لیے ہم کو آپ کو فقیروں کا بھیس بدلنا نہ پڑے گا۔

خیال آتا ہے کہ جہاں یہ ادنیٰ اشتعال قریب قریب ہر روز ملک کے کسی نہ کسی بڑے شہر میں دس بیس لاکھ کا اثاثہ دیکھتے دیکھتے نذرِ آتش ہو جاتا ہو اور نوع بہ نوع کی ہڑتالوں سے ملک کی کثیر آمدنی ضائع ہو جاتی ہو، وہاں حکومت کو پانچ لاکھ کا عطیہ ایک ایسے ادارے کو مرحمت کر دینا جیسا کہ جامعۂ اردو ہے تعجب کی بات نہ ہوگی۔ لطف و کرم کی یقیناً ہوگی جامعہ سے متعلق جو باتیں عرض کی گئی ہیں وہ رسمی، وقتی یا محض برائے گفتن نہیں ہیں جو ایسے موقع پر اکثر کہی جاتی ہیں، بلکہ اردو کی اہمیت، اور مشکل سے مشکل حالات میں ہرگزند سے محفوظ اور رو بہ ترقی رکھنے میں اس کے

خیر اندیشوں کی خدمات کا اعتراف، نغمہ سرائی اور سپاس گزاری ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے سے چھوٹے پیانہ پر بھی اردو کے تحفظ اور ترقی کی جیسی ضرورت ہے اور اس میں جو بڑائی اور برکت ہے، اس کا احساس کرنا اور دلانا بھی مقصود ہے۔ آپ نے ایسے ہسپتال اور تعلیم گاہیں شاید ہی دیکھی ہوں جو ڈاکٹر اور مریضوں یا معلّموں اور طالب علموں کے عطیات سے چلتے اور چلائے جاتے ہوں۔ جامعۂ اردو کی روایت اور روش اس کی تصدیق کرتی ہے۔

کاش مجھے وہ تمام اسرار و اصطلاحات اور جزئیات و تفصیلات معلوم ہوتیں اور ان کے اظہار پر قدرت بھی ہوتی جن سے ایک مکمل نغمہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لیکن اسے برتر اور مشکل تر حقیقت کا بھی اظہار نہیں کرسکتا کہ کس طرح اور کن عوامل کا عمل اور کشید و کشود، حسن اور برگزیدگی پیدا کرتا ہے جس کو شخصیت کہتے ہیں۔ اردو کیوں اور کیسے وجود میں آئی اس کو پہچاننے، اس سے محبت اور اس کا احترام کرنے میں کن سچائیوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے ان کا احساس اور احاطہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے، جب ہم اس کو تسلیم کریں گے کہ اردو کی ایک مستقل اور ممتاز حیثیت ہی نہیں بلکہ شخصیت ہے، اس کی ایک سنگیت ہے۔ اس کی شخصیت میں آپ کسی چیز کی ردّ و بدل کردیں چہ جائیکہ اس کو بیک قلم نکال دیں یا اس کی سنگیت (سمفنی) Syphony سے کسی نغمہ کو حذف کردیں تو شخصیت مجروح و مفلوج اور نغمہ بے سُرا اور بے سماں ہوجائے گا۔

اردو کلیتہً ہندوستان کی زائیدہ اور پروردہ ہے، یہیں کی ایک ممتاز زبان ہندی پر یہ ڈھلی اور اسی کے کینڈے پر اس کا اٹھان ہوا۔ اس کا ظہور ہندوستان کے اس حصہ میں ہوا (دہلی اور نواحِ دہلی) جو ہمیشہ سے اور آج تک ہر اعتبار سے ہندوستان کی اعلیٰ روایات کا سب سے ممتاز و معتبر خطہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سے اردو کے گرامی گہر ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہوا۔ یہ مسلمان لوٹ مار کے لیے نہیں آئے تھے۔ وہ یہاں آئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ انھوں نے اپنا کوئی تعلق اپنے چھوڑے ہوئے وطن سے نہیں رکھا۔ فاتح یا مفتوح فاتح کی ایسی مثالیں مسلمانوں کی تاریخ کے علاوہ شاید ہی کہیں اور ملتی ہوں۔ انھوں نے اپنے کم و بیش ہزار سالہ عہد حکومت میں ہندوستان کے رسم و رواج اور طور طریقوں کو جس طرح اور جس حد تک اپنایا، اس کے مقابلہ میں برائے نام بھی اپنے

رسم ورواج اور طور طریقوں کو ہندوستان کے باشندوں پر عائد نہیں کیا۔ یہاں کے معاشرے میں وہ اس طرح گھل مل گئے کہ مسلمان علما کو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

نو واردوں نے نئے دیس اور نئے دوستوں سے ہمہ وقت اور ہمہ جہت کا جو رابطہ قائم کیا ہوگا وہ ابتدا میں زیادہ تر اشاروں اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہی میں کیا ہوگا۔ یہ الفاظ دیسی بھی رہے ہوں گے اور بدیسی بھی، الفاظ کا یہ لین دین تیزی سے بڑھنے لگا ہوگا۔ انھیں الفاظ نے اَن گھڑ اور ناہموار فقرے اور جملوں کی شکل اختیار کی ہوگی جو رفتہ رفتہ لب ولہجہ اور زبان وذوق کی خراد پر چڑھ کر ترشے ہوئے جملوں اور مصرعوں میں نمودار ہونے لگے ہوں گے۔ اردو شاعری اسی نشیب وفراز سے گزر کر میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حالیؔ اور اقبالؔ تک پہنچی۔ اس طرح اردو زمانہ اور زندگی کے طرح طرح کے دھاروں کے سہارے ملک کے دور ونزدیک علاقوں میں پھلی پھولی۔ اس کی ابتدا، ارتقا اور ارتفاع اس درجہ فطری اور وقت وواقعات کے مطابق تھا کہ اس کی پذیرائی اطراف وجوانب میں کھلے دل سے کی گئی۔ اس نے اپنے آپ کو حدود وقیود اور چھوت چھات سے آزاد رکھا۔ جہاں پہنچی وہاں رشتہ جوڑ لیا۔ جتنا نفع اُٹھایا اس سے یقیناً زیادہ پہنچایا۔ اسی سبب سے تمام دوسری زبانوں کے خلاف یہ مختلف مقامات اور احوال کی نسبت سے بھی معروف ہے۔ مثلاً بنگالی اردو، گجراتی اردو، پنجابی اردو، بہاری اردو، سرحدی اردو، فوجی یا گوراشاہی اردو، کرخنداری اردو، انگریزی حکومت میں پولیس کے روزنامچوں کی اردو وغیرہ۔ ملک کی تمام دوسری زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں محدود اور محصور رہیں۔ اس لیے ان میں آج تک عام اور عالم گیر ہونے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔

صاحبو! اردو تنہا وہ زبان ہے جس نے تمام علاقائی موانع سے باہر اور بے نیاز ہوکر تاریخ میں پہلی بار ہندوستان کو لسانی اتحاد، جغرافیائی وحدت، اور بیرون ملکی رشتہ سے آشنا کیا۔ یہ اس کے جمہوری نژاد ہونے کا فیضان ہے کہ آج وہ ان موانع اور محرومیوں کے باوجود جو اس پر تقریباً چوتھائی صدی سے عائد ہیں وہ صرف اپنی خدمات اور خوبیوں کی بنا پر ہر طرف مقبول و محترم ہے۔ کوچہ و بازار، سینما، مشاعرے، جلسہ جلوس، نعرہ نفیر، تحریر وتقریر، تو تو میں میں، من تو شدم تو من شدی، غرض ہر موقع اور محل پر اسی کا سہارا لیتے ہیں، لیکن کہتے یہ ہیں کہ یہ اردو نہیں

کچھ اور ہے۔ حسن کرشمہ ساز خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد بتائے تو غریب حسرتؔ موہانی کیا کرلیں گے۔

اردو کی ابتدا سے متعلق آپ کے ممتاز اور ہردل عزیز شیخ الجامعہ اور میرے عزیز دوست پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی ایک نہایت مختصر لیکن جامع تحریر نظر سے گزری۔ یہ موصوف کے ایک گراں قدر مقالہ[1] کا جز ہے جو امریکہ کے ایک موقر علمی رسالہ میں شائع ہوا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی مثل اسی طرح کی کسی تحریر کو پاکر کسی نے وضع کردی ہوگی۔ اردو کے طالب علم اس تحریر کو ذہن نشین کرلیں گے تو میرے خیال میں اس موضوع پر وہ کسی محفل یا محاذ پر بند نہیں رہیں گے۔ مذکورہ اقتباس حسب ذیل ہے:

> ''........تاریخی اعتبار سے اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ جیسا کہ اس کے نام ریختہ سے بھی ظاہر ہے۔ اس کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے۔ جو نواح دہلی میں رائج ہے۔ ایک بازاری بولی کی حیثیت سے اس کا ارتقا بارہویں صدی عیسوی کے دوران مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے بعد ہوا۔ ارتقائی منازل سے گزرنے کے بعد دکن میں پندرہویں اور سولہویں صدیوں کے دوران اس نے مکمل ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اس کا مرکز پھر شمال کی جانب منتقل ہوگیا۔ اگر چہ اس کی اساس ہند آریائی ہے، لیکن اس کے علمی الفاظ کا ذخیرہ اور اس کی ادبی روایات خصوصی طور پر فارسی نژاد ہیں۔ دہلی کی یہ دبی ادبی زبان کی حیثیت سے چارسو سال تک نشوونما پاتی رہی۔

---

[1] A Phonological and Phonetic Study of the Word in Urdu اسے شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے 1954ء میں شائع کیا تھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کے ڈی لٹ کے مقالہ کا ایک حصہ ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اس کا ترجمہ ''اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے کیا۔ اسے شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے 1986ء میں شائع کیا۔

یہاں تک کہ 1800ء کے لگ بھگ ادبی اُفق پر جدید ہندی (کھڑی بولی ہندی) طلوع ہوئی۔ اس وقت سے اردو اور ہندی کا ارتقا تقریباً متوازی خطوط پر ہوتا رہا ہے۔ اپنی مشترک اساس (کھڑی بولی) کے پیش نظر دونوں زبانیں اکثر 'ہندستانی' کے نام سے یاد کی جاتی رہی ہیں۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد اس صورت حال میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔'' دستورِ ہند میں اردو کو پندرہ خاص زبانوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔''

علاقائی بولی کشمیری کے باوجود ریاست جموں اور کشمیر نے اسے اپنی سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ 1961ء کی مردم شماری کے مطابق یہ دو کروڑ تینتیس لاکھ کی (اور 1971ء کی حالیہ مردم شماری کے مطابق تقریباً دو کروڑ چھیاسی لاکھ ہے) مادری زبان ہے۔ اس کے بولنے والے یوں تو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا اجتماع اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کی ریاستوں میں پایا جاتا ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو پاکستان میں بھی رائج ہے۔ اگرچہ وہاں کی علاقائی زبانیں پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی ہیں۔'' (منقول از رسالہ جامعہ دہلی، بابت ماہ جون 1973ء)

اردو کی ترکیب و تشکیل جیسے کھلے بندوں اور کھلے بازار ہوئی اور اس کو قبول عام نصیب ہوا۔ یہ اسی کا تقاضا تھا کہ اس کی تہذیب اور آئین بندی میں غیر معمولی احتیاط برتی گئی اور اہتمام کیا گیا اور اس کو اعلیٰ سطح اور اعلیٰ ذوق کے مطابق رکھنے کے لیے زبان و ادب کے علما اور نکتہ رسوں نے اس کے اردگرد ممنوعات و مستحبات کے مناسب دیوار و در قائم کیے۔ مثالی طور پر اردو مشاعرے اس لیے نہیں مقبول ہیں کہ ان میں اشعار پڑھے یا گائے جاتے ہیں بلکہ اس لیے سدا بہار ہوگئے ہیں کہ ان میں غزل پڑھی اور پیش کی جاتی ہے۔ اس کے ہر شعر کا مختلف اور متنوع ہونا بعض حضرات کے نزدیک اس کا بڑا نقص ہے، لیکن یہی اس کی مقبولیت کا بڑا سبب ہے۔ اگر

کسی مشاعرے میں طرح طرح کی نظموں کے پیش کیے جانے کا التزام رکھا جائے اور اس کا اعلان کیا جائے تو غالباً شائقین کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔

اردو شاعری کے معیار کو بلند کرنے اور رکھنے میں غزل کا بڑا قیمتی حصہ ہے۔ غزل صنفِ کلام ہی نہیں کلام کا معیار بھی ہے۔ طریقِ کار غلط ہو یا صحیح ہم ہر صنف کلام کو شعوری یا غیر شعوری طور پر پرکھتے ہیں۔ غزل ہی کے دیے ہوئے نغمۂ جبریل یا صوتِ اسرافیل سے! آپ نے دیکھا ہوگا مشاعروں میں بیش تر شرکا شاعر و شاعری یا موسیقی میں کوئی قابلِ لحاظ درک یا دلچسپی نہیں رکھتے، لیکن معمولی یا غیر معمولی اشعار سن کر اپنے ردّعمل کا اظہار فی الفور کرتے ہیں اور صحیح کرتے ہیں۔ چنانچہ اردو اپنا رشتہ جتنا عوام سے استوار رکھتی ہے اور ان کے ذوق کو تربیت دیتی ہے، اتنا ہی ان پابندیوں کا لحاظ رکھتی ہے اور ہر کس و ناکس سے منواتی رہتی ہے جو خواص نے اس کو 'بت بے پیر' ہونے سے باز رہنے اور باز رکھنے کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ اردو کو ناقابلِ تسخیر بنا دینے میں غزل کا جیسا اور جتنا حصہ ہے اتنا کسی اور کا نہیں۔

آپ نے موسیقی اور مشاعرے دونوں تقریبات میں شرکت کی ہوگی۔ دونوں میں شریک عوام کا ردّعمل بھی نوٹ کیا ہوگا۔ راگ سے اَن پڑھ بھی متاثر ہوتے ہیں شاید جانور بھی۔ لیکن یہ اردو غزل کا اعجاز ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگ، اکثر اَن پڑھ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ راگ سے صرف متاثر یا لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دوسری طرف غزل کے اشعار سے لطف ہی نہیں اٹھاتے بلکہ اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے بے منّتِ غیرے کچھ اچھی اور قیمتی باتیں اکتساب کیں، موسیقی کی تقریب ختم ہونے پر رات کا اثر ختم ہو جاتا ہے لیکن مشاعرے میں سنا اور سمجھا ہوا شعر جلد فراموش نہیں ہوتا اور ایک معمولی شخص کے لیے امید و اعتماد کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

خواص اور عوام سے یکساں رشتہ رکھنے کی جو خصوصیت اردو زبان و ادب میں ملتی ہے وہ تاریخ ہے۔ ان آزاد عوامل کی کارفرمائی کی جس کی بدولت یہ زبان ریختہ، ہندی، ہندوی، ہندستانی وغیرہ کی منزلوں سے گزرتی اردوئے معلّٰی یا 'ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی' کے درجہ تک پہنچی۔ اردو کے طالب علم کو سالک کی مانند ان منازل اور مقامات سے پورے طور پر باخبر رہنا چاہیے۔

اردو کی ابتدائی اشاعت صوفیائے کرام کے رشد و ہدایت کے مشن، دہلی کے حکمرانوں کی کسی نہ کسی شکل میں دکن سے آویزش و آمیزش اور پھیلتی ہوئی معاشرت کے نوع بہ نوع تقاضوں کی بنا پر ہوئی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی درباروں میں اس کو غالباً سب سے پہلے حکمرانِ وقت کی سرپرستی نصیب ہوئی اور تصانیف کا آغاز ہوا۔ یہ تصانیف بیش تر مذہب و اخلاق سے متعلق تھیں۔ طویل تاریخی سفر پر کیسے شب و روز اور نشیب و فراز سے گزرتی، نوحہ و نغمہ کو اپناتی، ہمدمی اور یک جہتی کا پیام لیے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچی۔ دربار میں مستحقِ اکرام اور بازار میں وسیلۂ کاروبار ٹھیری۔ کیسا زرِ مبادلہ اس کے پاس تھا، کیسا یہ سودا تھا، جس نے اسے ہر لین دین میں معین اور کسی کاروبار میں اسے بند نہ پایا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اپنی پیدائش و تربیت کی کتنی کم مدت میں یہ اس قابل ہوگئی کہ ایک طرف کوچہ و بازار میں سب کی منہ بولی مانی گئی، دوسری طرف سرکار دربار میں منزلت پاتی ہے۔ تیسری جانب خانقاہوں میں بھولے بھٹکوں اور درماندہ و پس ماندہ کو نجات و نیکی کا مژدہ سناتی ہے۔

قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں اپنے مستقر دہلی سے دور اور کتنی دور اردو تصنیفی اور غالباً سب سے پہلے مذہبی زبان کا امتیاز حاصل کرتی ہے۔ مرکز سے دور دراز فاصلہ پر جتنے اردو کے اسالیب اور اسکول ظہور میں آئے، استناد حاصل کرنے کے لیے سب کو دہلی کی سیادت تسلیم کرنی پڑتی تھی، اور دہلی سے منسلک رہنا پڑتا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت سے وابستہ ریاستیں خودمختار ہونے لگیں، لیکن جہاں تک تہذیب و ثقافت کے آداب یا حکمرانی کے آئین و ضوابط کا تعلق تھا، دہلی کی کارفرمائی قائم رہی۔ 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ کمپنی کے انگریز ملازموں کو ہندوستان کی اس وقت کی مانی ہوئی زبان اردو سے آشنا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس میں تعلیم و تراجم کا کام ڈاکٹر گلکرسٹ کی نگرانی میں دہلی ہی کے اہلِ زبان اور اہلِ قلم کے سپرد کیا گیا۔ پنجاب میں کرنل ہال رائڈ کی ہدایت سے اردو شاعری میں نیچرل نظموں کی داغ بیل پڑی۔ وہاں بھی حالؔی اور آزادؔ کا تصرف نمایاں تھا۔ قدیم دہلی کالج میں پروفیسر رام چندر نے اردو کو کالج کے منازل میں وسیلۂ تعلیم قرار دینے کا سب سے پہلا اور کامیاب تجربہ کیا۔ وہاں سے غالبؔ کے خطوط کے سایے، سرسید کی قیادت اور حالؔی کی رفاقت میں اردو علی گڑھ پہنچی۔

علی گڑھ نے اردو کی حمایت کی اور اس کی توسیع اور ترقی کی جو خدمات انجام دیں، ان کی بنا پر یہ کہنا قرینِ حقیقت ہوگا کہ اردو Renaissance (نشاۃ الثانیہ) علی گڑھ میں طلوع ہوا۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ Reformation (اصلاحِ دین) کا کام بھی جتنا اور جیسا علی گڑھ میں ہوا وہ بھی نا قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ Reformation یا اصلاحِ دین ایک اصطلاح بھی ہے اور تحریک بھی، میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ علی گڑھ نے تمام و کمال وہ خدمات انجام دیں جو یورپ میں لوتھر کی اس تحریک سے بروئے کار آئیں۔ کہنا صرف اتنا اور یہ ہے کہ سرسید نے مذہب کی جو تعبیر کی، اس سے اس وقت کے ذہین مسلمان نوجوانوں کو مذہب کی طرف سے بدگمان یا بے راہ ہونے سے بڑی حد تک بچالیا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج کل عصری مسائل کی طرف سے مسلمان نوجوانوں کی رہبری جن خطوط پر کی جاتی ہے کم وبیش وہی نہیں ہیں جو سرسید کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

ایک مدت تک کسی مخالفت کے بغیر اردو ہر سطح پر، ہر مذہب وملت کی تحریک وتنظیم کی اشاعت میں تصانیف، رسائل اور اخبارات کے ذریعہ معین ہوتی رہی، آج بھی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غیر مسلم مذاہب کی ترویج واشاعت کی جو خدمات اردو نے انجام دیں ہیں وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں سے کسی ایک کے بھی حصہ میں نہیں آئیں۔ اردو کے اس طویل سفر میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، کہیں کوئی قابلِ لحاظ مزاحمت پیش نہیں آئی تھی۔ بلکہ یہ شمالی ہند کی سب سے مقبول اور کارآمد زبان مانی جاتی تھی۔ انگریزی کے ساتھ سرکاری زبان بھی مانی جاتی تھی۔

اردو کا یہ کارواں ملک کے دور اور نزدیک خطوں کو اپنی خدمت اور خوش نوائی سے بہرہ مند کرتا سرگرم سفر تھا کہ 'ناگہ زمیں' ہندی کی ترویج وترقی کی تحریک، اردو ہندی مناقشہ کی شکل میں اس طرح پھیلی کہ اس کے رو براہ ہونے کی اب تک کوئی شکل نکل نہ سکی، اور حالات کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ مصالحت کی کب اور کیا صورت بروئے کار آئے گی۔ میکڈانلڈ، محسن الملک ٹکر یا Confrontation میں اردو ہندی کا شاخ سانہ تھا۔ جس میں نواب محسن الملک کو لیفٹیننٹ گورنر انٹونی میکڈانلڈ کے جبر وجبروت کے سامنے اور ایم۔ اے۔ او کالج

کی خیر و عافیت کے پیش نظر سپر ڈالنی پڑی۔ اردو کی غالباً یہ پہلی لڑائی تھی جو حکومت نے اپنے محاذ سے اور علی گڑھ نے اپنی جائے پناہ سے لڑی تھی، اور کتنا حیرت ناک اور مایوس کن یہ تصور ہے کہ آج آزادی اور جمہوریت کے کم و بیش پچیس سال بعد اردو کی تقدیر نہ بدلی اور بدلی بھی تو کیا سے کیا ہو گئی۔

کیسے وقت اور کس عالم میں سرسید نے آج سے بہت پہلے اس اندیشہ کو ظاہر کیا تھا کہ اردو ہندی کا مناقشہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے نامبارک ثابت ہوگا، اور ایک دوسرے سے مشتبہ و منحرف رہنے کی خلیج بن جائے گا۔ کیسی محرومی اور بدنصیبی ہے کہ انسانیت اور آزادی کے دور میں یہ خلیج ختم ہو جانے کی بجائے وسیع ہوتی جا رہی ہے، اور کیسی عبرت ناک ہے یہ صورت حال کہ اس خلیج کو جوں کا توں رکھنے پر بعض سماج دشمن عناصر و عوامل اپنی سیاسی اہمیت باقی و برقرار رکھنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

سرسید کے دم قدم سے علی گڑھ میں اردو کا نام اور کام اور اردو کی اعلیٰ صلاحیتیں اس طرح اور اس درجہ روشن مقبول اور معتبر ہوئیں کہ ان کی وفات کے پچیس سال کے اندر اندر حیدرآباد دکن میں وہ تاریخی اور بے مثل علمی تجربہ اور کارنامہ ظہور میں آیا جو عثمانیہ یونیورسٹی کے نام سے معروف اور دور دور تک مشہور ہوا، لیکن آزادی کے عقب اور عواقب میں اس کا یہ غیر معمولی اور مبارک امتیاز ختم ہو گیا کہ وہ ہندوستان کی سب سے نوخیز اور ملک کی مخصوص لسانی اور تاریخی تقاضوں کے مطابق ایک ہمہ آہنگ اور ہمہ گیر زبان اردو کی اوّلین کامیاب اور معیاری یونیورسٹی تھی اور اس کا ایک قیمتی دارالترجمہ اور اس کی تالیف اور تراجم کا قیمتی ذخیرہ تھا جو تلف ہو گیا یا کر دیا گیا۔ یہ حادثہ کہیں اور پیش آیا ہوتا تو اس کا شاید اتنا تکلیف دہ احساس نہ ہوتا جتنا اپنے ہی ملک میں ہوا جو قدیم سے علم و انسانیت کا گہوارہ رہا تھا۔ جس کے بطن سے اردو پیدا ہوئی تھی اور جس نے مدتوں نوزائیدہ کی گہوارۂ جنبانی کی تھی۔

آزادی سے پہلے حیدرآباد کی علمی، تہذیبی اور 'صنادید عجم' کی دی ہوئی وقار و افتخار کی روایات شرفا اور اربابِ علم و فن کے آداب و انداز، وہاں کی عمارتیں، قدرتی مناظر اور عام رکھ رکھاؤ سے متاثر اور مستفید ہو چکا ہوں، پھر اس کی مسماری دیکھی۔ اگر کوئی کہے کہ یہ مسماری عظیم تر

آبادکاری کا پیش خیمہ ہے تو میں جھگڑوں گا نہیں، لیکن کس درد سے اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے:

سواد رومتہ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دل آویزی

میں نے سوادِ رومتہ الکبریٰ نہیں دیکھا ہے، لیکن دلّی کی نسبت سے حیدرآباد کی عبرت، عظمت اور شانِ دل آویزی آنکھوں کے سامنے اکثر پھر جایا کرتی ہے۔ جدید کو بالعموم قدیم پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ متحرک اور آگے بڑھنے والا ہوتا ہے اور قدیم کے سکون یا جمود کی تلافی کرتا رہتا ہے، لیکن شاعر کو کیا کہیے وہ حقائق کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ زماں اور مکاں کے قیود سے بے نیاز اور باہر ہو جاتے ہیں۔ بڑے شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہندو مسلمان نہیں ہوتے۔

آزادی ملنے سے پہلے اردو کا جو حال تھا اور آزادی ملنے کے بعد وہ جس حالت کو پہنچا دی گئی اس کا کچھ تصور اس شعر سے ہو سکتا ہے:

دیروز چناں بدی کہ کس چوں تو نہ بود
امروز چناں شدی کہ کس چوں تو مباد

یہ کچھ اردو ہی کی تصویر نہیں ہے۔ ہماری آپ کی بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اردو کا مولد و مسکن دہلی و نواحِ دہلی اور مرکزِ ثقل بحیثیت مجموعی اتر پردیش رہا ہے۔ بہار، آندھرا پردیش اور مہاراشٹر بھی اردو کے ہر طرح کے کاروبار کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آزادی ملنے کے بعد حکومت اتر پردیش نے مسلسل اور منظم طور پر ایک سوچے سمجھے پلان کے ماتحت اپنے بے مواخذہ و بے لگام اختیار و اقتدار کو کام میں لا کر اردو کو جو ہمہ جہتی نقصان پہنچایا وہ مہذب ہندوستان میں اسی کا کارنامہ ہو سکتا تھا۔ اربابِ انصاف اور اردو کا بھلا چاہنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس حادثے سے واقف، شرمندہ یا بیزار نہ ہو۔ حکومت کے اس طریقۂ کار سے جسے کسی حال میں نہیں سراہا جا سکتا یہ نقصان پہنچا کہ بچوں کی کم و بیش دو نسلیں مادری زبان سے محروم ہو گئیں۔ ایسے الم ناک حادثہ کو مہذب دنیا میں شاید ہی ارباب انصاف و انسانیت نے نظر انداز کیا ہو۔ چنانچہ اردو سے تعلق رکھنے والے دور اور نزدیک کے جتنے لوگ تھے

وہ سب ان حقوق اور حوصلوں سے محروم ہو گئے جو اب تک اردو کی چلن سے ان کو حاصل تھے۔ جس اردو کو بنانے سنوارنے اور مفید سے مفید تر بنانے میں ہندوستان کے ہر مذہب اور مسلک کے پیرو یکساں طور پر صدیوں شریک رہے، وہ ایک متاعِ بے قیمت ہو کر رہ گئی۔ حصول آزادی کے بعد اپنے ہی دیش کی کسی معتبر زبان کو جس نے آزادی کی جنگ میں تاریخی رول ادا کیا ہو۔ جنگی قیدی (POW) کی حیثیت دے دینا کچھ کم دلچسپ یا عبرت ناک تجربہ نہیں ہے۔

اردو سے متعلق بعض باتیں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ مثلاً وہ کلیتہً ہندستانی نژاد ہے اور بدلے اور بدلتے ہوئے حالات کے صحیح تقاضوں کے ماتحت وجود میں آئی۔ وہ بے شمار ہندستانی مسلمانوں کی مادری زبان ہونے کے علاوہ ان کی علمی، تعلیمی، تہذیبی اور مذہبی زبان بھی ہے اور ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ معاصر زبانوں میں غیر معمولی ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ وہ ایک طور پر بیرون ہندوستان کی مقتدر زبانوں اور تہذیبوں کے درمیان رابطہ اور خیر سگالی کی زبان ہے۔ یہ امتیاز ہندوستان کی کسی رائج الوقت زبان کو حاصل نہیں ہے۔

اردو کی تائید، توصیف یا تعزیت میں سیاست کے سقراط یا سکندر جو کلمات ارشاد فرماتے رہتے ہیں وہ سر آنکھوں پر، لیکن اس طفل تسلّی یا تضیع اوقات کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت ایسی ریاستوں میں نہیں دی جاتی، جہاں اردو سے کام لینے والوں کی کثیر اور قابلِ لحاظ تعداد پائی جاتی ہے۔ اس کے بغیر اردو نہ محفوظ ہے نہ ترقی کر سکتی ہے، نہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتی ہے جو اس سے فائدہ اٹھانے کے پورے طور پر مستحق ہیں۔ اس کے بعد کے مرحلے ابتدا سے لے کر اردو یونیورسٹی تک آسان ہو جائیں گے اور ہر اعتبار سے مفید ہوں گے۔ اردو کا یہ قانونی اور شہری حق ہے کہ اس کو وہ حیثیت دی جائے جس سے اس کو خاطر خواہ فائدہ اٹھانے اور پہنچانے کا موقع حاصل ہو، اور یہ درجہ سرکاری بخشش سے نہیں سرکاری حیثیت پانے سے ہوگا۔ کون نہیں جانتا کہ موجودہ ہندی کو جو سرکاری حیثیت اور سر پرستی حاصل ہے اگر وہ اس سے محروم کر دی جائے تو اس کا حال اردو سے کچھ زیادہ ہی قابلِ رحم ہوگا۔

کچھ دنوں سے اردو یونیورسٹی کے قیام کی تحریک عام ہو رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کا تصور جتنا ولولہ انگیز ہے اتنا ہی ہماری سنجیدہ غور و فکر کا محتاج ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب تک ملک میں

اردو میڈیم کے کافی اسکول اور کالج نہ ہوں گے، اردو یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے کہاں سے آئیں گے۔ظاہر ہے کہ اس طرح کے ادارے قائم کرنا اور چلانا حکومت کی تائید اور ہمدردی کے بغیر ناممکن ہے، لیکن اس سلسلے میں جو تجویز جامعہ (دہلی) کی سب سے بڑی مجلس 'انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ' دہلی نے پیش کی ہے، وہ ہماری بیش از بیش تائید کی مستحق ہے۔ ارباب جامعہ ملیہ نے اپنے مدلل معروضات حسب ذیل الفاظ میں پیش کیے ہیں۔ یہ اتنے دقیع ہیں کہ اتنے معروضات نہیں معلوم ہوتے جتنے ایک قومی حکومت کو اچھے طریقے اور راستے اختیار کرنے کی ہدایت اور رہبری، اعلیٰ تعلیم گاہ کا یہی رول بھی ہے۔

حسب ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''اردو یونیورسٹی کا مطالبہ کرنے والوں کو اس خبر سے خوشی ہوگی کہ 12/مئی 1973ء کو جامعہ کی سب سے بڑی مجلس 'انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ' نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ چوں کہ جامعہ ملیہ میں ابتدا سے اردو زبان ذریعۂ تعلیم رہی ہے اور یہ اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔اس لیے مرکزی حکومت سے درخواست کی جاتی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرکزی اردو یونیورسٹی کی حیثیت سے چارٹر عطا کیا جائے۔ نیز یہ کہ اس یونیورسٹی کو ملک کے ایسے تمام تعلیمی اداروں کا الحاق کرنے کا اختیار بھی دیا جائے جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو اور اسی کے ساتھ جامعہ کی تعلیمی اور اقامتی، کردار کو برقرار رکھا جائے۔

..........ذاکر صاحب مرحوم نے جامعہ ملیہ کو سرسید مرحوم کے اردو یونیورسٹی کے تصور، گاندھی جی کے نیشنل سوشل سروس کی تربیت گاہ کے خیال اور خود قومی یونیورسٹی کے متعلق اپنے نظریے کو اس طرح ہم آہنگ کرکے اسے اپنے قدیم تہذیب وتمدن کے صحت مند عناصر اور جدید عالمی تہذیب کے اعلیٰ تصورات سے فیضان حاصل ہوتا رہے۔ ترقی دینے کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں قائم کیا تھا، تقریباً چالیس سال تک جامعہ اپنے

محدود وسائل کے باوجود اس کے مطابق کام کرتی رہی۔ 1962ء کے بعد حالات قدرے بہتر ہوئے تو اس نے اپنے ان بنیادی مقاصد کو قدرے وسیع پیمانے پر پورا کرنے کی جدوجہد کی اور یہ جدوجہد جاری ہے، لیکن ایک چارٹرڈ یونیورسٹی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کارکن اپنے حوصلوں کو بروئے کار لانے کے لیے وہ امکانات اور مواقع نہیں دیکھتے جو ملک میں قومی تعلیم کے مجوزہ بڑے منصوبے کے تحت انھیں حاصل ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کے کارکن اور بہی خواہ محسوس کرتے ہیں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ جب جامعہ نئی بنیادوں پر ایک مکمل یونیورسٹی کا مرتبہ حاصل کر کے اپنے ان خوابوں کی تعبیر دیکھ سکتی ہے جو اس کے بانیوں کے خاص طور سے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے ذہن میں تھے، اور جنھیں مختلف عوامل کے سبب وہ پوری طرح عمل میں نہیں لا سکتے تھے......قومی تعمیر و ترقی کے اس عظیم منصوبے کے تحت جسے حکومت ہند شروع کرنے والی ہے، سیکولرزم، جمہوری طرزِ زندگی اور سماجی و معاشی انصاف کے اصولوں کے لیے جامعہ ملیہ ایک لیبارٹری کا کام انجام دے سکتی ہے کہ اس کی تاریخ اس کے آدرش اور اس کے اب تک کے کام اس بات کے شاہد ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے ماضی کے کارناموں کے پیشِ نظر اب بڑے پیمانے پر مرکزی اردو یونیورسٹی کی حیثیت سے جدید علوم کی تدریس و تعلیم کا انتظام کر سکتی ہے۔ یہ درس گاہ اس ہندو مسلم تہذیب یا گنگا جمنی ہندستانی تہذیب کا مرکز بن کر سیکولر طرزِ فکر اور قومی یک جہتی کے نظریے کی روشنی دور دور تک پھیلا سکتی ہے۔ جسے نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ شمالی مغربی ہندوستان کے بے شمار افراد اور پورے ملک میں بعض حلقے اور علاقے اپنے ماضی کی ناقابلِ تقسیم میراث تصور کرتے ہیں۔''

(منقول از رسالہ جامعہ (دہلی) بابت ماہ جولائی 1973 صفحات 5-4)

اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے کام میں لانے والے غیر مسلموں کا شمار کم نہیں ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے یہ تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کے بعد حالات کا رنگ ورُخ کچھ اس طرح بدلا کہ یہ تعداد بہت کم رہ گئی۔ بوڑھوں کو سب سے وفادار رفیق ان کے بیتے دنوں کی یادیں ہوتی ہیں، خاص طور پر عزیزوں اور بزرگوں کی دلیری اور دلیری کی یادیں اور باتیں۔ حافظہ کا اعتبار کروں تو (غالبًا) سرسپرو کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ''اردو ہماری مادری زبان ہے اور اس کی حمایت میں خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے۔'' اس بات کو اور اس طرح کی باتوں کو یاد کر کے مایوس اور ملول نہ ہونا چاہیے بلکہ اس خیال سے خوش اور پُراُمید رہنا چاہیے کہ ہم اور ہماری زندگی ایسی یادوں اور باتوں سے بہرہ مند رہ چکی ہے۔ کتنے دنوں بعد اور کس موقع پر سرسپرو یاد آ گئے اور ان کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکا، ورنہ کہنے یہ جا رہا تھا کہ زبان اور شعر وادب میں جو مہارت اور شہرت آج بھی غیر مسلم اہل قلم اور شاعروں کو حاصل ہے اور جس طرح ان کے اس رتبۂ عالی کا ہمیشہ اور ہر سطح پر اعتبار اور اعتراف کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے۔ ہندوستان کی مروجہ زبانوں میں اردو کے سوا کوئی دوسری ایسی زبان شاید نہ ملے جس میں اتنے مختلف المذاہب اور مختلف الدیار اور کثیر تعداد میں ادیب، شاعر اور فن کار کو ملک وحکومت کے دیے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ امتیازات نصیب ہوئے ہوں اور ان کا شمار اردو کے جید اور مسلم الثبوت اساتذہ میں نہ ہوتا ہو۔

مرکزی حکومت نے کچھ دنوں سے اتر پردیش میں اردو کی توسیع وترقی کے لیے جو گراں بہا اور عدیم المثال عطیات مرحمت کیے ہیں اس کے لیے اردو کا ہر بہی خواہ شکر گزار اور احسان مند ہے۔ اس سے اردو کے خدمت گزاروں یا محنت کشوں کو جو صلے اور انعامات ملے، اس سے ان کی بڑی دل جوئی اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ جن حوادث سے آج ہم آپ دوچار ہیں، اس میں ستائش کی تمنا اتنی اہم نہیں رہ گئی ہے جتنی صلے کی پروا، نصابی کتابیں اور لغات کی تدوین کا پروگرام، ابتدائی ثانوی اور دوسرے اونچے نیچے درجوں تک کی تعلیم کا انتظام، معلموں کا تقرر، ضروری کتابوں کی فراہمی، یہ سب تسلیم، لیکن سوال اس کا ہے کہ سہولتوں سے فائدہ اٹھانے والے کہاں سے آئیں گے۔ جب اردو کی تحصیل سے طالب علم کو روزی ملے گی نہ روزگار، صحرا میں اذان کا کیا فائدہ! اردو کا ہر خیر اندیش جاننا چاہے گا کہ اردو کا Locus Stand

(حیثیت مسلمہ) حکومت کی نظر میں کیا ہے۔ ملک کی پندرہویں یا سولہویں زبان ہونا تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔ یہ اور بات ہے اور بہت اچھی بات ہے کہ اس اسکیم میں جو لوگ کام کریں گے ان کی اور چند اور اہلِ علم کی کفالت ہوتی رہے گی۔ ایسے میں شاید اردو کے قحط زدہ زبان ہونے کا اعلان کرنا پڑے اور اس کی آبادکاری کی ذمہ داری حکومت کو اُٹھانا پڑے۔ طالب علم اور ان کے سرپرست کتنی ہی موٹی عقل کے کیوں نہ ہوں جب یہ کہیں گے کہ اردو سیکھنے سے ان کا مقصد روزگار حاصل کرنا ہے، عندالناس مشکور اور عنداللہ ماجور ہونا نہیں ہے، تو اس کا جواب ہم کیا دیں گے؟

ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر یا 'خلاصۂ فریاد' کو اربابِ اختیار سمجھتے نہ ہوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کو اس کا اندیشہ ہو کہ یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ میں رورعایت برتنے سے ملک کا فلاں سیکشن برہم ہوگا اور اردو کو وہ حیثیت دینی جس کے ہم ملتجی اور منتظر ہیں یعنی اس کو بعض علاقوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دینا، اس اقدام سے ملک کی فلاں جماعت بیزار ہوگی۔ رہیں کچھ اور باتیں، ان کی بھی کچھ نزاکتیں ہوں گی جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ اگر ایسا ہے تو سوال یہ ہے کہ جس حکومت کی اتنی بھاری اکثریت ہو اور وہ سیکولر اور جمہوری اقتدار کے تحفظ اور تعمیل پر اپنے کو مامور سمجھتی ہو، اس کا غیر جمہوری اور غیر سیکولر عوامل کے دباؤ میں ہونا کہاں تک قرینِ اخلاق و انصاف ہے۔ جہاں تک ہمارے اپنے ملک کا تعلق ہے اکثریت اور اقلیت کے بارے میں میرا ذاتی خیال کچھ اس طرح کا ہے کہ ہماری اقلیت کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ تعداد، تہذیب اور اعلیٰ خدمات کے اعتبار سے اکثریت کے مقابلے میں اتنی اقلیت نہیں ہے جتنی اکثریت نمبر 2 ہے۔ ہندوستان کی یہ اقلیت دنیا کی بہت سی مسلم حکومتوں کی آبادی، تہذیب اور کارہائے جلیلہ کے اعتبار سے ممتاز تر حیثیت رکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس امتیاز پر ہم سے زیادہ ہماری حکومت کو خوش ہونا چاہیے اور اس کی ذمہ داری محسوس کرنا چاہیے۔

حکومت کا سیکولر اور جمہوری ہونا ہر اعتبار سے مبارک اور مسلّم لیکن اس کا سیکولر اور جمہوری ہونا مشینی نہیں انسانی اور اخلاقی ہے۔ حکومت قانون ہی کی پابند نہیں ہوتی، Equity

یعنی مہر و معدلت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ معدلت، قانون اور حکومت دونوں کو توانا اور متوازن رکھتی ہے۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے انسانی اور اخلاقی ہونے کی ایک پہچان یہ ہوگی کہ اس کے تحت اقلیت یا ترقی نایافتہ گروہ کے اساسی حقوق کہاں تک محفوظ ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ جمہوریت اور سیکولرزم کے حاصل ضرب ہوگئے۔ مہذب حکومت اور سماج میں اکثریت اور اقلیت کا رشتہ اتنا اعداد کا نہیں ہوتا جتنا اخلاق کا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلم ہے اس لیے قومی بھی ہے نہ یہ کہ قومی ہے اس لیے مسلم نہیں۔ اقلیت اکثریت کی منافی یا ضد نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اقدار اور کردار کی پابند رہتے ہوئے بھی قومی ہوتی ہے اور رہ سکتی ہے اور اکثریت مذہبی ہوتے ہوئے سیکولر اور جمہوری رہ سکتی ہے بشرطیکہ اکثریت، اقلیت دونوں اپنے اور ایک دوسرے کے ساتھ منصفی اور ایمان داری برتیں، دونوں کا رشتہ اگر اخلاق وانسانیت پر نہیں صرف تعداد پر ہو تو اس کی حیثیت ایک طور پر جگن ناتھ جی کے اس رتھ کی ہوگی جس کے پہیے کے نیچے آجانے سے نروان نصیب ہوتا ہے، لیکن نروان یا نجات پانے کا مسئلہ تو بعد کی بات ہے جان وجہاں سے جانا فی الفور ہوتا ہے۔ یوں بھی ہر شخص نجات اور نروان ہر وقت اور ہر قیمت پر نہیں چاہتا۔ دوسری طرف اگر اس کا مدار انسانیت کے تقاضوں پر ہے تو یہ جمہوریت ہی نہیں رام راج یا حکومت الٰہیہ ہے!

یہ سرسید کی کھری اور کھڑی اردو تھی جس نے اس کو مخصوص دبستانوں مثلاً دہلی، لکھنؤ، آگرہ، عظیم آباد، رام پور وغیرہ سے نکال کر عام کیا جن میں وہ ایک طرح سے اسیر ہوگئی تھی جس طرح ملک کی دوسری زبانیں اور باشندے ذات پات اور چھوت چھات کے زندانوں میں مقید تھے۔ سرسید کی دی ہوئی اردو کا منشور یہ تھا کہ اب سے اردو کا دبستاں جغرافیائی حدود کا پابند یا صنائع بدائع کا مینا بازار نہیں بلکہ زندگی، زمانہ اور علم وادب کے تقاضوں کی کھلی اور آزاد فضا ہوگی۔ سرسید سے پہلے اردو نثر اردو شاعری کے روپ کی تھی اور غالؔب سے پہلے کچھ ایسی قابلِ اعتنا بھی نہ تھی۔ ہر چھوٹے بڑے کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کی نثر کہاں تک شاعری سے قریب تھی۔ یہ بڑی حد تک فارسی کا تصرف تھا جس کی نثر بالعموم شاعرانہ اور پُر تکلف ہوتی تھی۔ سرسید نے علی گڑھ تحریک کو اپنی اردو نثر اور اردو نثر کو علی گڑھ سے توانائی نہ پہنچائی ہوتی اور دونوں کو ایک دوسرے کے لیے مفید اور

مقبول نہ بنا دیا ہوتا تو جدید اردو کو وہ پر و بال نصیب نہ ہوتے جن کی بدولت آج سے پہلے تک ملک کی معاصر زبانوں میں وہ سر محفل نظر آتی تھی۔ سرسید اور ان کے رفقا نے اردو کو سنجیدہ اور علمی زبان بنانے کی مہم کو جس طرح اور جتنی جلد کامیاب بنایا یہ اسی کا فیضان تھا کہ حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی وجود میں آئی جس کے قیام، ترقی اور شہرت میں علی گڑھ کے اکابر کا معمولی حصہ نہیں ہے۔

دوستو! سلسلے کی بہت سی باتوں سے دفعتاً قطع نظر کرکے، آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اردو کو ایک معیاری اور ماڈرن زبان بنانے میں انگریزی کا بڑا اہم اور گراں قدر حصہ ہے۔ احسان لینے یا ماننے میں دیسی بدیسی کا فرق نہ کرنا چاہیے۔ اچھائی، برائی، دیس بدیس کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ آزادی ملنے کے بعد اردو اور انگریزی دونوں عتاب میں آئیں۔ ایک عملاً دوسری رسماً انگریزی کا کچھ نہیں بگڑا، اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ گیا۔ انگریزی حکومت، انگریزی منصوبوں اور انگریزی مصنوعات کا جو حشر ہو انگریزی زبان کی وقعت اور اہمیت میں ایک نامعلوم مدت تک کوئی فرق نہ آئے گا۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ اردو نے براہِ راست اور بے تکلف انگریزی سے استفادہ نہ کیا ہوتا تو وہ شعر و شاعری کی زبان سے آگے نہ بڑھ سکتی۔ اردو کو فارسی اور عربی سے جو کچھ لینا تھا وہ لے چکی۔ اب اسے انگریزی اور مغرب کی دوسری زبانوں اور علوم سے بہرہ یاب ہونا ہے۔ اردو کو سہل سادہ اور موثر و محکم اسلوب انگریزی اور مغربی طرز فکر و نظر کا دیا ہوا ہے۔ اعلیٰ علوم و ادب جس مرتبہ کی زبانوں کے متقاضی ہوتے ہیں وہ بیش تر مغرب کی زبانیں ہیں جن میں انگریزی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات میں ہی نہیں کہتا وہ حضرات مجھ سے بھی زیادہ اس کے قائل ہیں جو عادت یا حالات سے مجبور ہو کر انگریزی کے خلاف واسوخت تصنیف کیا کرتے ہیں۔

اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ہم اور ہماری زبانیں انگریزی کی جتنی محتاج ہیں اتنی انگریزی ہماری اور ہماری زبانوں کی محتاج نہیں ہے۔ شمالی ہند ملک کی اہم زبانوں کا خطہ مانا گیا ہے۔ اس میں اردو کو جو وقعت نصیب رہی اور ناسازگار حالات کے باوجود کسی نہ کسی اعتبار سے آج بھی حاصل ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے انگریزی سے ہر طرح کا فائدہ ہر سطح پر جس آزادی سے اٹھایا اتنا ملک کی دوسری زبانوں نے شاید ہی اٹھایا ہو۔ مغربی ممالک کی بیش تر

وقیع زبانوں سے زیادہ انگریزی ہمارے ملک کے ہر طبقہ میں رچ بس چکی ہے۔ اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے میں دشواری بالکل نہیں آسانی اور فائدہ زیادہ سے زیادہ ہے۔ بیرونِ ہندوستان کے علوم وفنون، زبان وادب اور طرز فکر ونظر سے آشنا ہونے اور فائدہ اُٹھانے کے لیے انگریزی کا وسیلہ مدتوں ناگزیر رہے گا۔ فرانس جو زبان کے معاملہ میں بڑا کٹر مانا جاتا ہے اس نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ سائنسی علوم میں انگریزی سے مدد لینا ناگزیر ہے۔ جب تک اصلاح واضافہ اور ترک وقبول عیب نہیں، اور اس عمل کی کوئی حد اور مدت نہیں اس وقت تک دوسری زبانوں اور علوم وفنون سے آشنا ہونا ہتک نہیں ہنر ہے۔ بڑی زبان، بڑے شاعر، بڑی شخصیتیں، بڑی تصانیف، بڑے علوم وفنون، بڑی بستیاں، بڑے کھنڈرات اور بڑے مناظر فطرت ہر ملک اور ہر قوم کی یکساں میراث اور ملکیت ہوتے ہیں۔ ''ہر ملک، ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست'' میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے لیکن کیا کیجیے کہ اس کو سمجھنے اور مان لینے کے لیے قلب ونظر کی جس کشادگی ضرورت ہے اس سے ہم میں بہت کم لوگ فیض یاب ہیں۔

عزیز واور دوستو! اردو کو معطل اور مفلوج کر دینے کا سانحہ ایک ایسی کمیونٹی یا جماعت کو پیش آیا جو مادری زبان اور اس میں تعلیم وتہذیب حاصل کرنے کا ویسا ہی احساس واستحقاق رکھتی ہے جیسا دنیا کی کوئی مہذب کمیونٹی جماعت یا قوم رکھ سکتی ہے۔ ایسی ریاستوں نے جہاں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے کام میں لانے والوں کی تعداد خاصی قابلِ لحاظ ہے اردو کے ساتھ جس برہنہ وبے باک ناانصفی کا سلوک کیا ہے اس سے اردو کو جیسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا، اس کا ہم کو بڑا گہرا اور دردناک احساس ہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال پر قابو پانے کے لیے اردو کے دوست اور غم خوار جن میں غیر مسلموں کی تعداد بھی کم نہیں، اپنے محدود ذرائع اور وسائل کے مطابق جس حوصلہ اور پامردی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بجا لا رہے ہیں وہ قابلِ ستائش اور مبارک فال ہے۔ یہ قافلہ جس طرح آگے بڑھتا رہے گا اسی کے مطابق اس کی رفتار اور اس کی قدر وقیمت بڑھتی رہے گی۔

ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ایک مقتدر اقلیت کی مادری، مذہبی، علمی اور تہذیبی زبان کو جو قطعاً اور کلیتہً ہندستانی نژاد ہے حکومت کی طویل ناانصافی اور بے توجہی سے جو شدید نقصان پہنچا

اور اقلیت مذکور کے گراں قدر وورثے کی جیسی بے وقعتی اور تاراجی ہوئی ہے حکومت اس کی جلد سے جلد تلافی کرے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ معلوم ومخصوص ریاستوں میں ہندی کے ساتھ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے، اور ابتدائی درجوں سے لے کر یونیورسٹی کے مدارج تک وہ تمام سہولتیں منظور وفراہم کی جائیں جو معاصر زبانوں کو اترپردیش اور بعض دوسری ریاستوں میں حاصل ہیں۔ اس منصوبے کے انصرام کی تمام ذمہ داری اور اخراجات متعلقہ حکومتوں کو اٹھانے پڑیں گے۔ اس لیے کہ ایک ممتاز اور مہذب اقلیت کی موقر زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کا تحفظ وترقی اور اس کی سالمیت کی ذمہ داری حکومت، اس کے قوانین اور عمال پر عائد ہوتی تھی۔ یہ اس بنا پر کہنا پڑ رہا ہے کہ آفاتِ ارضی، سماوی یا سیاسی سے جب کوئی عام بربادی وتاراجی وقوع میں آتی ہے تو اس کی از سرنو آبادکاری حکومت کے اوّلین فرائض میں ہوتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ حکومت کیا کرتی ہے یا نہیں کرتی اس لیے کہ اکثر وہ کرنے سے زیادہ نہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کی تفریح کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے، ہم کو اپنے طور پر اردو کے تحفظ اور ترقی کے لیے وہ تمام تدابیر اختیار کرنا پڑیں گی جن سے ہماری مادری زبان کی تعلیمی، علمی اور تہذیبی حیثیت بحال اور فعال رکھی جاسکے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلہ میں ہم نے پروگرام کے مطابق جہاں تہاں کام شروع کردیا ہے اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔ کام بہت بڑا ہے کرنے والے کم ہیں۔ رقبہ نہایت وسیع اور منتشر ہے، ذرائع اور وسائل بہت محدود ہیں تقریباً معدوم۔ کیا کہوں اور کیا کروں کہ گھوم پھر کر نظر آپ ہی پر پڑتی ہے۔ اس مہم کو آپ آگے بڑھائیں اور کامیاب بنائیں اور ان دوستوں اور بزرگوں کا ہاتھ بٹائیں جواب نہ مصافِ زندگی میں سیرت فولاد پیدا کرنے کے قابل رہے نہ شبستانِ محبت میں حریر وپرنیاں ہوجانے کے اہل رہے۔ اچھی تنظیم، وسیع پیانے پر کام کرنے اور پھیلانے کا سامان اور سہولت مہیا نہ ہو تو ہر شخص کو انفرادی طور پر، اپنی بساط کے مطابق چھوٹے بڑے پیانے پر کام شروع کردینا چاہیے۔ یہی انفرادی تنظیم (ڈسپلن) اجتماعی تنظیم کو ظہور میں لاتی ہے اور اس کو معتبر اور محکم بناتی ہے۔

زبان کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں فلاں قوم، ملک، مذہب یا ادب کے الفاظ، استعارے یا اشارے کیوں اور فلاں کے کیوں نہیں، زبان کے فطری اور سماجی عمل سے ناواقفیت یا تعصب کی دلیل ہے۔ اردو میں کبھی فارسی اور عربی الفاظ کی دروبست بھی انھیں زبانوں کے طرز پر تھی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ عوام اور خواص عمداً ایسا کرتے تھے یا کوئی آرڈی نینس نافذ تھا جس کی تعمیل میں یہ کیا جاتا تھا، بلکہ سرکار، دربار اور بازار کا یہی چلن تھا جس کی ہر شخص پیروی کرتا تھا۔ اس میں طبقاتی تفریق یا تعصب کو دخل نہ تھا بلکہ اس سے زبان کو کام میں لانے کی سہولت اور لکھنے بولنے والوں کی وقعت میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد بولنے اور لکھنے کا یہ طرز رفتہ رفتہ بدل گیا۔ جس طرح گردشِ روزگار سے ہم آپ بدلتے رہتے ہیں اس میں کسی جانی بوجھی تحریک کو دخل نہیں تھا۔ حکومت کے عروج و زوال سے زندگی کے طور طریقے، علم و ہنر، تہذیب و تمدن، خوب و ناخوب اور فکر و عمل کا انداز وابستہ ہوتا ہے۔ انگریز آئے، انگریزوں کے علم و فن آئے، رہن سہن، خورد و نوش، لباس اور مکان سب میں اسی کے مطابق تبدیلی عمل میں آئی۔ سرورؔ کی اردو کو سرسید کی اردو کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔ سرسید نے اردو کو تکلفات کا نہیں تقاضوں کا پابند کیا، اس طرح اردو تکلفات سے آراستہ یا بوجھل ہونے کے بجائے ہر ضرورت کو بطریقِ احسن پورا کرنے کے قابل ہوئی۔ تقسیمِ ملک کے بعد اردو پر انگریزی کا جو تصرف ہوا اور عربی فارسی الفاظ کا داخلہ یا استعمال کم ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، زندگی کے عام کاروبار میں انگریزی آمیز اردو زبان مقبول ہے بہ نسبت سنسکرت اور ہندی آمیز اردو کے، ایسا کیوں ہے؟ اس پر غور کرنا چاہیے۔ غم، غصہ یا غرور سے کام نہ لینا چاہیے۔

انگریزی، فارسی، عربی الفاظ کو استعمال کرنے پر کسی نہ کسی کو کبھی مجبور نہیں کیا۔ ان الفاظ کو منتخب کرنے کے لیے ہمارا کوئی وفد انگلستان، ایران اور عرب نہیں گیا۔ ان زبانوں کا جب ہندوستان میں عمل دخل ہوا تو ترک و قبول کے عالم گیر عمل سے ان کے الفاظ اور اسالیب اردو میں آئے۔ اگر اس پر کوئی مائل فریاد یا فساد ہو کہ وہ الفاظ ملک کے ادب اور روایات کے مطابق نہیں ہیں یا منافی ہیں اس لیے اچھوت اور غیر ملکی ذہنیت کی غمازی کرتے ہیں اور ملک سے غداری کے مرتکب ہیں تو اس کا کوئی جواب نہیں۔ زبان میں الفاظ اور اسالیب کا رد و قبول کسی کے بس کی

بات نہیں، عام زندگی کے طور تقاضے ان کو ترک یا قبول کرتے رہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عوام کی زبان عوام کی، اور بول چال کی رہتی ہے اور کہلاتی ہے اور خواص کی زبان خواص کی۔ خواص اور عوام کا یہ فرق ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کا ہوتا ہے۔ اسی فرق سے تہذیب کا خمیر اٹھتا ہے۔

اس لیے جب تک تہذیب باقی ہے یہ فرق باقی رہے گا چاہے دنیا کو جبر کے تسلط میں رہنا پڑے چاہے جمہوریت کے۔ زبان کا معیار و منزلت خواص ہی کی ذمہ داری ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ زبان کو خواص اور عوام دونوں میں سے کسی ایک کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنا چاہیے۔ کسی شائستہ اور مکمل زبان میں الفاظ، اسالیب اور صنائع و بدائع، تلمیحات اس زبان کی فضا، موسیقی (لب و لہجہ) روایات اور انفرادیت کے مطابق آتے ہیں، لائے نہیں جاتے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جس نے چاہا جب چاہا جتنا چاہا اضافہ یا تاراج کر دیا۔ ادب میں الفاظ کو جن شرائط پر شہریت نصیب ہوتی ہے وہ اکثر ان شرائط سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔

جو کسی ملک یا دیار کی شہریت کے لیے مقررہ ہوتے ہیں اور تو اور کسی قوم یا قبیلے کے خدا کو اسی نام سے آج تک مستثنیٰ حالتوں کے سوا کسی دوسری قوم یا قبیلے کے شعر و ادب میں جلوہ گر نہیں پایا گیا۔ ''تا بہ دیگراں چہ رسد!'' زبان کی حرمت کا جیسا التزام غزل نے رکھا ہے وہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ زبان کی صحت اور الفاظ و اسالیب کا ترک و قبول شاعری کی ذمہ داری ہے نثر کی نہیں۔

ان دنوں رسم الخط کا مسئلہ ہماری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اس موضوع پر آج سے پہلے اپنے خیالات کا کسی قدر تفصیل سے اظہار کر چکا ہوں ان کو یہاں دُہرانا نہیں چاہتا۔ میں اردو رسم الخط کو کسی اور رسم الخط سے بدل دینے کے حق میں نہیں ہوں البتہ دل سے یہ چاہتا ہوں کہ اردو کتابیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسری زبانوں کے رسم الخط میں بھی شائع کی جائیں۔ اردو رسم الخط میں جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت سمجھی جائے اس کو رسم الخط کے ماہرین اور اردو کے مصنفین کے باہمی مشاورت سے طے کر سکتے ہیں۔ رسم الخط کے معاملے میں اتنا بدعقل یا جذباتی واقع ہوا ہوں کہ اپنے مشاہیر شعرا کا اردو شعر کسی اور رسم الخط میں پڑھنا پڑتا ہے، اور کس مصیبت سے پڑھ پاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے شعر کی وقعت کم ہو جاتی ہے، اور پہلے سے یاد نہ ہو تو اس کے

الفاظ اور اوزان کو قابو میں لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی تو یہاں تک محسوس ہوا ہے جیسے اپنا کوئی عزیز دوست ایسے حلیے اور حالت میں مجھ سے مل رہا ہے جیسے کسی بڑے ہی ناموافق حالات کا شکار اور مدد کا خواستگار ہو۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے اپیل ہو سکتی ہے۔

آج اپنی لڑکیوں کو مشورہ ہی نہیں دوں گا ان سے مطالبہ کروں گا کہ موجودہ رسم الخط کو اپنائیں جو رسم الخط ہی نہیں مصوری اور نقش گری کا بڑا دل کش تاریخی اور مبارک تحفہ ہے اور ایسی اچھی اور بڑی باتوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جن کے طفیل ہم نے تاریخ میں نیک نامی اور نام وری حاصل کی ہے۔ لڑکیوں کو خوش خطی کی مشق بہم پہنچانی چاہیے، اس لیے کہ ان کا خط بالعموم کچا ہوتا ہے یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ لڑکیوں کا خط عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا کیوں نہیں کہ بالعموم اچھا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک لڑکیوں کے لیے خوش خط ہونا سامانِ آرائش و زیبائش ہی نہیں ہے ایک گراں قدر ہنر بھی ہے۔ خدا کی دی ہوئی نعمت (حسن) پر اس کا شکرگزار ہونا چاہیے لیکن حاصل کیے ہوئے ہنر مثلاً خوش نویسی پر فخر کرنا بھی 'عالمے دارد'۔ اپنے رسم الخط کو میں اپنی لڑکیوں کی امانت اور حفاظت میں دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ مادری زبان کی مانند رسم الخط کا تحفظ اور احترام بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ جس کو وہ سب سے بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔

دوستو اور عزیزو! رسم الخط کے بدلنے کے مسئلہ پر سوچتے ہوئے کبھی آپ کا خیال اس طرف بھی گیا ہے یا نہیں کہ مسلمانوں کی تاریخی عمارات مثلاً مساجد، مقبرے، زیارت گاہیں، دانش کدے، قصر و ایوان اور محراب و میناروں پر بے نظیر خطاطی کے جو نمونے اور نقوش ملتے ہیں نیز کلام پاک کی صحت متن، سالمیت اور سادیت کو انتہائی حسن آفرینی اور حسن کاری کے ساتھ ہمارے معجز رقم خوش نویسوں نے جس طرح محفوظ کر دیا ہے یا اپنے بڑے شعرا کے جواہر پاروں کو جس قدرت فن، احترام اور احساسِ نزاکت و نفاست سے ہم رنگ کلام کر دیا ہے یہ سب کیوں اور کس لیے؟ اس لیے کہ اس رسم الخط سے اپنے آثار عالیہ کو اور آثار عالیہ سے اس رسم الخط کو محفوظ کر دینا چاہتے تھے۔ اعلیٰ اور عظیم تعمیر و تخلیق کو، اعلیٰ اور عظیم خطاطی سے جس طرح مسلمان فن کاروں نے آراستہ کیا اور اس طرح انسان کو سب سے عظیم فن کی تمجید و تکریم کا شاہد عادل بنایا۔ اس حسنِ

خدمت اور عبادت میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کا ہم سر ہو۔ آگرہ اور دہلی کی مشہور عالم عمارات
جس عظمت رفتہ کا رسم الخط ہیں اس کو مٹانے کا سانحہ معمولی نہ ہوگا۔

آخر میں ایک بڑے اہم مسئلہ کی طرف اپنی لڑکیوں کی توجہ مائل کرنا چاہتا ہوں، جو
ان کی تائید و تعاون کے بغیر کسی طرح روبراہ نہیں ہوسکتا، وہ مسئلہ ہے اردو کے مادری زبان
ہونے کا۔ اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کا فریضہ تمام تر ماؤں کی
ذمہ داری ہے۔ جس کسی سے خواہ وہ کتنا اعلیٰ اوسط یا ادنیٰ ہو آپ پوچھیں گے کہ اس کی زندگی
بنانے میں کس کی محبت اور شفقت کو دخل رہا ہے۔ اس کا جواب بالعموم یہی ہوگا کہ اس کی ماں یا
اس کے معلّم کا۔ اس لیے مادری زبان سے متعلق ماؤں کا جو رول ازل سے چلا آرہا ہے جب
معلم بھی موجود نہ تھے۔ چاہتا ہوں کہ مائیں اس کا لحاظ رکھیں بچے کو مکان سے باہر چاہے جتنی
زبانیں، علوم اور ہنر سیکھنے پڑیں۔ گھر کے اندر ماں کے سایۂ شفقت میں اردو ان کو اس طرح
سیکھنی پڑے گی جیسا کہ سیکھنے کا حق ہے۔

مادری زبان سے میری مراد صرف معمولی گفتگو کی زبان نہیں بلکہ اس زبان یعنی اردو
کے پیچھے تاریخ و تہذیب کا جو گراں قدر اثاثہ اور ورثہ ہے ان کا پورے طور پر احساس بھی دلانا ہے
جو زندگی کے مکائد و مصائب میں آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرے گا اور ان کو حوصلہ مند رکھے
گا۔ زندگی میں آج کل جو عالم آشوب افراتفری ملتی ہے اور بے حیائی، بے ایمانی اور بے رحمی کا
جیسا طوفان امنڈ رہا ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مائیں اپنے بچوں اور معلّم اپنے طالب علموں
کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں اور کیسے کہوں کہ اس میں ماؤں کی آزادروی یا بے راہ روی کو
کہاں تک دخل ہے۔ اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن آج کی تقریب میں لڑکیوں اور
ماؤں کو تاکید سے بتانا چاہتا ہوں کہ بچوں کو مادری زبان سے پورے طور پر آشنا کرنے اور رکھنے
اور اس طور پر اردو جیسی عظیم الشان زبان کو زندہ اور کارآمد رکھنے کی ذمہ داری تمام تر ان پر عائد
ہوتی ہے۔ بغیر ان کی تائید و تعاون کے مادری زبان کا تصور بے معنی ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کا
اندازہ اس سانحہ سے بھی کر سکتے ہیں کہ آج کل خود ماؤں کی زبان ان کے بچوں کی مادری زبان
بننے کے قابل نہیں رہی ہے!

شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے معروضات اس توجہ اور تحمل سے سنے، اسے میں آپ کا کرم، جامعہ کی خوش نصیبی اور اپنی سرفرازی سمجھتا ہوں۔ جامعۂ اردو ایک چھوٹا سا ادارہ ہے، اس کے ذرائع اور وسائل محدود ہیں۔ نام ونمود سے بھی کچھ زیادہ ممتاز نہیں، لیکن جس خلوص اور خاموشی سے اس نے خدمت کے اپنی زندگی کے 35 سال گزارے ہیں وہ اس کے بہی خواہوں کے لیے بڑے امتنان اور افتخار کا موجب ہے۔ چھوٹے اداروں سے بڑے کام انجام پاتے ہیں تو جی خوش ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے یہاں نیچی سے نیچی سطح پر بھی بڑی سے بڑی خدمات انجام دینے والے موجود ہیں۔ یقیناً بڑی خدمت وہ ہے جس سے زیادہ فائدہ وہ لوگ اٹھا سکیں جو زندگی اور زمانے سے فائدہ اور مسرّت اٹھانے کی سب سے کم استطاعت رکھتے ہیں۔

آخر میں آپ سے ایک معمولی بات کہنا چاہتا ہوں لیکن توقع اس کی رکھتا ہو کہ آپ اس کو غیر معمولی اہمیت دیں گے۔ یوں بھی آپ جانتے ہیں کہ مقرر نیازمند ہو تو سامعین کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے وہ بات یہ ہے کہ جامعہ کے سپرد امتحانات کا جو کام ہے وہ کلیتہً مقررہ اور مانے ہوئے محور پر گردش کرتا ہے۔ اس محور کے کسی حال میں اس کو منحرف نہیں ہونے دینا چاہیے۔ موجودہ ناسازگار حالات میں جو تقریباً قابو سے باہر ہو چکے ہیں اس معیار کو اسی وقت تک محفوظ اور فعال رکھا جاسکتا ہے جب اس ادارہ کے عمّال اس عالم گیر وبا سے خود بچیں اور جامعہ کو بھی بچائیں۔ یہ زمانہ ہر معیار اخلاق سے روگردانی کا ہے۔ ہم آپ اس سے بھی ناواقف نہیں ہیں کہ اخلاقی بندھنوں سے آزادی اتنی ہی خطرناک ہے بلکہ اس سے زیادہ جتنی روزمرّہ کی زندگی میں امن و آئین کے تحفظ اور تسلط سے محروم ہو جانا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ جامعہ کی کارکردگی اور ساکھ کو گزند نہ پہنچے۔ جامعۂ اردو کے امیدوار بالعموم بارسوخ اور آسودہ حال نہیں ہوتے۔ ان کو طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ اور اکثر ان کے سرپرست بھی آفس کے ہیر پھیر سے ناآشنا ہوتے ہیں، جہاں ہمیشہ ان کی ہار ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔ ہر حال میں اور حتی الوسع ہر قیمت پر، یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے پر کڑی اور دوسروں پر کرم کی نظر رکھیں۔ کسی ادارہ کی دیانت، امانت اور کارکردگی کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے آفس کا عملہ کیسا ہے۔ جامعہ کے چھوٹے بڑے فرائض، جن چھوٹے بڑے

کارکنوں اور کمیٹیوں کے سپرد ہیں اگر وہ ان کو ایک مشترک اور متحد خاندان کی طرح انجام نہ دیں گے اور جامعہ کو نفع اندوزی اور گروہ بندی کا محاذ بنالیں گے تو جامعہ کے حق میں یہ امانت میں خیانت کا ارتکاب ہوگا۔ اس موقع پر اور اس خطبہ میں میرا اس طرف اشارہ کرنا شاید مناسب نہ معلوم ہوتا ہو، لیکن جتنی مدت سے جتنا قریبی اور ذمہ داری کا میرا تعلق جامعہ سے رہا ہے اس کے ہوتے ہوئے اور جامعہ کے نفع ونقصان کے پیشِ نظر اپنے کو نہ کسی رسم وروایت کا پابند سمجھتا ہوں نہ کسی کے چین ابرو کا! جمہوریت اور مصلحت اندیشی دونوں کا تقاضہ ہے کہ ادارہ کو جس نفع وضرر کا سامنا ہو اس کی خبر ہر چھوٹے بڑے کو ملتی رہے۔

آخر میں جامعہ کی ترقی کے کاموں میں آپ سب کے بے لوث تعاون کا ملتجی ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کی اور ہم سب کی اس اچھے اور بڑے کام میں مدد فرمائے۔ گو اس کا بھی کچھ کم قائل نہیں ہوں کہ بے لوث خدمات بجائے خود دعائے مقبول ہوتی ہیں۔

●●●

ایک خطبہ جو دیا نہ جا سکا

1967 میں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہوئے تو موصوف نے یونیورسٹی کی صدسالہ جوبلی منانے کا خیال ظاہر کیا۔ ضروری انتظامات شروع کردیے گئے۔ میرے دل میں بے اختیار یہ بات آئی کہ اس موقع پر آپ نوجوانوں کو ایک خطبہ دوں گا۔ اس کی نوبت نہ آئی تو چھپوا کر تقسیم کردوں گا۔ اس سے دل میں کچھ اس طرح کی کشاد محسوس ہوئی کہ خطبہ لکھا جانے لگا۔ کچھ دنوں بعد حالات اس طرح بدلے کہ جوبلی کی تحریک ملتوی ہوگئی، لیکن خطبہ کا لکھا جانا ملتوی نہ ہوا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو خطبہ توقع سے کہیں زیادہ طویل ہوگیا تھا۔ شوقِ فضول اور جرأت رندانہ پر ہنسی آئی، شرمندہ بھی ہوا لیکن اس اُمید نے دامن نہ چھوڑا کہ طباعت و اشاعت کی شاید کبھی نہ کبھی کوئی صورت نکل آئے۔ اس کا اندیشہ البتہ رہا کہ اگر یہ جلد شائع نہ ہوسکا تو قابو سے باہر ہوجائے گا۔ یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔

سرکاری اور غیر سرکاری پبلشنگ اداروں سے رجوع کیا سب نے اس طرح کانوں پر ہاتھ دھرے جیسے مجھے بھی آئندہ سے کان پکڑ لینا چاہیے۔ آخر میں کسی اسمگلر کی تلاش میں نکلا۔ کتنے بڑے سے بڑے لوگ اور ان کے منصوبے اس قبیلے کی داد و دہش کے منتظر و محتاج رہتے اور رجوع کرنے پر اپنی مراد کو پہنچتے ہیں، لیکن اس کوچہ میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ حکومت نے ایک 'خوش گوار صبح' پردۂ غیب سے باہر نکل کر سارے اسمگلروں کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔ یہاں تک کہ بلیک مارکیٹ سے بھی دستیاب نہیں ہوسکتے! ایک زمانہ میں 'دفترِ بے معنی' کو غرق مے ناب

کر دیتے تھے اب اس طرح کی اشیا یا مجموعہ کو سرد خانے یا غالبؔ کے عہد کے 'طاقِ نسیاں' پر رکھ دیتے ہیں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں!

متذکرہ صدر جوبلی کے ذکر نے ایم۔اے۔او۔ کالج کی پہلی پچاس سالہ جوبلی کی یاد تازہ کر دی جو 1925ء میں منائی گئی تھی۔ کتنا مبارک اور شان دار اجتماع تھا کتنے اور کیسے مایۂ ناز اکابر ملک کے اطراف و جوانب سے آ کر یک جا ہو گئے تھے جن کو دیکھ کر اور پا کر معلوم نہیں کیا کیا یاد آنے لگتا۔ یہ خیال بھی ذہن میں آتا تھا جو اب تک نہیں بھولا ہوں بلکہ نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی اس کی تصدیق ہوتے دیکھتے آیا ہوں وہ یہ کہ جس تقریب و تحریک کا نتیجہ یا نمونہ یہ جلیل و عظیم اجتماع ہو وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی بلکہ فروغ پاتی رہے گی۔

جوبلی کا میدان جہاں آج آزاد لائبریری اور کینڈی ہال اور ان کے خوب صورت اور فرحت فزا 'خیاباں و گلزار و باغ آفریدم' دعوتِ خبر و نظر دیتے رہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس طرح کی وادیِ غیر ذی زرع یا 'بیابان و کہسار و راغ آفریدی' کا نقشہ پیش کر رہا تھا اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ایک سمت صاحب باغ کی ملول شکستہ دیواریں دوسرے اطراف میں ننگی بھوکی زمین، جہاں تہاں کٹیلی جھاڑیاں دور دور تک چھوٹے بڑے ویران ٹیلوں پر نہ 'آہو کا بے پروا خرام' نہ ہمارا آپ کا، لیکن اس بے آب و گیاہ میدان میں جشن جوبلی میں شریک ہونے والوں کے افتخار و آرزومندی کے احساس و اظہار کی طرف نگاہ جاتی تو بے اختیار محسوس ہوتا جیسے یہ پوری تقریب اس عرش منزلت وادی غیر ذی زرع کی برکت سے مالا مال ہو جس کے فیضان سے ہمارے ضمیر کو روشنی اور ذوق و ذہن کو بلندی اور بالیدگی نصیب ہوتی رہے گی۔ کاش تصور اور تصویر کے ان لمحات و لمعات کو پیش کر سکتا جو اکثر تفصیل پر بھاری ہوتے ہیں، کوشش کروں تو گفتگو طویل ہو جائے گی اور آپ مجھے آدابِ محفل سے بے گانہ یا بے پروا قرار دے کر اس حسنِ ظن سے محروم کر دیں گے جسے میں اپنے لیے بڑی قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ یہ پوری مسل 'داخل دفتر' ہو چکی تھی کہ ایک عزیز[1] نے مشورہ دیا کہ اس خطبہ 'عزیزانِ علی گڑھ' کو لکھنؤ کے مشہور و مقبول روزنامہ 'قومی آواز' کے ہفتہ وار ضمیمہ میں شائع ہونے کے لیے بھیج دیا جائے۔ مشورہ پر ہی اکتفا

---

[1] ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی، شعبۂ کیمیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نہیں کیا بلکہ مسودہ پر قبضہ کر کے اس کے اجزا بھیجنے شروع کر دیے۔ اڈیٹر صاحب[1] کے لطفِ خاص کا شکر گزار ہوں کہ موصوف نے پورے خطبہ کو چھبیس (26) قسطوں میں شائع کر دیا۔ کیسا اطمینان اور خوشی ہوئی کہ اس پر موصوف کو کسی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچی!

یہ ہو رہا تھا کہ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین ایک طویل مدت کے بعد برسرِ کار آئی۔ یونین کے سکریٹری صاحب کا ارشاد ہوا کہ میں اس استقبالیہ میں حاضر ہوؤں جو وہ یونین کی طرف سے یونین اور یونیورسٹی سے میری دیرینہ وابستگی کے صلہ میں دینا چاہتے تھے۔ طرح طرح کی معذوریوں کے باعث میرے لیے شرکت ناممکن تھی، بہت کچھ ردوقدح کے بعد یہ طے پایا کہ میں خطبہ لکھ کر دے دوں وہ جس طرح مناسب سمجھیں گے کام میں لائیں گے۔ آئندہ صفحات اسی مفاہمت کا نتیجہ ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونین ایک دفعہ پھر تعطل میں آ گئی ہے اور عجب نہیں متذکرہ صدر جو تحریک اس کے سامنے تھی وہ نامعلوم مدت تک 'منجمد' رہے۔ ان دونوں خطبات[2] کا نصیب کچھ اس طرح کا معلوم ہونے لگا جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے کہ ''آشیانے کے لیے جو شاخ چنی وہ شاخ جل گئی۔''

اسی اثنا میں سرسید ہال میگزین کے مرتب عزیزی ڈاکٹر اصغر عباس لیکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی فرمائش موصول ہوئی کہ ان کے زیرِ ترتیب ہال میگزین کے لیے کچھ پیش کروں۔ میں نے خرابیِ صحت کا عذر کیا ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ اگر عزیز موصوف مناسب سمجھیں اور میگزین میں گنجائش ہو تو یونین ہال کے اس خطبہ کو شائع کر سکتے ہیں۔ اصغر عباس صاحب آمادہ ہو گئے اور ان کے رفیق و شفیق ڈاکٹر حسام الدین پرووسٹ سرسید ہال نے ان کی تائید فرمائی اور میری توقیر بڑھائی اس طرح مجھے اور ان معروضات کو ناظرین کے سامنے آنے کا موقع مل گیا۔

اراکینِ یونین کو شکایت ہو سکتی ہے کہ جو چیز ان کے لیے تھی وہ دوسروں کی نذر کیوں کی گئی۔ اس جواب و جواز میں آبِ حیات کا وہ لطیفہ پیش کروں گا جو آزاد نے انشا کے بارے میں لکھا ہے، وہ یہ کہ زندگی کے آخر زمانے میں جب انشا لکھنؤ میں عُسرت اور گمنامی کی زندگی

---

1. عشرت علی صدیقی، چیف ایڈیٹر، قومی آواز، لکھنؤ

2. ایک خطبہ جو دمانہ حاسکا اور عزیزان علی گڑھ

گزار رہے تھے ایک مشاعرہ کی خبر ملی۔ شرکت کے لیے قبل از وقت پہنچ گئے، لوگوں نے بتایا کہ مشاعرہ کا مقررہ وقت ابھی نہیں آیا ہے اس لیے کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر انشاؔ نے جھولی سے غزل کا پُرزہ نکالا اور اپنی مشہور غزل ''بے زار بیٹھے ہیں، تیار بیٹھے ہیں'' کے ردیف قافیہ کی پڑھ دی اور یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ ''اپنی غزل سنا دی مشاعرہ جب جی چاہے کرتے رہیے گا۔'' معلوم ہونے پر کہ یہ انشاؔ تھے لوگ دم بخود رہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بیان اتنا واقعہ نہیں جتنا لطیفہ، اس لیے کہ مذکورہ غزل لکھنؤ میں نہیں دہلی میں لکھی گئی تھی جب انشاؔ کا ستارہ عروج پر تھا۔ صورت حال کچھ بھی ہو میں اس لطیفہ کو واقعہ پر بھاری سمجھتا ہوں۔ اس لیے عزیزانِ یونین سے معافی کا خواست گار رہتے ہوئے انشاؔ کی پیروی کرتا ہوں!

غبار فطرت پیشیاں زما خیزد
صفائے بادہ ازیں دُردِ تہ نشیں پیداست
(غالبؔ)

جناب صدر خواتین و حضرات!

آپ کی دعوت پر آپ اور آپ کی یونین کے بارے میں کچھ عرض کرنے حاضر ہوا ہوں۔ باقرارِ صالح بہ تقاضائے وقت، بہ امیدِ اقتضات، بحیثیت مجموعی بطورِ مناجات! آپ کی یونین 1883ء میں قائم ہوئی اور مسٹر ایچ۔ جی۔ آئی سڈنس کے نام پر اس کو منسوب کیا گیا۔ مسٹر سڈنس آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ 1875ء میں اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر اور 1877ء میں کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آب و ہوا راس نہ آئی تو مستعفی ہو کر انگلستان واپس چلے گئے۔ اپنے طلبا کو انگریزی سکھانے پڑھانے اور انگریزی باضابطگی (ڈسپلن) ملحوظ رکھنے پر بڑا زور دیتے تھے۔ باری باری کلاسوں میں جا کر صحیح انگریزی تلفظ اور آئین و آداب بتانے سکھانے کے لیے اپنی طرف سے 2 وظیفے مقرر کر دیے تھے۔ ایک عمدہ عادات اور خصائل دوسرا کلاس میں پابندی سے حاضری کے لیے۔ باقاعدگی کے بارے میں ایسی شہرت تھی کہ سر سید جب کبھی کچھ دنوں کے لیے علی گڑھ سے باہر جاتے تو مسٹر سڈنس کو تعلیم اور ڈسپلن کا انچارج مقرر کر جاتے، طبعاً کم آمیز تھے لیکن طلبا معاصر اساتذہ اور منتظمین میں ایسی وقعت کی نظر سے دیکھے

جاتے تھے کہ علی گڑھ سے رخصت ہونے پر ان کو سپاس نامے دیے گئے۔ وہ اس اعتبار سے ایک منفرد امتیاز ہے کہ مسٹر نسبٹ پروفیسر انگریزی نے انگریزی میں، مولوی عباس حسین نے عربی میں، پروفیسر محمد اسحاق نے فارسی میں، بابو آسوتوش بھٹاچاریہ نے سنسکرت میں، سپاس نامے پیش کیے جو بڑے خوش نما اور قیمتی خریطے اور کاسکٹ میں مسٹر سڈنس کو نذر کیا گیا۔ انہی خدمات کے اعتراف واحترام میں کالج نے ان کے نام سے اس یونین کو موسوم کیا۔

مسٹر سڈنس کے بعد مسٹر ہیرولڈ کوکس Harold Cox آئے اور ریاضی اور اکنامکس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ریاضی میں کیمرج کے ٹرائپوس تھے۔ کیمرج یونین کے پریسیڈنٹ اور انگلستان کے کئی کالجوں میں لیکچرر رہ چکے تھے۔ علی گڑھ آئے تو ان کے سپرد سول سروس کے مقابلہ کے امتحان کے کوچنگ کلاسز بھی کیے گئے، اس کا نام The Civil Services and European Educational Preparatory Classes تھا جو کسی نہ کسی شکل میں تقسیم ملک کے زمانے تک قائم اور کامیاب رہا۔ آپ کی اس یونین کا سب سے گراں قدر انعام (HAROLD COX ENGLISH SPEAKING PRIZE) انھیں مسٹر کوکس کے نام سے منسوب ہے۔ یہ اس مقرر کو دیا جاتا جس نے سال بھر پابندی کے ساتھ یونین کی انگریزی تقریروں میں حصہ لیا ہو۔ جس ممبر کو یہ انعام مل جاتا اس کے لیے یونین کی وائس پریسیڈنٹ شپ (اب پریسیڈنٹ شپ) کا منصب ایک گونہ متعین ہو جاتا۔ قدر و قیمت کے اعتبار سے انگریزی کی برجستہ تقریر کا درجہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ اسی طرح اردو کے مقابلے کی تقریروں کے انعامات مقرر تھے۔ اس عہد میں اردو میں تقریر کرنا اتنا آسان اور ناقابل مواخذہ نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ جب اردو کا مادری زبان ہونا ہماری ذمہ داری نہیں بلکہ اردو کی ہو۔

ہیرلڈ کوکس کے بعد مسٹر تھیوڈور بک آئے۔ یہ ٹرینٹی کالج کے گریجویٹ اور کیمرج یونیورسٹی یونین کے پریسیڈنٹ رہ چکے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انگریز پروفیسر کو ترجیح دی جاتی تھی جو آکسفورڈ اور کیمرج یونین کا پریسیڈنٹ رہ چکا ہو۔

تقریر کے آئین وآداب اور اس کی اہمیت سے طلبا کو شروع ہی سے آشنا کرنے کے لیے اسی سڈنس یونین کے نمونے پر ایک جونیر ڈبیٹنگ سوسائٹی تھی جس کے اپنے عہدہ دار اور اپنا

انتظام تھا، اور فرسٹ اور سکنڈ ایئر کلاسوں کے طلبا کے لیے مخصوص تھی۔ یہ ابتدائی مشق و مہارت کے لیے تھی تا کہ آگے چل کر تقریر کرنے میں جھجک یا ہراس نہ محسوس کریں، اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اس دور میں مذاکرہ اور مباحثہ کے فن اور فوائد کو کتنی اہمیت حاصل تھی اور کالج کی شان اور شہرت میں یونین اور دوسری انجمنوں اور کلبوں کی تہذیبی، تربیتی اور تفریحی سرگرمیوں کا کتنا گراں قدر حصہ تھا۔

اس عہد میں اقامتی زندگی کے بعض قواعد آج کتنے عجیب معلوم ہوں گے شاید نا قابلِ عمل بھی۔ باوجود اس کے بیش تر طلبا اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو خوش حال ہوں یا تنگ حال تہذیبی شعائر میں تقریباً یکساں سطح پر ہوتے تھے۔ فارسی، عربی زبانوں اور مذہب و اخلاق کے اوامر و نواہی سے آشنا اور سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ ان پابندیوں کو بڑی خوشی سے قبول کرتے جیسے وہ پابندیاں نہ تھیں امتیازات تھے۔ یہ نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ ممکن ہے آپ میں سے بعض یا بیش تر اصحاب خیال کرتے ہوں کہ وہ دورِ آتش کی جوانی کا نہیں ان کی پیری یا پس ماندگی کا تھا اور اب دنیا صرف ایسے آتش کو گوارا کر سکتی تھی جو ہمیشہ جوان اور بے لگام رہ سکتے تھے۔ پابندی سے بے نیاز ہو کر آزادی کا دم بھرنا یا طلب گار ہونا ظلم بھی ہے جہل بھی۔ معاشرے میں جب کبھی اور جہاں کہیں اختلال یا عدم توازن راہ پائے گا، اس کو صراطِ مستقیم پر لانے اور رکھنے کے لیے پابندی یا ایمرجنسی کا نفاذ لازم آئے گا۔ کبھی اللہ اور رسول کی جانب سے، کبھی سلطان و سلطنت کی سمت سے۔ کبھی دونوں کے نائب اور نمائندہ اعلیٰ تعلیم گاہوں کی طرف سے!

تفریحاً ان پابندیوں کو سن لیجیے۔

1۔ بورڈنگ ہاؤس میں حاضری دن میں تین بار لی جاتی تھی۔ 7/بجے صبح فرداً فرداً کمرہ پر، 4/بجے شام نماز کی حاضری، 8/بجے رات کمرہ پر فرداً فرداً۔

2۔ کوئی طالب علم کالج کے گھنٹوں میں اپنے کمرے پر نہیں جا سکتا تھا۔

3۔ وارڈن کی تحریری اجازت کے بغیر کوئی بیرونی شخص کسی بورڈنگ ہاؤس میں نہیں جا سکتا تھا۔

4۔ کسی ڈے اسکالر کو اجازت نہ تھی کہ وہ کالج کے اوقات میں کسی بورڈنگ ہاؤس میں جائے۔

5۔ ڈائننگ ہال کی حاضری لازمی تھی۔

6۔ مسٹر سڈنس کو سرسید کی ہدایت تھی کہ جو طالب علم دینیات کے امتحان سے غیر حاضر ہو یا ہفتہ وار دینیات کے کلاس سے غیر حاضر ہو اس کا نام خارج کر دیا جائے۔ ایسی ہی اور پابندیاں بھی تھیں جن کا ذکر طوالت کے خیال سے نہیں کرتا۔

آپ کی اس یونین نیز کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس کے کارنامے، ڈائننگ ہال اور ڈیوٹی سوسائٹی کی سرگرمیاں، شعر و ادب کی محفلیں اور آج سے کم و بیش 60/50 سال کے شیوہ ہائے شائیگاں، علی گڑھ اور اس کے فرزندوں کی زندگی کے بڑے صالح، صحت افزا، دل کش اور قومی امتیازات تھے جواب بہت کم اور کمزور ہو گئے ہیں۔ اس تکلیف دہ صورت حال کی ذمہ داری تمام تر آپ پر عائد نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے اسباب وعوامل پر بھی ہوتی ہے جن پر ہمارا قابو نہ تھا، مثلاً ایم۔اے۔او۔ کالج کے قیام سے لے کر یونیورسٹی کی ابتدائی چند برسوں تک ہم اور ہماری یونیورسٹی طرح طرح کے بیرونی دباؤ اور دشواریوں سے محفوظ تھی اور ہم ہر کام آسانی سے انجام دے لیا کرتے تھے، لیکن اس کے بعد حالات یکسر بدل گئے اور یونیورسٹی اس کے اراکین اور بہی خواہ ایسی جارحانہ قوت اور تحریکوں کی زد میں آ گئے جو ہم سے مطمئن ہونے پر راضی نہ ہو سکیں۔ چنانچہ جب سے اب تک کا پورا زمانہ ہم پر دفاعی یا مدافعانہ تدابیر اختیار کرتے رہنے میں گزر رہا ہے اور کس قیامت کی آزمائش یہ دفاعی کام ہوتا ہے۔

نوا گرانِ نخوردہ زخم را چہ خبر!

اس وقت اپنی یونین کے بارے میں کہنا پڑتا ہے، جو اتنا کہنا نہیں ہے جتنا 'خود کلامی' کہ یونین اب ہمارے لیے شاید اتنی مایۂ افتخار نہیں رہی جتنی پہلے کبھی تھی۔ یہ اس لیے قائم کی گئی تھی کہ آپ یہاں وہ آداب سیکھیں گے اور سکھائیں گے جن سے مہذب معاشرے اور اہم مواقع پر اپنی کہی اور دوسرے کی سنی جاتی ہے اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ یعنی آزادی سے کہنا اور تحمل سے سننا۔ سفارت اور سیاست کے اعلیٰ ایوانوں میں آج کل اس ہنر میں مہارت اور اس کی اہمیت کسی

طرح اسلحہ اور افواج کی حرب و ضرب سے کم نہیں سمجھی جاتی۔ اسی طرح حفظِ مراتب کا جو سرمایہ و ثروت آپ یہاں حاصل کریں گے وہ آئندہ زندگی میں صحت مند سماج کے قیام و استحکام میں معین ہوگا۔ جمہوری اور پارلیمنٹری طرزِ حکومت اور معتبر معاشرے کے لیے جو صفات ضروری ہیں وہ اسی طرح پیدا ہوتی اور برسرِ کار آتی ہیں۔

اسی فضا اور ان فضائل کو ترقی دینے اور مقبول بنانے کے لیے آپ، آپ کے اساتذۂ کرام، اولڈ بوائز اور دوسرے اکابر سرگرم کار رہتے۔ مسائل فہمہ پر کیسے معرکے کے مذاکرے اور مباحثے ہوتے کہ دل خوش ہو جاتا، اس لیے اور کہ ہمارے طلبا کی تقریریں مہمان محترم کے خطاب و خطبہ سے کم درجہ کی نہ ہوتیں۔ مہمان اس کا اعتراف کرتے اتنا رسماً یا اخلاقاً نہیں جتنا بربنائے حقیقت اسی فضا میں ہم سانس لیتے، بالیدہ ہوتے، شہرت پاتے اور معتبر جانے جاتے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یونین کے وہ شب و روز خواب و خیال ہونے لگے ہیں۔ اسے متشابہ لگنے کا کرشمہ کہیے یا بے ربط باتیں کہنے کی عادت جس کے لیے بہر گونہ آپ کو درگزر سے کام لینا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ آپ اور یہ یونین ایسی یونینوں سے دور اور بہت دور رہیں جو یونیورسٹی طلبا کی کہی جاتی ہیں، لیکن ان کی سرگرمیاں اعلیٰ تعلیم گاہوں اور ان کے طالب علموں کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں کسی طرح گوارا نہیں ہوتا کہ یہ یونین اور اس کے اراکین جن کا ریکارڈ اور روایات قابلِ فخر رہی ہیں۔ وہ باہر کے ایسے اداروں سے اتحادِ خیال و عمل رکھیں۔ یہ آس پاس کی یونیورسٹی یونینوں کی روش اب ان روایات سے بے گانہ نظر آنے لگی ہے جو طالب علم کی زندگی کو بلند اور بہتر بنانے میں معین ہوتی تھیں۔ یہ مجالس اتحاد یا یونین ایسی قوتوں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں جو طالب علم کو علمی، تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں سے دور اور بے گانہ رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو دور اندیشی، صلح جوئی، سلامت روی اور اپنے مقاصد عالیہ کے پیشِ نظر سوچے سمجھے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا چاہیے۔

یہ میں علاحدگی کی ترغیب نہیں دے رہا ہوں جس سے زیادہ غیر دانش مندی کا کوئی اور اقدام نہ ہوگا۔ شاید میں ہی آپ کے سوچنے کے انداز کو سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے کچھ لوگ روزی روزگار یا شہرت، سبقت کے لیے سیاست کی وادی میں قسمت آزمائی اور مہم جوئی کو زیادہ

نفع بخش پاتے ہیں، بہ نسبت اس کے کہ علم واخلاق کے سرچشمہ سے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو سیراب کریں اور رکھیں۔ انفرادی حیثیت سے ممکن ہے کہ یہ طریقہ کام دے جائے لیکن اجتماعی اعتبار سے بے سود ہی نہیں نامبارک بھی ہے۔ یہاں اس خطرے کی نشان دہی سے باز نہیں رہ سکتا کہ جب اور جہاں نوجوان بالخصوص طلبا تعلیم، تربیت اور اخلاق سے آراستہ ہونے کے بجائے شوروشر اور شکست وریخت کے طریقوں کو ترجیح دینے لگیں گے۔ وہاں حکومت اور معاشرے میں کوئی بنیادی خلل ضرور پایا جائے گا۔ نیز یہ کہ ایسی خرابی کو دور اور اس کی اصلاح کرنے کے بجائے نوجوانوں کو بہر نوع و بہر قیمت رعایت بخشی ہے۔ خاموش رکھنے کی پالیسی اختیار کرنا بڑی تشویش ناک صورت حال ہے جس سے آپ کو حکومت اور پارٹی لیڈروں کو باخبر رہنا چاہیے۔

آپ بتائیں کہ آپ کے قبیلے (علی گڑھ کے باہر) کے افراد اور دوسرے نوجوان آئے دن جس غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے جلوس نکالا کرتے ہیں اور بے گناہ و بے خبر عوام وخواص کی عافیت، جان، مال، آبرو کا نقصان ہوتا ہے اور پبلک املاک تلف ہونے میں، وہ حق بجانب ہے یا نہیں۔ جب کہ آپ کا مطالبہ یہ ہو کہ یونیورسٹیاں یا اسی قبیل کے دوسرے ادارے امتحان لینا یکسر منسوخ کردیں یا نقل کرنے کی عام اجازت ہو۔ پروموشن بغیر امتحان کے ہو اور ڈگری اور ڈپلومہ حوالہ کردیے جایا کریں۔ کہیں اور بھی دنیا میں ایسا ہوا ہے اور اگر ہوا ہے تو قطعاً غلط ہوا ہے۔ جنگ عظیم (دوم) کے دوران یا اس کے کچھ دنوں بعد تک نوجوانوں کے لیے جو لڑائی میں شرکت کے سبب سے تعلیم سے معذور اور محروم رہے، حکومت اور یونیورسٹیوں نے کچھ رعایات منظور کرلی تھیں لیکن وہ مواقع جس قدر نازک، اہم اور خطرناک تھے، اس میں رعایت حق بجانب ہی نہیں بلکہ لازم آتی تھی۔ آج کے حالات بالکل ویسے نہیں ہیں۔ ایسے میں ایسی عاقبت نااندیش برادری کے قول وفعل کا تابع ہونا بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ کمزوریاں آپ میں نہیں ہیں لیکن بدنام ہوجانے کا امکان ضرور ہے جب اور جہاں ایسا ہو کہ بدنام نِکو نام کہلائیں اور نِکو نام بدنام، بلکہ اس سے کچھ زیادہ وہاں اپنی سوجھ بوجھ سے کام نہ لے سکے تو بڑی بے وقوفی کو کام میں لایئے اور وہ کیجیے جس سے یہ ادارہ، آپ ہم، سب 'خیر وعافیت' سے رہیں اور ایک دوسرے کی خیر وعافیت چاہتے رہیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے تنبیہ کی ہے:

چو از قومے، یکے بے دانشی کرد
نہ کہہ را منزلت ماند نہ مہ را

شیخ کا کہنا ہے کہ قوم کا ایک فرد بھی بے دانشی کا مرتکب ہو جاتا ہے تو چھوٹے کی منزلت باقی رہتی ہے نہ بڑے کی۔ ایسا تو نہیں کہ ہمارے فرد اور جماعت دونوں بے دانشی میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ اپنے اس مطالبے پر کہ امتحان نہ ہو اور انعام مل جائے اور ملتا رہے۔ غالبؔ کا بھی ایک شعر سنیے:

یا رب بہ زاہداں چہ وہی خُلد رائیگاں
جورِ بتاں نہ دیدہ و دل، خوں نہ کردکس

فرماتے ہیں اے خدا جنت کو زاہدوں پر رائیگاں کرنے سے کیا حاصل جنھوں نے بتوں کے جور اٹھائے ہوں نہ ان کے (زاہدوں کے) دلوں کو کسی نے خون کیا ہو!

معلوم نہیں اس شعر پر خدا کے لبوں پر ویسا ہی کوئی تبسّم نمایاں ہوا ہوگا یا نہیں جو اقبال کی نظم 'تنہائی' میں زندہ جاوید ہے۔ ضرور ہوا ہوگا۔ اس لیے کہ خدا کی بے شمار صفات میں 'سنس آف ہیومر' (Sense of Humour) بھی ہے اور میرا خیال ہے کہ کہیں اور نہیں تو کم سے کم ہماری آپ کی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنی اس صفت اور قدرت کو سب سے زیادہ کام میں لاتا ہو تو عجب نہیں، 'از مست کہ برماست' کے آشوب سے کبھی فرصت ملے تو میری طرف سے اس مسئلہ پر غور کیجیے گا کہ اقبالؔ کی نظم 'تنہائی' میں خدا کا تبسّم اور غالبؔ کے اس شعر میں خدا کا مفروضہ تبسم دونوں عظیم شعرا کی Genius کی کس طرح ترجمانی کرتے ہیں۔

فارسی کا ایک پرانا اور فرسودہ مقولہ ہے جو وقت آنے پر ہمیشہ تازہ اور حسب حال محسوس ہونے لگتا ہے۔ چاہتا ہوں آپ اس پر عمل کریں وہ مقولہ یہ ہے ''مصلحت بیں وکار آساں کن'' مصلحت بینی مشکل نہیں ہے لیکن کیا کیجیے کہ آپ نے اس پر کاربند ہونا اپنے لیے دشوار کر لیا ہے۔ حالاں کہ وقت کا یہ سب سے بڑا تقاضا ہے، سیاست کی دنیا میں دوربین اور خوردبین دونوں سے کام لے کر مصلحت بیں کا فارمولا بناتے اور اختیار کرتے ہیں۔ نوجوان فطرتاً باغی یا انقلابی ہوتا ہے لیکن نہ اس قدر کہ اسی کا ہو کر رہ جائے۔

ایم۔اے۔او۔کالج، آپ کی یونین اور اسی طرح کے دوسرے ضمنی یا ذیلی ادارے خاص مقاصد کے تحفظ و ترقی کے لیے معرضِ وجود میں آئے۔ سرسید پہلے شخص ہیں جس نے ایک نہایت درجہ نازک، فیصلہ کن اور تاریخی موڑ پر مسلمانوں کی دست گیری کی اور رہنمائی فرمائی۔ انھوں نے ایک درماندہ اور لٹے ہوئے قافلہ کو معظّماتِ زندگی کو اپنانے اور نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ بخشا اور ترقی کی شاہراہ پر چلنے کی ہمت اور ہدایت دی۔ یہاں تک کہ ہم ترقی پذیر اقوام اور ممالک کے ہم دوش و ہم سفر ہو گئے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندستانی مسلمانوں میں ایسی عظیم اور جامع حیثیات شخصیت پیدا نہیں ہوئی نہ ایسا ادارہ وجود میں آیا جیسا کہ علی گڑھ ہے۔ شاید ہندوستان سے باہر ممالک اسلامیہ میں بھی۔

سرسید کو بہ یک وقت ماضی، حال اور مستقبل پر نظر رکھنے اور ہر ایک کو مناسب حال اہمیت دینے کا غیر معمولی شعور تھا۔ ہندوستان پر انگریزی حکومت کے جبر و اقتدار اور عزائم، مسلمانوں کے سود و زیاں ملک کے ساتھی رہنے بسنے والوں کی ہوش مندی اور حقیقت پسندی، مغرب کے اندازِ فکر، طریقِ عمل اور بدلے ہوئے حالات کے بے اماں تقاضوں کا پورے طور پر علم تھا، انھوں نے ایک عظیم قوم کو زوال و زبونی سے بچانے اور اس کی آبادکاری کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ سرسید نے کسی اور سے جہاد کیا ہو یا نہیں، اپنی قوم کی جہالت، غفلت و غلط روی اور عاقبت نااندیشی سے کیا، اس میں ان کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کے کھنڈر پر ایک ایسی علمی، تہذیبی، اخلاقی اور قومی قلمرو کی بنیاد رکھی جو اپنے پیش رو سے کہیں زیادہ فیض بخش، استوار اور مبارک فال تھی۔ اس کے سائے میں اور اس کے سہارے ہم علم و اخلاق کی نعمتوں سے فیض یاب اور گردشِ ایام کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پاتے ہیں۔

انتشار و اختلال کے اس دور میں ممکن ہے آپ کا ذہن اس طرف متوجہ نہ ہوتا ہو کہ یہ درس گاہ اس مرتبہ کے بعض دوسرے اداروں کی مانند کسی ایک شخص کے عطیہ، کسی وقف کی بخشش یا حکومت کے نظر و کرم سے کسی دن دفعتاً ملک کے افق پر نمودار ہو گئی ہو، بلکہ یہ ہمارے بزرگوں اور مخلصوں کی دن کی محنت اور رات کی عبادت کا ثمرہ یا ورثہ ہے۔ پھر اللہ نے ہماری مساعی کو پسند کیا اور اس ادارے پر اپنے گوناں گوں نعائم کے دروازے کھول دیے اور ایسی شہرت اور

برکت دی کہ باوجود طرح طرح کے موانع کے یہ اپنی بیش بہا خدمات کو سب کے لیے عام کرتا رہا اور کرتا رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ عبارت پڑھیے جو کالج کے صدر دروازے وکٹوریہ گیٹ پر برملا نقش ہے:

''قوم کے بزرگوں اور معزز لوگوں نے جو غفلت کے اندھیرے کے لیے مثل چراغوں کے ہیں ایک عالی شان مکان بنایا ہے جس کی بنیاد تقویٰ الٰہی پر ہے تاکہ اس میں علوم دینی اور دینوی سکھائے جائیں اور عالم کے اخلاق شائستہ بنائے جائیں۔ ان لوگوں نے اللہ کی راہ میں کماحقہٗ کوشش کی ہے اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک کوشش کی جزا دے اور اجرِ عظیم عطا کرے۔''

اس انتسابِ اقرار واعلان کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ علی گڑھ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کیوں باقی رہے گا؟ خدا کے ان بے لوث بندوں کے ایمان و ایقان، مسکنت اور خشیت کا کتنا عظیم انتساب یہ اعلان ہے۔ کیا آپ نے اس طرح کا بیان کہیں اور پڑھا یا سنا ہے؟ ایسا نہیں تو پھر آپ اس ذمہ داری کو صمیمِ قلب سے قبول کریں جو اس انتساب سے آپ پر عائد ہوتی ہے۔

کیا بتاؤں اور کس طرح بتاؤں کہ اس یونین نے کتنے اچھے دن دیکھے ہیں اور علی گڑھ کی بے مثل اور قابل رشک شہرت میں اس کا اور کرکٹ کلب کا کتنا وقیع حصہ ہے۔ 'یونین' کہیں ہو کسی نوع کی ہو ان کے بارے میں کچھ عرصہ سے جو کچھ دیکھنے، سننے اور سہنے میں آتا رہتا ہے اس سے بدگمان اور بدحظ رہنے لگا ہوں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی جی چاہنے لگا ہے کہ اپنی اس یونین کو کسی اور نام سے موسوم اور ممتاز کر دیا جائے تو بہتر ہوگا، ورنہ عجب نہیں اس کی گذشتہ خدمات بے نور ہو جائیں اور آنے والی نسل نام کے سبب سے نیک نام اور بدنام میں فرق نہ کر پائے۔ ایسا دیکھنے میں آنے لگا ہے کہ یونیورسٹی یونین اور سیاسی یونین دونوں کے طریق کار میں فرق برائے نام رہ گیا ہے۔ اپنے اس خیال اور خطرے کی تائید پر اصرار نہیں کرتا، اپنے بہک جانے کی معافی ضرور چاہتا ہوں۔

سرسید کے انگریزی رفقا کی خیرخواہی، فرض شناسی اور جرأتِ اقدام کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونین کی خدمات اور روایات کے پیشِ نظر انھوں نے سڈنس کلب کی بنیاد رکھی۔ اس طرح ایم۔اے۔او۔کالج کے اوّلین دور میں ہیرو Harrow اور اٹن Etton کے خطوط پر کرکٹ کلب کا قیام عمل میں آیا۔ ان دونوں کی اسپرٹ کو ہندوستان میں سب سے پہلے علی گڑھ نے قبول کیا۔ ملک کو علی گڑھ کی یہ پیش کش معمولی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک ان خدمات سے ملتی جلتی ہے جو مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہر ملک اور اس میں رہنے بسنے والوں کے لیے انجام دیں۔

اس وقت کے یورپین کلکٹر نے کالج میں کرکٹ کا اہتمام واحترام اور اس کے واضح ہمہ جہتی اور صحت مند اثرات اور فضا کو محسوس کر کے کالج میگزین میں یہ لکھا تھا کہ کرکٹ فیلڈ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے بہتر مرکز معلوم ہوتا ہے۔ مشرقی ممالک میں جس طرح کی حکومتیں اور معاشرہ ہوتا تھا ان میں آزادیِ افکار واقدام کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ یا پروہت جو چاہتا کرتا۔ مغربی ممالک بھی اس محرومی کا شکار رہے لیکن یہ وبا مدت ہوئی وہاں سے دور ہو چکی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں پارلیمنٹری روایات اور کرکٹ اسپرٹ ابھی قابلِ اطمینان حد تک مقبول نہیں ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان ممالک میں جمہوری اور پارلیمنٹری ادارے آگئے ہیں، ان کے آداب اور روایات موثر پر ہیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تاریخی اور فیصلہ کن جنگ واٹرلو (Water-Loo) کا آپ کو علم ہوگا۔ بتایا جاتا ہے کہ انگریز یہ جنگ واٹرلو میں نہیں ایٹن اور ہیرو کے کرکٹ کے میدانوں میں جیت چکے تھے۔ اس سے ہم خیال کر سکتے ہیں کہ کرکٹ اسپرٹ کیا ہوتی ہے، اور کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو آپ کو، سارے ملک کو علی گڑھ نے آشنا کرایا۔ یہ آپ کے اسلاف کا کارنامہ ہے جس کی آپ کو یاد دلاتا ہوں۔

سیاست نہ میرا مطالعہ ہے نہ میدان، البتہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے ہندوستان اور اس سے باہر سیاست کی بساط پر مسلمان جس طرح مات کھاتے اور ان کے مہرے پٹتے رہے ہیں ان کا دور اور نزدیک سے تماشائی رہا ہوں۔ اس داستان کو سن کر کیا کیجیے گا۔ اس بارے میں میرے معروضات آپ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ہندستانی سیاست میں ہماری نمائندہ اور

معتبر لیڈر شپ کی جگہ خالی ہے۔ مستقبل قریب میں اس کے پُر کیے جانے کا امکان بھی بہ ظاہر نظر نہیں آتا۔

سیاست میں لیڈر شپ کی مثال ایک طبعی کرشمہ سے دی جا سکتی ہے۔ گرمی اور سردی ایک دوسرے کا عدم توازن ہموار کرنے اور رکھنے کے لیے ہمہ وقت ایک دوسرے کی طرف رواں دواں رہتے ہیں، اس طرح جس قوم یا جماعت میں لیڈر شپ خالی ہوتی ہے دور اور نزدیک کے اہل یا نااہل بالعموم نااہل کچھ مہم جوئی کی خاطر، کچھ شاطروں کی شہ پا کر، کچھ شیاءً للّٰہ کہتے ہوئے کچھ آپ طالب علموں کے زور اور شور پر اور آپ طالب علم قسمت کی یاوری کی اُمید پر لیکن بغیر قسمت غریب کا مشورہ لیے یا اس کی داستانِ غم سنے ہوئے اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے تگ و تاز شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ملک کی کسی سیاسی پارٹی سے آپ کی ذاتی وانفرادی وابستگی آپ کا اپنا مسئلہ ہے اور یہ آپ کا حق بھی ہے لیکن جہاں تک اس ادارہ اور اس کے منتظمین کا مِن حیث اُلکل کسی پارٹی سے تعلق ہے آپ کی وابستگی مِن حیث اُلکل ادارے کی وابستگی سے مختلف نہیں ہونی چاہیے۔ بالفاظ دیگر جماعت طلبا کی حیثیت سے آپ یونیورسٹی کے سیاسی مسلک کے خلاف صف آرا ہونے کے مجاز نہیں۔ آپ کو اس کا حق ہے نہ اختیار۔ یونیورسٹی کی مستقل آب وہوا اور فضا ہوتی ہے اس کو فصلی اور موسمی ہواؤں سے زیروزبر نہ ہونے دینا چاہیے۔ باہر کے طلبا جو چاہیں کریں یہ کچھ ضروری نہیں کہ ان کو تسلیم کیا جائے یا ان کی تعمیل کی جائے۔ مصالح اور مجبوریوں کے باعث ہم وہ کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح، صالح اور واجب التعمیل ہوگا اور ہمارے آئینی حقوق اور اقلیتی کردار کی حفاظت اور احترام کرے گا۔ یہ میرا یقین ہے کہ جو باتیں ہمارے لیے صحیح، صالح اور واجب التعمیل ہوں گی وہ دوسروں کے لیے بھی ہوں گی۔ اس کے خلاف سوچنے اور عمل کرنے والے کو ہم معتبر و محترم قرار نہ دیں گے، خواہ وہ ہم میں سے ہو خواہ ہم سے باہر! مسلمانوں میں جتنے صیاد اور دانہ ودام ہیں ان کا شاید آپ کو اندازہ نہ ہو، اس لیے باخبر رہنے کی درخواست کروں گا۔

سیاست سے ہماری وابستگی اتنی جذباتی نہیں ہونی چاہیے جتنی سوچی سمجھی ہوئی۔ ہماری لیڈر شپ ہم میں آپ سے برآمد ہونا چاہیے نہ یہ کہ وہ تمام ملک کے نوع بہ نوع سیاسی

لیڈروں میں منتشر ہو۔ تقسیم ملک اور حصولِ آزادی کے بعد سے ہمارا قافلہ تقریباً بے سالار رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سب فرداً فرداً لیڈر کے درجہ پر فائز ہو گئے ہیں۔ یہ مزاج اچھی علامت نہیں ہے، مسلک و معمول اور فکر و عمل کے اعتبار سے علی گڑھ کی سالمیت اس کی علمی و اخلاقی روایات کی نگہ داشت اور اس کے بنیادی مقاصد کی حفاظت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا پڑے گا۔ اس کے لیے کچھ دنوں سے ہم خاص طور پر کوشاں ہیں۔ ملک کا آئین اور ملک کا ذمہ دار طبقہ ہماری تائید میں ہے۔ یوں بھی امید بہتری کی رکھنی چاہیے۔

خوشی اور فخر کی کیسی کیسی باتیں گذشتہ عہد کی یونین کی یاد آتی ہیں۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے سربرآوردہ شخصیتیں کس شوق سے علی گڑھ آتیں اور شفقت و شادمانی کا اظہار کر کے رخصت ہوتیں۔ وہ اتنا یہاں کے عمائدین سے نہیں جتنا طالب علموں سے ملنے، ہمارے طور طریقے دیکھنے اور یہاں کی فضا سے آشنا اور شاد کام ہونے کے لیے آتیں۔ اس زمانہ میں اتنا یہ نہیں دیکھتے تھے کہ آنے والا کتنا صاحبِ اختیار و اقتدار تھا جتنا یہ کہ کردار اور علم و فضل کے اعتبار سے اس کا قد و قامت کیا تھا۔ کوئی آئے یونین میں آنا لازمی تھا۔ کالج اتھارٹیز خود اس کا التزام رکھتے، مہمان کی پذیرائی طلبا کی طرف سے یونین میں بالضرور ہو۔ اس لیے کہ ان کو یقین تھا کہ اس تقریب کا جتنا اچھا اور پائدار اثر مہمان پر ہوگا اتنا کسی اور تقریب سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ پہلے کبھی منتظمہ اور آپ طلبا کا اس یونین کے واسطے سے توافق و تعاون اور اخلاص و اعتبار کا کیسا پائندہ اور پاکیزہ رشتہ تھا اور اب کیسا ہے۔ آپ ہی سوچیں اور بتائیں ایسا ہی کوئی سانحہ ہوگا جسے یاد کر کے غالبؔ نے کہا ہوگا۔

لہراسپ کجا رفتی و پرویز کجائی
آتش کدہ ویرانہ و مے خانہ خراب است

مفہوم یہ ہے کہ لہراسپ کہاں ہے اور پرویز کہاں گیا۔ آتش کدہ ویران ہے اور مے خانہ خراب۔

طالب علموں کی تعداد آج سے بہت کم تھی، مشکل سے ایک چوتھائی اس سے بھی کم گنجائش یونین کے حامد ہال میں تھی۔ کیسے کیسے بڑے لوگ آئے اور ان کے استقبال کے لیے

بڑے سے بڑا اجتماع ہوا۔ جن کو اندر جگہ نہ ملی وہ باہر دور دور تک پھیل گئے، لیکن یہ ناممکن تھا کہ ہجوم سے کوئی ناسزا کلمہ بلند ہو یا مجمع میں کسی طرح کا انتشار پیدا ہو۔ یہ نظم یونین کے مباحثوں میں خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ بہ ایں ہمہ آپ نوجوانوں کی ذہانت، شگفتگی اور خوش طبعی سے وقتاً فوقتاً مجلس شاداب و شادماں ہوتی رہتی۔ اشتعال کیسا ہی ہو فرد واحد یا مجمع پارلیمنٹری آداب و آئین سے منحرف نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ذکر کر دینے کی ضرورت پیش آئی کہ آج کل کبھی کبھی قانون ساز اسمبلیوں میں جہاں ملک کے مقبول و منتخب لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور زیر بحث مسائل نہایت درجہ اہم ہوتے ہیں وہاں بلّڑ، ہاتھا پائی اور سب وشتم کے بھی حادثات پیش آتے رہتے ہیں، جیسے اراکین کو پارلیمنٹری آئین و آداب کی خبر ہو نہ پروا۔ نہ شاید خود اپنی پروا!

یونین میں مہمان کی پذیرائی اور باتوں کے علاوہ گل افشانی سے کی جاتی۔ یونین کی چھت میں جو بڑا روشن دان ہے اس میں سے ٹھیک اس وقت جب یہاں مہمانِ آنریری ممبر شپ کے رجسٹر پر دستخط کرتا ہوتا، رنگ رنگ کے بکثرت پھول اور پنکھڑیاں گرائی جاتیں۔ اکثر سورج یا برقی روشنی میں سنہری رنگ کی پنکھڑیاں کا جیسے ایک تھرتھراتا جگمگاتا ستون سا قائم ہو جاتا۔ یونین میں استقبال کی رسم ایسی دل کش اور ڈرامائی انداز کی ہوتی کہ مہمان مبہوت رہ جاتا اور اس کو کبھی نہ بھولتا۔ معلوم نہیں کتنے معزز و ممتاز مہمانوں کی پذیرائی اسی طرح ہوتی رہی۔ ناموں کی تفصیل پیش کرنا نہ ممکن نہ مقصود۔ چند یاد آتے ہیں جن کی طرف شاید آپ کا ذہن نہ منتقل ہوا ہو۔

سری نواس شاستری یاد آتے ہیں۔ غالباً یہی نام تھا اپنے عہد کے ہندوستان کی اعلیٰ ترین شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ یونین میں انگریزی میں جو تقریر کی تھی اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ مقرروں کو محوِ حیرت کر دیا تھا۔ رواں، ہموار، پُرمغز، شائستہ، دل کش، تکلف و تصنع سے پاک، موسیقی نہ ہونے کے باوجود موسیقی سے لبریز مقرر کا پُرتمکین سراپا اور ملنے جلنے، بات کرنے کا کڑھا ہوا انداز جیسے ہمارے ہی آس پاس کے رہنے والے ہوں! اس دن سے بہت دنوں بعد تک اس تقریر اور سری نواس شاستری کا ہم پر بڑا اثر رہا۔ ان کے بعد نوبل پرائز پانے والے ڈاکٹر رمن کی

تقریر اسی یونین میں سننے کا اتفاق ہوا۔ کیسا متین مسکراتا چہرہ اور سراپا نہایت سجل، ستھرا، مدراسی لباس،
انھوں نے رمن ریز (Raman Rays) 'رمن شعاعیں' پر عام دلچسپی کی ایک تقریر کی تھی۔
کیسا ٹکنیکل موضوع جسے شاید اس زمانے میں بہت سے سائنس داں بھی اچھی طرح نہ سمجھتے ہوں۔
یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اسے کچھ بھی سمجھ سکا۔ اس لیے کہ آپ بجا طور پر اس کا یقین نہ کریں گے لیکن
معلوم نہیں تقریر، انگریزی زبان، مقرر، اس کی شخصیت، عالم کا عرفان و فیضان کیا چیز تھی یا سب
ملی جلی تھیں کہ برابر یہی محسوس کرتا رہا کہ جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ میں سمجھ رہا تھا۔ جیسے اس کا سمجھا جانا
کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اپنا اعتبار نہ کر کے مجمع پر نظر ڈالتا تو یقین آ جاتا کہ جو کچھ محسوس کرتا تھا
اس میں حاضرین بھی شریک ہیں۔ اچھی تقریر اور اچھے مقرر کی یہ بہت بڑی پہچان ہے۔

مولانا محمد علی کی تقریر کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ مرحوم مجاہد پر
اکثر کچھ نہ کچھ عرض کرتا رہا ہوں وہ ہمارے لیے کبھی اجنبی نہیں رہیں گے۔ اقبال کی طرح محمد علی
بھی ہر مشکل مقام پر ہم کو یاد آتے رہیں گے۔

عبداللہ یوسف علی آئی-سی-ایس، اس زمانہ میں مسلمانوں کے اوّل درجہ کے دانش ور
مانے جاتے تھے، اس عہد میں مسلمان آئی-سی-ایس تقریباً نہیں کے برابر تھے۔ مقدمات کے
فیصلہ میں بڑے دلیر اور انصاف پسند تھے۔ اپنے سے اوپر کے انگریزی حکام کے خشم یا خوشنودی
کی پروا نہ کرتے تھے۔ علی گڑھ کے نہ تھے لیکن علی گڑھ کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا۔ تقریر
بڑی فاضلانہ ہوتی، جب چاہیں تو زیر بحث موضوع پر دیر سے دیر تک گفتگو کریں اور سامعین
یکساں دلچسپی سے سنتے رہیں، تاریخ اور مذہب ان کا مخصوص مطالعہ تھا۔ کیسی مرتب تقریر ہوتی
جیسے اقلیدس کی کسی شکل کی وضاحت۔ انگریزی کا تلفظ ہم میں سے بعضوں کو عجیب سا لگتا تھا
معلوم ہوتا کہ آکسفورڈ کا یہی لب و لہجہ تھا۔ پوچھا آخر مولانا محمد علی بھی تو آکسفورڈ کے تھے، ان
کے انگریزی تلفظ میں یہ غرابت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ایک صاحب پاس ہی کھڑے تھے، بولے
یہ اردو اور یوپی کا فیضان ہے جو اجنبی تلفظ اور لب و لہجہ کے کھردرے پن اور ثقالت کو اپنے ساز
اور خراد پر چڑھا کر سلیس اور گوارا بنا دیتا ہے۔ ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو یہ امتیاز حاصل
نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوئی لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا قائل ہو گیا۔

البتہ اس کا تعجب ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں ایک ساتھی نے اپنے ایک معمولی ساتھی طالب علم پر کس تحمل اور تواضع سے یہ نکتہ واضح کر دیا۔

ہندو راج تھا نہ مسلم راج، لیکن آبرو، عافیت اور فراغت کا زمانہ ضرور تھا۔ جب ہندو کافی ہندو تھا اور مسلمان کافی مسلمان۔ انگریز بھی کچھ کم انگریز نہ تھا۔ نواب محمد اسحاق خاں صاحب آنریری سکریٹری تھے جنھیں کالج میں نام وروں کو بلانے، لڑکوں سے ملانے، دونوں کو خوش کرنے اور دونوں سے زیادہ خوش ہونے کا بڑا شوق تھا۔ اس میں نہ بندہ کی قید تھی نہ بندہ نواز کی۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت مدن موہن مالویہ، دہلی کے نام ور داستان گو باقر علی، وقتاً فوقتاً سب کو کالج میں بلا لائے اور سب ایسے خوش ہوئے کہ یہ ان کی زندگی کے بڑے کارناموں میں ایک تھا۔ آپ کے پیش رووں نے اس طرح ان کی پذیرائی اور مدارات کی جیسے یہ آپ کے بڑے سے بڑے بزرگوں میں تھے، اسی سے کالج کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ اس وقت کے آپ اور آپ کا علی گڑھ ایسا ہی تھا۔

ہندو کالج بنارس کے بانی پنڈت مدن موہن مالوی کالج کی دعوت پر تشریف لائے اور وہاں کی ہاکی ٹیم میچ کھیلنے اور یہاں کے طلبا سے روابط پیدا کرنے اور بڑھانے کے لیے آئی پنڈت مالوی ہندو دھرم، ہندو سماج و ہندو آدرش اور ہندو فکر و عمل کے امامِ وقت مانے جاتے تھے۔ مذہب و مسلک میں اس درجہ تقشف تھا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے تو اشیائے خورد و نوش اور باورچی ہندوستان سے ساتھ لے گئے تاکہ 'آب ودانہ' کا اطلاق استعارۃً بھی نہ ہو سکے۔ علی گڑھ تشریف لائے تو سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس، سر پر سفید ہی صافہ، گردن سے گھٹنے تک سفید انگوچھا لٹکتا ہوا جیسے سفید پھولوں کا گنجان ہار زیبِ گلو ہو۔ پاؤں میں صاف سپید کرپ سول جوتا، اس لیے کہ چمڑے کو پوتر نہیں سمجھتے تھے۔ طبعاً بڑے سنجیدہ، خاموش اپنے کو بہت لیے دیے ہوئے آواز نرم اور اثر کرنے والی ایک گھنٹہ تقریر کی ہوگی، جذبات و تکلفات سے دور جیسے کسی مذاکرے، محفل یا مجمع میں نہیں بلکہ کوئی پروفیسر یونیورسٹی کے اونچے درجوں میں لیکچر دے رہا ہو۔ یہاں تک کہ ہم کو اس کا کوئی موقع نہ ملا کہ ہم تحسین سے اس کے بعض حصوں کا خیر مقدم کر سکتے۔ پنڈت مالویہ کو فارسی اور اردو میں اچھا

درک تھا۔ اردو میں شیریں اور شائستہ گفتگو کرتے۔ کس کو یقین آئے گا کہ جس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں اس میں شاید ہی طبقہ اعلیٰ اوسط یا اس سے کم درجہ کا بھی شہراتی یا قصباتی ہندو ایسا ہوتا جو بے تکلف صحیح اور سلیس اردو بولنے پر قادر نہ ہوتا۔ تقریر سے فارغ ہونے کے بعد آس پاس کے طلبا سے بڑی دل نشیں اردو میں باتیں کرتے رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی کسی نے محسوس نہیں کیا کہ ہندو مذہب اور ہندی زبان کے کتنے اور کیسے شیدائی تھے۔ پنڈت مالوی کی اس خوبی کا ہم پر بہت اچھا اثر پڑا اور لیے دیے رہنے کے باوجود طلبا کے آداب اور یونین کی گل ریزی اور گل افشانی کا بار بار ذکر کرتے رہے۔

ہندو کالج کی ہاکی ٹیم میچ کھیلنے علی گڑھ آئی۔ خالص ہندو ٹیم اور کلیتہً مسلمان ٹیم میں ایسا دوستانہ میچ شاید ہی کسی نے کبھی دیکھا ہو۔ تمام شہر میچ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑا تھا۔ موجودہ نہرو پارک (نقوی پارک) پہلے ایک چٹیل میدان تھا۔ کالج کے فٹ بال اور سائکل پولو کے میچ اور مشق یہیں ہوتی تھی۔ جس شام کو علی گڑھ اور بنارس کا ہاکی میچ ہونے والا تھا اس میدان میں کھیل کی فیلڈ کا نہیں، دہلی کے کسی جید جلسہ جلوس کا گمان ہوتا تھا۔ دونوں ٹیمیں اس ہنر مندی، شرافت اور تن دہی سے کھیلیں کہ سارا میدان رہ رہ کر تماشائیوں کی تحسین و آفرین سے گونجنے لگتا۔ کھیل ختم ہوا تو دونوں طرف سے کھلاڑی بے اختیار ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور کسی طرح یہ نہیں محسوس ہوا کہ کون ہندو تھا اور کون مسلمان۔ سارا مجمع شام کے پھیلتے ہوئے سایہ میں تحلیل ہو گیا۔ رات کا بیش تر حصہ ہر دو ٹیم کے اراکین نے دعوت کی تواضع اور تفریح و انبساط میں گزار دیے۔ کھیل کے میدانوں اور امتحانوں کے ہالوں اور عام زندگی میں آج کل جیسے حادثے پیش آتے رہتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی کیسے کیسے دن اور دیکھنے ہیں۔ جب یہ حال ہو کہ ملک کا تقریباً ہر کس و ناکس اپنے فعل کو خواہ وہ کتنا ہی سنگین و شرم ناک کیوں نہ ہو، ہر احتساب اور مواخذہ سے بری سمجھتا ہے۔

بنارس ہندو کالج سے متعلق ایک قصہ سنیے۔ اس کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اپنی یونیورسٹی اور بنارس یونیورسٹی میں وہ یگانگت اور روابط نہیں پاتا جو تقسیم ملک سے پہلے تھی۔ اس وقت دونوں کا رشتہ اور روایت علمی اور تہذیبی تھی۔ دونوں اتر پردیش میں واقع اور متعین جو ہندو مسلمانوں

کی بہترین آرزوؤں اور بلند عزائم کا سرچشمہ تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کچھ اور ہوگیا جسے نہ اس یونیورسٹی کے لیے مبارک فال سمجھتا ہوں نہ ہندو یونیورسٹی کے لیے۔ قصہ یہ ہے کہ ملک کی خوں چکاں داستانیں اور ڈرامے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ہیبت و ہلاکت کی خبریں آتی رہتیں۔ یونیورسٹی کے ایک ضروری کام سے پروفیسر محمد حیدر خاں مرحوم کو بنارس ہندو یونیورسٹی جانا پڑا، جاتے ہی بیمار پڑ گئے۔ کچھ دنوں صاحب فراش رہ کر وہیں وفات پاگئے۔ علالت کے پورے زمانے میں ہندو یونیورسٹی کے ہر چھوٹے بڑے نے مرحوم کی جس طرح دیکھ بھال کی، ہمہ وقت صحت و آرام کا اہتمام رکھا گیا، بہترین ڈاکٹروں کی خدمات وقف رہیں اور میت کو جس احتیاط و احترام سے علی گڑھ پہنچایا گیا اسے ہم کبھی نہیں بُھلا سکتے۔ کاش دونوں یونیورسٹیوں میں وہی شب و روز واپس آجائیں۔ یہ آپ طالب علم ہی کر سکتے ہیں، لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے شاید زہرِ غم کام و دہن کی آزمائش سے نیچے اُترنے لگا ہے۔ کچھ بھی ہو آپ نوجوانوں کو اپنی اور اپنے ملک کی خوش حالی اور اقبال مندی کا راز اور راستہ اپنے ہی میں ڈھونڈنے اور کام میں لانا پڑے گا۔

یہاں ایک محترم اولڈ بوائے عبدالرحمٰن سندھی (صدیقی) کا تعارف آپ سے کرانا چاہتا ہوں۔ نواب محمد اسحاق خاں کے پرسنل سکریٹری تھے۔ بڑے ذہین، طباع، شوخی اور شائستگی دونوں سے آراستہ، گورا رنگ، اوسط قد، ترشا ہوا نقشہ، ایسا شریفانہ رکھ رکھاؤ کہ دیکھتے ہی آدمی بھروسہ کرنے لگے۔ کتنا وسیع اور متنوع مطالعہ تھا کہ ہر مسئلہ اور موضوع پر بڑے عالمانہ اور ضرورت دیکھی تو قلندرانہ انداز میں گفتگو کرتے اور کامیاب رہتے۔ کسی کی کم ہمت ہوتی کہ ایسے مواقع پر بے تکلف ہونے کی جرأت کر سکے۔ اپنے عہد کے اعلیٰ پایہ کے انگریزی مقرر مانے جاتے تھے۔ ایسے عہد میں جب کہ کالج میں اچھے سے اچھے مقرروں کی کمی نہ تھی۔ کیسا جی لگتا ان کی تقریر سننے میں، لب و لہجہ میں کیسا ٹھہراؤ اور شیرینی، جہاں تہاں طنز و ظرافت سے اس طرح کام لیتے جیسے صبا و صہبا سے لیتے ہوں۔ گھومتے پھرتے کبھی کبھی کچی بارک کی طرف آنکلتے تو آناً فاناً خبر پھیل جاتی کہ رحمٰن صاحب آئے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے چاروں طرف ایسا مجمع ہو جاتا جیسے بڑے بھائی کے گرد چھوٹے بھائیوں کا، سب سے محبت، ہمت افزائی، تفریح اور تفنن طبع کی باتیں کرتے اور تھوڑی دیر میں رخصت ہو جاتے۔

انگریز اور انگریزی حکومت کے بالکل عاشق نہ تھے، لیکن نہ اس طرح کہ بدگمانی اور بیزاری سے روگ کی شکل میں ان پر غلبہ پالیا ہو۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور شہرت سے کالج کا یورپین اسٹاف ان سے چوکنا رہتا اور ان کا احترام بھی کرتا۔ رحمٰن صاحب چھوٹوں کے بڑے اور بڑے سے کچھ نکلتے ہی ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کالج کے ایسے شیدائی کم ہی دیکھے گئے۔ یونین کی طرح اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے بھی کچھ کم الفت نہ تھی اور یہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا وہ زمانہ تھا جب اس سے کالج کا یورپین اسٹاف بھی خائف رہا کرتا۔ یاد آتا ہے ایک بار اولڈ بوائز کے سالانہ ڈنر میں یورپین اسٹاف بہت کم تعداد میں شریک ہوا۔ اس پر اولڈ بوائز کے اکابر نے ڈنر کی تقریروں میں اس طرح باز پُرس کی کہ یورپین اسٹاف نے پھر کبھی غیر حاضر رہنے کی جرأت نہیں کی۔

تفریحاً گالی دینے میں رحمٰن صاحب جیسا موزوں طبع میں نے نہیں دیکھا۔ جس موقع پر بڑے شاعر کا کوئی شعر کام نہ دے سکتا، رحمٰن صاحب کی گل افشانی و دشنام کام دے جاتی۔ غالبؔ کا نظریہ۔

''لطافت، بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی''

رحمٰن صاحب کی گالیوں پر پورے طور پر صادق آتا تھا۔ یونین کی ایک میٹنگ یاد آتی ہے۔ پہلے یونین کا صدر بحیثیت عہدہ کالج کا پرنسپل ہوتا اور نائب صدر منتخب شدہ طالب علم، صدارت کے لیے صدر اسی وقت آتا جب کوئی غیر معمولی موقع ہوتا۔ ایسی ہی ایک میٹنگ تھی کالج کے پرنسپل J.H.Towle (جے۔ ایچ۔ ٹول) صدارت کر رہے تھے۔ زیر بحث مسائل بغیر بحث و مباحثہ کے پاس ہوتے جا رہے تھے، کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ٹول صاحب کو مخاطب کر سکے۔ بعضوں نے کی تو التفات نہیں کیا گیا۔ حاضرین احتجاج و اضطراب کے فشار میں مبتلا تھے۔ اتنے میں ہال کے ایک کونے سے کچھ تھرتھراتی کچھ لڑکھراتی آواز آئی:

Sir, with all the timidity at my command I

beg to submit.......

یہ رحمٰن صاحب کی آواز اور فقرہ تھا۔ ٹول صاحب مسکرائے (موصوف کو مسکراتے کم کسی نے دیکھا تھا) سارا مجمع یک لخت ہنس پڑا، مطلع صاف ہو گیا اور کارروائی معمول پر آ گئی۔

انجمن آرائی میں سیّد راس مسعود صاحب، رحمٰن صاحب اور مسز سروجنی نائیڈو کا مثل مجھے اب تک کوئی اور نہ ملا۔ کیسا ہی موقع ہو، کیسے ہی لوگ ہوں، ان کی گرفت سے باہر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ہر سطح، ذہن، ذوق اور مسلک و مشرب کے لوگوں کو اپنی توجہ و تواضع اور عالی منشی سے گرویدہ کر لیتے تھے۔ بعض تصاویر یا مجسمے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آرٹسٹ نے ان کی آنکھوں کی ساخت اس طرح رکھی ہے کہ وہ ہر شخص کو اسی کی طرف دیکھتی اور توجہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہی حال ان تینوں کا تھا۔ ان کی محفل سے جو نکلتا، وہ یہی محسوس کرتا کہ اس دن کا ہیرو وہی تھا۔ ان کے قریب رہ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے نہ یہ کبھی بوڑھے اور باسی ہوں گے، نہ ہم کو ہونے دیں گے۔ پھر رحمٰن صاحب علی گڑھ سے چلے گئے۔ کچھ دنوں کلکتہ کی ایک فرم سے وابستہ رہے۔ ملک تقسیم ہوا تو پاکستان تشریف لے گئے اور بڑے ممتاز مناصب پر فائز رہ کر وہاں پہنچ گئے جہاں پیچھے سبھی پہنچنے والے ہیں۔

اردو میں تقریر کرنے کا معیار بہت اونچا تھا۔ انگریزی تقریروں میں جہاں تہاں کوئی نیچ اونچ ہو جاتی تو اسے اکثر نظر انداز کر دیتے۔ اردو تقریر میں ان لوگوں کی لغزش معاف نہیں کی جاتی تھی جو اردو خطّہ کے باشندے اور جن کی مادری زبان اردو ہو اردو کے بعض سر پھرے یہ کہتے کہ مادری زبان غلط بولنا غدّاری ہے جسے کبھی گوارا نہ کرنا چاہیے۔ عرض کر چکا ہوں کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے زمانے میں اوّل درجہ کا (Cricketor) کریکٹر اور اعلیٰ پائے کا یونین کا مقرر، اسٹاف کے اکثر اراکین سے زیادہ قابل لحاظ سمجھا جاتا تھا۔ آج کل جو صورتِ احوال ہے وہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ کیسا رنج اور کتنی مایوسی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ اتر پردیش جو اردو کا کعبہ اور کیلاش تھا وہاں جن نوجوان لڑکے لڑکیوں کی مادری زبان اردو ہے یا کبھی تھی، وہ والدین، عزیزوں اور دوستوں کو ہندی میں خط لکھنے لگے ہیں اور اردو سے بے گانہ ہو گئے ہیں۔ یہ قصور نہ ہمارا ہے نہ ہماری اولاد کا نہ خود ہندی اور ہندی دوستوں کا۔ گناہ اس ریاست کے متعلقہ سربراہوں کا ہے جنھوں نے ہماری مسلسل فریاد و فغاں کے باوجود ہم کو ہماری زبان سے محروم کرایا۔ حکومت کی زبان ہونے کی حیثیت سے ہندی میں زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کرنا بہ منزلہ لوازم کے ہے اور اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اسی طرح مادری، مذہبی اور تہذیبی

زبان ہونے کے باعث اردو پر عبور اور اس کا التزام واحترام ہمارے فرائض میں ہے اور اس کے لیے سہولت فراہم کرنا حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ ہندی اور اردو کے ساتھ ساتھ عالمی زبانوں میں ہونے کے اعتبار سے ہر ملک اور ہر قوم اور ہر طرح کے مسائل و مذاکرات سے اچھی واقفیت اور بہرہ مند رہنے اور علوم وفنون سے فیض یاب ہونے اور رہنے کے لیے انگریزی سے اچھی واقفیت رکھنا بھی ضروری ہے۔

مادری زبان سے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت رہی، غیر مسلم باشندے فارسی اور اردو اس شوق اور محنت سے سیکھتے تھے کہ ان میں سے اکثر اہلِ زبان کے درجہ تک پہنچ جاتے۔ انھوں نے بڑی خوشی اور فخر سے اردو کو اپنایا لیکن یہ خصوصیت غیر مسلم مردوں کی تھی۔ ان کی بیش تر خواتین اور لڑکیاں مادری زبان سے وابستہ رہیں۔ استثنا سے قطع نظر، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی مادری زبان کو کسی قسم کی محرومی کا سامنا نہیں ہوا۔ دوسری طرف ان کے مردوں نے وہ تمام فوائد حاصل کیے جو حاکم اور حکومت کی زبان پر قدرت رکھنے سے ان کو میسّر آسکتے تھے۔ اس طرح خواتین نے مادری زبان کو ہرگز ند سے محفوظ رکھا اور مردوں نے اکتسابی زبان سے ہر طرح کا نفع اٹھایا۔ اس دلچسپ صورتِ حال سے آپ نوجوان لڑکے لڑکیاں باخبر رہیں تو دونوں کا ہم پر بڑا احسان ہوگا۔ اردو کے ساتھ کچھ دنوں سے غیر معمولی اچھا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔''

جہاں تک اکاڈمی، انعامات اور طرح طرح کی تصانیف و نصابی کتب و تراجم، لغات وغیرہ کی طباعت و اشاعت کا تعلق ہے ہم میں ہر شخص حکومت کا سپاس گزار ہے۔ یہ بے دریغ بخشش اور کرم بے حساب ذوقؔ و ظفرؔ کے زمانے میں اردو کو نصیب ہوا نہ انیسؔ و اقبالؔ کے عہد میں۔ لیکن اس سے اردو کو وہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے جس سے وہ مدت دراز سے محروم ہے۔ اس کا اور اس سے کام لینے والوں کا یہ بنیادی حق ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے کماحقہٗ فائدہ اٹھائیں۔ ان زود پشیمانوں کو کسی طرح کوئی سمجھائے کہ پورے طور پر اردو سیکھے بغیر اردو اکاڈمی کس کام کی، انعامات کس کو دیے جائیں گے، طباعت و اشاعت کن اور کیسی تصانیف کی ہوگی، مادری زبان سکھانے پڑھانے والی مائیں کہاں سے لائی جائیں گی اور اس قانون کی کیا وقعت رہ

جائے گی جس میں اقلیتوں کے حقوق کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اردو پر ہم روضہ نہیں تعمیر کرنا چاہتے، اس کو شارع عام بنا دینا چاہتے ہیں۔ ہم بخشش کے خواست گار نہیں ہیں حق رسی کے طلب گار ہیں۔

یونین کے مباحثوں کے معیار کا اونچا ہونا تعجب کی بات نہ تھی۔ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کی تاسیس و تشکیل آکسفورڈ اور کیمرج کی یونینوں کے نقشہ اور روایات پر ہوئی تھی جن کو فروغ دینے میں ان انگریز پروفیسروں کو بڑا دخل تھا جو خود آکسفورڈ اور کیمرج کی مجلسوں کے صدر رہ چکے تھے اور اعلیٰ تعلیم گاہوں میں اعلیٰ مجالسِ اتحاد (یونین) کی صحت مند سرگرمیوں کی قدر و قیمت پہنچانتے تھے۔ ان کے اس احسان کو ہم کبھی فراموش نہ کریں گے۔ دوسرے یہ کہ تقریباً تمام طالب علم ان مذہبی عقائد اور تہذیبی روایات اور طور طریقوں سے بہرہ مند ہوتے اور ان کا احترام کرتے جن سے ہر مسلمان گھرانے کا چھوٹا بڑا چاہے وہ ان پر پورے طور پر عمل بھی کرتا ہو یا نہیں، آشنا تھا۔ یہ شعائر اس عہد کے نوجوانوں کے لاشعور میں خواہ وہ معاشرے کے کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں پیوست ہوتے اور برابر اپنی یاد دلاتے رہتے، مثلاً خدا، رسول، نماز، روزہ، حرام، حلال، ستر طہارت ایسے عقائد اور حقائق تھے جن کو مسلمان گھرانا نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ یہ وہ فضائل ہیں جو دوسرے محاسن کی ترغیب دلاتے رہتے اور طرح طرح کے منہیات کے مانع ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ باوجود ان تمام مکروہات اور معاصی کے جن میں وہ گھر گیا ہے آج بھی نوجوان مسلمان ان شعائر کا کسی نہ کسی حد تک ضرور لحاظ رکھتا ہے جن کی مذہب، اخلاق اور روایات کی تاکید ہے۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ شاعر ہی نہیں اچھا مقرر ہونے کے لیے بھی اچھا آدمی ہونا ضروری ہے جس کی صراحت اوپر کر چکا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں مقرر اور شاعر کا میرا آپ کا تصور مختلف نہ ہو۔

یونین میں اب جو ہلکا پن اور سطحیت راہ پا گئی ہے اور اس کا وقعت و احترام جو کبھی اس کا نمایاں امتیاز تھا جس طرح قصۂ ماضی بنتا جا رہا ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ آپ اعلیٰ پایہ کی بحثیں اور مذاکرے اور ممتاز شخصیتوں کی وقتاً فوقتاً تشریف آوری سے محروم رہنے کے باعث اپنا دیرینہ آب و رنگ اور قدر و قیمت کھونے لگے ہیں اور اس کی جگہ بے وقعت اور پادر ہوا سیاست

نے لے لی ہے۔اس طرح کی سیاست گری آج جس طرح ہم کو آپ کو خوار اور کم عیار کر رہی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میری گزارش ہے کہ آپ اس طرح کی بازاری سیاست سے نہ اپنا دامن آلودہ کریں نہ اس ادارہ کو بازیچۂ انفار بننے دیں۔ سیاست میں ہمارا وہی رویہ ہونا چاہیے جو ہمارے ملک و وطن، ہمارے بنیادی اغراض و مقاصد اور ہمارے ادارے کے اعلیٰ روایات کے مطابق اور شایانِ شان ہو۔

اس وقت ہم زمانہ اور زندگی کے ایسے مرحلے سے گزر رہے ہیں جہاں آپ نوجوانوں کو سیاست کے مکائد و مکروہات سے دور اور محفوظ رکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے لیکن ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں کو کم سے کم مضر رساں کرنے کی کوشش سے نہ بوڑھوں کو مایوس ہونا چاہیے نہ آپ نوجوانوں کو بے پروا۔ تفصیل اکثر طوالت ورنہ تنازعہ کا باعث ہوتی ہے۔ مجھے دونوں سے دلچسپی ہے لیکن اس عہد رفتہ کی کچھ باتیں یاد آ رہی ہیں لیکن نہ ایسی جن کے لیے ساز کی ضرورت ہو یا عمر رفتہ کو آواز دینے کی۔ بچے گھر کی بوڑھیوں سے شہزادہ، شہزادیاں اور جادوگر جادوگرنیوں کے قصے سنتے سنتے سو جاتے ہیں۔ آپ نوجوان ہیں بہت ممکن ہے بوڑھے مغنی کے آوارہ نغموں سے آپ بیدار ہو جائیں، اگر بیدار ہونے کی ذمہ داری قبول کرنے کا حوصلہ باقی رہ گیا ہو۔

بہت دن ہوئے تقریباً 45-40 سال۔ بعض تکالیف اور متعدد آپریشن کے سلسلے میں عرصہ تک گنگ جارج میڈیکل کالج ہسپتال لکھنؤ میں گزارنے پڑے۔ صحت یاب ہوا تو اپنے مکرم بزرگ سید ظفر الملک مرحوم ایڈیٹر الناظر سے فرمائش کی کہ یوروپین وارڈ میں اچھے سے اچھے ڈاکٹر، خوب صورت سے خوب صورت نرسوں، جان چھڑکنے والے عزیزوں اور دوستوں کی خدمات، لذیذ تر کھانوں، لکھنؤ کے مشہور پھلوں اور مٹھائیوں سے لذّت یاب، حضرت شاہ مینا کی درگاہ کی قوالی سے فیض یاب اور شمبھو مہاراج کی کتھا کلی رقص سے لطف اندوز ہونے کے بعد جی چاہتا ہے کہ آپ کے توسّل سے لکھنؤ کے بعض عجوبۂ روزگار شخصیتوں کی خدمت میں بھی حاضر ہوؤں، اگر آپ کے علاوہ اور کوئی رہ گیا ہو۔ مولانا اس طرح مسکرائے جیسے اتنا مسکرانا ہفتہ بھر کے لیے کافی تھا۔ موصوف تقریباً ہر روز مجھے دیکھنے چلے آیا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان اوقات میں جب مریضوں سے ملنا ممنوع ہوتا اور اس کی تلافی یوں کرتے کہ ٹھیک اس وقت واپس جاتے

جب مریضوں سے ملنے کی عام اجازت ہوتی۔ نرسیں ان کی سج دھج اور سراپا سے خوف کھاتیں اور ڈاکٹر ان کی قومی خدمات کا بڑا لحاظ کرتے اس لیے کوئی مانع نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا اور اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ غالباً نخاس اور اس کے آس پاس کا خطہ تھا یا کوئی اور جگہ ہو، ٹھیک یاد نہیں پیچ دار، تنگ و ناصاف گلیوں اور ناشائستہ حال مکانوں سے گزرتے ہوئے ایک جگہ پہنچے جو نسبتاً بہتر تھی۔ دروازے پر پردہ لٹکا تھا، مولانا نے آواز دی، خادمہ آئی، اور اندر بلا لیا۔ ہم دونوں داخل ہوئے ایک معمر بزرگ بڑھاپے کے سارے آزار اور شرافت کے جملہ اوصاف میں مبتلا چارپائی پر تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے تپاک و تواضع سے ملے۔ ظفر الملک صاحب نے مزاج پرسی کے بعد میری طرف اشارہ کر کے تعارف کرایا۔ ''طویل بیماری سے صحت یاب ہوئے ہیں لکھنؤ کی نادرہ روزگار شخصیتوں سے ملنے کا شوق ہے۔ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔''

بڑے شوق اور شفقت سے ملے۔ گفتگو زیادہ تر لکھنؤ کی زبان، شاعری، شائستگی، آداب و روایات، ماضی و حال پر کرتے رہے۔ ایسی شستہ درفتہ زبان اور لب و لہجہ کہ بس سنا کرے کوئی۔ ایک موقع پر فرمایا۔ (اس کا ذکر اس زمانے کے مضمون میں کر چکا ہوں) ''آج کم و بیش بیس سال سے محلہ سے باہر قدم نہیں رکھے معلوم نہیں کہاں غلط زبان سننے یا کسی گنوار سے ملنے کا حادثہ پیش آ جائے!'' اس وقت سوچتا ہوں کیا حالت ہوتی اگر آج مرحوم زندہ ہوتے اور ان کو غلط زبان سننے کے ساتھ غلط شکلیں بھی دیکھنا پڑتیں۔ یہ نصف صدی پہلے کے لکھنؤ کی تہذیب کا نقشہ تھا۔ دم بخود رہ گیا کہ زبان (اردو) کے معیار و منزلت کا یہ احترام کہاں سے آیا اور کیوں کر آیا اور اس ہیلن کی بازیافت کے لیے کیسے کیسے ہومرؔ ظہور میں آتے رہیں گے۔

اس سے پہلے کی وہ تصویر بھی آپ کے سامنے ہوگی جو محمد حسین آزادؔ نے آبِ حیات میں میرؔ کی پیش کی ہے۔ آلامِ روزگار سے تنگ آ کر میرؔ نے دہلی سے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ ہم سفروں میں سے کسی نے گفتگو کرنا چاہی۔ میرؔ طرح دے گئے۔ تھوڑی دیر بعد عرض کیا۔ ''حضرت گفتگو سے راستہ آسانی سے کٹ جاتا ہے۔'' میرؔ نے بدحظ ہو کر جواب دیا۔ ''جناب کا سفر کٹ جائے گا لیکن میری زبان خراب ہو گئی تو کیا ہوگا۔'' یہی میرؔ لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں پہنچتے ہیں تو ان کی

سج دھج دیکھ کر لوگ مسکراتے ہیں۔ اس کا جواب میرؔ نے ''پورب کے ساکنو'' کو جس قطعہ میں دیا ہے وہ آپ کو یاد ہوگا۔ غالبؔ نے اپنے زمانے میں اس کا ماتم کیا ہے کہ اب دہلی میں اردو کہاں پنجابی کا غلبہ ہے۔ مثالیں کہاں تک دی جائیں، آپ سے تو صرف یہ کہنا ہے کہ جس متاعِ گراں مایہ کی امانت دیوانوں کے سپرد تھی۔ ان کا قصہ آپ نے سن لیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ فرزانے کیا کرتے ہیں۔

صفیؔ نے بڑی حسرت سے کہا ہے:

زمانہ، بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

سوال یہ ہے کہ گذشتہ یونین کی بڑائی کی داستان کہتے کہتے یا سنتے سنتے آپ اور میں دونوں سو گئے تو کیا ہوگا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ بعض ایسے مسائل بھی معرضِ گفتگو میں آجائیں جن سے سونا حرام ہوجائے تو اتنا ملال بھی نہ رہے۔ مثلاً کیا تدابیر اختیار کی جائیں جن سے پرانی یونین کی بازیافت نئے زمانے کے تقاضوں اور نئی نسل کے حوصلوں کے مطابق ہوجائے۔ ہم جس حال میں ہیں وہ ہمارے ماضی اور مستقبل دونوں کی بارگاہ میں ہماری آپ کی طرف سے جواب طلبی اور جواب دہی دونوں پر مامور بھی ہے مجبور بھی، یونین کی آبادکاری بہر حال کرنی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بدلے ہوئے اور بے اماں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں آبادکاری کن خطوط پر اور کن جہات میں ہو۔ حالات کے اس طرح کچھ کا کچھ ہوتے رہنے سے نہ پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ پشیمان۔ حالات کیسے ہی سنگین کیوں نہ ہوجائیں بالآخر انسان ان پر قابو پالے گا۔ اس لیے کہ انسانیت کو کبھی شکست نہیں ہوئی ہے۔ یونین کی اصلاح و ترقی کے لیے کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

1۔ یونین بہت کثیرالعیال ہوگئی ہے۔ خاندان مشترک کے بندھن ڈھیلے ہوگئے ہیں۔ ایم۔اے۔او۔ کالج کے مقابلہ میں اس کے اراکین کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے، اتنے بے شمار نازک اور آتش گیر مسائل دفعتاً سامنے آگئے ہیں کہ کوئی مستقل انتظام دیرا اور دور تک ساتھ نہیں دیتا۔ اس کا براہِ راست، بڑا کاری اور دوررس اثر اس کے اقلیتی و اقامتی کردار پر

پڑا ہے۔ یعنی جن لوگوں کے جن بنیادی مقاصد کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا وہ معرضِ خطر میں نہیں بلکہ سانحہ کی شکل میں سامنے آگئے ہیں۔ حکومت سے ہماری درخواست یہ ہے کہ اس ادارے کے اقلیتی کردار کو بہ تمام اجمال و تفصیل قانوناً تسلیم کیا جائے اور ان پر عمل کرنے کی سہولت فراہم کی جائے۔

جس صورت حال کا سامنا ہے اس میں ہم سب کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یونین کی رکنیت کو قابو سے باہر نہ ہونے دینا چاہیے۔ اس کی افادیت اور اہمیت کا بہت کچھ انحصار اس پابندی پر ہوگا۔ تعداد کو بے روک ٹوک بڑھنے دینے سے مشکوک عناصر و عوامل میں اضافہ ہوتا ہے اور طرح طرح کی دشواریاں اور نزاکتیں سامنے آتی ہیں۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں یونین کی رکنیت پر کڑی پابندی عائد تھی۔ اس کی شکایت کبھی کسی نے نہیں کی۔ فوائد سب کے حصے میں آئے۔ یونین کے وزن اور وقعت کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا یوں بھی حفاظت و حرمت صرف منتخب اشخاص یا جماعت یا ادارے کے سپرد کرنے اور رکھنے کے حق میں ہوں۔ یاد آتا ہے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے عہد میں ڈے اسکالرس سڈنس یونین کے نہیں اپنی علاحدہ یونین، ڈے اسکالرس یونین کے ممبر ہوتے تھے۔ خواص کے بغیر عوام کی حیثیت بیاباں میں سمت سے ناآشنا سفر سے معذور اور سالار سے محروم قافلے کی ہے۔

چاہتا ہوں کہ یونین میں تعداد کی تجدید کے مسئلہ پر بحیثیت مجموعی آپ غور کریں اور اس کا حل نکالیں، ایسے علمی اور تعلیمی ادارے ہوسکتے ہیں جن کی رکنیت پر پابندی ہو۔ بذات خود میں یونین کی رکنیت کی توسیع کے حق میں اتنا نہیں ہوں جتنا تجدید اور تنظیم کے۔

2۔ حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ نوجوانوں کا عام رجحان بے راہ روی اور آشفتہ سری کی طرف ہے ایسی بے راہ روی جو کسی نوع کی ذمہ داری یا ڈسپلن کو خاطر میں نہیں لاتی، اس کے سبب سے عزت نفس خلوص اور خودداری کی اہمیت باقی رہی نہ وقعت، زندگی ایک عالم گیر ہیبت و ہیجان کی گرفت میں ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ بہت سے اسباب کی بنا پر مسائل اتنے بڑھ اور پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے بھی قابو میں نہیں آتے، اس کا نہایت سستا لیکن خطرناک اور نامبارک نسخہ یہ طے پایا ہے کہ بداطواری کا علاج مزید بداطواری

سے کیا جائے یا ہونے دیا جائے۔ چنانچہ اب ہر طرح کے جرائم اور افعال قبیحہ وشنیعہ نہ صرف نا قابلِ اعتنا رہے بلکہ ان کو قانونی جواز بھی دیا جانے لگا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جرائم کے انسداد کی کوشش سے جرائم بڑھتے ہیں ڈھیل دینے سے زندگی کے معمولات بن جاتے ہیں اور گناہ، گناہ نہیں رہ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اور جرائم سے قطع نظر گذشتہ 25-20 سال میں جنسی معائب و مکروہات کے جواز کے جتنے قوانین وضع کیے گئے اس سے پہلے شاید کئی سو سال میں نہیں کیے گئے ہوں گے۔ حکومت کے ارجمند چاہے جو کہیں یا کریں، سارے آپ کے بزرگوں نے بتایا ہے کہ عورت کے ناموس کا نگہ بان مرد ہے، عورت نہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ خواتین کی جدید نسل عصمت سے انحراف کو اہمیت نہیں دیتی، اب آپ نوجوان ہی بتائیں۔ ایں چہ بوالعجبی است آپ کو سن کر شاید تعجب ہو کہ تہذیب جدید کہ دانش وروں نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ عورت کی عصمت کا جتنا لحاظ مرد کو ہوتا ہے اتنا عورت کو نہیں۔ آپ کے بوڑھے چاہتے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے اس لحاظ میں کمی نہ کریں۔

لیکن اس وقت میرے سامنے عالم کے اتنے مسائل نہیں ہیں جتنے علی گڑھ کے۔ آپ کے شب و روز کی سرگرمیوں میں ایسی باتوں نے دخل پالیا ہے جن سے آپ کی وقعت خود آپ کی نظروں میں گھٹ گئی ہو تو عجب نہیں۔ سنتا ہوں آپ میں سے کچھ پاس کے سستے اور عوام سے آباد ریستورانوں اور سینماؤں میں کبھی خورد و نوش اور فلمی گانوں کے سننے میں مصروف ہوتے ہیں اور غیر ذمہ دار بیرونی اشخاص سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ آپ فرمائیں گے نوجوانوں کی اس انداز کی روک تھام اس زمانے میں نہیں کی جا سکتی۔ جس صفائی سے آپ یہ کہیں گے اس سے زیادہ خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری رکھتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ کہیں اور یا کسی دوسرے ادارے کے نوجوان ایسی عوامی یا بازاری زندگی چھوڑ سکتے ہوں یا نہیں علی گڑھ کے نوجوانوں کو اس طریقۂ زندگی سے دور رہنا پڑے گا۔ برائی برائی ہے چاہے اس میں آپ جیسے نوجوان ہی کیوں نہ مبتلا ہوں۔ آس پاس، ستھرا، صحت مند اور خوب صورت ہو تو نوجوان میں بگاڑ آ سکتا ہے، نہ اس میں عرصہ تک مبتلا رہ سکتا ہے۔ یونین کے گرد و پیش کو خوش نما آباد اور مفیدِ مطلب بنانے اور رکھنے کی کوشش کیجیے۔ ماریسن کورٹ اور آپ کی یونین کے درمیانی حصہ

اور مشرقی اور مغربی قطعات کو ذاکر صاحب مرحوم نے اپنے عہدِ وائس چانسلری میں بڑے شوق سے ایک پُرفضا خیاباں بنانے کا اہتمام کیا تھا۔ فرمایا کرتے کہ ''اس قطعہ کو ترقی دے کر 'اسٹوڈنٹس کارنر' کی حیثیت دی جائے گی۔ جہاں طلبا روز روز کے شور وشغب اور ہنگامہ و ہیجان سے دور رہ کر فرصت کے اوقات اچھی فضا، اچھے مشاغل اور ساتھیوں میں گزارا کریں گے۔'' جیسا کہ کہا گیا ہے: ''فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے'' مَیں نے عرض کیا تھا ذاکر صاحب، شاید اسی شاعر نے یہ بھی کہا ہے ''جامے دُبتے و بربطے برلبِ کشت'' مسکرا کر فرمایا۔ ''کیا مضائقہ'' اکثر مواقع پر ذاکر صاحب یہ فقرہ بڑے لطف سے کہہ جاتے، چاہتا ہوں اس اسکیم کو آپ کامیاب بنائیں۔ اس طرح آپ کو اس فضا اور سوسائٹی کی دوری زیادہ شاق نہ گزرے گی جس کا ذکر اُوپر آیا ہے۔

انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج اور متعلقہ عمارات کی تعمیر ہوجانے کے باعث یونیورسٹی کا رقبہ اب شمال مشرق کی طرف بڑھنے لگا ہے اور پرانا علاقہ یعنی وکٹوریہ گیٹ، سرسید ہال، مہدی منزل سے مشتاق منزل اور مسجد تک کی عمارات، کرکٹ فیلڈ اولڈ بوائز لاج اور آپ کا یونین کلب جو کالج کی اعلیٰ روایات کا سرچشمہ اور امتیازی علامات Symbols میں داخل ہوچکی ہیں نسبتاً اتنی آباد اور آپ کی طالب علمانہ سرگرمیوں کا محور نہیں رہے جو پہلے کبھی تھے، لیکن ان کی بڑائی اور دل آویزی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس لیے خاص طور پر درخواست کروں گا کہ آپ یونین کی اعلیٰ روایات اور اس کے گرد وپیش کو ستھرا، دل کش اور آباد رکھنے کے ساتھ یہ نہ بھولیں کہ اس ادارے کی شان وشبیہ وہی خطہ رہے گا جس کی نشان دہی ابھی کی گئی ہے۔

3۔ یونین کے احاطہ میں بچوں کا ایک اسکول اور اس کی چھوٹی سی عمارت ہے جو مضحکہ انگیز حد تک ناکافی ہے۔ ایک درخت کے گرد پختہ چبوترہ بنا دیا گیا ہے۔ اس پر بھی کلاس ہوتی ہے۔ اکثر یہ بتانا دشوار ہوا ہے کہ درخت پر پرندے چہچہا رہے ہیں یا چبوترے پر بچے۔ ماسٹر صاحب کی آواز 'خاموش'، 'خبردار' پر باغ کے رکھوالے کی صداؤں کا دھوکہ ہوتا ہے! اس مدرسہ کی پوری کفالت یونین کرتی ہے۔ میں اسے یونین کا خیر جاریہ سمجھتا ہوں۔ چند برسوں

سے یونین کے تعطل یا تگ و دَو کا جو نقشہ رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یونین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ اسکول ہے۔

کم استطاعت والدین کے بچے بچیاں اس اسکول سے جتنا فائدہ اب تک اٹھا چکے ہیں اور اُٹھا رہے ہیں اس کا خیال کرتا ہوں تو دل خوش ہو جاتا ہے اور آپ کی کتنی فردگذاشتیں فراموش ہونے لگتی ہیں۔ میں اسکول کی اندرونی درو بست سے واقف نہیں ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کچھ ایسے مستقل انتظامات کر دیں کہ یہ اسکول ہمہ جہتی ترقی کرے اور کرتا رہے نیز یونین اور یونین کے الیکشن کے گاہے چنیں گاہے چناں سے محفوظ رہے، ساتھ ہی ساتھ عملہ کی فرض شناسی پر مستقلاً کڑی نظر رکھی جائے۔ اسکول سے قریب کی مسجد میں بچوں کا مکتب ہے، اسکول اور مکتب دونوں کو مشترکہ نظم و نگرانی میں کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

4۔ یونین کا بجٹ بناتے وقت اس اصول کو خاص طور پر مدنظر رکھنا چاہیے کہ بجٹ یونین کی ضروریات کے مطابق بنایا جائے، منسٹری کے اغراض و مصالح کے پیشِ نظر نہیں۔ برسرِ کار منسٹری کے اخلاقی فرائض میں ہے کہ آنے والی منسٹری کے لیے حتی الامکان واجب الوصول بل نہ چھوڑے۔ غیر معمولی تعداد میں واجب الادا بل چھوڑنا رخصت ہونے والی منسٹری پر ایک گونہ بے اعتمادی کا ووٹ ہے۔ یونین کا مقصد تقریر کی مشاقی گفتگو اور مباحثہ میں پارلیمنٹری آداب و روایات کا لحاظ، تقریری اور تحریری مقابلوں کے لیے گراں قدر انعامات کی منظوری، اعلیٰ شخصیتوں کو معرکۃ الآرا مسائل و مباحث پر اظہارِ خیال کرنے کی دعوت دینا اور ہمارے ممتاز طلبا کا ان میں حصہ لینا۔ اعلیٰ معیار اور پیمانے کے مشاعروں اور مذاکروں کا انعقاد اور یونیورسٹی کی عام شہرت کو محفوظ رکھنے اور آگے بڑھنے کا اہتمام و انصرام ہے کچھ اور نہیں۔

یونین کا سرمایۂ آمدنی زیادہ تر انھیں مقاصد کے لیے محفوظ اور مخصوص ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں یونین کا کوئی سرمایہ محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ کسی ادارے کی ساکھ کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ یونین کا سرمایہ و ثروت کسی فرد یا جماعت کی آمدنی نہیں، یونین کے اراکین کی امانت ہے۔ اس سے انحراف آپ ہی بتائیں کیا ہے؟ کسی چھوٹے بڑے ادارے کی خوبی یا خرابی کا انداز اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی آمدنی کیسے لوگ کس طرح کام میں لاتے ہیں۔ ایک لطیفہ سناؤں، واقعہ

اس لیے نہیں کہتا کہ شاید آپ کو اس کا یقین نہ آئے۔ یونین کے شمالی سمت کے کمرے اور برآمدہ کسی وقت آنریری سکریٹری (اب وائس چانسلر) کا دفتر تھا۔ نواب وقارالملک مرحوم سکریٹری تھے۔ کالج کا سرکاری کام ہوتا تو آفس کے قلم دوات کاغذ سے کام لیتے، ذاتی ہوتا تو اپنی اسٹیشنری کام میں لاتے جو میز پر ایک سمت رکھی ہوتی۔ پروفیسر محمد حمید الدین خاں مرحوم جب کسی کی بداعمالی یا خورد بُرد کا قصہ سنتے تو اپنے اس چشم دید واقعہ کا ضرور ذکر کر دیتے۔ جی چاہتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی قائم کی ہوئی اس روایت کی ابتدا کسی نہ کسی حد تک آپ کے عہد اور عہدہ داروں سے کی جایا کرے۔

5۔ کچھ دنوں سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ یونیورسٹی سے اپنا مطالبہ منوانے کے لیے آپ بھوک ہڑتال وغیرہ کے طریقے کام میں لانے لگے ہیں۔ جواز میں غالباً مہاتما گاندھی کے برت رکھنے کی مثال ہوگی۔ ذاتی طور پر میں اس طریقۂ کار یا استدلال کو درست نہیں سمجھتا۔ مہاتما جی نے اس کو سیاسی یا وقتی مصالح کی بنا پر نہیں کلیتہً روحانی واخلاقی سطح پر صفائے قلب اور تزکیۂ باطن کی بے پایاں آزمائشوں اور ریاضتوں سے گزرنے کے بعد اختیار کیا تھا۔ جب تک کوئی مہاتما جی کی شروع سے آخر تک کی بپتاؤں سے نہ گزرا ہو اس کو ان کے اس طریقۂ کار کو اختیار کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مہاتما گاندھی نے اعلیٰ اقدار اور عزیمتوں کی جیسی زندگی گزاری تھی۔ اس کو نظر انداز کر کے یا اس کی تاب نہ لا کر ان کے مرن برت کا اپنی مشکوک اور آئے دن کے معمولات کے حصول کا وسیلہ بنا لینا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ اعلیٰ کو ادنیٰ کی چاکری میں دے دینا ہے جسے آپ کو ہرگز گوارا نہ کرنا چاہیے۔ کسی حال میں نہ آپ یونیورسٹی کے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں نہ یونیورسٹی آپ کے خلاف تعلیم گاہوں کو یہ فارمولا ہمیشہ کے لیے اپنا لینا چاہیے۔

اس بارے میں میرے سوچنے کا انداز ایک قصہ کی بنا پر بھی ہے جو ایک دوست سے کبھی سننے میں آیا تھا۔ آپ بھی سنیے۔ آپ کو تفریح ہوگی تو مجھے ثواب ملے گا۔ کہیں شادی کی تقریب تھی۔ دولہا دلہن کے اعزا و احباب جمع تھے۔ عقد نکاح کا وقت آیا تو مہر کی رقم پر گاڑی رک گئی۔ دولہا کی طرف سے مہرِ فاطمی پر اصرار ہو۔ لڑکی والوں کے لیے یہ قابلِ قبول نہ تھا۔ جھگڑا بڑھا تو ایک بزرگ سامنے آئے جن سے شادی کے فریقین ہی نہیں سارے حاضرین شناسا

بھی تھے اور خائف بھی۔ان کی ہیئت وحیثیت برخانہ ان کے آنریری دادا اور قصبہ کے خدائی فوج دار دادا کی تھی۔ جہاں جیسا دیکھتے وہاں ویسا رول اختیار کرتے۔ جھگڑا بڑھتا ہوا نظر آیا تو مجمع پر قابض ومتصرف ہوکر لڑکے والوں سے فرمایا، مہرِ فاطمی سر آنکھوں پر لیکن یہ بتاؤ دولہا حضرت علی ہیں یا دلہن حضرت فاطمہ جواب نفی میں ملا تو بولے پھر مہر فاطمی کیوں اور کیسے جب دولہا حضرت علی اور دلہن حضرت فاطمہ ہونے لگیں گی اس وقت مہرِ فاطمی کا مسئلہ اٹھانا فی الحال مہر کی رقم وہی ہوگی جو برادری میں عام طور پر رائج ہے۔ مانتے ہوتو خیر ورنہ ہرجانہ ادا کرو اور بھاگ جاؤ۔ دادا کا فیصلہ بے چون وچرا تسلیم کرلیا گیا، اور تقریب بخیر وخوبی انجام کو پہنچی۔

ایم۔اے۔او۔کالج کے قیام سے لے کر اس کے یونیورسٹی میں منتقل ہوجانے تک اس ادارے کا آنریری سکریٹری ہندستانی مسلمانوں کا متفقہ طور پر سربراہ ہوتا تھا۔ یہ صورت حال کسی خاص تحریک آئین یا ضابطہ کی بنا پر نہ تھی۔اس کا سبب کلیتہً سرسید کی غیر معمولی شخصیت اور ان کی گراں قدر خدمات تھیں، اس سے ہم کو بے شمار فائدے حاصل ہوئے۔آج جو اہمیت اس ادارے کو حاصل ہے اور یہ ادارہ ہماری منزلت کا نشان بنا ہوا ہے، وہ اسی عہد کی دی ہوئی متاعِ گراں مایہ ہے۔یونیورسٹی ملنے، ملک کے تقسیم ہوجانے اور آزادی سے ہم کنار ہونے سے طرح طرح کے مسائل سامنے آئے جو روبراہ ہونے کے بجائے پیچیدگی اور نزاکت کے اعتبار سے مشکل تر ہوگئے اور پہلی صورت حال کچھ کا کچھ ہوگئی۔سب سے دوررس اور تقریباً لاینحل دشواری یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہیں اور طلبا، اساتذہ اور منتظمہ کے معتبر اور ہمدرد نگرانی سے نکل کر مشتبہ دیانت وامانت کے سیاسی لیڈروں کے دستبرد میں آگئی ہیں، اس طرح وہ عظیم مقصد خطرہ میں آگیا ہے۔جس کے لیے اعلیٰ تعلیم گاہیں قائم کی جاتی ہیں اور آپ نوجوانوں کی تعلیم وتربیت اور داشت وپرداخت انتہائی اہتمام واحترام سے کی جاتی ہے، اس لیے کہ آئندہ ملک اور وطن کی حفاظت وبڑائی کا فریضہ آپ کے سپرد ہوگا اور اس سے عہدہ برآ ہونا آپ کی اوّلین ذمہ داری ہوگی۔

اس مقصد کے پیشِ نظر چاہتا ہوں جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ آپ اور منتظمہ اپنے کو ہر وقت ہر جگہ اور ہر کرائسس (Crisis) میں ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ

رفیق و شفیق سمجھیں۔ یہ کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ یونیورسٹی کے اندر منتظمہ اور آپ طلبا آمنے سامنے صف آرا ہوں۔ کہیں اور کچھ ہی ہوتا ہو، آپ اپنی یونیورسٹی کے بزرگوں اور خیراندیشوں کی مصلحت و مرضی سے باہر جانے اور رہنے کے کسی طرح مجاز نہیں ہیں۔ ہماری یونیورسٹی ایک مشترکہ خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں وہ ڈسپلن اور آئین حیا اور وفا ہر قیمت پر نافذ رہے گا، جو شریف خاندانوں میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی سے باہر آپ براہِ راست یا بجائے خود کسی ایسی جماعت سے رابطہ رکھنے میں حق بجانب نہ ہوں گے جس کا مسلک یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کا منافی ہو۔ یہ فکر و عمل کی آزادی پر پابندی لگانے کی تائید یا تبلیغ نہیں کر رہا ہوں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ جب تک یونیورسٹی میں طالب علم رہیں، یونیورسٹی کے اعلیٰ اساسی اور دیرینہ مقاصد اور روایات کی ہر حال میں پیروی کریں، اس میں اجتہاد سے کام نہ لیں۔

کہنا یہ ہے کہ نوجوانوں اور ناآزمودہ کار ہونے کے سبب سے آپ کو معاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے ان گراں قدر ذمہ داریوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے جو آپ پر عائد ہیں۔ میرا خیال ہے جس کا وقتاً فوقتاً اظہار کرتا رہتا ہوں کہ ہمارا یہ ادارہ (مسلم یونیورسٹی) شروع دن سے آج تک مسلمانانِ ہند کا ضمیر رہا ہے اور اس ضمیر کے نمائندے آپ طلبا ہیں۔ یہی اور اتنا ہی نہیں بلکہ ہم سب اپنی جگہ پر اس منصبِ جلیل کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے مجبور و مامور ہیں۔ اس وادی میں سدا آبلہ پائی اور دعوتِ خار و خلش کوئی راہِ فرار یا جائے پناہ نہیں ہے۔ یہ بڑے شرف و سعادت کا مقام ہے۔

''اب روئے سخن حضرتِ صاحبِ عالم کی طرف ہے..........''

جیسا کہ آپ جانتے ہیں رقعاتِ غالبؔ میں آیا ہے یعنی آپ کے اساتذہ کرام کی طرف جن کو آپ بطور امانت سپرد ہیں۔ صوفیائے کرام کے حلقہ میں نہیں بلکہ ان کے 'حلقۂ بیرونِ در' میں، سُنا ہے کہ پیر و مرید کا تعلق اس طرح کا ہے کہ مرید جب چاہے پیر سے علاحدگی اختیار کرے، اس کو پورا حق حاصل ہے۔ لیکن پیر مرید کو کبھی اور کسی حال میں چھوڑنے کا مجاز نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ذمہ داری میں رہے گا۔ میرے نزدیک یہ رشتہ معلّم اور متعلّم پر بھی یکساں عائد ہوتا ہے۔ یعنی طالب علم استاد کو چھوڑے یا نہیں، استاد شاگرد سے کسی حال میں دست کش

نہیں ہوسکتا! یہی رشتہ ماں باپ اور اولاد کا ہے۔ پہلا رشتہ عقیدت اور ذمہ داری کا ہے، دوسرا خوف کا۔کون بتائے اور کیسے بتائے کہ کون سا رشتہ نا قابلِ شکست ہے اور کون قابلِ شکست! شاید دونوں نا قابلِ شکست ہیں۔

ان رشتوں کے ہوتے ہوئے آپ اساتذہ اور طلبا کسی حال میں ایک دوسرے سے علاحدہ رہ سکتے ہیں نہ رکھے جاسکتے ہیں۔آپ فرمائیں گے یہ رشتے اب تمام دنیا میں کمزور اور بے وقعت ہوگئے ہیں۔علی گڑھ کس شمار میں ہے میرا معروضہ یہ ہے کہ ہم آپ اسی ذمہ داری کے تو پابند ہیں کہ خسران وعصیان کے سمندر میں علی گڑھ طوفان کا مقابلہ کرے گا۔یمن وسعادت کے جزیرے تعمیر کرے گا اور اخلاق واکرام کے جہاز Even Keel پر چلائے گا۔علی گڑھ کسی طرح آؤٹ آف ڈیٹ یا قصہ پارینہ بننے کے لیے تیار نہیں ہے۔دنیا کا کوئی ادارہ جس کی بنیاد شرف وسعادت کی اساس پر رکھی گئی ہو، شروع تہذیب سے آج تک کہیں آؤٹ آف ڈیٹ (Out of Date) نہیں ہوا، ہو نہیں سکتا۔

میں پیر نہ مرید اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔دونوں کا رشتہ مقررہ یا بتائے ہوئے اورادو وظائف سے آگے بڑھ کر تزکیۂ باطن اور خدمت خلق تک پہنچتا ہے یا نہیں۔یہ مسئلہ زیرِ بحث بھی نہیں، لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اولاد اور والدین اور شاگرد واستاد کا تعلق وہ نہیں رہا جو کبھی تھا اور آج بھی ہونا چاہیے۔یہ تشویش ناک آثار ہیں، جہاں یہ صورت حال ہے وہاں کے معاشرے کے مفاسد کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ہر روز جیسی سفاکیاں دیکھنے اور سننے میں آتی رہتی ہیں وہ بڑی مایوس کن ہیں۔اولاد والدین کے کہنے میں نہیں رہی۔چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے یونیورسٹی میں اولاد کا والدین ہی سے نہیں بلکہ استاد کا شاگرد سے ربط ورشتہ اس سے بہ درجہا بہتر ہو، جیسا کہ دوسری چھوٹی بڑی تعلیم گاہوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔یہ اجتماع آپ طالب علموں کا ہے، اس لیے اساتذہ کرام کی خدمت میں اظہار خیال یا 'گزارشِ احوالِ واقعی' کا یہ محل نہیں۔اس لیے ان کی خدمت میں غالب کا یہ شعر پیش کرنے کی جرأت کروں گا۔

فرزند زیرِ تیغ پدر می نہد گلو
گر خود پدر در آتش نمرود می رود!

اگر کسی وجہ سے آج، اساتذہ کرام اور آپ کا رشتہ اولاد و والدین کی مانند ابراہیم اور اسماعیل کا نہیں رہا تو چاہتا ہوں کہ آپ آئندہ نسل کے ابراہیم بننے کی ہمت کریں۔ اسماعیل کی روش اور روایات کا دور کچھ زیادہ دور نہ رہ جائے گا۔ آج جیسی آتشِ نمرود کب اور کہاں نصیب ہوگی؟ کیا معلوم پھر کسی کو کسی کا امتحان مقصود ہو! اس امتحان کا سامنا کرنے کی آپ دونوں کو دعوت دیتا ہوں۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم!

(مطبوعہ سرسید میگزین، علی گڑھ 1975)

●●●

عزیزانِ علی گڑھ
کچھ ''اس بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس''
کے بارے میں

1967 میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ موصوف اس ادارے کی صد سالہ جوبلی منانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسکیم کی داغ بیل دی گئی۔ کچھ کام بھی ہونے لگا۔ لیکن کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ مجوزہ تقریب ملتوی کردی گئی۔ جوبلی کے ساتھ یہ خیال دل میں آیا کہ اپنے طلبا، عزیزانِ علی گڑھ کو ایک خطبہ دوں گا۔ لکھنا بھی شروع کردیا تھا، پھر یہ ہوا کہ جوبلی ملتوی ہوگئی۔ لیکن خطبہ کا لکھا جانا بند نہ ہوا اور طویل وقفوں کے ساتھ یہ مشغلہ جاری رہا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ لذیذ نہ ہونے کے باوجود حکایت دراز ہوگئی۔

خیال آیا کہ جب تک کوئی دوسرا انتظام نہ ہو اس کے کچھ اجزا یونیورسٹی کے علمی و ادبی صحیفہ فکر ونظر میں بالاقساط شائع کیے جائیں تو شاید نامناسب نہ ہو۔ اربابِ رسالہ کے کرم سے یہ بھی ہوگیا — صرف اس ستم ظریفی کے ساتھ کہ خطبہ کے اجزا بجائے اس کے کہ ابتدا سے شروع ہوکر آگے کی طرف بڑھتے۔ آخر سے شروع ہوکر آغاز کی طرف رہ نورد ہوگئے۔ کبھی کبھی اس سے بھی انحراف ہوا۔ ممکن ہے کہ فکر ونظر یا دوسرے ناظرین کو یہ بے ربطی محسوس نہ ہوئی ہو۔ اس لیے کہ رسالہ وقفوں سے شائع ہوتا رہا اور مضمون کی نوعیت خطبے کی تھی۔ ناول، ڈرامہ یا افسانہ کی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں خود سراسیمہ ہوگیا کہ شائع اور غیر شائع شدہ اجزا کو ازسرنو کیسے ترتیب دوں۔ اس لیے کہ ان کا اور چھور میرے قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ جب کوئی صورت فلاح یا فرار کی نظر نہ آئی تو مقدم و موخر کو جہاں کا تہاں چھوڑ کر ان کو ناظرین کی خدمت میں پیش کردینے پر آمادہ ہوگیا۔ خطبے کے جو اجزا ناظرین قومی آواز کی نظر سے گزریں گے۔ وہ اب تک کہیں اور شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اس تمام گزارشِ احوال کے ساتھ عرض کروں گا۔ عیبم مکن کہ درشبِ ہجراں نوشتہ ایم! (غالب) ●

عزیزانِ علی گڑھ

عزیزانِ گرامی!

کوئی مشکل مقام آتا ہے تو آہ وفغانِ نیم شب کا پیام شاعر ہی کو نہیں دیوانے کو بھی آتا ہے۔ بہت دن ہوئے اصغؔر گونڈوی مرحوم سے پہلی بار علی گڑھ میں ان کا یہ شعر انھیں کی زبان سے سنا تھا ؎

گم صاحبِ تمکیں ہے افسانۂ محفل میں
مجنوں کو یہی لیکن پیغامِ بیاباں ہے

یہ شعر علی گڑھ کی اس محفل میں پڑھا اور محسوس کیا گیا جس کی تعبیر وتکریم علی گڑھ ہی کے دیوانوں اور فرزانوں سے کی جاتی تھی۔ ایسا شعر بھی اصغؔر صاحب ہی جیسے شاعر کہہ سکتے تھے جو ان رموز وروایات کے نمائندے اور زبان وبیان کی اس غزل سے آشنا تھے جس کا نام اردو بھی ہے۔ اس وقت اصغؔر صاحب زندہ تھے۔ کیسے اور کتنے شریف، شائستہ اور شگفتہ۔ جیسے غزل نے ان کو اور انھوں نے غزل کو اپنے اپنے اعتبار واظہار کے لیے منتخب کرلیا ہو۔ پھر ایک زمانہ آیا، جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے تھے۔ زمانہ اور زندگی یکساں روانی اور ردّعمل کے ساتھ بدلتے رہے جیسا کہ ان کا خاصہ اور تقدیر ہے، لیکن نہ اس تشدد وتعزیر کے ساتھ جن کا سابقہ

ہونے لگا تھا اور رفتہ رفتہ یونیورسٹی ان کی آماج گاہ بن گئی۔ یونیورسٹی ہی نہیں وہ اقدار و عوامل بھی جن کے طفیل یا تقاضوں سے اس کا ظہور ہوا تھا۔ کتنے اور کیسے کیسے صاحبِ تمکین افسانۂ محفل میں گم ہونے لگے۔ صاحبِ تمکین یا فرزانوں کی یہی گم شدگی دیوانے کو بستی چھوڑنے اور بیابان بسانے کا پیغام لاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں صاحبِ تمکین ساقی سے کہتا ہے شراب لا کہ روئے عالم روئے محبوب کی مانند ارغوانی ہوگیا ہے۔ دیوانہ چیختا ہے کہ سیف وسناں اٹھا کر محبوب کی آبروزد میں ہے۔

یہ عذران احباب اور عزیزوں کی خدمت میں ہے جو مجھے علی گڑھ کے آزار میں مبتلا پا کر اکثر ترس کھاتے رہتے ہیں۔ الزام یہ ہے کہ میرا دیرینہ مشغلہ مطربی و مسخرگی تھا۔ اس سے تھک ہار کر اب اتقیا و طاعت کی تلقین شروع کردی ہے، جیسا کہ مغفرت کی امید میں بے مصرف اور کسم پرسی بوڑھے کرنے لگتے ہیں یا کچھ کہنے کو نہ رہ گیا ہو۔ اس لیے خانہ پُری کرنے لگا ہوں، یہ سب صحیح لیکن جب سیاست کا نقشہ بقول شاعر یہ ہو جیسے کوئی طوائف تماش بینوں میں گھر گئی ہو، اور سیاست ہی کیا پوری زندگی اور فکر و عمل کا یہی نقشہ ہو، اس وقت دیوانے (مسخرے) کو کچھ کہنے کے لیے نہ رہ جائے، یہ حسنِ ظن تو انہی لوگوں کو ہوگا:

ع جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں!

دیکھنے میں آیا ہے کہ آسمان کسی دولتِ غرناطہ کو برباد کرتا ہے تو کسی نہ کسی 'ابنِ بدروں کا دلِ ناشاد' فریاد پر مائل ہوتا ہے۔ سمندر کی آبرو اور 'بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی' (سسلی) کو دیکھ کر اقبال نے بے قرار ہو کر اسلاف کے کارناموں کو یاد کیا، یاد دلایا اور ان پر ماتم کرنے کا شرف محسوس کیا۔ یا 'داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر'۔ حالاں کہ داغ اصلاً نغمہ و نشاط کے شاعر تھے یا 'فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی' کی تاراجی پر اردو شعرا نے جیسے جاں گداز مرثیے لکھے ہیں شاید کسی اور زبان میں شہر یا تمدن کے زوال پر باستثنا سعدی اور خاقانی کے فارسی مرثیوں کے جو 'ملک مستعصم امیر المومنین' اور خرابۂ مدائن پر لکھے گئے ہوں۔ ان مرثیوں نے جس ملک اور تہذیب کی تباہی پر الفاظ و الم کے پیکر اختیار کیے، دراصل ان کے زوال کو ان کے عروج سے زیادہ عظیم و جلیل بناتے ہیں۔ عظیم کا اندازہ اور احساس اکثر اس کے

زوال کی قیمت و قامت سے کرتے ہیں، اور یہ کارنامہ شاعر کا ہے جو کلام کو موضوع سے اور موضوع کو کلام سے دوام و دل آویزی بخشتا ہے۔ اس طور پر زندگی کے اسرار و معارف کو ظہور میں لاتا ہے، اسے پھیلاتا ہے اور پائندگی دیتا ہے اور آنے والی نسلوں کے حافظہ کو اعلیٰ روایات اور اقدار کو بالیدہ اور برگ و بار لانے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ برخلاف نئے انداز کے عام شاعروں اور ان کی شاعری کے جن کی شاعری موضوع کو اور موضوع شاعری کو بے وقعت بناتا رہتا ہے۔

دلّی کی تباہی ان شعرا کے نزدیک تہذیبِ عالم کی تباہی تھی۔ تہذیب اور اقدار کا کتنا جلیل و جمیل تصور ان کا تھا۔ تہذیب انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس لیے خواہ وہ کہیں ظہور میں آئی ہو تمام دنیا کی تہذیب متصور ہوگی۔ اس سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ دلّی کتنی عظیم تھی کہ ہمارے شعرا اس کی بربادی پر بے قرار ہوتے ہیں تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اچھے اور بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ معرکہ میں معرکہ آرا کس طرح ہوتا ہے۔ ایسے ہی معتبر شاعر کو شعر و ادب کی بیش قرار امانت سونپی جاسکتی ہے۔ میں اور میری طرح کتنے اور علی گڑھ کے جہاں آباد میں زندگی کے حسن و حسنات سے بہرہ مندرہ چکے ہیں اور برابر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ عہد کتنی اور کیسی کیسی گراں مایہ ہستیوں سے معمور تھا جن کی شخصیت اور کارناموں کی تاب نہ لا کر کتنوں کو مسلسل اور مستقل احساسِ کمتری میں مبتلا دیکھتا ہوں۔ عظیم سے عداوت، ادنیٰ اور حقیر کی ایسی مریضانہ لذت کوشی ہے جس سے وہ کبھی نجات نہیں پاتا۔ اس لیے کہ اس کو خود آزادی اور عناد پیشگی میں جو لذت ملتی ہے وہ ترک کردینے کی برائی میں نہیں ملتی۔ اس محرومی یا شامت میں افراد ہی نہیں جماعت بھی مبتلا پائی گئی ہے۔

جس عظیم تہذیب کے کھنڈر پر جن اقدار و عزائم کو سامنے رکھ کر جس سرآمد روزگار نے علی گڑھ تعمیر کیا تھا اور جس علی گڑھ نے اپنے فرزندوں کو زندگی اور زمانے کے بڑے سے بڑے چیلنج کو قبول کرنے کا حوصلہ دیا، جن کی تاریخ اور تقدیر کو اس نے ان کے لیے دریافت کیا اور تب و تاب دی، اس کو رُسوا اور مسمار ہوتے دیکھ کر علی گڑھ کا دیوانہ اپنے نوجوانوں کو اللہ اور انسانیت کی طرف لے بھاگے اور بھگا لے جانے پر آمادہ نہ ہو جائے تو کیا کرے۔ جان و مال، آبرو، زبان،

ادب، تہذیب اور شعائر جن سے زندگی اعتبار و افتخار حاصل کرتی ہے۔ ان کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا تھا ان کو محسوس کر کے دیوانے کو اپنا خدا، اپنا رسولؐ، اپنے اسلاف و اکابر اور ان کے دیے ہوئے اعلیٰ اقدار، عقائد اور اعمال یاد آنے لگیں تو اسے کیوں ہنس ہنس پکاریئے۔

عزیزو!

علی گڑھ جن حالات میں جن لوگوں کے لیے قائم کیا گیا تھا، جو خدمات اس نے انجام دیں اور ملک وملت کے جن اکابر نے اس کی تعمیر و تاسیس کا مبارک و عظیم کام انجام دیا، ان کو ملک کا شاید ہی کوئی تھوڑا بہت بھی لکھا پڑھا شخص نہ جانتا ہو۔ سن شعور سے اس کے بارے میں ایسے ہی بیانات اور بشارتیں سنتا آ رہا تھا، اور اس پر خوش ہوتا اور فخر کرتا جیسے شررؔ، شبلیؔ کی تاریخی تصانیف پڑھ کر بڑا بننے اور بڑا سمجھے جانے کا ولولہ دل میں پیدا ہوا کرتا۔ آج کس قدر اپنے اس خیال پر حیرت ہوتی ہے اور شبہ میں پڑ جاتا ہوں کہ خواب میں بیدار تھا یا بیداری میں خواب دیکھ رہا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ پہلے خواب میں تھا اور نہ آج ہوں، بلکہ حقیقت ہی کے دو پہلو تھے۔ طالب علمی کے عہد میں جس کو آج سے پچاس ساٹھ سال ہو گئے کتابوں اور اخباروں میں پڑھتا، تقریروں اور بزرگوں کی آپس کی گفتگو اور صحبتوں میں سنتا تو بھی تعجب ہوتا۔ کبھی ہنسی آتی کہ اپنی تعلیم کے لیے حکومت کی امداد کے محتاج نہ بنو ورنہ ان تمام صفات سے بے گانہ ہو جاؤ گے جن کو اچھے لوگوں نے ہر آزمائش سے گزر کر تمہاری سرفرازی کا طرۂ امتیاز بنا دیا ہے اور جن کے طفیل محترم اور نیک نام ہو۔

بتایا جاتا ہے کہ غیر ملکی حکومت اپنے مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر تعلیم کا نقشہ بناتی ہے جو محکوم کے مفاد سے اکثر وبیش تر مختلف ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ محکوم کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن ادھر اُدھر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا کہ تعلیم کا کیسا اچھا بندوبست ہے جس سے ہر شخص حسب حوصلہ، استطاعت اور ضرورت فائدہ اٹھاتا ہے۔ کسی تعلیمی یا تہذیبی ادارے کو حکومت کوئی پرچۂ ترکیب استعمال نہیں دیتی تھی کہ اس کی تجویز کردہ دوا، غذا یا پرہیز کا التزام رکھا جائے۔ امن، آسودگی اور عزّت کے شب وروز ہیں۔ کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے کی آزادی اور سہولتیں بیش از بیش فراہم ہیں۔ ایک دوسرے کے اختلافات کو نظر انداز کر کے یا ان کے باوجود ایک دوسرے

کی شادی غمی میں رسماً و مصلحتاً نہیں بلکہ ہمدردی اور شرافت کے تقاضے سے شریک ہوتے ہیں۔ مکتب، پاٹھ شالا، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم پائے ہوئے کلرک بھی ہیں، کلکٹر بھی، مہاتما بھی اور مہارشی بھی۔ آروبندو گھوش، سبھاش چندر بوس، محمد علی، حسرت موہانی، سپرو، گوکھلے، اقبال، ابوالکلام، جواہر لال، رادھا کرشنن کیسے کیسے سربرآوردہ، کیسے کیسے سرپھرے، کن کن کو گنایئے اور کس کو پکاریئے، یہ سب کہاں گئے۔ اب کیوں نہیں پیدا ہوتے؟ انگریزی عہد حکومت جو ہمارا عہدِ غلامی تھا اس میں جتنے جلیل القدر، محسن، مدبّر، مصلح، مجاہد، شاعر اور دانش ور ہندوستان میں گزرے اس کی نظیر اس عہد کے انگلستان ہی نہیں باہر کے متمدن سے متمدن ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ انھیں مایۂ ناز شخصیتوں کی بے لوث خدمات کا فیضان ہے کہ آج ہماری ناگفتہ بہ خامیوں اور خرابیوں کے باوجود ملک کا شیرازہ اور شہرت غیر متزلزل ہے۔ کیا کہیے اور کہیے نہ کہیے کہ پہلے ہم اقدار کے لیے سربکف تھے۔ آج اغراض کے پیچھے روسیاہ ہیں!

اس سے غلامی کی برکت اور بڑائی کا اظہار مقصود نہیں ہے۔ کوئی فاتر العقل بھی ایسا نہ کرے گا بلکہ جس دورِ آزادی سے ہم دوچار ہیں اس میں ضمیر کے تقاضوں کی یکسر پامالی یا اس سے انحراف کی طرف توجہ دلانا مدّنظر ہے۔ ہم غلامی میں کہاں تھے اور آزادی میں کہاں ہیں؟ کیوں ہیں؟ کون سے اشخاص کہاں چلے گئے اور کیسے کہاں سے آ گئے؟ غور کرنے کے لیے بڑے دلچسپ سوالات ہیں اگر اتنے ہی عبرت ناک نہیں!

کتنے دنوں کی بات ہے اس لیے شاید ناقابلِ التفات بھی نہ ہو۔ زندگی کے شب و روز کچھ اس طرح کے تھے کہ ویرانہ ہو، آبادی ہو، سفر ہو یا حضر، سوار ہوں یا پیدل، بوڑھے ہوں یا نوجوان، عورتیں ہوں یا بچے، تنہا ہوں یا ساتھ، اندھیرا ہو یا اجالا، جیب میں نقدی، جسم پر زیور ہو کبھی بھولے سے بھی اس کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا کہ لوٹ لیے جائیں گے، بے عزّت کر دیے جائیں گے یا مار ڈالے جائیں گے۔ پہلے پولیس سے بدمعاش ڈرتے تھے اب نیک معاش مشتبہ رہتے ہیں۔ زندگی عزّت، عافیت اور آزادی سے گزرتی تھی۔ یہ نعمتیں اپنے ہی دیار سے نہیں کم و بیش ساری دنیا سے اٹھ گئیں یا اٹھا دی گئیں۔ ہر جگہ ان سے محرومی کا ماتم ہے، لیکن کیا کہیے:

ع کہ آئینِ جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

آئینِ جہاں کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے لیکن آخر آئینِ جہاں بنانے والے بھی تو ہم ہی ہوتے ہیں۔ جب ہم اس کو بگاڑنے میں معین ہوتے ہیں تو اس کو بدلنے اور سدھارنے کے وقت کہاں چلے جاتے ہیں۔ یہاں ایک حکایت یاد آتی ہے جب حقائق پامال ہوتے ہیں تو حکایت کا سہارا لینے میں کبھی کبھی تسکین مل جاتی ہے۔ کوئی بادشاہ بھوکا پیاسا شکار سے واپس ہوتے ہوئے ایک باغ میں ٹھہر گیا۔ باغ کی بڑھیا مالکہ سے پینے کے لیے کچھ مانگا۔ اس نے بہت جلد ایک بڑا گلاس انار کے شربت کا لاکر پیش کیا۔ بادشاہ نے سیر ہو کر پیا۔ پھر بڑھیا سے پوچھا کہ شربت کتنے اناروں کا تھا۔ اس نے کہا، صرف ایک کا۔ دریافت کیا کہ باغ کی سرکاری مال گزاری کیا تھی معلوم کر کے دل میں بہت متعجب ہوا کہ ایسی کثیر اور نفیس پیداوار کا لگان اتنا کم۔ دارالخلافہ واپس آیا تو باغوں کے محاصل میں اضافہ کی تجویز پیش کی، کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ بادشاہ دوسری بار اسی بھوک پیاس کی حالت میں اسی باغ میں داخل ہوا۔ بڑھیا سے انار کے شربت کی فرمائش کی۔ اس نے کافی دیر بعد شربت کا گلاس لاکر دیا۔ بادشاہ نے غیر معمولی توقف کا سبب دریافت کیا۔ بڑھیا نے کہا کہ اناروں میں شربت کی مقدار بہت کم ہوگئی ہے اس لیے چار پانچ انار کام میں لانے پڑے۔ بادشاہ نے اس کمی کی وجہ دریافت کی تو بڑھیا نے کہا کہ بظاہر کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا، سوائے اس کے کہ بادشاہِ وقت کی نیت میں فتور آ گیا ہو۔ اس لیے پیداوار سے برکت اُٹھ گئی۔

قصہ قصہ ہی ہوتا ہے لیکن کبھی قصہ گو کی حیرت انگیز دانش و بینش پر ایمان لائے بغیر نہیں رہا جاتا جس نے کیسے کیسے حقائق اس وقت دریافت کر لیے تھے۔ جب اس کا شعور، تجربہ اور تجزیہ آج کے سائنسی شعور، تجربے اور تجزیے کے مقابلے میں ناقابلِ لحاظ تھا۔ حقیقتِ ابدی بھی کس طرح زمان و مکان کے عمل سے ماورا ہوتی ہے۔ بڑی بڑی حکومتیں، ان کے حلیف و حریف، تابعین اور تبع تابعین، زبردست تجارتی، سیاسی، مذہبی، صحافتی تنظیمیں، عالم گیر اور عالم آشوب، خبر رساں ایجنسیاں اور خفیہ انجمنیں، سفارت خانے، دفاتر اور ان کے عمال، غرض وہ تمام سرگرمیاں جو زندگی کو مسلسل مہمیز کرتی اور متحرک رکھتی ہیں۔ ان سب میں جہاں دیکھئے فتنہ سامانی اور فتورِ نیت! اس کا جو نتیجہ سامنے آتا رہتا ہے وہ اس بڑھیا کی تعبیرِ حقیقت سے مختلف نہیں ہے، جس نے انار کے شربت کی کمی کو حکومتِ وقت کے فتورِ نیت پر محمول کیا تھا۔

ایک صبح نہیں، بلکہ رات گئے علی گڑھ آ گیا۔ معلوم سے نا معلوم میں ایسی غیر متوقع جست کی ضرورت یا ذمہ داری پیش نہیں آئی۔ زندگی کو ایسی خیر و برکت نصیب ہوئی کہ نفس کی کسی ناروا ترغیب یا تقاضے کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں جذبۂ شکر گزاری کا یہ جذبۂ بے اختیار تھا یا کیا۔ اکثر یہاں تک خیال آیا ہے کہ ایسا کرمِ بے حساب اب علی گڑھ شاید ہی اپنے کسی وابستۂ دامن سے کر پائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کالج اپنی اعلیٰ روایات اور اعلیٰ شخصیتوں کی گراں مائیگی، مغربی تعلیم، مشرقی تہذیب اور بے مثل رواداری، بلند نظری اور خیر سگالی کا ایسا نمونہ پیش کر رہا تھا جو ملک کے کسی تعلیمی، علمی، مغربی ادارہ میں نہیں ملتا تھا۔ آج بھی مفقود ہے جب بعض دوسری یونیورسٹیوں کو اس یونیورسٹی سے کہیں زیادہ دست گیری نصیب ہے اور نسبتاً کم ذمہ داریوں اور اندیشہ ناکیوں کی فضا میں کام کرنے کی سہولت میسّر ہے۔ ایسے احباب اور اساتذہ، مواقع اور مشاغل، فوز و فضا، سرفرازی اور شادمانی نصیب ہوئی کہ ان پر بعد کی زندگی کی کوئی مایوسی و محرومی یہاں تک کہ دورِ حاضر کی عالم گیر بےزاری، بے دلی اور بے راہ روی بھی غلبہ نہ پا سکی۔

ایک آدھ سال اور جیا تو علی گڑھ کی تابع داری، ترفع اور تحفظ میں اپنی بساط کے مطابق اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کرتے ہوئے مسلسل ساٹھ سال ہو جائیں گے۔ علی گڑھ سے وابستہ یا ناوابستہ کسی کو یہ امتیاز شاید ہی نصیب ہوا ہو۔ یہ امتیاز اگر میرے سوچنے اور کہنے کے انداز میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی کچھ اونچ نیچ پیدا کرتا ہو تو ؎

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے، خود برباد ہوتا ہے

جون پور میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ جنگِ بلقان اور طرابلس کے سلسلے میں شام کے قریب کبھی کبھی احتجاجی جلوس نکلتا تھا، نہایت منظّم اور مہذب۔ اس میں اقبالؔ کا یہ مصرعہ سننے میں آتا:

ع   اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم

اسکول کے ایک معمولی مسلمان طالب علم پر اس زمانے میں اس مصرعہ کی کیسی گرفت تھی، اور آج جب کہ وہ طالب علم بوڑھا، بے اثر و بے سپر ہے تو اس پر اس کا کیا اثر ہے؟ کیا بتاؤں کیا ہے۔ کاش اعتقاد و عقیدت کی اس گراں مائیگی کا تھوڑا سا بھی بہرہ نصیب ہوا

ہوتا جو اقبال جیسے عظیم شاعر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے اور جس سے اقبال کی شاعری کو دوام حاصل ہے! یہ بات ایسے عزیزوں کو کیسے سمجھاؤں جن کا مسلک یا مشغلہ اعلیٰ شاعری کو ادنیٰ شاعری کے مقابلہ میں فروغ اور رُسوا کرنا ہو۔ اعلیٰ شاعری حیوانیات وشہوانیات کا نہیں انسانیت اور الٰہیات کا مسئلہ ہے۔ جب غیر متعلق باتیں کہنے میں بدنام ہوں تو بھائی یہ بھی ظاہر کردینے میں تامل نہیں کرتا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اور انسانیات والٰہیات میں تضاد نہیں توافق ہے۔ اس توافق کو واضح کرنے میں طوالت ہے اور اس زحمت سے آپ کو بچانا چاہتا ہوں۔

سوچتا ہوں کیا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جسے روزِ اوّل تقریباً ایک صدی سے ہم اپنا سمجھتے رہے اور چھوٹے بڑے دوست اغیار سبھی اس تواتر سے گواہی دیتے آرہے تھے، بیک جنبش قلم یا گردشِ چرخ نیلوفری وہ ہمارا نہ رہ جائے، اور مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل 1972ء کے دفعتاً پاس ہوجانے سے ملک کے گوشے گوشے سے کرب کراہ کی جو صدا اُٹھی، جس کی بازگشت معلوم نہیں کب تک گونجتی بھٹکتی رہے، وہ بے بنیاد اور ناقابلِ اعتبار ہو۔ (یہ کچھ دنوں پہلے کی بات ہے جب یہ سطریں سپردِ قلم کی گئی تھیں۔ اب اس میں قابلِ لحاظ 'اصلاح ورعایات وحقوق' کا سامان کردیا گیا ہے)۔

بہ ایں ہمہ علی گڑھ ہی کے سایۂ شفقت وسربلندی میں رہ کر یہ بھی سیکھا کہ آزمائش 'نشانِ بندگانِ محترم' ہی نہیں ہوتی بلکہ معظّم اداروں کی بھی نشان دہی کرتی ہے۔ حسرؔت نے کہا ہے:

ہوئیں بدنامیاں، ناکامیاں، رُسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری!

بدنامیوں اور ناکامیوں کے باوجود حسرؔت سے کوئے جاناں کی ہواداری نہ چھوٹی تو مجھ سے علی گڑھ کی ہواخواہی کیسے چھوٹ سکتی تھی جس کو علی گڑھ نے اپنے نعم ونوازش سے اس طرح سرفراز کیا اور رکھا جس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اکثر بے اختیار وشکر گزار ہوکر سوچنے لگتا ہوں کہ اتنا اچھا اور بڑا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ایسے بندے سے کیوں اور کیوں کرلیا جو مجھ جیسا نااہل اور گنہ گار تھا۔ اس کے کرمِ بے حساب سے میری اور کالج کی کیسی بڑائی نکلتی ہے، پھر چونک پڑتا ہوں کہ ایسا تو نہیں کہ یہ فقرہ بے سمجھی کا لکھ گیا ہوں!

ایم۔اے۔او۔کالج میں طالب علمی کا زمانہ یاد آتا ہے۔ ہر بوڑھا جو اپنی طفلی سے دور ہوتا جاتا ہے اس کی طفلی اس سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ ایسی یادوں سے زندگی بنتی نہیں تھوڑی دیر کے لیے صرف بہل جاتی ہے۔ ان کا اتنا ہی اور یہیں تک جواز ہے، آگے نہیں! کیسا زمانہ، کیسے دن رات اور کیسے کیسے ساتھیوں کی یاد! اس وقت بھی کالج سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتا تو حسرتؔ کا یہ شعر کہیں نہ کہیں اپنے لیے جگہ نکال لیتا۔ کیا عجب کہ اسی زمانے یا اس کے آس پاس حسرتؔ نے یہ شعر کہا ہو، اور کیا صادق آتا ہے یہ شعر۔ حسرتؔ کی بے سروساماں مجاہدانہ زندگی پر جب وطن کو آزاد کرانے میں انھوں نے اپنے عہد کی سب سے بڑی طاقت برطانیہ سے آمنے سامنے کی ٹکّر لینی شروع کردی تھی۔ اس یک طرفہ محاربے میں حسرتؔ نے قید ومحن کی جیسی سختیاں جھیلیں۔ ان کے زمانے کا کوئی اور شخص مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا۔ ایسا رنگیں نوا، نبرد آزما اور صاحبِ صدق وصفا آج کہیں نہیں ملتا، جب اس کی ضرورت ہر جگہ ہر شخص کو محسوس ہورہی ہے۔ حسرتؔ ایک ایسے فرد یا فوج تھے جس کو کبھی شکست نہ دی جاسکی۔ اس فوج میں ایک ہی سپاہی تھا اور ایک ہی سپہ سالار، اور یہ تھے حسرتؔ! طالب علمی، علی گڑھ منتھلی یا میگزین اور گلِ منزل، کچی بارک یا سید محمود کورٹ کے زمانے کا ایک فارسی کا شعر اکثر کالج کے ذکر میں زبان اور قلم سے نکل جاتا جو پہلے مولانا آزادؔ کے تذکرے میں نظر سے گزرا تھا۔ شعر یہ تھا:

نہ حُسنش غایتے دارد، نہ سعدیؔ راسخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی!

عزیزانِ کرام!

دیکھنے میں کالج چھوٹی سی بستی تھی، لیکن اتنے بزرگوں، چھوٹے بڑے ساتھیوں اور ایسی اُمیدوں اور امکانات سے آباد معلوم ہوتی تھی جیسے علی گڑھ اپنے آباء واسلاف اور اکابر کا خاندان اور وطن ہو۔ دن رات اس طرح گزرتے تھے جیسے وہ طبعی معمولات نہ ہوں بلکہ امن، آسودگی اور یگانگت کے تنوع اور تہنیت ہوں۔ رفتہ رفتہ یہاں تک محسوس ہونے لگا جیسے علی گڑھ کی شہریت دنیا کی تمام مہذب اقوام اور ممالک کی شہریت کی ضامن ہو، اور کیسے کہوں یا نہ

کہوں کہ آج بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔محکومی (غلامی کہ لیجیے) کے دن تھے،لیکن خدا معاف کرے یا نہیں اس کے نیکوکار بندے جان بخشی فرمائیں۔کسی طرح کی گرفتاری یا رنجوری نہیں محسوس ہوتی تھی، نہ خوف نہ خواری، بلکہ اس کا یقین تھا کہ ہم سب کے لیے اور سب ہمارے لیے باعثِ اعتبار وافتخار ہیں اور رہیں گے۔کالج کا اس عہد کا میزانیہ کم وبیش اتنے ہی کا ہوتا تھا جتنا شاید آج کل مسلم یونیورسٹی کی کسی بڑی فیکلٹی کا۔کہیں سے پانچ ہزار مل جاتے تو کالج کا پورا کنبہ اس طرح خوش ہو جاتا جتنا آج پانچ لاکھ ملنے پر نہیں ہوتا۔یاد آتا ہے حیدرآباد دکن سے کچی بارک کو پختہ (عثمانیہ ہاسٹل) بنانے کے لیے پچاس ساٹھ ہزار کا عطیہ موصول ہوا تھا۔اس کی خوشی اس طرح منائی گئی تھی اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی گئی تھی جتنی یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کی تاسیس وتعمیر کے لیے ملنے پر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔یہ فرق اس بنا پر اتنا نہیں ہے کہ پہلے اور آج کے روپے کی قوتِ خرید وفروخت میں کتنا فرق آ گیا اور کیوں، جتنا دینے اور پانے والے میں آ گیا اور کیوں، جتنا دینے اور پانے والے کے خوش ہونے، خوش کرنے اور خوش رکھنے کی خواہش اور خلوص پر، کچھ یہ بھی ہے کہ زمانہ بدل گیا،طبیعتیں بدل گئیں اور ان کے ساتھ کیا کیا نہیں بدل گیا۔غم اتنا بدل جانے کا نہیں جتنا مسخ ہو جانے کا ہے!

اخلاق وانسانیت کا محور، علمی اور تہذیبی لین دین کا مسئلہ کاروباری اور سیاسی لین دین سے جدا ہوتا ہے۔سیاسی اور سماجی احوال میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔اس سے نہ مفر ہے نہ اس کا ماتم، لیکن یہ بابرکت اور بامقصد اس وقت ہوتی ہیں اور اس وقت تک رہتی ہیں جب تک ان کو اخلاق وانسانیت کے محور سے منحرف یا معزول ہونے نہ دیا جائے۔اس حقیقت کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اخلاق وانسانیت کا معیار بدلتے رہنے پر بھی اخلاق وانسانیت ہی کا معیار رہے گا اور رکھنا چاہیے، کسی اور کا نہیں۔آبادی، آزادی اور دولت کی بے اندازہ فراوانی کے باوجود مفلس اور تونگر کا تناسب جوں کا توں ہے، اگر بدتر نہیں۔بڑی حکومتوں کی ایک دوسرے سے بالادستی اور اسلحہ بندی کے میدان میں سبقت لے جانے کی مجنونانہ کوشش پس ماندہ اقوام اور کمزور حکومتوں کو کسی نہ کسی طرح تابع عتاب یا عنایت رکھنا، جمہور کے دلوں سے صواب اور ناصواب کا امتیاز واحتساب کے اندیشے کا اُٹھ جانا، ایسے اسباب ہیں جن سے حکومت کا وقار،

معاشرے کا اعتبار اور خاندان کی روایات کا احترام قصۂ ماضی بن چکا ہے۔ اس کی اصلاح یا مداوا معلوم نہیں کب اور کیسے ہو سکے۔ البتہ وہ ہرگز نہیں ہے جو کوتاہ اندیش اور کڑی ذمہ داری کے فرائض سے پیچھے بھاگنے والی حکومتوں نے افعال قبیحہ و رذیلہ کو سندِ جواز دے کر عام کر دیا ہے۔ جرائم اور ذمائم کو ڈھیل دینا اور عواقب کا ماتم کرنا اخلاق و دانش دونوں کی کتنی برملا اور مضحکہ انگیز توہین ہے۔ اس کی مثال تاریخ کے دور ظلمت میں بھی شاید ہی ملے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم شک، خوف، مایوسی اور ناراستی میں مبتلا اور تحفظِ ذات کی خاطر وہ تمام ناروا تدابیر سوچتے اور اختیار کرتے رہتے ہیں جن سے دوسروں کا حق تلف اپنا احساسِ فرائض مجہول و ماؤف ہوتا رہتا ہے۔ زندگی اسی عالم گیر عمل اور ردِّ عمل کے شدائد کا شکار ہے۔ فرد، سماج، حکومت سب کے سب اپنے اپنے اغراض کی خاطر اس طریقِ کار پر مائل ہیں جو ناروا ہے اور ہر اس اقدام سے آنکھ چُراتے ہیں جو روا ہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک پر لازم اور واجب ہے۔ طوفان شدت پر ہو تو بغیر کسی کشتی، ناخدا اور قطب نما کے ساحلِ مراد پر کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ وہ کشتی اور ناخدا کیا ہیں اور کہاں ہیں۔ ان کا جان لینا آسان ہے، دشواری ان پر عمل کرنے میں ہے۔ ہر نفع اور تمام نفع ہر سطح پر، ہر قیمت پر اور ہمہ وقت اپنے لیے اور اپنوں کے لیے ایسی نالائقی ہے اور اس درجہ ہمارے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے کہ اس سے نجات پانے کی مستقبل قریب میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کالج کیا تھا، کن روایات کا حامل اور کن اقدار کا امین، اس کا اظہار طالب علموں کی صحت مند اور صحت بخش سرگرمیوں سے ہوتا۔ مثلاً بورڈنگ ہاؤس کا رہن سہن، ڈائننگ ہال، کلاس روم، مسجد، یونین کلب، کھیل کے میدان، مشاعرے، متعارفے، حتیٰ کہ مُڈرائٹ (کیچڑ پانی سے برسات کا خیر مقدم) اور عام شریفانہ میل جول کے طور طریقے جسے ایک معمولی شخص بھی کالج کے اندر قدم رکھتے ہی محسوس کرنے لگتا۔ اس طرح کی پابند آزادی یا آزاد پابندی کو ڈسپلن سے بھی تعبیر کرتے ہیں جو صدیوں کی انفرادی اور اجتماعی پُرامن و بامقصد ریاض، رواج، روایات اور فکر و عمل کی کشید و کشود سے تکمیل پاتی اور قوم کا شعور اور مزاج بنتی ہو۔ یہی مزاج و شعور بالآخر قوم کا امتیاز و افتخار قرار پاتا ہے۔ آزادی بڑی سخت گیر محبوبہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ آزادی غلاموں کی نہ ہو جن کی محبوبہ خود ان کی غلام ہوتی ہے۔ سخت گیر دونوں ہوتی ہے۔ اس بڑے

فرق کے ساتھ کہ ایک سعادت و سرفرازی بخشتی ہے۔ دوسری ذلّت اور ضلالت کی طرف لے جاتی ہے۔

عزیزو!

اس ادارے کا زرّیں عہد ایم۔اے۔او۔ کالج کا تھا اور وہ تمام تر طلبا کا عہد تھا۔ ہر تحریک یا ادارے کا ابتدائی زمانہ اس کا بہترین دور ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی بنیاد راستی اور خیرخواہی پر رکھی گئی ہو، بزدلی اور بداندیشی پر نہیں۔ ابتدائی دور اس لیے سعادت اور شرافت کا ہوتا ہے کہ اس کے بانی اور رفقائے کار اس کے مفید اور مبارک بنانے کے لیے ہر قربانی دے چکے ہوتے ہیں۔ جلد یا بہ دیر وہ ادارہ یا تحریک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے جو اپنی غرض کے لیے اس کے موقف و معیار کو قربان کرتے رہتے ہیں۔ مذہب، حکومت، معاشرہ ہر جگہ یہ کرشمہ نظر آئے گا۔ ملک کو آزاد کرانے کی تحریک اٹھی۔ اپنے زمانے کے سب سے محترم اور معظم سردار نے ہمارے طالب علموں کو شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس تحریک کو دیکھنے، اس میں شریک ہونے والے ابھی زندہ ہیں اور ایمان دار بھی ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ اس زمانے میں علی گڑھ نے مہاتما جی کی دعوت پر اپنے بہترین طلبا کو جس دلیری اور خلوص سے حوالہ کر دیا تھا، اس درجہ کسی اور ادارے کو یہ توفیق ہوئی تھی یا نہیں۔ تحریک عدم تعاون میں طالب علم بڑے موثر اور آسان آلۂ کار ثابت ہوئے تھے، لیکن آزادی کے بعد بالعموم جس قماش کے لیڈر بالائے آب ان میں بیش تر ایسے تھے جنھوں نے اپنے محدود و مذموم اغراض و مقاصد کی خاطر طالب علموں کو تعلیم اور تعلیمی اداروں سے اس طرح بے زار و نفور اور سیاست کے مزبلے میں خوار و زبوں کیا اور ہونے دیا کہ جن نوجوانوں کو ملک اور قوم کے ناموس اور نیک نامی کا نشان اور نگہبان ہونا چاہیے تھا اور وہ خود اپنے پر نفریں کرنے یا رحم کھانے کے قابل نہیں رہے۔ لیکن سیاسی لیڈروں سے قطع نظر طالب علموں کو بے راہ کرنے اور پرکھنے میں کالجوں کے اساتذہ کرام کا جو وطیرہ حال میں سننے میں آیا اور جس طرح انھوں نے یونیورسٹی کی حدود اور اس کی عمارت میں زبان درازی اور دست درازی کا قابل نفریں مظاہرہ کیا، وہ بھی دنیا جہان کے معلّموں کے اجتماع اس مقصد کے پیشِ نظر کیا گیا تھا کہ وہ کیا طریقے اختیار کیے جائیں جن سے طلبا کی دیرینہ شورش کا سدّ باب اور

ان کو نارمل زندگی اختیار کرنے پر مائل کیا جا سکے اگر سیاست کی مثال اس طوائف سے دی جا سکتی ہے جو تماش بینوں میں گھِر گئی ہو تو تعلیم اور تعلیم گاہ کی دوشیزہ کے بارے میں ہمارے اربابِ فکر و نظر کیا حکم لگائیں گے کہ وہ کن میں گھِر گئی ہے۔

عزیزو!

دوسری عالمی جنگ کے ختم ہونے پر محکوم ملکوں میں سب سے بڑا ملک ہندوستان غالباً سب سے پہلے آزاد ہوا۔ یہ ایک بشارت یا علامت تھی۔ تاریخ میں ہندوستان کی آزادی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ مذہب، تاریخ، تہذیب اور علم و فضل کے ایک ایسے وسیع و عریض ملک کو ایسی حکومت کی گرفت سے آزاد کیا گیا تھا جو ایک طرف تمام علوم و فنون سے آراستہ اور دوسری طرف حرب و حکومت کے فنون میں یکتائے روزگار تھی۔ اس کے علاوہ ایسے طریقوں سے آزاد کرایا گیا جو دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کبھی دیکھنے یا سننے میں آیا ہو، یعنی عدم تشدد سے۔ اگلے زمانوں میں انسانیت کے محسن ملکوں اور قوموں کے ظلم و ضلالت سے نجات دلاتے تھے تو ان کا فیضان ایک مدت تک زندگی کے طور طریقوں میں جاری و ساری رہتا۔ لیکن ہم نے ایک عظیم معلّم اخلاق کی رہنمائی میں برطانیہ جیسی زبردست حکومت پر جیسی مکمل و محکم فتح پائی۔ اس اعتبار سے اپنے اخلاقی ذمائم پر غلبہ نہ حاصل کر سکے۔ کتنا عجیب اور عبرت ناک یہ سانحہ ہے کہ جس دن عدم تشدد کو فتح نصیب ہوئی اسی شام کو اس کا داعی اور شاید اس کا دیا ہوا دین بھی ختم نہیں تو مفلوج ہو گیا۔

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ دوسری محکوم اقوام کو آزادی ملی تو نقشہ کچھ ایسا نظر آنے لگا جیسے یہ عالم اور عالم گیر آزادی ایک تیسری جنگ عظیم یا پہلی شکستِ عظیم کی شکل میں نمودار ہوئی ہو اور معلوم نہیں کب تک جاری رہے۔ اس لیے کہ قرائن کچھ اس طرح کے ہیں کہ آئندہ کا نظم جہاں تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اسی رُستاخیز کا ہوگا اور رہے گا جیسا کہ ہمارے سامنے ہے۔ اس اندیشے کا بڑا سبب یہ ہے کہ بے زاری اور بغاوت کی جس بے پناہ و بے پایاں بحران میں آپ نوجوانوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے یا نامبارک و نامساعد حالات و حوادث کے شکار ہو گئے ہیں۔ ان سے نجات پانا اس لیے دشوار ہو گیا ہے کہ آپ پابندی اور ذمہ داری کی زندگی بسر کرنے کی ہمت ہار چکے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ خطرہ بھی ذہن میں آیا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ جرائم یا

ذمائم کی زندگی سے اذیت یاب ہو کر (جس کا ایک رُخ لذت یاب ہونا بھی ہے) آپ اپنے اور سوسائٹی دونوں سے انتقام لینے پر اتر آئے ہوں۔ نوجوان طبقہ جس کے حوصلے اور حسنِ عمل پر قوم اور ملک کی خوش حال اور اقبال مندی کا انحصار ہو آج تک ایسی آزمائش میں تاریخ کے کسی عہد میں شاید ہی کبھی دوچار ہوا ہو۔

جس تیسری عالمی جنگ یا پہلی شکست عظیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس وقت کسی نہ کسی شکل میں تمام دنیا پر مسلط ہے۔ اس کا سبب کم و بیش وہی لات و منات ہیں جو کبھی سیاسی اور فوجی غلبہ کی صورت میں کمزور حکومتوں اور ملکوں پر قابض اور متصرف تھے۔ اب تاجر و تجارت کی شاطری سے ان پر نازل ہیں۔ یہ چھوٹی بڑی حکومتیں پورے طور پر آزاد نہیں ہو پائی تھیں کہ اس دامِ سخت میں گرفتار ہو گئیں جو آشیانہ کے قریب پھیلا دیا گیا تھا۔ تمام دنیا کی منڈیوں کے بڑے سے بڑے سود خوار اور ساہوکاران حکومتوں، قوموں، پارٹیوں کو قرض کی مے پینے کی ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرنے پر تیار آموجود ہوئے یہ ساہوکار اور ساہوکارہ اس فوجی تسلط سے کم نہ تھا جس سے ان حکومتوں نے رہائی پائی تھی۔ اس تعمیر میں جو خرابی مضمر تھی اور جس کی اصلاح کسی کے بس کی نہ تھی۔ وہ یہ تھی کہ نو آزاد پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو اپنی تعمیر، توسیع اور استحکام کے لیے زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد مالی امداد کی ضرورت تھی۔ امداد حاضر تھی لیکن نیت بخیر نہ تھی۔

پچھلے پچاس سال میں ملک کی پس ماندہ اقوام کا معیار زندگی جتنا بڑھا ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف کارنامہ ہے لیکن اس یک طرفہ ترقی کا جو ردِّعمل ہمارے سامنے آیا ہے وہ بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ جس تیزی سے اور بغیر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے پس ماندہ اقوام کا معیار زندگی بلند کیا گیا۔ اس تندہی اور اور تدبر سے ان کے معیار اخلاق اور احساس ذمہ داری کو اونچا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ معیار زندگی کو بلند کرنا اور معیار اخلاق اور احساس ذمہ داری کو جوں کا توں رہنے دینا معاشرے کے توازن اور تدبر مندی کے لیے خطرہ ہے۔ عوام یا پس ماندہ طبقہ کی خواندگی اور حفظِ صحت کا گراف (Graph) بھی بلندی کی طرف مائل نظر آئے گا لیکن اس کا جو اثر قومی کردار کی تشکیل اور تہذیب پر ہونا چاہیے وہ خاطر خواہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تعلیم و تربیت کا نظام جیسا ہو حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ اس نقص و نقصان کا

احساس واعتراف مسلسل کیا جاتا رہا ہے۔ نچلا طبقہ تعلیم وتہذیب اور احساسِ فرائض سے جتنا بے گانہ رہے گا یا رکھا جائے گا اتنا ہی دولت فراغت اور طاقت کے ہاتھ آجانے سے نظم ونسق اور تعمیری سرگرمیوں کے لیے سنگ راہ بنتا جائے گا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایشیا اور افریقہ کی محکوم اقوام اور ممالک کو جو کچھ یا جیسی آزادی ملی اور یہ آزادی جس ہیبت اور ہلچل کا باعث ہوئی وہ ایک حد تک اسی معیارِ زندگی اور معیارِ اخلاق کے عدم توازن کا نتیجہ ہے جو بظاہر جلد ہموار ہوتا نظر نہیں آتا۔

عزیزانِ گرامی!

مسلم یونیورسٹی کا تصور اور تذکرہ ہمارے ذہن اور زبان پر اس وقت سے تھا اور ہے جب اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تاسیس کے موقع پر سید محمود کی ایک برمحل یاددہانی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جب انھوں نے فرمایا تھا کہ اس وقت اسکول کی نہیں بلکہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جارہی ہے۔ سید محمود کے انتباہ سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں کسی معمولی، یہ بھی اور وہ بھی قسم کی درس گاہ کا نہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کا واضح الفاظ میں تصور تھا اور وہ روزِ اوّل سے اسے مسلمانوں کے اعلیٰ مقاصد وموقف کا ضامن اور ذمہ دار رکھنا چاہتے تھے۔ لفظ قومی اور جمہوری کہاں کیا کام دیتا ہے یا کام میں لایا جاتا ہے ان کے ذہن میں نہ تھا۔ ہندو یونیورسٹی کا تخیل بہت بعد کی چیز ہے جب مسلم یونیورسٹی کی مستقل تحریک پورے ملک میں عام ہو چکی تھی، لیکن ہوا یہ کہ علی گڑھ جن شرائط پر یونیورسٹی قبول کرنا چاہتا تھا اسے حکومت نے منظور نہیں کیا۔ دوسری طرف حکومت جن شرائط پر یونیورسٹی دینا چاہتی تھی اسے بنارس نے خوشی سے قبول کیا۔ اس واقعہ کا اظہار اس لیے ضروری تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی اقلیتی حیثیت کو قائم رکھنے یا نہ رکھنے کا جو قضیہ حکومت اور اقلیت کے درمیان معرضِ بحث میں ہے اس کی اہمیت ونزاکت کا پورے طور پر اندازہ کیا جاسکے (یہ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل 1972ء کے پاس ہوجانے سے پہلی کی بات ہے) یعنی اقلیتی حیثیت کو قائم اور موثر رکھنے کے لیے اقلیت کا ردِّعمل کیا ہوگا۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بنارس ہندو یونیورسٹی یا ہندوستان کی کوئی دوسری یونیورسٹی حکومت کی سخت سے سخت شرائط کو بھی منظور کرلیتی یا آج بھی کرلے تو عملاً اس کی ہیئت و

حیثیت میں نہ جب کوئی فرق پڑتا نہ آنچ پڑ سکتا ہے۔ اکثریت کی اکثریت اس کی سالمیت اور اس کے اختیار واقتدار کے موثر اور مستحکم ہونے کی ہمیشہ ضامن رہتی ہے۔

علی گڑھ کا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ اس کے لیے ایک بھی ناسازگار شرط عملاً اس کے بنیادی مقاصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ صورت حال آج اور زیادہ پیچیدہ اور نازک شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ بہر حال اس وقت مسلم یونیورسٹی کو بروئے کار آنے یا لانے کا مسئلہ معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ اس سے مسلمان مایوس اور بددل ہوئے، مایوسی کی یہ فضا ابھی دور نہیں ہوئی تھی کہ کالج نان کوآپریشن کی زد میں آیا جس سے بڑا حادثہ اس کو اب تک پیش نہ آیا تھا۔ یہ اختلال فرد ہوا تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے مسلمان ایک دفعہ پھر تقدیر کے اس دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں غدر کے فوراً بعد سرسید نے ان کو پایا تھا۔ اربابِ کالج کو بڑے اہم مسائل کا سامنا تھا۔ ایک بنارس کا حکومت کے شرائط پر ہندو یونیورسٹی قبول کر لینا، دوسرے نان کوآپریشن تحریک کے عواقب، تیسرے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا علی گڑھ سے کٹ کر وجود میں آنا اور کالج سے متصل اس کی موجودگی جیسے دو متحارب فوجیں آمنے سامنے صف آرا ہوں۔ یہ نزاکت اور پیچیدگیاں معمولی نہ تھیں۔ نئے حالات وحوادث میں پورے ادارے کی ہمہ جہتی تنظیم اور آبادکاری کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے خواب کی یونیورسٹی کو خیر باد کہہ کر حقیقت یا بیداری کی یونیورسٹی کو وقت کا تقاضا سمجھ کر قبول کر لیا۔

مسلم یونیورسٹی ایک بدیسی حکومت کے سایہ میں وجود میں آئی، لیکن وہ حکومت تعلیم و تہذیب کے قدیم اور جدید روایات سے واقف اور ان کا احترام کرنا جانتی تھی۔ اس نے بیش تر وہ حقوق و اختیارات بغیر نامناسب تحفظات کے یونیورسٹی کو تفویض کر دیے تھے جو اس کی علمی، مذہبی اور اقلیتی کردار کی سلامتی و سالمیت ہی نہیں بلکہ اس کی قدرتی نشو ونما میں معین ومفید ہو سکتے تھے۔ کم و بیش تیس سال تک اس یونیورسٹی نے ان ہی خطوط پر چل کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنی ذمہ داری اور اپنی ضروریات کا پورے طور پر احساس رکھتی تھی اور ان سے عہدہ برآ ہونے میں حکومتِ وقت، اصحابِ علم وفن اور ملک وملت کے بہترین توقعات کو بہ طریقِ احسن پورا کر سکتی تھی۔ نیز ایک تہذیبی ادارے اور معیاری دانش کدہ کی حیثیت سے ہر حلقہ اور ہر سطح پر ممتاز و منفرد

تھی۔ اس پورے زمانے میں کسی وقت اور کسی حال میں یہ ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ اس کے نظم ونسق میں اس کی منتظمہ کورٹ، اکیڈمک کونسل، اساتذہ اور طلبا میں مسلم و غیر مسلم عناصر یا عوامل کا کتنا اور کیسا ردّعمل ہے اور وہ ملک کی سالمیت، سلامتی وخوش حالی اور نیک نامی میں مفید ہے یا غیر مفید۔

آزادی ملنے کے بعد 1951ء میں جو ایک ایکٹ پاس ہوا۔ اس سے پہلی بار اس کا احساس ہوا کہ اس ادارے کے نظم ونسق میں جو اپنی ہمہ جہتی، شہرت اور نیک نامی کے اعتبار سے ایسے ہی درجہ کے کسی ادارے سے کم نہ تھا ایسی تبدیلیاں کردی گئی ہیں کہ جو اس کے خصوصی کردار سے متناقض تھیں۔ یاد آتا ہے اس عہد کی اگزی کیٹو کونسل کے ایک رکن نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ یہ اقدام The Edge of the Wedge، (کسی چیز کا معمولی آغاز جو آگے چل کر نہایت اہم نتائج کا باعث بن سکتا ہو) لیکن وہ زمانہ یونیورسٹی اور حکومت ہند میں ایسے بالغ نظر اصحاب اخلاص واقتدار اور ان کی قائم کی ہوئی اعلیٰ روایات کا تھا کہ اس اندیشے کا اثر دیر تک نہ رہا اور بات جیسے آئی گئی ہوگئی ہو۔ کچھ دنوں بعد مرکز کی وزارتِ تعلیم کے سربراہ مسٹر کریم بھائی چھاگلا نے بغیر کسی ایسے حادثے کے پیشِ نظر جو موصوف کے اشتعال طبع یا حکومتِ وقت کے اختلال وانتشار کا باعث ہوسکتا تھا، ایک انتہائی نازک اور آتش گیر تحریک یہ پیش کردی اور اس فتنے کو فرو کردینے کے بجائے ہوا دیتے رہے کہ علی گڑھ اور بنارس یونیورسٹیوں سے مسلم اور ہندو کا لفظ (امتیاز) حذف کردیا جائے۔ اس پر علی گڑھ اور وابستگانِ علی گڑھ سے جو فغانِ نیم شبی اور گریۂ سحری اٹھا اس سے منفعل ہونے کے بجائے مشتعل یا دلیر ہوکر بنارس کی طرف روئے سخن پھیرا تھا کہ اس نے۔

ع کی ایک نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

لیکن پنڈورا کا صندوق کھل چکا تھا۔ طرح طرح کے فتنے جہاں تہاں سے سر اٹھانے لگے۔ کہیں مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل، کہیں پرسنل لاء میں کتر بیونت وغیرہ، اور ہمارا یہ حال ہوا کہ کبھی مراقبے میں چلے گئے، کبھی مناجات کرنے لگے۔

کریما بہ بخشائے برحالِ ما!

برسوں یونیورسٹی کا کام جن آئین وضوابط کے تحت اور جس آب و ہوا میں چلتا رہا اسے اتنا علمی، تعلیمی اور تہذیبی نہیں کہہ سکتے جتنا کہ تادیبی یا تعزیری یا فرمائشی۔ یہ صورت حال ایسی نہ تھی جو کسی سیکولر اور جمہوری حکومت کے شایانِ شان ہو۔ اعلیٰ علمی اور تعلیمی اداروں کو جیسا کہ یونیورسٹیاں ہوتی ہیں۔ ناروا بندشوں سے سب سے زیادہ محفوظ اور آزاد رکھنا چاہیے اس لیے کہ یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے ہم کو اعلیٰ اقداران کے تحفظ اور ان کی ترقی کی روشنی اور رہبری ملتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں کی روایات کا احترام نہ کرنا اور علم، تعلیم اور متعلم کو مل مزدور یا راعی و رعایا کی سطح پر دیکھنا پرکھنا کسی دردناک حادثہ سے کم نہیں۔ یہ کہنا کہاں تک قرینِ قیاس و اخلاق یا صحت و صواب ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا مقصد وہ نہیں ہے جن کو پیشِ نظر رکھ کر سرسید نے اس کو قائم کیا تھا جس کا اعلان انھوں نے تمام عمر اپنی تحریر، تقریر اور عمل سے کیا اور ان کے جانشینوں نے اس کی پیروی کی اور اس کی تائید و تصدیق ہی نہیں اس کی توصیف بڑے سے بڑے اربابِ حکومت، والیانِ ریاست، اصحابِ علم وفضل اور عامتہ الناس کرتے رہے۔ بلکہ اس درس گاہ کے قیام کے سوسال بعد وہ ہے جسے اربابِ اختیار و اقتدار متعین فرمائیں۔ جن کی تقدیر یا مسلک ہر صبح شام منقلب ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس ادارے کا بنیادی امتیاز محمڈن یا مسلم ہے جو روزِ اوّل سے آج تک باقی ہے۔ اسی نسبت یا امتیاز کی تصدیق بنارس ہندو کالج اور بنارس ہندو یونیورسٹی سے بھی ہوتی ہے۔ حکومت کے متعلقہ دفاتر میں اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر اسی نام و نسبت سے مراسلات آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان امور کے ہوتے ہوئے کس طرح مان لیا جائے کہ مسلم یونیورسٹی وہ نہیں ہے جس کو شروع سے آج تک ہر مسلمان اور غیر مسلمان دیکھتا، سمجھتا اور مانتا آیا ہے۔ بلکہ وہ ہے، ہوگئی ہے یا رہ گئی ہے جسے کوئی اور دیکھنا، سمجھنا اور ماننا چاہتا ہے۔

عزیزو! علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آزاد ہندوستان میں ملک کی سب سے اہم اور سب سے بڑی اقلیت کی یونیورسٹی ہے۔ سیکولر جمہوریہ میں اس کے خصوصی امتیازات اور حقوق کو برقرار رکھنے کا مسئلہ معمولی نہیں ہے۔ اس کو ہمدردی اور دانش مندی سے سمجھنے اور سمجھانے پر حکومت کی بین الاقوامی ساکھ اور سیاسی شہرت کا انحصار ہے۔ اکثریت کی یونیورسٹیوں کے لیے جو قیود معمولی اور ناقابلِ لحاظ ہوتے ہیں وہ اقلیت کی یونیورسٹی کی پوری ہیئت اور حیثیت کو مسخ یا منقلب کر دینے

کا باعث ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس یونیورسٹی کے عام بہی خواہ بالخصوص اولڈ بوائز نہایت درجہ فکرمند ہیں کہ آنے والے مسلم یونیورسٹی بل میں کہیں ایسی پابندیاں راہ نہ پا جائیں جو اس یونیورسٹی کے جانے اور مانے ہوئے کردار کو جن کا ہم بڑا احترام کرتے ہیں ختم کر دیں اور یہ ادارہ ہمارے علمی، تعلیمی و تہذیبی موقف اور کارناموں کو زندہ اور موثر رکھنے کے بجائے ایک فیکٹری کی حیثیت اور شہرت اختیار کر لے جہاں منڈیوں میں فروخت ہونے والی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔ عالمی جنگوں کے بعد نوجوانوں کو توپ کا چارہ کہا جانے لگا تھا۔ اس طرح 'تابع فرمان' یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے نوجوانوں کے بارے میں یہ کہا جانے لگے تو کیا تعجب جب کہ وہ تعلیم یافتہ بے روزگاری کے شکار اور آئیڈیلز سے بے گانہ انبوہ ہیں اور ملک کی بدنظمی، معاشرے کی پراگندگی اور اخلاق کی تباہی کا باعث بن گئے ہیں۔ جیسا کہ دیکھنے میں آ رہا اب طلبا سیاسی پارٹیوں کے جیسے سستے اور نامبارک آلۂ کار بنے ہوئے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اس راہ اور روش کو آپ اپنا بنیادی مقصد سمجھنے لگے ہیں۔ نوجوان، بالخصوص طالب علم ہونے کی بنا پر آپ کی بیش تر بے راہ روی اور بے دانشی نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جلد یا بہ دیر آپ کو اس سے باز رکھنے اور آپ کی تعمیری صلاحیتوں کو بحال کرنے اور طاقت پہنچانے کا اقدام کون اور کب کرے گا۔ جب تعلیم گاہیں بالخصوص یونیورسٹیاں مسلّماتِ زندگی کا سرچشمہ ہونے کے بجائے ناسزا سرگرمیوں کا مرکز بن گئی ہیں۔ طے کرنے کی بات یہ ہے کہ یونیورسٹیاں سیاسی طاقتوں کو اُکسانے بڑھانے اور بحال رکھنے پر مامور ہیں یا علم، تہذیب اور انسانیت کی روشنی پھیلانے کا فریضہ انجام دینے پر۔ طے کرنا ظاہر ہے بہت آسان ہے لیکن اس کو قابلیت اور ہمدردی سے نافذ کرنا آسان نہیں ہے جب کہ حکومت کو حکمرانی سے زیادہ ورنہ ساتھ ساتھ انتقامی قابلیت اور طاقت کا لحاظ رکھنا اور ثبوت دیتے رہنا چاہیے ورنہ نظم و نسق کی طرح طرح کی دشواریاں سامنے آتی رہیں گی، جیسا کہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ آپ عزیزوں کو جب کہ سیاسی طوفان و تلاطم سے فرصت نصیب ہوا کرے تو اس حقیقت پر بھی غور کر لیا کریں کہ حکومت چاہے جیسی ہو اور اس کے بنانے بگاڑنے میں آپ یا کسی اور کو کتنا ہی دخل کیوں نہ ہو کسی کو بھی قانون سے اونچا درجہ کبھی حاصل نہ ہونا چاہیے۔

ماضی انسان کے شعور اور تجربے کا حافظہ اور یادداشت ہے۔ وہ اپنے زمانے کے منتخب دل و دماغ کے حسنِ خیال اور حسنِ عمل اور عام زندگی کے عمل و ردِعمل کا حامل اور حاصل ہوتا ہے جس کی آئینہ داری اس عہد کے شعروادب وعلم وحکمت، فنونِ عالیہ وسیاست حکومت معاشرہ اور معیشت میں ملتی ہے۔ ماضی کا مقصد اور مقدر حال اور مستقبل کو بتدریج ومسلسل اپنی امانت میں لیتے رہنا اور آنے والی نسلوں کو ان کے فرائض سے آشنا کرانے میں مدد دینا ہوتا ہے۔ حال اور مستقبل دونوں بے سہارا ہو جائیں اگر ماضی اپنے اندوختہ سے ان کو مدد نہ پہنچائے یا اپنی روشنی میں ان کی رہبری، ہمت افزائی یا تنبیہ نہ کرتا رہے۔ خدا ماضی، حال و مستقبل کے امتیاز، امتداد، ادوار یا حد بندیوں سے بے نیاز ہے، لیکن اس نے ماسوا کو جس میں انسان کا وجود اور حیثیت سے اہم اور افضل ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کا پابند کیا ہے تاکہ وہ اپنے ارتقاء یا ترقی پذیری کا احساس اور احتساب کر سکے اور کرتا رہے۔ خدا کے لامحدود اور لازوال ہونے کے تصور کو ماسوا کے زوال آمادہ اور محدود ہونے سے بڑی تائید ملتی ہے۔ ماضی کا لحاظ کرنا اور رکھنا ترقی کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ حوصلہ مند قوموں کے نزدیک اور ان کے لیے ماضی جامد (سکوتی) نہیں بلکہ متحرک اور ترقی پذیر ہوتا ہے۔ کسی فرد، فرقہ یا جماعت کو اس کے ماضی کے دیے ہوئے اقدار و روایات اور محرکات سے محروم یا بے گانہ کرنا اور رکھنا کسی مہذب ملک یا معاشرے کا آئین و اخلاق گوارا نہیں کرے گا۔ ماضی کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے قومیں یتیم ہو جاتی ہیں۔ ایسی یتیم جن کا دنیا کے کسی ورثے میں حصہ نہیں ہوتا۔

عزیزو! ماضی، حال اور مستقبل (زمانہ) کے اسی جوئے رواں یا زندرُود کا ایک افسانہ یا شاخسانہ شاید وہ قومی دھارا ہے جس کے نام پر ملک کی اقلیتوں کو اپنی خصوصی روایات و امتیازات (بالفاظ دیگر اپنے تشخصات) کو ترک کر کے مذکورہ دھارے میں مل جانے یا معدوم ہو جانے کی دعوت وقتاً فوقتاً مختلف انداز سے مختلف سیاق وسباق میں دی جایا کرتی ہے جو کبھی اتنی دعوت نہیں ہوتی جتنی چیلنج یا اعلانِ جنگ کا رنگ آہنگ اختیار کر لیتی ہے۔ بھارتیہ کرن کا بھی شاید یہی مفہوم ہے۔ دھارے کا تصور دریا کے دھارے کا ہے جو کسی خطہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا ہو۔ مطالبہ یہ ہے کہ اس میں ہر فرقہ یا جماعت کے ندی نالوں کو شامل ہو کر

وحدت الوجود قسم کی کوئی چیز بن جانا چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ اس تحریک کی جارحانہ تبلیغ اس کی قدر و قیمت کو گھٹا دیتی ہے۔ دھارے کا مفہوم یا استعارہ دراصل اتنا دین و مذہب کا نہیں جتنا تہذیب اور انسانیت کا ہوتا ہے جس میں ہر فرقہ یا جماعت اپنی اپنی کشتیوں میں متاعِ تجارت اور زادِ سفر لے کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ کشتی کشتیاں اپنے اپنے سامان تجارت راستے کے بازار بستیوں میں فروخت کرتی اور نئے مال و متاع خریدتی، رواں دواں رہتی ہیں جن کا جیسا مال ہوگا اسی اعتبار سے اس کا لین دین یا ساکھ ہوگی۔ بالفاظ دیگر دنیا کی بزم اور بازار میں کون سی نئی پرانی قدریں باعثِ ردّ و قبول ہوسکتی ہیں۔ قدیم اور جدید کا یہی عمل ورد عمل مہذب زندگی کا ضامن اور محافظ ہوتا ہے۔ کسی دھارے میں کسی دھارے کا، انضمام کا تصور نہ منصفانہ ہے نہ اطمینان بخش۔ اس دھارے کا صحیح اور صالح تصور اس کی تازگی اور نفع بخش سمت اور روانی ہے۔ یعنی تہذیب و انسانیت کے دھارے میں رواں دواں، کس کشتی میں یا کارواں کے پاس ایسی متاعِ کنعاں ہے جو بحیثیت مجموعی ہر مصر کے بازار میں زیادہ سے زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے یا نہیں رکھتی تو اس کو اس سفر میں شریک ہونے کا حق نہیں۔

کاروانِ حیات کا یہی عمل افراد، جماعت اور قوموں کو ان کی اعلیٰ تقدیر کی طرف دعوت دیتا ہے اور رہبری کرتا ہے۔ یہ تاریخ اور قومیت کا جبر و قہر نہیں بلکہ انسان کے شرف و سعادت کی بشارت اور ضمانت ہے۔ انسان کو یکساں بتایا اور مانا گیا ہے لیکن پہچانے جانے کے لیے ان کو قبائل و اقوام میں رہنے بسنے کا مجاز کیا گیا ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ یہ قومیں اور قبائل علاحدہ علاحدہ اپنی اپنی بساط اور حوصلے کے مطابق صراطِ مستقیم یعنی تقویٰ اور نیکوکاری کے راستہ پر رہ کر اور چل کر ایک دوسرے کے لیے خوب سے خوب تر اور احسنِ تقویم کی تعبیر اور نمونہ پیش کریں نہ کہ یہ کہ طبعی قوانین کی پابند کسی دھارے میں کشاں کشاں یا بے اختیار معلوم سے نامعلوم کی طرف چلے جا رہے ہوں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ دھارے کا صحیح وصحت مند تصور قومی یا قبائلی یا ملکی دھارے کا نہیں بلکہ عالم گیر اخوت و انسانیت کے صراطِ مستقیم کا ہے۔ اس لیے کہ دھارا جیسا کہ وہ ہوتا ہے ایک حادثہ یا کرشمۂ فطرت ہے۔ بالفاظِ دیگر اس قانون الٰہی کا اس سے تعلق نہیں جو انسان کی ہدایت و اعانت کے لیے پیغمبرانِ مرسل کے توسّل سے نازل اور تمام تر

انصاف، آزادی اور فوز و فلاح پر مبنی ہوتا ہے۔ زندگی کی ہمہ جہت روش و روانی کو پانی کے کسی دھارے کے رحم و کرم پر چھوڑنا یا اس سے تشبیہ دینا بدتوفیقی، انسانی عظمت کی نفی یا اس سے روگردانی کرنا ہے۔ دھارے کے آشوب میں مبتلا ہونے اور رہنے کا جو نقشہ دہلی کے اپنے عہد کے دو بڑے شاعروں نے پیش کیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
(غالبؔ)

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں
(ذوقؔ)

قومی دھارے کی تبلیغ میں اختلاف آرا کا امکان ہے لیکن صراطِ مستقیم یا انسانیت کا دھارا خود وضاحتی ہے کسی تعبیر کا محتاج نہیں۔ زندہ اور مہذب اقوام طبعی دھارے یا ڈھرے کی پابند نہیں ہوتیں بلکہ اس طرح کے طبعی، حیوانی یا میکانکی رجحان یا کشش کو اپنے قابو اور قدرت میں رکھتی اور سمت و رفتار بخشتی ہیں۔ علاوہ بریں قومی دھارے کی تحریک یا تصور میں یہ اندیشہ خارج از امکان نہیں ہے کہ کسی وقت وہ ہماری سیکولرازم اور جمہوریت کو بھی قومیانے کے درپے نہ ہو جائے۔

عزیزو!

جہاں تک مسلمانوں میں انگریزی زبان و ادب اور مغرب کے سائنسی اندازِ فکر کو رواج دینے اور مقبول بنانے کا تعلق ہے۔ ایم۔ اے۔ او کالج کی تاسیس آکسفورڈ اور کیمبرج کی دیرینہ روایات کے خطوط پر ہوئی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ مصر کی جامعہ ازہر کو بھی شامل کرلیں تو بے محل نہ ہوگا۔ قیام دارالعلوم سے قبل یونیورسٹی کی منزل تک اس ادارے میں دینی تعلیم و تربیت کا جو نقشہ تھا وہ مغربی یونیورسٹیوں میں خصوصیت کے ساتھ مروّج و مقبول رہا ہے۔ یہ نہ کوئی نئی بات ہے نہ اس سے بدگمان ہونا چاہیے۔ ہر مذہب میں خواہ وہ کہیں ظہور میں آیا ہو علم اور تعلیم کا تصور

بنیادی طور پر دینی علوم وعقائد کا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دینوی اعتبار سے جس تیزی سے دنیوی ہوتے گئے اسی رفتار سے دینی تعلیم وتربیت کو زمانے کے تقاضے کے ساتھ مقبول ومفید نہ بنا سکے نہ رکھ سکے۔ آکسفورڈ، کیمبرج اور ازہر کے اولڈ بوائز کی مانند علی گڑھ اولڈ بوائز کو بھی اپنی درس گاہ سے شغف ہے اور جس طرح ہر موقع پر اس کی صلاح وفلاح کا خیال رکھتے آئے ہیں وہ اس ارادت سے کچھ زائد ہی ہے جو مذکورہ یونیورسٹیوں کے فیض یاب کو اپنی درس گاہوں سے ہے۔ ہمارے اولڈ بوائز موجودہ طلبا کے Elders یعنی بزرگوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا قدیم الایام، مقدس اور غیر منقطع سلسلۂ حسب ونسب ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ان کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کا ان کو احساس دلاتا رہتا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ طالب علم کا تعلیم اور تعلیم گاہ سے یہ رشتہ تعلیم وتہذیب کے کارناموں میں سمجھا جاتا ہے اور یہ علی گڑھ کا بڑا نمایاں امتیاز ہے۔ چنانچہ ہر نازک موقع پر اولڈ بوائز نے اس ادارے کو خطرات سے بچانے اور اس کی حمایت میں سینہ سپر ہو جانے اور رہنے کی بڑی قابلِ قدر مثالیں پیش کی ہیں۔ اس بنا پر یہ مطالبہ کہ اس درس گاہ کے نظم ونسق اور صلاح وفلاح میں اولڈ بوائز کو خاطر خواہ دخل ہونا چاہیے، قابلِ احترام ہے۔ یونیورسٹی کو حکومت سے جس فیاضی سے عطیات ملتے رہتے ہیں اس کے لیے ہم حکومت کے بدل سپاس گزار ہیں اور اس عطیہ سے جزاً محروم ہونا کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس سے مسلم یونیورسٹی کا دیرینہ اور قیمتی تعلقِ خاطر اولڈ بوائز اور دوسرے بے شمار بہی خواہان سے ختم نہیں تو بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔ اس تعلق کو پورے طور سے بحال کرنا اور رکھنا چاہیے۔ زر دینا اور زیر رکھنا حکومتوں کا بڑا کارگر حربہ ہے اس سے تعلیمی اور علمی اداروں کو ہمہ وقت باخبر رہنا چاہیے۔

یونیورسٹیوں کی توسیع وترقی میں مالی مشکلات کو حائل نہ ہونے دینا حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن ان کو اپنے اختیار واقتدار کا پابند کرنا کسی حکومت کو زیب نہیں دیتا۔ بعض حکومتوں اور طاقتوں سے قطع نظر جہاں آزادی اور گرفتاری کا تصور جداگانہ ہے دنیا کی شاید ہی کسی چھوٹی یا بڑی تعلیم گاہ کو یہ گوارا ہو کہ اس کے اساسی کردار پر سرکاری تصرف ہو۔ خواہ اس تصرف کے جواز میں کیسے ہی دقیق یا قانونی اصطلاحیں وضع کی جائیں حسنات کو سرنگوں اور سیئات کو سربلند کرنا علم

وانسانیت کے ساتھ اچھا سلوک نہیں۔ ہماری یا کسی اور ملک میں شاید ہی کوئی قابلِ ذکر یونیورسٹی ایسی ہو جو حکومت کی بیش قرار امداد کے بغیر چلتی اور چلائی جا سکتی ہو۔ چہ جائیکہ مسلم یونیورسٹی جو ہندوستان کی سب سے بڑی، سب سے نادار اور سب سے زیادہ طرح طرح کی دشواریوں میں مبتلا اقلیت کی یونیورسٹی ہے۔ یونیورسٹیوں سے ڈرنا یا ان کو ڈرانا ضمیر اور دانش سے بے گانہ ہونے کی علامت ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد محکومی و مجبوری کے بند ٹوٹنے لگے لیکن اس آزادی نے گرفتاری کا طرفہ طرز اختیار کیا جیسے آزادی ذمہ داری نہیں بے لگام جعل وجہل کی گرم بازاری ہو، انگریز دورِ حکومت میں پولیس کا ایک طریقہ کار یہ تھا کہ جو شخص بدقماش یا حکومت سے ناوفاداری کے جرم میں سزایاب ہو کر جیل بھیج دیا جاتا تھا اور قید کی مدت ختم کر کے باہر آتا تو اس خیال سے کہ کہیں کسی اور گناہ کی لپیٹ میں آ کر اپنی یا پولیس کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ اسے کسی نہ کسی ڈھب سے جلد سے جلد جیل کی پناہ گاہ میں محفوظ کر دیتے۔ باوجود ہر قسم کے قانونی تحفظات اور فرد کی آئینی آزادی کے آج بھی جہاں تہاں اس روایت کا احترام کرتے اور لحاظ رکھتے ہیں۔ پہلے بدچلنی میں افراد کو گرفتار کر لیتے۔ آج درماندگی اور زبوں حالی پر اقوام کو حراست میں لے لیتے ہیں۔ سامراجی طاقتیں پہلے حرب وضرب اور ہر طرح کے استحصال سے کام لیتی تھیں۔ اب تو آزاد لیکن تعلیم، صنعت اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے پس ماندہ اقوام اور ملک کو بے تحاشا عطیات اور قرض دے کر ان نامبارک اغراض ومقاصد کو زیادہ آسان اور موثر طریقہ سے پورا کر لیتی ہیں جو پہلے پیشِ نظر رہتی تھیں۔ قرض دینے اور وصول کرنے کا طریقہ البتہ بدل گیا ہے۔ موجودہ طریقہ یہ ہے کہ اتنا بیکراں امدادی قرضہ دو اور سود کو بڑھنے دو کہ مقروض میں نہ ادا کرنے کی سکت رہے نہ مجالِ سرتابی۔ پہلے ملک پر قبضہ کرنے اور رکھنے کے لیے فوجیں اتارتے تھے، اب زر ومال سے صدقہ اتارتے ہیں۔ زبردست سامراجی طاقتیں انتہائی مہارت سے کسی نہ کسی شکل میں یہ ٹیکنیک عمل میں لا رہی ہیں۔

ہندوستان کے بیش تر مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ بہت بڑی تعداد ایسے غیر مسلموں کی ہے جو اس کو اسی طرح کام میں لاتے ہیں جس طرح مسلمان ایسوں کی بھی تعداد کم

نہیں ہے جو اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور سارے ملک اور اس کے باہر بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ امتیازات غالباً ہندوستان کی دوسری کسی زبان کو حاصل نہیں ہیں۔ یہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں وجود میں آئی لیکن اس کو شروع کرنے، ترقی دینے، یا اس کو کسی کے سر تھوپنے میں نہ مسلمان حکمرانوں کو دخل رہا ہے نہ مسلمان باشندوں کو۔ یہ وقت کے نئے ناگزیر طبعی، لسانی اور سماجی تقاضوں کی پیداوار ہے جن سے سرتابی نہ ممکن تھی نہ مناسب، جس آب و ہوا میں پیدا ہوئی اسی میں پھلی پھولی۔ یہی سبب ہے کہ بغیر کسی کوشش کے یہ ملک کے دور دراز خطوں تک پہنچی اور مقبول ہوئی۔ دوسری زبانوں کو اب تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی تھی۔ سب کی سب علاقائی محدود اور مقید تھیں، جیسے میل جول یا چھوت چھات سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ دوسری طرف اردو کے بارے میں محسوس کرتے تھے کہ یہ چھوت چھات یا طبقاتی نیچ اونچ سے بری ہے۔ اس لیے اس سے رشتہ رکھنے میں فائدہ ہے نقصان نہیں۔ زبانوں میں تبدیلی سماجی اور لسانی تقاضوں کی بڑی اہم علامت ہے۔ چہ جائیکہ وہ تقاضے اتنے شدید اور ناگزیر ہوں کہ ایک نئی زبان ہی وجود میں آجائے۔ اس طرح اردو کا ملک کی ہر زبان سے تعاون کرنا اور پانا قدرتی امر ہے۔ تعجب اور عبرت دونوں ہے کہ وہ زبان جو تفرقہ اور دوری کو مٹانے کے لیے سماجی تقاضوں کی بنا پر قدرتی طور پر ظہور میں آئی ہو اسے سیاسی مصالح یا مقاصد کی بنا پر نظر انداز کیا جائے۔

اس سے اب تک انکار نہیں کیا جا سکا ہے کہ اردو کلیتہً اسی ملک کی زبان ہے۔ یہیں کے عوام اور خواص اور صوفیا نے اسے منہ لگایا اور سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اس نے کسی ہمسایہ اور ہم وطن زبان کی حق تلفی نہیں کی۔ ہر زبان سے فائدہ اٹھایا اور ہر زبان کو فائدہ پہنچایا۔ اچھی سے اچھی اور اعلیٰ سے اعلیٰ زبانوں کو حسن اور خوبیوں سے ملک کے باشندوں کو ہر تعصب سے پاک اور بلند ہو کر روشناس کیا اور رکھا۔ موسیقی، شاعری، فکر و فن اور شخصیت کے اظہار کے لیے کیسے کیسے خوب صورت سانچے فراہم کیے۔ جمہوری نژاد ہونے سے ہندوستان گیر ہوئی اور دور دور تک پہنچی۔ باہر سے آنے والی اقوام نے جن میں سب سے ممتاز انگریز تھے اس میں شاعری کی جو زبان سے بے لاگ شغف رکھنے اور خود زبان کی خوبی اور خوب صورتی کی بڑی معتبر نشانی ہے۔ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی، سب سے نوعمر اور شاید سب سے بھرپور جدید زبان تھی جس میں انگریز،

انگریزی زبان اور انگریزی تسلط کے سب سے زیادہ دبدبہ اور طنطنہ کے زمانے میں ایک اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹی (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) قائم ہوئی جس کے معیار اور وقعت کو اندرون و بیرون ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹیوں نے تسلیم کیا۔ ہندستانی زبانوں کی جتنی خاص یا عام تقریبیں منعقد ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ مقبول عام آج بھی اردو مشاعروں کو نصیب ہے اور کیسا قبولِ عام جس میں ذوق و ذہن کے ہر درجے کے سامعین یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جیسے پہلے کبھی ہندو مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ تہواروں کے وہ دن تو خواب و خیال ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن اردو شاعروں کا تہوار آج بھی سب سے زیادہ سیکولر اور جمہوری ہے۔

اس سے اردو کے کتنے دل کش خدوخال اُبھرتے ہیں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے فلم کس درجہ پسند کیے جاتے ہوں گے۔ کون سی زبان دور اور نزدیک زیادہ مقبول ہے اس بارۂ خاص میں اردو کو جو امتیاز حاصل ہے اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ اطلاعاً یہ بھی عرض ہے کہ حال میں جوز بردست اور بے نظیر اجتماع غیر مسلم اردو شعرا اور مصنفین کا لکھنؤ میں ہوا تھا جس میں انھوں نے یک زبان ہو کر اردو کو اپنایا اور اس سے اپنے پورے شغف اور تعاون کا اظہار کیا تھا، وہ اس کا ثبوت ہے کہ اردو مسلم اور غیر مسلم تفریق کی لعنت سے پاک ہے۔ ایسا برملا اعتراف اور ایسی کھلی تصدیق اردو کو ایسے زمانے میں حاصل ہوئی جو اردو کے حق میں خصوصیت کے ساتھ ناسازگار تھا۔

اس سے پہلے کچھ اس طرح کی پالیسی پر عمل تھا کہ اردو کی تعلیم اسکول کے ابتدائی مدارج ہی میں مسدود یا مفلوج کر دیا جائے۔ اردو کے بہی خواہوں نے واویلا شروع کیا۔ ہر بارگاہ پر جھکے اور ہر محاذ پر لڑے ان سے ہمیشہ ہر سطح پر طرح طرح کے وعدے کیے گئے۔ اُمیدیں دلائی گئیں، لیکن معلوم یہی ہوا کہ 'بندھا تھا عہد بودا' التوا و مزید التوا اور ہمیشہ التوا اس مہم کا سب سے بڑا اور موثر حربہ تھا جو اردو کو معطل و معزول کر دینے کے لیے کام میں لایا گیا۔ اس یک طرفہ حرب اور حربہ کا اردو کے بہی خواہوں کے پاس جواب نہ تھا۔ چنانچہ دن گزرتے گئے اور وہ بچے جن کی مادری زبان اردو تھی اپنے اس حق سے محروم ہوتے گئے جو ان کو شیرِ مادر کے

ساتھ ملا تھا۔ ان کو یہ زبان سیکھنی اور پڑھنی پڑی جو مادری زبان نہ تھی۔ یہ معصوم بچے مادری زبان میں نہ ہنس بول سکتے تھے نہ فریاد و فغاں کر سکتے تھے۔ سرکاری زبان ہو یا کوئی اور زبان مادری زبان کا بدل نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف نصاب کی ایسی کتابیں تصنیف کی گئیں جن میں ایک طبقہ کی طرف سے دوسرے کے لیے بدگمانی اور نفرت پیدا ہوتی اور پھیلتی تھی۔ یہ سلوک اور ستم جمہوریت اور سیکولرزم کے اس شیر خوار پر تھا جو ابھی نشو ونما کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔

عزیزو!

اردو شاعری کے آغاز سے اب تک جتنے بے شمار غیر مسلم شعرا اور ادیب گزرے ہیں اور موجود ہیں ان کی غیر معمولی صلاحیت شعری اور قدرتِ فن کا اظہار اردو میں ہوا ہے۔ اس کا اعتراف و اعلان اردو شعر و ادب کے مصنفوں اور مبصروں نے ہر موقع پر کیا ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اردو کو اس لیے گردن زدنی قرار دینا کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے قرینِ انصاف نہیں ہے۔ بایں ہمہ یہ کہنے میں خوشی اور فخر محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے جتنے مخلص اور دلیر حامی غیر مسلموں میں ملتے ہیں اتنے مسلمانوں کے کسی اور مطالبے کی تائید کرنے والے غیر مسلموں میں نہیں ملیں گے۔ ان میں سے بعض نوجوان اردو شاعر اور اسکالرس اس فضا سے ضرور متاثر ہونے لگے ہیں جو اردو اور اردو والوں کے خلاف پھیل چکی ہے، اور پھیلائی جاتی رہتی ہے۔ لیکن یہ اتنی عجیب بات نہیں ہے جتنی یہ کہ بعض مسلم شعرا اور ادیب اردو کی عمارت میں رخنے ڈالنے میں اپنا فائدہ دیکھنے لگے ہیں۔ اردو رسم الخط کے بدلنے کی تحریک ایسی رخنے اور فتنے کا شاخسانہ ہے جو دل بدل اور سیاسی مزبلے سے شرفائے شعر و ادب تک پہنچا اور کہاں سے کہاں تک پہنچا۔

تقسیمِ ملک کے بعد اردو دشمنی کی جو لہر اُٹھی اس کی وسعت اور شدت بڑھتی ہی گئی۔ سیاست اور حکومت کے سربراہوں سے سوا طفل تسلی اور نامعتبر وعدوں کے کچھ اور ہاتھ نہ آیا۔ پانی سر سے گزر گیا۔ جن بچوں کی مادری زبان اردو تھی وہ برابر اس سے محروم ہوتے گئے چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ روزی اور بے روزگاری کی خاطر اب خود اردو والے اردو سیکھنے پڑھنے سے احتراز کرنے لگے ہیں۔ اس لیے کہ نوکری کرنے میں اردو حارج اور ہندی معاون ہوتی ہے۔ جو طبقہ اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ ہو وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔ یہ ستا اور

طریق سیاست کی روش و روایت کے مطابق کیوں نہ ہو، اخلاق و انسانیت کے صحیفے میں ہمیشہ قابلِ ملامت رہا ہے۔ طاقت ہاتھ میں ہو اور محاسبے کا اندیشہ یا پرواہ نہ ہو تو اربابِ اختیار و اقتدار اور دوسرے طاقت ور عوامل سے اس سے مختلف سلوک کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ مخالفت اور مایوسی کی آب و ہوا میں اردو کے خدمت گزاروں نے ایک طرف اپنی بساط کے مطابق اردو کی ابتدائی تعلیم کا ٹوٹا پھوٹا انتظام کیا، دوسری طرف اردو کی تعلیم کو درجہ ثانوی تک لازم کرنے اور اونچے مدارج تک پہنچانے کی تگ و دَو شروع کی، لیکن اردو کا کام صرف اردو دانوں کی سعی اور سرمائے سے انجام نہیں پا سکتا۔ تاوقتیکہ حکومت اردو کو زندہ اور نفع بخش رکھنے کے اچھے اور اعلیٰ کام کو آگے بڑھانے میں فیاضی اور جرأت سے کام نہ لے۔ جہاں تک یہ کام ہمارے کرنے کا ہے دیکھئے آشیاں کے لیے قفس میں کب تک اور کتنا خس جمع کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سیکولر جمہوریہ یا کسی اور حکومت کا امتحان یہ ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کے مسئلہ کی سطح اخلاقی و تہذیبی ہے یا جبر و بالا دستی یا شمار و اعداد کا ہمارا حال کچھ اس طرح کا ہے جیسا کبھی نزاکت اور معرکے کا وقت آتا ہے تو ہمارے سربرآوردہ حضرات اوّلین فرصت میں کسی محفوظ اور منفعت بخش حصار میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ حصار بالعموم حکومت کے حصن حصین کے سائے میں ہوتا ہے۔ جہاں سے یہ قوم کے لیے بیانات صادر کرنے شروع کر دیتے ہیں۔ حادثے پیش آنے لگتے ہیں تو یہ کبوترانِ بام حکومت مرغانِ رشتہ بر پا کو ہدایت نامے یا تعزیت نامے بھیجتے ہیں۔ موخرالذکر سرفروش ہوتے ہیں ایمان فروش نہیں ہوتے۔ اپنے نفع نقصان کو نہیں دیکھتے۔ اس اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھتے ہیں جن کو خودغرض اور نفع شعار چھوڑ کر خطرے کے اوّلین آثار کو دیکھ کر راہِ فرار اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ پھر جو کچھ پیش آتا ہے، آتا ہے!

عزیزو!

زبان کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں فلاں قوم، ملک، مذہب یا ادب کے الفاظ استعارے، اشارے و اسالیب کیوں اور فلاں کے کیوں نہیں۔ زبان کے فطری اور سماجی عمل سے ناواقفیت یا تعصب کی دلیل ہے۔ کبھی اردو میں فارسی اور عربی الفاظ و انداز کی بہتات اور الفاظ

کے مطابق ان کی دروبست بھی انھیں پرتھی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ کوئی آرڈی ننس نافذ تھا جس کی تعمیل میں ایسا کیا جاتا تھا۔ بلکہ سرکار، قوم اور بازار کا یہی لب ولہجہ اور نقشہ تھا۔ جس کی ہر شخص غیر شعوری طور پر پابندی کرتا۔ اس میں طبقاتی تفریق اور لسانی تعصب کو دخل نہ تھا بلکہ اس سے زبان کو کام میں لانے کی سہولت اور لکھنے بولنے والوں کی وقعت ہوتی تھی۔ اس کے بعد بولنے اور لکھنے کا اسلوب و انداز رفتہ رفتہ بدل گیا جس طرح گردشِ روزگار سے رسم ورواج تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ انگریز آئے اور انگریزی آئی اور انگریزی علم وفن آئے۔ تہذیب ورہن سہن، طریقِ تعلیم، تجارت، دکان مکان سب میں اس کے اثرات آئے اور سرورکی اردو کو سرسید کی اردو کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ سرسید نے اردو کو تکلفات کا نہیں تقاضوں کا پابند کیا۔ اردو تکلفات سے آراستہ اور بوجھل ہونے کی بجائے زبان وادب کی ضرورت کو پورا کرنے کی کفیل ہوئی۔

لیکن کچھ عرصہ سے صورتِ حال یہ ہے کہ شاعری جو اصول وضوابط کی سب سے زیادہ پابندی رکھتی تھی۔ ہر قید و پابندی سے آزاد ہوگئی یا کردی گئی۔ جس نے چاہا شاعر بن گیا اور ہر گفتار اور طریق اظہار شاعری قرار پایا۔ جب میزان اور معیار ناقابل اعتنا اور ناقابلِ اعتبار ہو جائیں تو متاع کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ بریں انگریزی یا کسی اور معیاری ومقبول زبان سے اپنی زبان وادب کو بہتر بنانے، مالا مال کرنے کا کون مخالف ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اور اسالیب، زبان کی ثروت و استحکام میں اضافہ کرتے ہوں۔ نہ یہ کہ زبان وادب کے جسم میں بدنما و معطل یا خطرناک گلٹیوں کی شکل میں نمودار ہوں اور جسم کی صحت وزیبائی اور استحکام سب کو غارت کردینے کا باعث ہوں۔ اردو کتنی ہی کم مایہ زبان کیوں نہ ہو اس کی محتاج نہیں ہے کہ اس میں کم سواد ہر طرح کا اضافہ اس طرح کریں جیسے 'جو گناہ کیجیے ثواب ہے آج!' مفید و معتبر اضافہ کا کون قائل نہ ہوگا۔ لیکن ہر بوالہوس کو حسن پرستی پر آمادہ دیکھ کر اگر آبروئے شیوۂ اہلِ نظر داغ دار ہوتی ہو تو اس کا ماتم کرنا بھی بے جا نہ ہوگا۔

بایں ہمہ یہاں اس امر کی وضاحت اور اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ انگریزی فقرے و ترکیبیں اس درجہ عام اور مقبول ہو چکے ہیں کہ بغیر کوشش کے طرح طرح کے تلفظ سے اور مفہوم میں ہر کس وناکس کی زبان پر غیر شعوری طور پر رواں ہوتے ہیں۔ اگر اس پر کوئی مائلِ فریاد یا فساد

ہو کہ وہ الفاظ ملک کے ادب اور روایات کے مطابق نہیں ہیں یا منافی ہیں اس لیے اچھوت ہیں اور غیر ملی ذہنیت کی غمازی اور ملک سے غداری کے مجرم ہیں تو اس کا کوئی جواب نہیں۔ زبان میں قبول کسی کے بس کی بات نہیں۔ زندگی وضرورت اور سہولت کے طور تقاضے ان کو ترک یا قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ عوام کی زبان عوام کی اور بول چال کی رہتی ہے اور کہلاتی ہے اور خواص کی زبان خواص، اور شعروادب کی رہتی اور کہلاتی ہے۔ خواص اور عوام کا یہ فرق خلقی بھی ہے، تہذیبی بھی۔ اسی فرق سے تہذیب کا خمیر اٹھا ہے۔ اس لیے جب تک تہذیب باقی ہے یہ فرق بھی باقی رہے گا چاہے دنیا جبر کے تسلط میں رہے چاہے جمہوریت کے۔ زبان کا معیار اور اس کی منزلت خواص کی ذمہ داری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ زبان کو خواص اور عوام دونوں میں سے کسی ایک کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جائے گا۔ ہندی کے فاضلوں اور فوج داروں کو سوچنا چاہیے کہ ہندی یا سنسکرت کے اتنے الفاظ یا فقرے یا اور چیزیں اردو میں کیوں نہیں جتنی کہ وہ چاہتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے زبان کو مروّج اور مقبول بنانے میں کن مبادیات کو نظر انداز کر دیا ہے یا کون سا طریقہ اختیار کیا ہے جس کے سبب اردو ہندی کی درمیانی خلیج کو نہ پاٹا جا سکا ہے، نہ اس پر کوئی خوب صورت اور مضبوط پل تعمیر کیا جاسکا۔ کسی وقت حکومت مسلط کی جاسکتی ہے، لیکن زبان وادب اور ان کے سرچشمے مذہب و تہذیب وتمدن پر جبر وتشدد کا عمل مشکل سے کارگر ہوا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ فلاں زبان کی ساخت پرداخت اس طرح کی کیوں ہے اور اس طرح کی نہیں ہے تو خیریت نہیں ہے نابالغ معصوموں کی ناسمجھی نہیں تو اور کیا ہے۔

عزیزو!

علی گڑھ تحریک اور مدرستہ العلوم کا اردو کی اہمیت، اشاعت واستحکام میں کیا حصہ رہا ہے۔ اس مسئلہ پر بعض دوستوں اور دانش مندوں نے حصول آزادی کے بعد جن خیالات کا خصوصیت کے ساتھ اظہار کیا اور کرتے رہتے ہیں ان میں قابلِ توجہ یہ ہے کہ اپنے ابتدائی ارادے سے ہٹ کر سرسید اردو کو مدرستہ العلوم (ایم۔اے۔او۔کالج) میں وسیلۂ تعلیم بنانے اور رکھنے سے کیوں منحرف ہو گئے۔ انھوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اردو کو بڑا فائدہ اور تقویت پہنچتی۔

بعض تلخ حقائق یا حقیقت پسندی کی بنیاد پر یہ خیال نہ پہلے قابلِ قبول تھا نہ آج ہے، باوجود اس کے کہ جب سے اب تک حالات میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا ہے۔ اس لیے کہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے مسلم یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی قرار دینے سے مسلمان ان فوائد سے محروم رہ جاتے جو انگریزی حکومت میں چھوٹی بڑی ملازمتوں کے ملنے اور مغربی علوم وفنون سے کامل شناسائی اور مغربی طور طریقوں کو اختیار کرنے سے میسّر آ سکتے تھے، اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب مدرستہ العلوم اور مسلم یونیورسٹی انگریزی زبان اور مغربی علوم میں دسترس رکھنے میں معاصر یونیورسٹیوں سے بھی آگے ہوتی۔ ہم آپ پسند کرتے یا نہ کرتے انگریزی حکومت یونیورسٹیوں کے عام اور عالمی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے دار العلوم میں اردو کی خیر و عافیت کو کبھی خاطر میں نہ لاتی۔ سرسید کے عہد میں مسلمان جس عبرت ناک اور قابلِ رحم حالت کو پہنچ گئے تھے، انگریز اور انگریزی حکومت جس درجہ ان سے بدگمان تھی اور روزی روزگار کی طرف سے جیسی سفاک مسابقت کا سامنا تھا۔ اس میں لازم آتا تھا کہ سارے ہندوستان میں ہر اعتبار سے مکمل اور معیاری ایک سے زیادہ علی گڑھ قائم اور برسرکار ہوتا۔ اگر مسلمان کی مغربی طرز کی اعلیٰ تعلیم گاہیں ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوتیں جیسی کہ حکومت کی تھیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ہم کو وہی آسانیاں میسّر ہوتیں جو غیر مسلموں کو تھیں، لیکن ہم کو کم و بیش اب تک نصیب نہیں ہوئیں، تو کسی ایک کو اردو کالج یا یونیورسٹی بنا دینے میں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن لے دے کر صرف ایک علی گڑھ میں دوسرے عناصر کی آمیزش کی گئی ہوتی یا عوامل کو دخل دیا گیا ہوتا تو اس کے مخالف اس کو رُسوا کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ساری تعمیر مسمار ہو جاتی اور ہم شاید کہیں کے نہ رہ جاتے۔ 1947ء تک انگریزی کے سوا ایک بھی دوسری زبان کی یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ کہیں سے نہیں کیا گیا اور جس زبان کی ایک جیتی جاگتی یونیورسٹی قائم تھی اس کا کیا حشر ہوا، اور کیوں ہوا وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی بنیادی یا اضافی طور پر 'اردو یونیورسٹی کیوں اور کیوں نہیں' یہ مسئلہ ہمیشہ سے اربابِ نظم ونسق کے سامنے رہا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ ایم۔اے۔او۔ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی حیثیت ایک کل ہند ادارے کی تھی۔ اس میں ایسے طلبا کو بھی داخلہ کا حق تھا جو ملک کے دور افتادہ حصوں کے باشندے تھے اور ان کی مادری زبان اردو نہ

تھی۔اس بنا پر علی گڑھ کو 'اردو بردار' رکھنے میں ہر سے اور ہر طرح کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی نہیں یقین تھا۔اس لیے علی گڑھ کے لیے لازمی تھا کہ وہ اس طرح کے پُر خطر امکانات سے اپنے آپ کو علاحدہ اور محفوظ رکھے۔غالباً اس امر سے کم لوگ واقف ہوں گے کہ جب دور آصفی میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں قائم ہوئی اور چل نکلی تو وہ لوگ جن کو ہم سے عشق نہ تھا علی گڑھ کی شہرت سنتے تو طنز و تضحیک کے اس طرح کے نشتروں سے نوازا کرتے کہ حیدرآباد نہیں بلکہ علی گڑھ اردو یونیورسٹی تھی اور اس کے معیار کے اونچے نیچے ہونے کا سوال ہی کیا،اور یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم میں، ڈسپلن میں، یونین کی اعلیٰ مشاغل میں، کھیل کے میدانوں میں، حکومت کے ہر طرح اور ہر سطح کے مناصب اور دوسری تہذیبی سرگرمیوں میں ہمارا کوئی نظیر نہ تھا۔جب ایک ہی بساط اور ایک ہی مہرہ رہ گیا ہو اس وقت کھیل کا انداز اس سے مختلف ہوتا ہے جو ایک معصوم تماشائی کی سمجھ میں آسانی سے آسکے۔

تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ علی گڑھ کی حیثیت شروع سے اردو یونیورسٹی کی ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس میں طلبا کی فراہمی کے لیے سارے ملک میں اردو کے چھوٹے بڑے اسکول اور کالج ہوتے۔تقسیم ملک کے بعد اردو کو جیسے دن دیکھنے پڑے وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ پہلے اور آج بھی ہمارے طلبا کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو ان کی پذیرائی بالعموم 'دور باش' سے کی جاتی ہے۔ان حالات کے ہوتے ہوئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یونیورسٹی کی معیاری تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ایسا ادارہ نہ رہ جاتا جیسا کہ بحیثیت مجموعی علی گڑھ ہے۔جہاں ہم آسانی سے ہر علم و فن کے شعبہ میں داخلہ پا کر مقررہ معیاری تعلیم حاصل کر سکتے اور اردو یونیورسٹی ہونے کی وجہ سے علی گڑھ کا وہی حشر ہوتا جو اردو کا ہوا۔یہ اتنا بڑا نقصان ہوتا جس کی آئندہ تلافی نہ ہو سکتی۔لیکن کیا کیجیے کہ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آج بھی ہمارے بعض کرم فرما معلوم نہیں کون سے مصالح کی بنا پر ہم کو تنبیہ کرتے رہتے ہیں کہ سرسید نے اردو کے بارے میں غلط فیصلہ کیا اور آج بھی مسلم یونیورسٹی میں اردو کو وسیلۂ تعلیم قرار نہ دے کر ارباب یونیورسٹی غلطی کر رہے ہیں۔اردو کو کہیں پنپنے کا موقع نہ دیا جاتا تو اردو سے علی گڑھ کو اور علی گڑھ سے اردو کو پنپانے کا منصوبہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اگر مضحکہ خیز نہیں۔

عزیزو!

سرسید کی بے مثل دور اندیشی اور حقیقت پسندی کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے اردو کے بارے میں اپنی رائے بدل دی اور علی گڑھ کو اردو ادارہ رکھنے کی بجائے اس کو ایک اعلیٰ درجہ کے انگریزی (مغربی) ادارے میں ڈھال دیا لیکن انہوں نے اردو کے تحفظ اور ترقی کے موقف کو نہیں بدلا بلکہ اس کو بروئے کار لانے اور موثر بنانے میں اپنی سعی و شغف کو تیز تر اور وسیع تر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ ایک طرف مثالی ماڈرن مغربی اعلیٰ تعلیم گاہ ہونے کے اعتبار سے سارے ہندوستان میں اور بیرون ملک ممتاز رہا۔ دوسری جانب مذہب، اخلاق، روشن ضمیری، تہذیب اور زبان (اردو) کی بنیادوں کو چوڑا اور مضبوط، ان کی محرابوں کو بلند اور ان کے صحن و بام کو زیادہ کشادہ کیا۔ مخلص اور حوصلہ مند رفقا اور مردان کار پیدا کیے۔ ایسے مردانِ کار جن کا سلسلہ اس ادارے سے آج تک منقطع نہیں ہوا۔ یہ جماعت آپ، اعلیٰ شعار طلبا اور اولڈ بوائز کی ہے۔ علم و انسانیت کا یہ گہوارہ جسے ہم علی گڑھ کہتے ہیں جو اپنوں کے لیے ایک عظیم احساسِ ذمہ داری اور دوسروں کے لیے ایک دعوت اور بشارت ہے۔ سرسید کا دیا ہوا ہے۔ صرف ایک شخص کے ہول و ہلاکت کے ایسے دور میں جو اس وقت تک ہم پر کبھی نہیں گزرا تھا۔

اردو یونیورسٹی قائم ہر وقت ہو سکتی ہے لیکن کار آمد و کامیاب اس وقت ہو گی جب اردو کو وہ سہولتیں میسر ہوں گی (مثلاً اردو کا علاقائی زبان ہونا) جو دوسری زبانوں کو حاصل ہیں، اور وہ محرومیاں دور کر دی جائیں جن سے وہ کم و بیش 25 سال سے دوچار ہے اور ایک حد تک ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا چکی ہے۔ دوسری معاصر ملکی زبانیں ان سہولتوں سے پورے طور پر مستفید اور اس کی محرومیوں سے محفوظ ہیں۔ اس کے باوجود اس کے باعث ان زبانوں کی یونیورسٹیاں قائم کرنے کی کوئی تحریک نہیں اٹھائی گئی ہے۔ اس لیے کہ ان کو وہ تمام آسانیاں فراہم ہیں جن سے مستفید ہونے کے لیے اردو والے ملتجی برابر اور مایوس و محروم اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ یونیورسٹیاں افراد اور مقررہ چندے کے حاصل ضرب سے نہیں چلتیں نہ صرف بینک بیلنس سے نہ جذبات کے طوفان و طغیان میں جڑ پکڑتی اور پھولتی پھلتی ہیں۔ یونیورسٹی قائم کرنے اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے کبھی کبھی بڑی تلخ حقیقت پسندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کے ہم بہت

کم خوگر رہے ہیں۔ یونیورسٹی کی جوئے رواں کی مسلسل اور مکمل آب رسانی نہ ہوتی رہے تو وہ خشک اور بے آب وگیاہ رہ جاتی ہے۔ ایسی یونیورسٹیوں کا تصور آسانی سے کیا جاسکتا ہے جہاں سب کچھ ہو صرف طالب علم کتابیں اور معلم نہ ہوں۔ آخر ایسی مسجدیں بھی تو دیکھنے میں آتی ہیں جہاں نہ مؤذن ہوتے ہیں نہ مقتدی نہ امام! اس کے باوجود میں اردو یونیورسٹی کا مخالف نہیں ہوں۔ میں تو مسلمانوں کے اس عالم گیر یا عالم آشوب قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جسے مددِ خدا پر اتنا بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ ہمتِ مرداں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

دوستو!

میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں کچھ اور باتیں بھی آپ کے ذہن میں محفوظ رہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ سرسید نے جو کچھ کیا وہ ایسا نہ تھا کہ ان کا شکرگزار اور ان کی بڑائی کا معترف ہونے کے بجائے ان کو ہدف ملامت بنایا جائے۔ جدید اردو کی ابتدا ڈاکٹر گلکرائسٹ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ اس کو آگے بڑھانے میں ماسٹر رام چندر (دہلی کالج) کی قیمتی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حیدرآباد کے امیر فخر الدین شمس الامرا امیر کبیر کی مساعی بھی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی سے تقریباً نصف صدی پہلے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ جہاں علوم وفنون کی کتابوں کے فارسی اور اردو ترجمے کیے جاتے تھے۔ یہ ادارہ فورٹ ولیم کالج سے یوں مختلف تھا کہ یہاں تعلیم کا انتظام نہیں تھا، اور قصے کہانیوں کے بجائے علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمے کیے جاتے تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی کا بھی یہی مقصد وموقف تھا۔ ان اداروں کو اردو کے نقیب یا 'طائرانِ پیش رس' کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے سہل، سادہ اور کارآمد نثر کے نمونے پیش کیے جو بہت جلد مقبول ہوئے اور بحیثیت مجموعی اردو نثر کی شاہراہ قرار پائے لیکن اس کی مساعی زیادہ تر انگریزی تراجم اور اپنے انگریز عملے کو اردو اور ہندی سے آشنا کرنے اور رکھنے تک محدود تھیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی کو مختلف اور متحارب زبانیں جاننے اور ماننے کی نامبارک تحریک کی ابتدا بھی فورٹ ولیم کالج سے ہوئی جہاں زبان کے دسترخوان پر سب سے پہلے اردو اور ہندی کی کھچڑی چنی گئی۔ دہلی کالج نے اردو کو وسیلۂ تعلیم قرار دیا تھا، لیکن ان اداروں کے پیچھے کوئی ایسا عزم یا شخصیت نہ تھی جو کسی بڑے مقصد یا مشن کی

تکمیل کے لیے قوتِ محرکہ کا کام دیتی ہے۔ یہ امتیاز واضح طور پر سرسید کے حصے میں آیا۔ اگر سرسید نے علی گڑھ تحریک کو اپنی اردو نثر سے اور اردو نثر کو علی گڑھ تحریک سے توانائی نہ پہنچائی ہوتی اور دونوں کو ایک دوسرے کے لیے مفید و مقبول نہ بنا دیا ہوتا تو جدید اردو کو وہ پر و بال نصیب نہ ہوتے جن کی بدولت آج سے پہلے تک ملک کی معاصر زبانوں میں وہ سرِ محفل نظر آتی تھی۔

یہ سرسید کی کھری اور کھڑی اردو تھی جس نے اس کو مخصوص دبستانوں مثلاً دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، رام پور وغیرہ سے نکال کر عام کیا جن میں وہ اسیر ہو گئی تھی۔ جس طرح ملک کی دوسری زبانیں اور باشندے ذات پات اور چھوت چھات کے زندانوں میں مقید تھے۔ سرسید کی دی ہوئی اردو کا منشور یہ تھا کہ اب سے اردو کا دبستان جغرافیائی حدود کا پابند یا صنائع و بدائع کا مینا بازار نہیں بلکہ زندگی، زمانہ اور علم و ادب کے تقاضوں کی کھلی اور آزاد فضا ہو گی۔ سرسید سے پہلے اردو نثر اردو شاعری کے روپ کی تھی اور غالبؔ سے پہلے کچھ ایسی قابلِ اعتنا بھی نہ تھی۔ ہر چھوٹے بڑے کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کی نثر کہاں تک شاعری سے قریب تھی۔ بڑی حد تک یہ فارسی کا تصرف تھا جس کی نثر بالعموم شاعرانہ اور پُر تکلف ہوتی تھی۔

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اردو نظم و نثر کو تصنع اور تکلف سے نکال کر سادہ اور موثر اسالیب سے روشناس کرانے کا امتیاز انگریزوں کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ (کلکتہ) اور کرنل ہالرائڈ (لاہور) دونوں نے اتنے دور دراز مقامات پر ہوتے ہوئے اردو نظم اور نثر کو جس طور پر جدید رجحانات سے آشنا کرایا۔ اس کو ہم ہمیشہ مسرت اور شکر گزاری سے یاد رکھیں گے۔ اس ورثے کو معیاری بنانے میں سرسید کے ساتھ حالیؔ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حالیؔ نے اردو غزل اور نظم کو جس خلوص و صناعت اور قابلیت سے ہر دل عزیز بنایا اور وقت کا ساتھ دینے کی اہلیت بخشی، اس کی مثال اردو شعر و ادب میں کم ملے گی۔ غالبؔ کے خطوط اپنے طور پر بے نظیر اور سدا بہار ہیں۔ نثر کا یہ انداز جتنا غالبؔ کے نجی خطوط میں ملتا ہے اتنا ان کے ادبی خطوط میں نہیں۔ حالیؔ نے اس کو بڑی خوبی سے علمی اور ادبی قالب میں ڈھالا اور اس انداز کو عام کیا۔ انھوں نے اردو شاعری اور شاعروں پر جیسی کڑی تنقید کی تھی اپنی شاعری سے اس کی صحت و اصلاح بھی

کردی، اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ حالؔی کی اعلیٰ خدمات کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی تطہیر کی۔ اس کو تازگی، توانائی اور تاثیر بخشی، اور سب سے بڑی بات یہ کی جس کے مان لینے کی نہیں بلکہ اس پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں کہ انھوں نے ایسے راستے کھولے جہاں سے اقبالؔ نے ہماری تہذیب اور تاریخ کی ہمارے لیے نئے زاویوں سے بازیافت کی۔ سرسید اور حالؔی نے اردو کو سنجیدہ اور علمی زبان بنانے کی مہم کو جس طرح اور جتنی جلد کامیاب بنایا بڑی حد تک یہ اسی کا فیضان تھا کہ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی وجود میں آئی جس کے قیام اور ہمہ جہتی ترقی اور شہرت میں علی گڑھ کے بزرگوں کا معمولی حصہ نہیں ہے۔ اس طور پر اردو یونیورسٹی ہو جانے کے نقصانات سے بچنے، دوسری طرف ایک معیاری اردو یونیورسٹی بنوانے کے فوائد دونوں کا امتیاز یا کریڈٹ سرسید اور علی گڑھ کے حصے میں آتا ہے۔ سرسید اور علی گڑھ کے نکتہ چین اور اردو کے غم گسار معلوم نہیں اب بھی ان دونوں کے گناہ بخشے جانے کی تائید کریں گے یا نہیں!

اردو ہندی کا مرض یا فتنہ کم وبیش پونے دوسو سال پرانا ہے، اور جیسا کہ بعض امراض کا خاصہ ہے کہ اگر وہ جلد دور نہ کیے جائیں تو ان کا ازالہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اردو کا حال کچھ اس طرح کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اردو کیوں، ہندی کیوں نہیں یا اس نوع کے اور مسائل کا تصفیہ نہیں ہوا تھا کہ ملک کی آزادی کے بعد ان کا ایک اور شاخسانہ سامنے آیا۔ یعنی 'انگریزی ہرگز نہیں' انگریزی نے کبھی فریق یا فرقہ بندی کی صورت نہیں اختیار کی تھی۔ معلوم نہیں کیسے اور کس گیہوں کا گھن قرار پا کر پسنے کی زد میں آ گئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ گیہوں کے ساتھ پسنے پر راضی ہے نہ گھن کے ساتھ۔ عجب نہیں انگریزی کے گیہوں اور گھن کے ساتھ چکی کی خیر و عافیت خطرے میں پڑ جائے۔ ہم میں کسی کو اس کا اعتراف نہ ہوگا کہ علاوہ دوسری مفید اور قیمتی خدمات کے انگریزی نے اس ملک کی زبانوں کو جو بیش بہا فائدے پہنچائے ہیں اتنے کسی اور زبان نے نہیں پہنچائے۔ یہ حقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی کے ہم اور ہماری زبانیں جتنی محتاج ہیں، ہماری زبانوں کے انگریز اور انگریزی زبان محتاج نہیں ہیں۔ ہر زبان خواہ وہ کسی کی اور کہیں کی ہو علم کا ذخیرہ اور وسیلہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہر زبان وادب

ہر شخص کی بین الاقوامی یا عالمی میراث ہے۔ اگر وہ اس میراث سے بدکتا اور بھاگتا ہے تو وہ بدعقل بھی ہے اور قابلِ رحم بھی۔

عزیزو!

حال میں تصنیف، تالیف، تراجم اور اسکالرس کو انعامات دینے کے لیے جو خطیر رقم منظور اور عطا کی گئی ہے اور جہاں تہاں اردو بورڈ اور اکیڈمیاں قائم کی گئی ہیں اس کا ہم نہایت درجہ خوشی اور شکر گزاری کے ساتھ احساس رکھتے اور اعتراف کرتے ہیں۔ فیاضی کا ایسا سلوک اردو سے پہلے کبھی کسی منزل میں نہیں ہوا۔ لیکن اس کا بھی کچھ کم احساس نہیں ہے کہ یہ تصنیف، تالیف، ترجمہ، انعامات اور گراں مشاہرہ وعملہ اس وقت مفید ہو سکتے ہیں جب ملک کی معاصر زبانوں کی مانند اوّل سے آخر تک اردو کی درجہ بدرجہ تعلیم کا موقع سہولت اور سرکاری دفاتر اور محکموں میں روزگار ملنے کا امکان بھی ہو، ورنہ ان تصانیف وتراجم کا انبار کس کے کام آئے گا جن پر خطیر رقم، گراں قدر محنت اور بیش قرار وقت صرف کیا جا چکا ہو۔ سوا اس کے کہ تہہ خانوں اور کتب خانوں یا بعض دکانوں پر اس عبرت ناک اور ناگفتہ بہ انجام کو پہنچنے کا انتظار کرے جو اس کے آغاز کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ کتابیں پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے تیار اور فراہم کی جاتی ہیں۔ بے مصرف رہنے اور بالآخر تلف کر دینے کے لیے نہیں ہوتیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے ساتھ وہاں کے بیش بہا اردو تراجم اور تالیفات کا جو حشر ہوا وہ کس کو نہیں معلوم ہے۔ کچھ اردو مصنفین کو ہر سال یا وقتاً فوقتاً انعامات سے سرفراز کرنا یا مترجمین ومولفین کو ان کی محنت کا صلہ دینا یا آفس کے عہدے داروں پر بھاری رقمیں صرف کرنا، یہ تمام عطایا کس طرح ان لاتعداد طالب علموں کو مادری زبان سے محروم کر دینے کی کسی عنوان اور کسی حساب سے تلافی نہیں کر سکتے جو ملک کے دور اور نزدیک خطوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سانحہ کا اندازہ اس لیے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس مادری زبان سے پوری ایک نسل محروم کر دی گئی ہو اس کی آئندہ نسلیں کیا اور کہاں ہوں گی۔ کیا اس سے اس شبہ کی تصدیق نہیں ہوتی کہ مادری زبان سے محرومی سوچی ہوئی پالیسی کا نتیجہ ہے جو کسی ذمہ دار حکومت یا معاشرے کے لیے باعثِ فخر نہیں ہے۔ یہ بات بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہے کہ ایک سے زائد اقلیتیں ہیں۔ ان میں اقلیت محروم، اور اقلیت محبوب کی تخصیص اور تقسیم کیوں۔

عزیزو!

یادش بخیر، مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل 1972ء کی ستم رانی اور سخن سازی کے دور میں ہم کو یہ کہہ کر تشفی دی جاتی تھی کہ اس درس گاہ کا اقلیتی کردار کس درجہ محفوظ، ممتاز اور مستحکم ہے کہ اس میں دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے اور اسلامک اسٹڈیز اور ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے شعبے ہیں جس پر بعض ستم ظریفوں نے یہ اضافہ کیا کہ ایک خوش نما وسیع مسجد بھی ہے۔ اس سے ملحق بانی درس گاہ سرسید کا مزار ہے۔ مسجد میں طلبا نماز اور مزار پر اکابر ملک وملت فاتحہ پڑھتے اور پھول چڑھاتے ہیں۔

ایک طرف طویل وعریض مرتب ومنظم قبرستان بھی ہے جہاں درس گاہ کے متعلقین و متوسلین امن و آزادی اور احترام سے مدفون ہونے کے مجاز ہیں۔ اب کون کس کو بتائے کہ اسلامک اسٹڈیز وغیرہ کے کیسے کیسے اور کتنے جید ادارے یورپ اور امریکہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ لیکن ان سے آج تک ہم کو کسی نے یہ یقین یا تسکین دلانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ہمارے اقلیتی کردار کو محفوظ و معتبر رکھنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں، اور ان سے ہماری تاریخی وتہذیبی ثروت و امانت کو ہماری زندگی کے صالح وصحت مند تقاضوں کو مربوط، ہم آہنگ اور فعال رکھنے کا کام لیا جاتا ہے یا لیا جاسکتا ہے۔

علی گڑھ کے نفع وضرر کو متعین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اس ادارے کے ساتھ ابتدا سے اب تک کسی نہ کسی اعتبار سے وابستہ اور ہر آزمائش میں اس کے لیے سینہ سپر رہے ہیں۔ یعنی 'اولڈ بوائز' دوسرے وہ اراکین اسٹاف اور منتظمہ جو اس درس گاہ کے فیض یافتہ اور اس کے بہترین مقاصد کے امین رہتے آئے ہیں۔ تیسرے وہ جنھوں نے اس ادارہ کو مسلسل بیش بہا مالی و اخلاقی امداد سے تازہ اور توانا رکھا۔ یہ اس کے محسنوں میں ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار وہ اچھے لوگ ہیں جو علی گڑھ سے جذباتی لگاؤ اور غائبانہ عقیدت رکھتے ہیں اور ملک کے دور اور نزدیک کے خطوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایکٹ میں ترمیم سے ان محترم بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں پر جو کچھ گزری اور گزر رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اکثر اس ستم ظریفی پر ہنسی بھی آتی ہے کہ اب ضرب اور زخم کی تکلیف مضروب و مجروح کو نہیں بلکہ ان وفادارانِ ازلی کو پہنچنے لگی ہے جو ہر صدمہ سے محفوظ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے طفیل ہر طرح کا نفع کماتے ہیں۔

عزیزو!

سرسید اور علی گڑھ کے بارے میں بیش تر علمائے کرام روزِ اوّل سے آج تک کبھی بالجبر اور کبھی بالسّر یہ خیال ظاہر فرماتے آرہے ہیں کہ دونوں نے دنیا کی خاطر دین کے خدوخال کو بگاڑا اور اس میں شوشے اور گوشے نکالے کہ ان کا سدباب یا اصلاح کرنے کے لیے مخصوص ادارے قائم کرنے پڑے۔ اتنا شاید کافی نہ تھا کہ سیاست کے بعض ہم جولیوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ علی گڑھ نے قوم کے نونہالوں کو حکومت کی غلامی میں دے دیا۔ ان بشارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ علی گڑھ نے مسلمانوں کو نہ دین کا رکھا اور نہ دنیا کا! کتنے شب و روز اور مہ و سال اس نالۂ و نفیر کو سنتے سنتے گزار دیے۔ اس دوران میں علی گڑھ نے ہماری دین و دنیا کے ساتھ جیسا سلوک کیا اور اس سے ہم نے جو فائدہ اٹھایا اور جیسی آبرو اور تقویت پائی اس کی تفصیل آسان نہیں ہے۔ میں کچھ اس طور پر محسوس کرتا ہوں کہ دنیوی علوم و فنون میں مہارت اور عام زندگی میں عافیت، فراغت اور عزت حاصل کیے بغیر دین کا کام نہیں بنتا۔ بُرے احوال جینا اور دین کے مطالبات سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے، اور آسان نہیں ہے تو دین یا دنیا کی کسی عدالت میں قابلِ مواخذہ و محاسبہ بھی نہیں! رہا دین کے مسائل میں اختلاف و اجتہاد وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ شروع سے چلا آرہا ہے، اور آخر تک قائم رہے گا۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھیے کہ سرسید نے مذہب کے تعارف و تعبیر میں جو کچھ کہا ہے وہ بالکل وہی ہے جو ان سے پہلے جید علما دین فرما چکے ہیں۔

جہاں تک دنیا کا تعلق ہے تو نہایت جرأت و فخر و شادمانی اور شکر گزاری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سے اب تک مسلمانوں کو کسی شخص یا ادارے نے وہ ہمہ جہتی فائدہ اور دوررس فائدہ نہیں پہنچایا جو علی گڑھ نے پہنچایا اور جب ہم اس میں غیر مسلموں کو بھی شامل کرلیں تو یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس ادارے نے ابتدا سے آج تک غیر مسلموں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اور روزگار سے جس طرح بہرہ مند کیا اور رکھا وہ ایسا غیر معمولی امتیاز ہے جس کو حاصل کرنا آج تک ہندوستان کے کسی سرکاری غیر مسلم ادارے کو نصیب نہیں ہوا۔ اس ادارے کو ہر طرح کے مخالفین نے اس سے جتنا زیادہ سے زیادہ نفع اٹھایا اس کا جائزہ لیا

جائے تو بڑا دلچسپ مطالعہ ہوگا۔علی گڑھ نے دین کو جس طرح بگاڑا اس کا ریکارڈ تو میرے پاس نہیں ہے لیکن اس نے ہم کو دنیا میں عزّت اور آرزومندی سے جینے کا بیش از بیش سلیقہ ضرور دیا ہے جن کے بغیر آج ہم جہاں ہوتے اس کا اندازہ علی گڑھ کے نیک نیت مخالفین کر سکتے تو خاموش ہو جاتے اور جو نیک نیت نہیں ہیں ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں کوئی بھی کیا کہہ سکتا ہے۔

آپ نے یہ لطیفہ کہیں نہ کہیں پڑھا یا سنا ضرور ہوگا۔ایک مایوس الحال اور پریشان روزگار مولوی صاحب سرسید کی خدمت میں تشریف لائے۔اپنی مصیبت بیان کی اور کسی روزی روزگار سے لگا دیے جانے کی درخواست کی۔سرسید نے فرمایا کہ مولانا سب سے آسان اور مجرب نسخہ یہ ہے کہ مجھے برملا بُرا کہیے اور کہتے رہیے۔صلہ میں کہیں نہ کہیں سے مطلب برآری ہو جائے گی۔معلوم نہیں کس عالم میں سرسید نے یہ مشورہ مولوی صاحب کو دیا تھا۔اس لیے کہ جب سے اب تک دیکھنے میں یہی آرہا ہے کہ یہ مشورہ اب صلائے عام بن چکا ہے، اور یارانِ نکتہ داں اس ادارے کی آبروریزی اور بیخ کنی کر کے زیادہ سے زیادہ اور بڑے سے بڑا نفع جس طرح کما رہے ہیں وہ کوئی راز نہیں ہے۔

نیت بخیر ہو اور عقلِ سلیم ساتھ دے تو علی گڑھ کا درجہ پہچاننا مشکل نہیں ہے۔علمائے کرام اور دوسرے حضرات از راہِ حقیقت پسندی اس کا تصور فرمائیں کہ علی گڑھ موجود نہ ہوتا تو ہندوستان میں پچھلے سو سال میں ہم کہاں اور کس حال میں ہوتے۔تعجب ہے ہم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ کچھ دنوں سے علی گڑھ جن آزمائشوں سے گزر رہا ہے اور جس جس طرح اس کی آزادی اختیار و اقتدار کی کتر بیونت ہوا کی ہے وہ کیوں ہے؟ کیا یہ سب اس ادارے کی غیر معمولی اہمیت کی دلیل نہیں؟

غالباً علی گڑھ کے مخالفین سرسید کے اس بیان کو دور از کار نہ سمجھتے ہوں کہ انھوں نے سلاطینِ دہلی کی اولاد کو پیٹ پالنے کے لیے گھاس چھیلتے اور بیچتے دیکھا یا سنا تھا۔ایسے میں سرسید نے علی گڑھ کے وسیلے سے ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی کو جس طرح مستحکم کیا اور معتبر بنایا وہ سرسید اور علی گڑھ دونوں کے ان گناہوں کا کفارہ ہے۔اگر کفارہ سے بہت زیادہ نہیں جو ان کے مخالفین آج تک ان پر عائد کرتے چلے آرہے ہیں۔رہا یہ اعتراض کہ علی گڑھ نے کلرک اور کاسہ

لیس پیدا کیے اور کرتا رہا۔ اس کا جواب تو یہ ہے کہ علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ کلرکوں اور کاسہ لیسوں کی تعداد میں ان مخالفین اور ان کی اولاد اور اعزا نے بھی کچھ کم اضافہ نہیں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی قوم اس وقت تک نہ اپنی حفاظت کرسکتی ہے نہ کوئی اہمیت حاصل کرسکتی ہے جب تک ملک کی خوش حالی اور خوش انتظامی کی ہر جہت اور ہر سطح پر مناسب حد تک اور بامقصد اس کو دخل نہ ہو۔ کلکتہ کے سرآموتوش مکرجی کی گراں مایہ شخصیت اور اعلیٰ خدمات سے کون نہیں واقف ہے۔

اس زمانہ میں انگریزوں کی کوران سے دبتی تھی۔ بنگال اور باشندگانِ بنگال کی قومی اور ملکی زندگی کو انھوں نے جس طرح آراستہ اور استوار کیا اور ملک کی اعلیٰ تعلیمی و علمی اسکیم میں ان کی فراست کا جو قیمتی حصہ رہا ہے وہ ہم سے آپ سے کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی پر بھی جس کے وہ تقریباً دوامی وائس چانسلر مانے جاتے تھے یہ الزام لگایا گیا کہ وہ کلرکوں کی تعداد میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ سرآموتوش نے اس اعتراض کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون ''ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد'' جو فکر و نظر کے کسی شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

جب روزی کمانے کے دوسرے دروازے تقریباً بند ہوں۔ حکومت بدیسی اور جبری ہو، ملک کی اکثریت و اقلیت کے درمیان تعلقات مفاہمت کے اتنے مغائرت نہ ہوں جتنے مغائرت کے اور تعلیم و معیشت دونوں میں غیر معمولی عدم توازن ہو اس وقت حکومت کی چاکری کے سوا چارہ نہیں۔ مسلمانوں کی بہت سی معذوریوں اور محرومیوں کی تلافی انگریزی حکومت میں چھوٹی بڑی ملازمت مل جانے سے ہوئی۔ اس سے سہارا پا کر انھوں نے اپنی گری اور گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا اور سدھارا۔ غدر کے بعد آزادی پانے کے دنوں تک ہندستانی مسلمانوں کی تقدیر و تاریخ کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ سرسید علی گڑھ تحریک اور ان دونوں کے سب سے بڑے سربراہ کار لیفٹننٹ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نہ ہوتے تو آج مسلمان کہیں کے نہ ہوتے۔ تعجب ہے جس گناہ کے مرتکب خود محتسب اور اس کے اہلِ شہر ہوں اس میں علی گڑھ کو مبتلا رہنے کا الزام کیوں دیا جاتا ہے۔ کاش آج بھی ہم کو کاسہ لیس ہی کی حیثیت سے کچھ ملازمتیں جہاں تہاں مل جاتیں اور ملا کرتیں۔

سرسید نے علی گڑھ کو مذہب کے افہام وتفہیم یا اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے نہیں قائم کیا تھا۔ وہ قوم کو مغربی طرز، فکر و عمل سے آشنا کرانا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر بدلے ہوئے حالات میں یکسر معذور، منکوب و مقہور مسلمان عزت اور فراغت کی زندگی نہیں بسر کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زمانہ کا جو رُخ تھا اس پر پس ماندگی اور درماندگی سے نہ دنیا بنتی تھی اور نہ دین۔ انھوں نے وہی کیا جو 'سوار اشہب دوراں' ہر زمانے میں کرتے آئے ہیں۔ یعنی زندگی اور زمانے کے تقاضے مذہب و اخلاق کے تقاضے کس طرح اور کس حد تک ایک دوسرے سے قریب تر اور ایک دوسرے کے لیے مفید تر رکھے جا سکتے ہیں۔ شروع سے اب تک اسلام اسی عمل اور ردّ عمل سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور آئندہ نسلوں تک پہنچتا رہے گا۔ اس سے مذہب کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ مذہب خدا کا دیا اور بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا انسان ہی کے لیے ہے اور انسان ہی یہ حوصلہ رکھتا ہے کہ بالآخر وہ دنیا کو اس سے بہتر حالت میں خدا کو واپس کرے گا جس میں اس کو وہ سونپی گئی تھی۔ سرسید اور ان کے ساتھی ایسے ہی مسلمان تھے۔ ہم آپ بھی ہوں تو قابلِ عفو ہیں لائقِ تعزیر نہیں۔ بحیثیت مجموعی سرسید اسلام کے حلقہ بگوش اور مسلمانوں کے خیر اندیش تھے جہاں تہاں ان میں کوئی خامی نظر آئے تو اسے اچھالنا یا اس انکشاف پر اس طرح فخر کرنا کہ اس سے خود ہماری کمزوریوں کو سندِ جواز ملتی ہے اور بخش دیے جائیں گے بہت بڑی بھول ہے۔ ممکن ہے خدا ان کمزوریوں کو بخش دے لیکن اس سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ شاید خدا کی مخلوق نہ بخشے۔

مذہب سے زیادہ مذہبی ہونے والے دوستوں اور بزرگوں اور خود آپ عزیزوں سے اس مسئلہ پر خاص طور سے غور کرنے کی درخواست کروں گا وہ یہ کہ دوسرے مذاہب کے خلاف دنیا کا آخری مذہب ہونے کی بنا پر اسلام کو سب سے بڑا انقلاب پذیر اور انقلاب انگیز ہونا اور رہنا چاہیے۔ وہ ایسا مذہب ہے جو زمانے سے سمت و رفتار بھی اختیار کرتا ہے، اور اس کو سمت و رفتار دیتا بھی ہے۔ زمانہ کبھی مسلمان (مردمومن) کا مرکب ہوتا ہے اور کبھی اس کا راکب۔ دنیا کا جو ڈھنگ ہے اور ہم سے آپ سے مشورہ لیے یا ہم کو مطلع کیے بغیر وہ جس طرح اور جن نامعلوم محوروں پر گھومتی اور پلٹے کھاتی رہتی ہے اور رہے گی، اس میں ہمارے آپ کے صرف مذہبی

ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ مذہب نہ پیشہ ہے نہ میراث۔ وہ آئینِ حیات ہے۔ نظری اور عملی دونوں اعتبار سے ہم کو مذہبی ہونے کے ساتھ حقیقت پسند بھی ہونا اور رہنا پڑے گا۔ ایسی حقیقت پسندی نہیں جو کام جوئی یا جبر و کراہ کی لائی ہوئی ہو بلکہ وہ حقیقت پسندی جس کا حرکی اور حسین تصور اقبالؔ نے دیا ہے۔

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بے تابے

اس طور پر مذہب، پابندی اور ذمہ داری ہی نہیں دل نوازی اور دردمندی بھی ہے۔

اسلام آئیڈیلزم بھی ہے اور حقیقت پسندی بھی۔ ڈرتے ڈرتے یہ بھی کہوں گا کہ معلوم یا نامعلوم تمام صفات کے علاوہ یہ صفات خود باری تعالیٰ کی بھی ہیں۔ اسلام اپنے کارواں کو ہمیشہ حقیقت پسندی کی وادی سے سرگرم رکھتا اور رکھتا آیا ہے۔ حقیقت پسندی سے محروم رہ کر آئیڈیلزم بے برگ و ثمر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح حقیقت پسندی بغیر آئیڈیلزم کے ابن الوقتی اور موقع پرستی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اسلام کو آخری مذہب اور ہر زمانے کا مذہب نہ قرار دیا جاتا۔ مذہب کے بارے میں سرسید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی بنا پر سرسید اور علی گڑھ کو موردِ الزام قرار دیتے وقت اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اسلام کے عقائد اور کلام پاک کے احکام کی ہر زمانے میں ہر طرح کے ذوق، ذہن اور رجحان رکھنے والوں نے جس طرح تعبیر و تلقین کی ہے یا بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر ترجمہ کیا ہے یا تفسیر لکھی ہے، وہ خود اس امر کی شہادت ہے کہ اسلام وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی دعوت دیتا ہے۔ جب سے کلامِ پاک نازل ہوا اس وقت سے آج تک شاید ہی ایسی کوئی کتاب ہو جس کی اتنی تفسیر لکھی گئی ہو جس کی اتنی تعبیر یا تبلیغ و تصدیق کی گئی ہو جتنا کلامِ پاک کی۔ بایں ہمہ اس میں ایک نقطہ اور اعراب کی نہ تحریف ہوئی نہ اصلاح نہ حذف و اضافہ نہ اس کی تعلیم و تفہیم کے موثر اور مقبول ہونے میں کوئی فرق آیا۔ اسلام ایک کھلی ہوئی عالم گیر دعوتِ حق ہے۔ اس لیے ہر خطہ و قریہ کے باشندوں کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور جن مخصوص اور گوناگوں حالات کے ماتحت زندگی بسر کرتے

ہوں ان سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بن سکیں۔ اس سے بدگمان یا برہم نہیں ہونا چاہیے کہ قرآنِ کریم یا حدیث شریف کے احکام کی کس نے کیا تاویل کی۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ اسلام کے حرکی اور دوامی ہونے کی نشانی ہے۔ مذہب و اخلاق کی دستگیری و رہنمائی کے بغیر مادی ترقی انسان کے لیے کھلا ہوا خطرہ اور خسارہ ہے اور ہمیشہ رہا ہے جو آج بھی ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح مذہب و اخلاق کو دینوی ترقی کا منافی یا اس کے راستے میں حائل سمجھنا اور بتانا بھی قرین عقل وصواب نہیں۔ اس کی مثالیں بھی چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اسی لیے ہر کاشت کار کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کو جو آراضی جس آب و ہوا میں میسّر ہے اس میں کامیاب کھیتی کے لیے کن مادی اور دینوی امور کی پابندی لازم آتی ہے۔

یہاں نہیں تو کہیں اور یہ بات بھی ضرور یاد رکھیے گا کہ دنیا کے موجودہ بحران کا سبب یہی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ دفعتاً آبادی پھٹ پڑی۔ آبادی کو ہم قابو میں نہ لا سکے۔ علوم کو ہضم نہ کر سکے۔ یہ خطرہ معمولی نہیں ہے جس سے سارا جہاں دوچار ہے جن کا ماتم سب کرتے ہیں مداوا کوئی نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے جن حالات میں جتنے دنوں سے زندگی کو جس میں امانت عظمیٰ یا وراثتِ کبریٰ کا امین بنانے اور بنائے رکھنے کی کوشش کی ہے اس سے ایک معمولی شخص بھی اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے کہ مذہب کا تصور کسی طرح فریب دینے یا فریب کھانے کا نہیں رہا ہے۔ اس لیے کہ جب کبھی انسان اس غلط فہمی کا شکار اور اس کی لائی ہوئی قباحتوں سے دوچار ہوا اس کو مذہب ہی کی دی ہوئی روشنی اور رہبری کا سہارا لینا پڑا اور کون نہیں جانتا کہ ہر تعمیر و تخلیق کا سرچشمہ مذہب ہی رہا ہے خواہ وہ تعمیر و تخلیق کسی نام سے کسی وقت آئی ہو۔

عزیزو!

صورت حال ایسی معلوم ہوتی ہے کہ بڑھتی ہوئی دنیا کے جو تقاضے ہیں اور جیسی کہ اس کی سمت و رفتار اور رہے گی اس میں مذہبی قیود کو دینوی تقاضوں پر اس طرح عائد کرنے کی کوشش کرنا کہ موخرالذکر کا سدباب ہو جائے یا وہ کلیتہً ہمارے معیار اور منشا کے مطابق ہونے لگیں، حقیقت پسندی نہ ہوگی۔ اس لیے اس کی کامیابی مشکوک ہے۔ جیسا کہ اب تک دیکھنے میں آرہا

ہے جن حالات وحوادث کا سامنا ہے ان کی اصلاح اور ان کو اعتدال پر رکھنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم ایسے دینوی تقاضوں کو حتیٰ الوسع مذہب کے وسیع اور وسیع تر افق میں دیکھیں اور پرکھیں اور اس پر احتیاط و اعتدال سے عمل کریں نہ کہ مذہب کے نسبتاً تنگ حدود اربعہ میں نیز مذہب سے اتنا احتساب اور تعزیر کا کام نہ لیں جتنا احترام انسانیت کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ احتساب اور احترام کے اس امتیاز کو وہ حضرات نظر انداز نہ کریں گے جو دین اور دنیا کے درمیان ویسی ہی ایک دیوار قائم کرنا چاہتے ہیں جس سے برلن مشرقی و مغربی جرمنی میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ہم کو کسی حال میں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ دنیا کا رجحان شروع تہذیب سے پھیلنے اور آگے بڑھنے کا رہا ہے، سمٹنے کا نہیں۔ بیسویں صدی میں اس عمل کی رفتار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اندیشہ یا امید ہے کہ بڑھتی ہی جائے گی۔ یہ اندیشہ کہ سائنسی و میکانکی اور مادی ترقی اس حد تک پہنچ جائے گی کہ مذہب و اخلاق کا کوئی پُرسانِ حال نہ رہ جائے گا صحیح نہیں ہے۔ حال کے طرح طرح کے انکشافات کی مانند بلکہ ان سے زیادہ انقلاب آفریں اور طمانیت قریں ایک اور انکشاف سے بھی ہم آپ باخبر ہو چکے ہیں۔ وہ یہ کہ طبعی اور حیوانی تقاضے جتنے قوی ہوتے ہیں ان سے کسی طرح کم قوی اور ناگزیر اخلاقی یا مذہبی تقاضے نہیں ہوتے۔ ان انکشافاتِ حقیقت پر ایمان لاکر ہم کسی پر احسان نہیں کرتے اپنی عافیت اور عاقبت بخیر ہونے کی خاطر اس کی تعمیل کرنے پر مجبور ہیں۔ سائنس کے ایک بہت بڑے فاضل کا قول ہے جسے ہمارے عالموں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ مادے کے بارے میں ہم اتنا جان گئے ہیں کہ اس کی طرف سے کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا۔ آپ کو آئن اسٹائن کا یہ قول بھی یاد ہوگا کہ تمام انسانی مساعی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ کہاں تک انسان کی تقدیر کو بہتر و برتر بنانے میں معین ہوتی ہیں۔

عزیزو!

اس وقت مسلم یونیورسٹی اردو زبان اور جان مال و آبرو کے مسائل جس طرح ہمارے تردد اور تشویش کا باعث بنے ہوئے ہیں اور جس طرح دستورِ حکومت کی حدود میں رہتے ہوئے اور ملک کے دیے ہوئے آئین کا سہارا لے کر واسطہ دے کر کم و بیش پچیس سال سے ہر جارحانہ اقدام سے دور رہ کر ہم ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں وہ آپ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں ان لوگوں سے

بھی جو ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ان مسائل کے تصفیہ اور بنیادی حقوق کے تحفظ و ترقی پر ان اقدار کا انحصار ہے جو ہم کو بجا طور پر بہت عزیز ہیں اور کون ایسا ہے جو اپنی دانش گاہ اپنی زبان اور شعر و ادب اور حفظِ ناموس جان اور مال کا حق دار اور خواستگار ہوگا۔ زیادہ دن نہیں گزرے ملک کی پچیس سالہ آزادی کا جشن ملک کے ہر چھوٹے بڑے نے کس فخر اور خوشی سے منایا کیسی کیسی ہمہ جہتی ترقی اور نام وری کی باتیں دیکھنے اور سننے میں آئیں۔ ایسی جو شاید ہی دنیا کے کسی نو آزاد ملک کو اتنی قلیل مدت میں نصیب ہوئی ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ان تین امور کا نقشہ دیکھ کر جو اوپر بیان کیے گئے بڑی حیرت اور عبرت ہوئی کہ جمہوریت اور سیکولرزم کے شجر کے کتنے پھول اور پھل کس طرح اوروں کی طرف پھینکے گئے لیکن 'خانہ بر انداز چمن' سے ہم کو کچھ بھی نصیب نہیں ہوا بلکہ جو میسر تھا وہ بھی کیا کہیے کہ کیا ہوا۔

وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

مسلم یونیورسٹی ایک ایسی اقلیت کا ورثہ ہے جو اوسط درجہ کے ملکوں کی اکثریت سے تعداد میں زیادہ اور تہذیب میں برتر ہے۔ اس تعداد اور رتبے کے باشندوں کو آپ ریاضی کے حساب سے چاہے جہاں رکھ دیں لیکن تاریخ اور تہذیب کے دیے ہوئے امتیازات کے رو سے ان کو اونچا ہی مقام دینا ہوگا۔ اس بڑی اقلیت کا ظہور اس ملک میں ہوا۔ یہیں وہ پھولی پھلی اور جیسا کچھ اس سے ممکن ہو سکا اس ملک کی نام وری اور خوش حالی کے کاموں میں بیش از بیش حصہ لیا اور اس میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا۔ ملک کا دستور واضح اور صریح الفاظ میں اقلیت کی زبان، شعائر و مذہب و اخلاق کے تحفظ اور احترام کی ضمانت دیتا ہے۔ اس طور پر حق پہنچتا ہے کہ وہ ان سہ گانہ امور کی حفاظت اور سالمیت کی حکومت سے درخواست کرے اور اس سے تلافی کی امید رکھے۔

عزیزانِ گرامی!

جس 'خضرِ بے برگ و ساماں' اور 'سفرِ بے سنگ و میل' پر نکلا تھا۔ آپ نے ساتھ دے کر اسے میرا کارنامہ بنا دیا ہے خواہ آپ پر کچھ ہی نہ گزر گئی ہو۔ ایسے مجبور و مجہول کی رفاقت جیسا کہ میں ہوں نوجوانوں کے لیے آسان نہیں۔ لیکن کیسے کہوں کہ ان کے شایانِ شان بھی نہیں۔ اپنے طلبا سے اپنے لیے ایسا تعاون و تکریم جتنا حوصلہ افزا اور حوصلہ بخش ہو سکتا ہے اس کا

مجھے پورے طور پر احساس ہے۔ ایسا اور اتنا احساس جس کا اظہار میرے لیے آسان نہیں ہے۔ آپ کی اقبال مندی کی دعا مانگتا ہوں۔

عزیزو!

کسی قوم، ملک اور قوم کے کردار اور اس کی تاریخ و تہذیب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اچھے اور بڑے شاعروں کے کلام کا مطالعہ شوق و شغف سے کیا جائے۔ ان کا کلام قوم کے مزاج کا مقیاس اور ذہن و ذوق کا معیار ہوتا ہے۔ جس قوم، ملک اور شعر و ادب میں اعلیٰ پایہ کے شاعر نہ گزرے ہوں گے وہ جریدۂ عالم پر اپنے دوام کا نقش ثبت نہیں کر سکتے۔ اردو کے ایسے شعرا میں غالبؔ، حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ ہیں۔ یہ کوئی امر اتفاق نہیں کہ وہ ایسے ہیں۔ وہ جس دور سے گزرے ہیں اس میں ایک عظیم تہذیب کے سقف و ستون گر رہے تھے اور اس کی جگہ ایک اجنبی لیکن قوی اور وسیع تر تہذیب بڑی تیزی لے رہی تھی۔ ہمارے یہ شعرا قدیم اور جدید دونوں تہذیبوں کے خوب و ناخوب سے باخبر تھے۔ اس لیے کہ ایک کے زائیدہ اور دوسری کی زد میں تھے۔ ان کا ردِّعمل دردمندانہ اور دانش مندانہ تھا۔ اظہارِ خیال کے لیے ان کو اعلیٰ تہذیبوں اور زبانوں کی بڑی جامع اور نمائندہ زبان اردو ہی تھی جس نے ان کی محبت اور امید و حوصلہ سے بھرے ہوئے جذبات اور خیالات کو دلوں میں اس طرح اتار دیا جو صرف پیغمبرانِ مرسل اور شاعرانِ مرسل دونوں کے حصے میں آیا ہے۔ بذاتِ خود میں پیغمبروں ہی کو نہیں شاعروں کو بھی مرسل سمجھتا ہوں۔ ان شعرا کو اچھی طرح جانے پہچانے بغیر آپ اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اپنے شعر و ادب نہ اپنے مشن اور پیش آنے والے حالات و حوادث میں اپنے صحیح و صالح رول کا نہ احساس کر سکیں گے نہ اس کو سمجھ سکیں گے۔ ایسے شعرا کے بغیر اُمتیں گونگی، بہری و بے بصر اور بے عمل رہ جاتی ہیں۔ ان کی تاریخ کو کتبۂ مزار کی بھی حیثیت نہیں حاصل رہ جاتی۔

میں آپ کو ان لوگوں میں نہیں سمجھتا جو اپنے ماضی کو بھول چکے ہیں۔ ان لوگوں میں بھی شمار نہیں کرتا جو ماضی کے روضہ خواں ہو کر رہ گئے ہیں۔ یا جن کا ماضی آج یا کل کے فساد اور فشار سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نہ ان کو ہدایت دے سکتا ہے نہ ان کی رہبری کر سکتا ہے۔ ایسے افراد یا جماعت حالات کی شکار ہو سکتی ہے، ان کو سدھار نہیں سکتی۔ ماضی پر فخر کرنا لیکن اس کی ذمہ داریوں

سے بچنا غداری نہیں تو نکما پن ہے۔ایسا تو نہیں کہ ہم اس کا شکار ہوں اسے جلد سے جلد ہمیشہ کے لیے ترک کر دینا چاہیے۔اس کو 'خسران مبین' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زیادہ دن نہیں گزرے غالب کا صد سالہ جشن، عالم گیر پیانے پر منایا جا چکا ہے۔ اس میں علم وعقیدت کے جتنے اور جیسے بے شمار نذرانے شعروادب کے مشاہیر نے پیش کیے وہ یقیناً آپ کے ذہن میں تازہ ہوں گے۔اس لیے غالب کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔

راقم السطور اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو :''نظام اردو خطبات (غالب کی شخصیت اور شاعری) جشن صد سالہ غالب 1969ء شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

سرسید نے علی گڑھ تحریک کو بروئے کار لا کر جیسے مایوس کن اور اندیشہ ناک حالات پر قابو پانے کی کامیاب کوشش کی، اس سے ہم آپ بخوبی واقف ہیں۔یہ ایک ایسا تاریخی، انقلاب آفریں اور تعمیری کارنامہ تھا جو اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ میں کم ہی نظر آئے گا۔حالؔی سرسید کے سچے اور گہرے رفیق، نام ونمائش سے دور بڑے برگزیدہ انسان اور شخصیت تھے۔بعض امور میں حالؔی اپنے مرشد سے کسی طرح کم معظم نہ تھے۔سرسید کی مساعی کو مقبول بنانے اور مضبوط کرنے میں حالؔی کے کلام اور کردار کو بڑا دخل ہے جیسے سرسید کی ہمہ گیر اور کبھی کبھی اصلاحی سے آگے بڑھ کر انقلابی سرگرمیوں کو اپنی خاموش موجودگی اور دردمندی سے مقبول، مفید اور گوارا بناتے رہتے ہوں۔

حالؔی نے شاعری کے تمام لوازم کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل کو اس طرح سدھارا، سنوارا اور اس کی تطہیر کی اور ایسی جہت، لب ولہجہ اور ترک وقبول کی صلاحیت بخشی اور سب پر فوق اور سب سے مشکل یہ کہ اس کے ایسے نمونے پیش کیے کہ ایک بے راہ اور بدنام صنفِ کلام اردو شاعری کی آبرو بن گئی۔کوئی پیغمبر معتبر خلفا کے بغیر اپنے مشن کو مفید، مقبول اور مستحکم نہیں کر سکتا۔ سرسید کے ایسے خلفا میں حالؔی کا رتبہ بہت بلند ہے۔اگر دہلی اور لکھنؤ کے زوال پر غالبؔ کا ظہور نہ ہوتا اور حالؔی، اکبر اور اقبالؔ نے اردو شاعری کے سفینہ کی ناخدائی اپنے ہاتھوں میں نہ لی ہوتی تو اردو اور اردو تہذیب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا۔ان باکمالوں کی شاعری نے اردو کو خاص و

عام کے دلوں میں اس طرح جاگزیں کر دیا کہ آج بھی جب کہ اردو ہر طرح کی عداوت اور ہر سطح سے مخالفت کا شکار ہے۔ اس کی ساکھ اور شہرت میں فرق نہیں آیا ہے۔ میرے اس خیال سے آپ شاید اختلاف نہ کریں کہ ملت کی تاریخ و تہذیب کی جیسی دل دوز، دل افروز اور لازوال ترجمانی اور وکالت حالی اور اقبال نے کی ہے اس کی مثال عربی اور فارسی شعر و ادب میں بھی نہ ملے گی جن کی اردو خوشہ چین رہی ہے۔

ہندوستان کی ریاستی زبانیں دوسرے اسالیب کلام کے علاوہ جب تک غزل کے رموز و علائم اور انداز و آداب اختیار نہ کریں گی اس وقت تک شاید ان کو وہ قبول عام نصیب نہ ہو جس کی وہ خواہش مند اور مستحق ہیں۔ اس کے لیے صدیوں کی اس گوناں گوں تہذیبی ثروت کو بر سر کار لانے کی ضرورت ہوگی جس کے بغیر انسان کا ذہن اور ذوق نہ تازگی پاتا ہے، نہ توانائی نہ تسکین۔ ملک کی متعدد و مختلف زبانوں کے اکابر نے اس مسئلہ پر غور نہیں کیا ہے کہ جب تک وہ ملک کی دوسری زبانوں سے رابطہ پیدا کر کے ہندستانی پیمانے پر اپنی علاحدہ علاحدہ محدود و محصور زبانوں کو ترقی دینے کا حوصلہ نہ کریں گے وہ مقصد حاصل نہ ہوگا جو ان کے پیش نظر ہو یا نہ ہو۔ زبان اور ملک کے بہترین مقاصد کے لیے ضروری ہے، یہ کچھ غزل پر موقوف نہیں ہے بلکہ جب تک ان زبانوں میں غالب، حالی، اکبر اور اقبال کے قد و قامت اور وزن و وقعت کے شعرا پیدا نہ ہوں گے۔ متعدد اور مختلف ریاستی زبانوں میں وہ کشش، توانائی، وسعت اور قومی شعور و شعار میں وہ شائستگی اور بلندی نہ آئے گی جس پر قائم کی نجات اور نام وری کا انحصار ہوتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ ریاستی زبانیں اور ان سب پر محیط اور ان کی محافظ ہندی زبان و ادب، ملک کے مشترک اعلیٰ اقدار اور اخلاق و مذہب کی برگزیدہ ہستیوں کی تعلیم، خدمات اور اعلیٰ روایات کو اپنے عظیم شاعروں کے کلام میں اس طور پر پیش کرے جس طرح حالی اور اقبال نے کیا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے مشاہیر کے کارناموں کی بازیافت اور اعلیٰ روایات کا احیا نہیں کر سکتیں۔ کام مشکل ہے لیکن کم نظری کا نہیں ہے۔

اردو شاعری میں حالی اور اقبال دو ایسے بڑے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے عورت کی عفت کے تحفظ اور ملت کی اساس عظمت کی محکمی کی تائید و تصدیق میں اپنی پوری صلاحیت

شعری و شاعری اور دل سوزی سے کام لیا ہے۔ اردو شعرا نے بالعموم اپنے کلام میں عورت کا نقشہ جس نازیبا طریقہ سے پیش کیا ہے وہ کسی معاشرے کی فضا اور تقاضوں کے مطابق ہو یا نہ ہو، شرفائے ادب کے نزدیک قابلِ معافی نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک عورت کی حرمت اور تکریم کا تعلق ہے اقبالؔ اور حالیؔ کے پایہ کا شاعر اردو ہی نہیں فارسی اور عربی شعر و ادب میں بظاہر نظر نہیں آتا۔ رسول اکرمؐ کی بعثت سے پہلے عرب میں نوزائیدہ لڑکیوں کے ساتھ جس شقاوت و سفاکی کا سلوک کیا جاتا تھا اس کا سدّ باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور عورت کے تحفظ و احترام اور اس کے حقوق کو ملحوظ رکھنے کی مسلسل تلقین اور تاکید فرمائی۔ اس کے بعد عورت کی حمایت میں ہمارے انہی دونوں عالی گہر شعرا حالیؔ اور اقبالؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ شاید کسی دوسری شریعت میں بھی عورت کے احترام کی ایسی تاکید نہ ملتی ہو جیسی کہ دینِ متین میں۔ شعر و ادب میں شاعر اور ادیب کی گراں مائیگی کا مقیاس و معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے کام اور کلام میں عورت کو کیا اور کہاں جگہ دی ہے۔

ڈاکٹر بجنوری نے ہندوستان کی دو ہی الہامی کتابیں مانی اور بتائی ہیں۔ ایک وید مقدس دوسری دیوانِ غالب۔ یہ مقولہ جتنا برجستہ اور چونکا دینے والا ہے اتنا قرینِ صحت اور قابلِ قبول نہیں ہے۔ اچھے مبالغہ کا یہی کرشمہ ہوتا ہے۔ حالیؔ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مسدس اصطلاحی نقطۂ نظر سے رزمیہ نہ ہوتے ہوئے بھی اردو کی اعلیٰ نظموں میں رزمیہ کے حدود سے سب سے قریب ہے۔ اردو میں اعلیٰ پائے کی نظموں کے چشمے اکثر مسدس ہی کی گہرائیوں اور پہنائیوں سے برآمد ہوتے ہوئے معلوم ہوئے، مسدس کے اکثر بند، اعلیٰ ڈرامے کا مواد اور جواز فراہم کرتے ہیں۔ آپ میں جو اصحاب عالمی رزمیوں اور اعلیٰ ڈرامے کے اسکالر ہوں گے اور اسلام سے قبل عرب کی حالت رسولِ کریم صلعم کی ولادت اور بعثت اسلام کے مشن، علم دامن کی فتوحات اور آخر میں اس کی شکست و ریخت اور رُسوائی کا مطالعہ کیا ہوگا، وہ اس کی شہادت دیں گے۔

مسدس الہامی نہ ہوتے ہوئے مقدس ہے اور مقدس ہوتے ہوئے کتنا ارضی و انسانی، مسدس کی تراوش، ترنم اور اجمال و تفصیل شکوہ ہند، عرض حال بجنور رسولِ اکرمؐ، چپ کی داد اور

بیوہ کی مناجات میں ملتی ہے۔ ان نظموں میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں، جیسا لب ولہجہ اور زبان و بیان کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ سادگی کے اعجاز اور تاثیر کی کرامات سے کم نہیں۔ اس کی مثالیں پیش کرتا لیکن اس کے لیے صبر وشکر یا صرف صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوجوان اس کو کم ہی گوارا کرتے یا کر سکتے ہیں۔ اس لیے صرف دو بند کی طرف آپ کی توجہ مائل کرنا چاہتا ہوں:

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانب بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آئے تھے جس کی دینے شہادت

ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

شروع سے آج تک جتنے اور جیسے میلادنامے تصنیف کیے گئے ان میں کیا ہوتا ہے، عقل کی کمی، عقیدت کا دفور یا نیت کے فتور کے باعث ان کو کسی طرح اتنا پڑھا نہیں جاتا جتنا کہیں کہیں جلسے جلوس میں دکھایا جاتا ہے۔ یا اربابِ دل اور اربابِ قلم نے اس موضوع پر محبت اور انشاپردازی کے جیسے نوادر پیش کیے ہیں ان سب پر مسدس کے یہ دو مفہوم سیدھے سادے بھاری ہیں۔ تفصیل کو اختصار میں اس طور پر مقید کر لینے کا کیسا خداداد ملکہ حالی میں تھا کہ تفصیل کی خوبیاں اختصار میں خوب تر اور پائندہ تر ہو جاتی تھیں۔ یہی انداز اور فضا 'شکوہ ہند' اور 'عرض حال' میں ملتی ہے۔ 'شکوہ ہند' شکوہ ہونے کے علاوہ مرثیہ، رجز اور دعوت، جہد وعمل بھی ہے۔ ایسا مرثیہ اور رجز نہیں جس سے قوم میں افسردگی یا ازخود رفتگی آئے بلکہ ان میں امید اور عزم کی دعوت اور بشارت ملتی ہے۔ حالی نے نعت، مرثیہ، منقبت اور مناجات کی شاعری کو رسم وروایات یا کارِ ثواب کی شاعری سے علاحدہ اور بلند کر کے عملِ صالح اور سعیِ پیہم کی طرف موڑ دیا اور ذوق و ذہن کے اعلیٰ تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ اسی رجحان اور روش کو اقبال نے اپنے دور اور اپنی شاعری میں

نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ اردو شاعری میں جتنے اسالیبِ کلام ہیں ان میں بعض اعتبار سے غالباً سب سے مشکل اسلوب نعت کا ہے۔ اس میں اب تک میرے خیال میں گلستان کے دیباچے میں سعدیؔ، مسدس حالیؔ میں حالیؔ اور ارمغانِ حجاز میں اقبالؔ سے آگے کوئی نقشِ قدم نہیں ملتا۔ شاید دونوں نہ ملیں، 'مناجاتِ بیوہ' اور 'چپ کی داد' میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی مصیبت و محرومی، مہر و وفا، صبر و رضا کو ان سے بھی زیادہ دکھ درد سے محسوس کر کے حالیؔ نے ان کو تشفی اور انسانیت سے جس طرح پکارا ہے وہ اس درجہ دردناک اور ہر غم کی طرح رگ و پے میں اتر جانے والی ہے کہ اس کی مثال کم سے کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری ہے۔ آپ عزیزوں کو کسی اور ادب میں ملی ہو یا مل جائے تو اور بات ہے۔

عزیزو!

غالب کا ایک شعر ہے۔

با من میا ویزاے پدر فرزندِ آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

دوسرے اچھے اشعار کی مانند اس کو بھی کم سواد اور تنگ نظر لوگوں نے اپنے مشتبہ مقاصد کا آلہ یا آڑ بنا لیا ہے۔ اس کو نہیں دیکھتے کہ کس نے کس کے دین کو خوش نہیں کیا۔ صرف یہ فرض کر لینا کہ ہم فرزندِ آذر نہ سہی فرزندِ آدم تو ہیں۔ اس لیے آبا کے دین و مذہب کو ترک کر دینے یا اس کا مذاق اڑانے کے مجاز ہی نہیں بلکہ اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لیے مامور بھی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، آزر بت گر کے بیٹے یا بھتیجے تھے، لیکن اپنے عہد کے بہت بڑے پیغمبر بھی تھے۔ انھوں نے اس وقت کے فنا نصیب خداؤں کا جس طور پر انکار اور لافانی معبود کا انکشاف، اقرار اور اعلان کیا اسے عقیدہ اور مذہب کی تاریخ میں ایک لازوال عظیم حقیقت تسلیم کیا گیا ہے جسے کبھی جھٹلایا نہ جا سکے گا۔ حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم کی جس طور پر بے چون و چرا تعمیل کی اس کا خیال کیجیے تو انسان کے رتبے کی بلندی کا تصور گرفت سے باہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ خدا کی مرضی پاتے ہی بے تکلف آتشِ نمرود میں کود پڑے۔ اس کا اشارہ ہوا تو بیوی اور شیر خوار بچے (حضرت اسماعیلؑ) کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے

آئے۔ حضرت اسماعیلؑ سنِ شعور کو پہنچے تو حکم ہوا، لختِ جگر کی قربانی دو، فی الفور راضی اور آمادہ ہو گئے۔ باپ ہی نہیں فرزند (اسماعیل) بھی۔ پھر کعبے کی تعمیر کا فرمان ہوا۔ ''دنیا کے بُت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا'' جس کی طرف سر جھکا کر ہر مسلمان ہر نماز میں اپنے پیدا کرنے، یا پالنے، فرائض کی نعمت سونپنے والے اور آخر میں اپنی طرف بلا لینے والے کے حضور میں عبودیت اور تقدیس و تکریم کا نذرانہ لیے ہوئے لوٹ جاتا ہے۔ لیکن ہمارے اکثر نوجوان لکھنے والے یہ بالکل نہیں دیکھتے کہ حضرت ابراہیمؑ کا کیا درجہ تھا جس نے ان کو دینِ آبا سے انحراف کرنے کا مجاز کیا یا ان کے فرزند اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی کس نے سکھائے اور ہماری نئی نسل کو آدابِ فرزندی بجالانے کی بھی توفیق ہوئی یا نہیں۔

جہاں تک مسدس اور مقدمۂ شعر و شاعری پر تنقید کا تعلق ہے۔ دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ آج کل اکثر نوعمر لکھنے والے سب سے پہلے مغربی تنقید کے آئین و اصول اور مشرقی اندازِ طنز و تضحیک کے حربوں سے حاؔلی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اس کے جواز میں غاؔلب کی گواہی پیش کرتے ہیں کہ صاحب نظر کو دین بزرگاں کبھی خوش نہیں آیا۔ جس طرح فرزندِ آزر کو نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں آزر کے عہد میں اتنے فرزندانِ آزر تھے بھی یا نہیں جتنے آج دیکھنے میں آتے ہیں۔ حاؔلی کو اپنی زندگی میں لکھنؤ کے اربابِ شعر و سخن کی عدالت میں پیش ہو کر شعر و شاعری و تنقید کی جواب دہی کرنی پڑی تھی، شاید ہی معافی مانگنے کی بھی نوبت آئی۔ لکھنؤ اسکول کے یہ وہ ارباب سخن تھے جو شعر و ادب کے تیزی سے بدلتے ہوئے محرکات و تحقیقات کے سمجھنے کا نہ احساس رکھتے تھے نہ اہلیت صرف بندھے ٹکے سستے اور گھسے پٹے صنائع لفظی کی داد پر پنپتے تھے۔ معرکہ شرؔر و چکبسؔت کے دوران اور اس کے بعد شرؔر کے ہم خیالوں نے چکبسؔت اور ان کے اندازِ فکر کا جیسے بھونڈے الفاظ اور لب و لہجہ میں مذاق اڑایا اور اردو رسائل و اخبارات نے ان کو شہرت دی اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حاؔلی کو کیسے حریفوں سے سابقہ تھا۔ لیکن اب حاؔلی کے نکتہ چینوں کا اندازِ گفتگو علم، عمر، تجربہ اور عبادت کی برکت و ثروت سے جہاں تہاں بدلنے لگا ہے۔ حاؔلی اور سرسید کے زمانے سے ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ زندگی کیسے کیسے انقلابات سے گزری اور گزر رہی ہے لیکن ان دنوں کے دکھائے بتائے ادب اور زندگی کے راستوں سے باہر نہیں جاسکے ہیں۔

مغربی اصولِ تنقید کا علم حالؔی کو نہ براہِ راست تھا نہ مکمل، وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ جانتے بھی ہوں گے تو برائے نام۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے جن سے استفادہ کیا وہ مغربی تنقید کے آئین واصول میں کامل یا کافی دسترس رکھتے تھے۔ ان معذوریوں کو دیکھتے ہوئے حالؔی کی طبع رسا، خلوص، محنت، وسعت، معلومات، شعروادب کے مزاج سے واقفیت اور تنقیح طلب امور میں مقدمات کی صحیح ترتیب وتطبیق کا غیر معمولی درک ایسی صنعات ہیں جن کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ انھوں نے غالباً سب سے پہلے منظم طور پر اردو ادب کو انگریزی ادب کے بعض آئین وضوابط کی روشنی میں دیکھنے پرکھنے اور اس کو دیے ہوئے خطوط پر لانے، چلانے اور رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ حالؔی نے انگریزی تنقید کے چند سادہ اور سہل اصولوں کو لے کر اردو ادب کی روایات اور اسالیب کی جس طرح توضیح کی اور ان میں معنوی ربط دیکھا وہ اس قدر رفاضلانہ اور دل نشیں ہے کہ آج ہم بعض ان تنقید نگاروں میں بھی کم پاتے ہیں جو انگریزی اور اردو ادب دونوں کے شناور بتائے جاتے ہیں۔ حالؔی نے اردو کو صنعت نہیں سلیقہ اور زبان و بیان کو قواعد اور گرامر کا دیا یا بتایا ہوا نہیں بلکہ سچائی، سادگی اور سلاست کا حسن دیا۔ اردو زبان اور انشا کو جولب ولہجہ حالؔی نے دیا، میرا خیال ہے اس پر نظر ثانی کی شاید کبھی ضرورت نہ پیش آئے۔ اس لیے کہ وہ بنیادی ہے ضمنی اور وقتی نہیں۔

عزیزو!

آپ نئے لکھنے والوں کا اگر کوئی اور مقصد نہیں ہے تو اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ حالؔی کے بعد کتنے بے شمار شاعر اور ادیب گزرے اور موجود ہیں لیکن نظم ونثر میں شائستگی، سلاست وزن اور سطح کے جو نمونے حالؔی نے چھوڑے ہیں ان کی پیروی ہمارے تمام اچھے لکھنے والوں نے کی ہے۔ سادگی، شائستگی اور اختصار لکھنے اور کہنے کے بنیادی اصول ہیں۔ اردو نثر کو یہ صنعات حالؔی نے دیے ہیں۔ اس کی پیروی حتی الوسع حالؔی ہی کی دی ہوئی فضا میں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد لکھنے والے کو اختیار ہے جس وادی کا راستہ چاہے اختیار کرے۔ وہ کبھی گمراہ ہوگا نہ واماندۂ راہ۔ اردو شاعری اور ادب دراصل عبادت، ریاضت، خدمت اور بالآخر ان سب کا انعام ہے۔ غلط زبان، بے قابو جذبات اور ناشائستہ لب ولہجہ سے بچنا چاہیے۔ شعروادب فسق و

فساد کا آلہ نہیں ہے، گفتار اور کردار کا جمال و کمال ہے۔ اس حقیقت کو کبھی نہ بھولیے گا۔ ہر شخص شاعر اور ادیب نہیں بن سکتا خواہ اس کا قبیلہ کتنا ہی طاقت ور اور اس کی آواز کتنی ہی بلند ہو۔ نئی سے نئی اصطلاحات سے کبھی پرانے گناہوں کی نہ پردہ پوشی کی جا سکتی ہے نہ ان کے لیے سندِ جواز مل سکتی ہے۔

حالی کی مانند اقبال نے عورت کی دیرینہ مظلومیت و مصائب کو دور کرنے کی براہِ راست تحریک نہیں کی ہے۔ حالی کے زمانے میں عورت کی مجبوری اور گرفتاری جیسی ناگفتہ بہ تھی اس سے کہیں زیادہ اقبال کے عہد میں ان کی مختاری و آزادی ناگفتنی تھی۔ اس صورت کے پیشِ نظر اقبال نے عورت کے لیے امومت کا نصب العین اور اسوۂ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو قبول کرنے کی ہدایت اور وکالت کی ہے۔ اپنے کلام میں جابجا انھوں نے عورت کی آزادی میں گرفتاری اور نجات میں ناکامی کا بڑا موثر اور عبرت انگیز نقشہ کھینچا ہے۔ امومت اور اسوۂ زہرا کی تبلیغ ان کی نظموں میں جابجا جس طرح کی گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ کو اس کی یاد دلا دوں۔ مثلاً:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!

....

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیتِ خیر الامم

سیرتِ فرزند ہا از امہات
جوہرِ صدق و صفا از امہات

نیک اگر بینی اُمومت رحمت ست
زانکہ او را با نبوت نسبت ست
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است
سیرتِ اقوام را صورت گر است

....

اگر پندے ز درِ ویشے پذیری
ہزار امت بمیرد تو نمیری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

رموز بے خودی کے آخر میں اقبالؔ نے نوع کو امومت پر مبنی بتایا ہے اور مسلمان عورتوں کے لیے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو تین نسبتوں سے کامل قرار دیا ہے۔ (الف) نورِ چشم رحمۃ للعالمین۔ (ب) بانوئے مرتضیٰ مشکل کشا۔ (ج) مادرِ حسین سید الشہدا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی جن عظیم ہستیوں سے یہ اعلیٰ نسبتیں وابستہ ہیں وہ کسی بھی قوم کی عظیم ہستیوں سے منسوب ہو کر اس کی خواتین کے لیے اسوۂ کاملہ نہیں بن سکتیں۔ اسی طرح حالیؔ نے میلادناموں کے معیار و موقف کو بھی اپنے مسدس سے ایک نئی جہت اور رہنمائی دی۔

اقبالؔ نے شہادتِ حسینؓ اور مقامِ شبیری کو ایک تنگنائے سے نکال کر ایک حقیقت گیتی نورد بنا دیا۔ مقام شبیری کا یہ تصور اقبالؔ سے پہلے شاید کسی اور نے اتنے واضح اور دل نشین طور پر نہیں پیش کیا تھا۔ یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

....

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسمٰعیل

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

....

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

....

ایک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی ہے سرمایۂ شبیری

مرثیوں میں بالعموم سیدالشہدا کو منتخب اقربا اور رفقا کے ساتھ بتایا گیا ہے اور یہ صحیح ہے لیکن اقبالؔ نے پورے قافلہ حجاز میں حسینؑ کے نہ ہونے پر جس محرومی کا جس حسرت سے اظہار کیا ہے وہ مرثیہ میں سب سے پہلی نمایاں اور قابلِ قدر آواز ہے۔ جیسے ملت اور انسانیت کا ہر قافلہ حسینؑ کے بغیر بے جہت ہے اور بے مقصد ہے۔ جس حقیقتِ ازلی اور مقامِ شبیری کی طرف مولانا محمد علی جوہرؔ نے اپنے اس لازوال اور بے مثل شعر میں اشارہ کیا ہے، وہ بھی محمد علی ہی کے شایانِ شان ہے اور مرثیہ کے صحیفے میں بڑا اعالی مقام ہے۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

میرا ذاتی خیال ہے کہ شہادت حسینؑ کے طفیل اقبالؔ نے جو اجتماعی، اصلاحی، تعمیری اور ارتقائی کام لیا ہے اور اردو شاعری کو جو رُتبہ اور روشنی بخشی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

اردو شاعری کو فارسی سے مزیّن، مستحکم اور مالا مال کرنے کی سب سے پہلی کوشش غالبؔ نے کی۔ ممکن ہے اس کے اسباب میں ایک یہ رہا ہے کہ غالبؔ طبعاً غالی عجمی تھے اور فارسی کو فروغ دینا اپنی فضیلت وفرائض میں سمجھتے ہوں، یا طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا ان کے مزاج یا رجحان کے مطابق رہا ہو۔ یہاں اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ غالبؔ اگرچہ تاج کے

سائے میں پیدا ہوئے، سنِ شعور کو پہنچے شاعری بھی کی، لیکن ہندوستان کی سرزمین کے اس معجزۂ سنگ وخشت کا کوئی پرتو ان کے کلام میں نہیں ملتا۔ یہی نقشہ دلّی میں نظر آتا ہے جہاں ان کی ساری عمر گزری، وہاں کی عالی شان تاریخی عمارات اور کھنڈروں کا بھی ان کے کلام میں کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ غالبؔ کے عہد میں شعرا کی توجہ خارجی مناظر و مظاہر کی طرف بہت کم ہوتی تھی۔ یوں بھی جہاں غزل گوئی کا غلبہ ہو وہاں خارجی مظاہر و مناظر کی طرف خیال کم جاتا ہے۔

غالبؔ نے فارسی اردو کا جو آمیزہ تیار کیا تھا وہ سعدی اور حافظؔ کی فارسی سے اتنا متاثر ہو کر نہیں تھا جتنا بیدلؔ کے تتبع میں تھا۔ اس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر انھوں نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن یہ تحریک رائیگاں نہیں گئی۔ اس سے اردو کے حسب ونسب میں اضافہ ہوا، فارسی کی کلاسیکیت آئی اور اردو ایک عظیم تہذیب اور روایت سے بہرہ یاب ہوئی۔ اقبالؔ نے اردو کے اس مقام اور مرتبے سے وہ تمام فوائد حاصل کیے جو ان کی بے مثل جینیس کر سکتی تھی۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں فارسی سے جو کام لیا ہے اس سے اس امر کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری کی اونچی سطح پر فارسی کا کتنا اور کیسا دخل ہونا چاہیے۔ فارسی کی خوبیوں کو اقبالؔ نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں جس فنی کمال اور خداداد ذوق و ذہن سے منتقل کر کے اردو کو فارسی سے اور فارسی کو اردو سے نفع پہنچایا ہے وہ اقبالؔ کا ایک لازوال کارنامہ اور خدمت ہے جس کی مثال کسی اور زبان وادب میں مشکل سے ملے گی۔ باوجود اس کے کہ اقبالؔ کی مادری زبان نہ فارسی تھی نہ اردو۔ اقبالؔ نے اردو کو جس فارسی سے مربوط و محکم کیا وہ زیادہ تر ہندوستان کی ساختہ پرداختہ اور سعدیؔ اور حافظ کے کلام کی شیرینی، نغمگی اور تاثیر سے معمور تھی۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ مروجہ ایرانی شاعری اب اردو کو کچھ دینے کے بجائے اس سے کچھ لینے کی محتاج ہے۔

اردو میں خوب صورت فارسی ترکیبوں کی کمی نہیں ہے۔ بعض کے کلام میں تو یہ محاسن کے اظہار کے بجائے محاسن کی غمازی کرتے ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں یہ ترکیبیں پہلے سے ترشی ترشائی موجود نہیں معلوم ہوتیں۔ بلکہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے یہ خاص موقع، مفہوم، کیفیت یا

تصور کو ظاہر کرنے کے لیے وضع کی گئی ہوں اور جہاں آ گئی ہوں یا رکھ دی گئی ہوں وہاں سے علاحدہ ہو کر کسی اور خانے، نقشہ یا تال و سم میں موزوں نہ ہوئی ہوں۔ چنانچہ مفہوم سے قطع نظر، اقبال کے الفاظ اور ترکیبوں کو جس کسی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے کلام میں استعمال کیا اقبال کی آواز فی الفور پہچان لی جائے گی۔ اس لیے کہ اقبال یا کسی بڑے شاعر کی آواز اور لب و لہجہ کی کوئی دوسری آواز اور لب و لہجہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ بڑا شاعر اپنی آواز اپنے ساتھ لاتا ہے اور ساتھ ہی لے جاتا ہے۔ اس سے اقبال کے اس نظریے کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے کہ اکثر پورا شعر مخصوص الفاظ، ترتیب، ترکیب اور آہنگ کے ساتھ بیک وقت ان کے ذہن میں اترتا اور زبان پر آتا ہے۔ اردو کو فارسی سے آراستہ و استوار کرنے اور رکھنے کا بہترین اور آخری رول اقبال پر ختم ہو گیا۔ ایسی مشاطہ گری اردو کو اب شاید ہی نصیب ہو۔

اسلام کے عقائد، اقدار و روایات اس کے ائمہ و اکابر کے حسنات اور اس کے دیے ہوئے تاریخی و اخلاقی معظمات کا تعارف جس گہری عقیدت، فکر عالی اور غیر معمولی حسن بیان سے اقبال نے کرایا ہے اور جس عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے عالمی مسائل پر فیصلہ کن، حیرت انگیز اور دل کش پیرائے میں روایتی صنائع و بدائع کا سہارا لیے بغیر اقبال نے اظہار خیال کیا ہے وہ ان چھوٹی بڑی زبانوں میں شاید ہی نظر آئے جن سے خود اردو مرکب اور فیض یاب ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اقبال نے روایتی اور نیم جان تلمیحات و تشبیہات کو اپنے کلام کی صحت مند فضا میں جگہ دے کر ان کو ایسے پر و بال، تازگی اور توانائی بخشی کہ گذشتہ 50-40 سال میں اردو شاعری کی نئی سے نئی کروٹوں میں بھی جتنے طرح طرح کے رموز و علائم اختراع کیے گئے اور کلام میں لائے گئے ان میں سے کسی ایک کو وہ قبول عام نصیب نہیں ہوا جس کی توقع کی جاتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس ناکامی کا یہ ردّ عمل ہو کہ ہر نئے انداز کے ہر شاعر کو مجاز کر دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے رموزِ و علائم اپنے اپنے طور پر اختیار کر سکتا ہے۔ پہلے کبھی مبہم یا مہمل شعر کے بارے میں کہتے تھے کہ اس کا مطلب شاعر کے بطن ہی میں رہ گیا اب شعر ہی نہیں پوری نظم کا مفہوم شاعر کے بطن میں نہیں رہ جاتا بلکہ اس کی تلاش اس کے تنقید نگار کے بطن میں کرنی پڑتی ہے، اکثر ناکامی ہوتی ہے۔

شاعری میں شخصی و انفرادی رموز و علائم اختیار کرنے کی آزادی یا کج روی نئے انداز کے شعر وادب کی اہمیت وافادیت پر جس طرح اثر انداز ہو رہی ہے اسے کسی طرح امید افزا نہیں کہا جاسکتا۔ جیسا کہ دنیا کا طریقہ ہے۔ اکثر ایک لغزش دوسری سنگین تر لغزش کا باعث ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ شعر وادب میں من مانے رموز و علائم کی انفرادی آزادی نے من مانے خدا کو بھی قبول کرنے کی آزادی دے دی۔ اب کسی مذہب، اخلاق، مسلک، مشرب کے متفقہ خدا اور اس کے بتائے ہوئے اوامر ونواہی کی پابندی نہیں رہی۔ بلکہ ہر شخص نے اپنے لیے ایسے خدا وضع کر لیے ہیں جو اپنے احکام بندوں پر عائد نہیں کرتے بلکہ ہر بندے کی خواہشات نفس کی تعمیل و تکمیل کے فرائض ادا کرتے ہیں اور اپنے خداوندوں سے اس کی داد پاتے ہیں۔ ہمارے ایک مستند اور مقتدر شاعر اور معلم نے حال میں ایک اہم قومی تقریب کے افتتاح واحترام میں جو کلماتِ خیر کہے اس میں اس پر بھی زور دیا ہے، اور فخر کیا ہے کہ پرانے خدا نے نئے خداؤں کے لیے جگہ خالی کر دی ہے۔ ایسے خدا اور خداؤں کے لیے جو ہمارے جسم اور جنس کی بے لگام ترغیبات کا احتساب نہیں بلکہ انصرام کرتے ہیں اور جنس وجسم کی لذتوں کے حصول میں معین ہوتے ہیں۔ ایسے خداؤں کا انکشاف اب تک کسی عہد میں کسی نے نہیں کیا تھا جو اپنے بندوں کا خدا نہیں بلکہ خانہ ساز خداؤں کا بندہ ہو۔ عوام کی بے خبری اور خواص کی بے غیرتی سے ہمارے بعض مشہور شعرا کا اس طرح اپنی شہرت میں اضافہ کرنا کیسی عبرت ناک صورت حال ہے۔

ہم عقل و دانش کے کیسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں شرم ناک عادات اور امراض کا جواز مایۂ ناز اکابر کی شخصی و انفرادی زندگی سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے گناہوں کا جن کو ابتدائے تہذیب سے اب تک متفقہ طور پر اللہ اور انسان دونوں نے گناہ ہی بتایا اور سمجھایا ہے۔ جب جنسی میلانات سے آزادی کے ساتھ لذت یاب ہونے میں کوئی برائی نہ بتائی جاتی ہو بلکہ اس کو جائز قرار دیا جاتا ہو، تو کیا عجب مذہبی اور اخلاقی بندشوں کو غیر فطری یا غیر تہذیبی قرار دے کر اس کے ماننے والے کو مستوجب سزا بھی قرار دیا جانے لگے۔ معلوم نہیں ایسے بھی عافیت اندیشی سے کام لینے کی ضرورت پیش آئے گی یا نہیں۔

اہم عصری اور عالمی مسائل پر ماہرین ومبصرین نے بھی ایسے بے لاگ اور خاطر نشیں فیصلے نہیں دیے ہوں گے جیسے اقبالؔ نے اپنی مختلف معرکہ آرا نظموں میں دیے ہیں۔ یہ فیصلے اتنے برجستہ، مکمل اور موثر ہیں کہ قریب قریب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ معقولات ادب ہی نہیں بلکہ سماج، معاشرت اور سیاست سب کی ہدایت کے لیے شہ پارے اور شمع ہدایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کو یہ روایت اقبالؔ نے دی ہے جس کی مثال ملک کے دوسرے شعروادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب اردو یا کسی اور زبان کے شعرائے کرام یا مدعیانِ کلام ایسی ہی اور اتنی نظمیں لکھنے کا قصد فرمائیں گے۔ کسی شاعر کے کلام کی کامیابی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کے کتنے اشعار یا مصرعے یا فقرے زباں زد ہو گئے۔ اس بارۂ خاص میں جو امتیاز غالبؔ اور ان کے بعد اقبالؔ کو حاصل ہے اردو کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ نئی وضع قطع کی شاعری میں ایک کمی یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ اس کے اتنے بے شمار اور نو بہ نو شاعر کے ذخیرۂ کلام میں کہیں کوئی ایسا تازہ اور برجستہ فقرہ یا ٹکڑا نہیں ملتا جو عام طور پر لوگوں کو یاد رہ گیا ہو۔ ایسے اشعار، مصرعے اور فقرے ملتے بھی ہیں تو جماعت کے ان چند شعرا کے یہاں، جنھوں نے اب تک پرانے سانچوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور کلام میں تاثیر اور حسن پیدا کرنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے روایتِ راسخہ اور آئینِ پیشیناں کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان میں بھی مثال ایک ہی ملتی ہے اور وہ فیض احمد فیض کی ہے۔ میرے نزدیک ترقی پسند ادب کی ساکھ کو خواہ اسے اب کسی نام یا لقب سے موسوم کرتے ہیں دو افراد پر قائم ہے۔ شاعروں میں فیضؔ اور شخصیتوں میں سجاد ظہیر مرحوم پر۔

رسولِ اکرمؐ سے شیفتگی اور اسوۂ حسنہ کی پیروی ہم پر بمنزلہ فرائض عائد ہے نعت گوئی کی یہی شانِ نزول ہے۔ اس کو اردو شعروادب میں ایک مستقل اور نازک صنفِ سخن ہے۔ نعت کے آداب ملحوظ رکھنا اور شاعری کے گل وریحان سے اس کو آراستہ کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ تاوقتیکہ شاعر خود گرامی نہ ہو۔ نعت کے جیسے کڑے آداب ہیں اس کا اندازہ عرفیؔ جیسے شاعر کے اعترافات سے ہوتا ہے جو اپنی اور اپنی شاعری کی منزلت کے سامنے کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتا۔ نعتِ شہ کونین کے بارے میں بار بار اپنے کو یاد دلاتا اور خبردار کرتا رہتا ہے۔

عرفی مشتاب این رہِ نعت است، یا'' آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را'' لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور مذہب کی تعبیر و تلقین معمولی درجہ کے اشخاص کے ہاتھوں میں آتی گئی، نعت گوئی بھی معمولی درجہ کے شعرا کے حصہ میں آئی۔ جنھوں نے اس کو کھانے کمانے کا وسیلہ بنایا اور صرف کارِثواب جانا۔ انھوں نے شاعری کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا یا ان میں ان کو پورا کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس صنفِ کلام کے حسن اور عظمت کو حالؔی اور اقبالؔ نے خاص طور پر پہچانا اور اسے اتنا مشکل اور بلند کر دیا کہ آبروئے شیوۂ اہلِ نظر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔ یہ عشقِ رسولؐ ہی کا فیضان ہے کہ حالؔی اور اقبالؔ نے اپنے کلام سے اردو کے بیش تر اصنافِ سخن کی جن میں غزل کافی بدنام تھی، اس طرح تہذیب و تطہیر کی اور نئی جہت اور جہان بخشے کہ اردو زبان اور شاعری کی وقعت مدت دراز کے لیے متعین ہو گئی۔ عشقِ رسولؐ آئینِ ملت ہی نہیں تعبیرِ انسانیت بھی ہے۔

اعتراض یہ ہے کہ اقبالؔ مذہبی یا اسلامی شاعر ہونے کی بنا پر جدل و جدال یا تشدد اور خوں ریزی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ مثال میں وہ شعر بار بار دُہرایا جاتا ہے جہاں کبوتر پر باز کے جھپٹنے جھپٹ کر پلٹنے اور اس طرح خون کو گرم رکھنے کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ کسی شاعر کے مذہبی ہونے پر اکثر وہ لوگ اعتراض کرتے ہیں جو نہ مذہب سے واقف ہوتے ہیں نہ شاعری سے جو شخص مذہب یا شاعری میں کسی ایک سے محروم ہوگا وہ دوسرے سے بھی محروم ہو تو عجب نہیں۔ اس ضمن میں ایک اور بات بھی عرض کر دوں۔ ایک زمانے سے اقبالؔ اور ان کی شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ پہلے ان کی لے ہندستانی تھی، اس کے بعد حجازی ہو گئی۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ کوئی بڑا شاعر کبھی مقامی نہیں ہوتا۔ مذہبی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہوتا ہے۔ شاعر اپنے اپنے ابتدائی دور میں کیسا ہی رہا ہو اگر قلب و نظر کی کشود و کشاد ساتھ لایا ہے تو جلد یا بہ دیر اعلیٰ شاعری کی بے کراں وسعتیں نہ ملتیں تو وہ اتنے اور ایسے عظیم نہ ہوتے جیسے کہ ہیں۔ یہ بات نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ دنیا کو ہر بڑا شاعر خواہ وہ کسی ملک، مذہب یا مسلک سے تعلق رکھتا ہو نظر و خبر دونوں کے اعتبار سے ہر ملک مذہب یا مسلک کا شاعر بالفاظ دیگر آفاقی شاعر ہوتا ہے۔ یہ اس کا ثبوت بھی ہے کہ حقیقت کبریٰ یا قدرتِ کاملہ ایک ہی ہے اور ہر بڑا شاعر یہیں پہنچ کر قرار پاتا ہے

اور اسی کی تسبیح و تمجید کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی اپنی بساط کے مطابق اس حقیقت عظمیٰ کو کس نام سے پہچانتے اور پکارتے ہیں۔ سچائی کو سیاست کے دخل اور دجل سے بلند ہو کر تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن کیا کیجیے کہ:

پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

عزیزو!

سوال یہ ہے کہ اگر اقبالؔ جدال و قتال کی تبلیغ کرتے ہیں کہ وہ ایسے مذہب یا مسلک کی وکالت کیوں کرتے ہیں جس کی اساس سچائی اور سلامتی پر رکھی گئی ہے جس مذہب یا شاعر کا خدا رب العالمین اور اس کا رسول رحمتہ للعالمینؐ ہوگا تو وہ ستیز و سفاکی کی تبلیغ کس طرح کر سکتا ہے۔ نیٹشے کے فوق البشر یا سوپر مین اور اقبالؔ کے مردِ کامل یا مردِ مومن کے بنیادی فرق کو سمجھے بغیر دونوں کو ہم جہت و ہم سطح بتانا بڑی جہالت اور ظلم ہے۔ اقبالؔ نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر اور ''شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا۔'' اقبالؔ کا عقیدہ ہے کہ مسلمان ہونے کا رمز، اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی میں پوشیدہ ہے۔ اقبالؔ اپنے پورے کلام میں اس کی تائید و تبلیغ کرنے سے کہیں نہیں تھکتے۔

دنیا جب سے مہذب ہوئی ہے یا کہلائی جانے لگی ہے زندگی کی کشاکش پیہم میں فرد، جماعت یا ادارہ سب کے لیے یہ اصول متفقہ طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس پر عمل ہوتا رہا ہے کہ مصافِ زندگی میں امن، عزّت اور فراغت کی زندگی بسر کرنے کے لیے اپنی اپنی جگہ پر اور موقع سے سنگ و آہن اور حریر و پرنیاں دونوں کی کارفرمائی لازم آتی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ یا توازن سے باہر رکھنا ایسی غفلت یا نادانی ہے جو صرف ہلاکت پر ختم ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے سرِّ کلیمی کے دو پہلو بتائے ہیں۔ ایک یہ کہ:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

دوسرے ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز!

اور کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کو محفوظ متوازن متحرک اور مبارک رکھنے کے لیے سرِّ کلیمی کے یہ دونوں پہلو لازم نہیں آتے۔

اقبال کا شمار ہمارے بڑے سے بڑے شعرا میں ہوتا ہے، لیکن اس اعتبار سے ان کو دوسروں پر ترجیح دی جائے گی کہ دوسروں کے کلام میں کافی اشعار، اکثر پوری غزلیں اور جو کچھ ان میں بیان کیا گیا ہے سب کو بآسانی حذف کیا جاسکتا ہے، اور یہ کوئی حادثہ نہ ہوگا۔ اقبالؔ کا کلام حشو و زوائد سے پاک ہی نہیں ہے بلکہ اپنی دل آویزی اور فکر انگیزی کے اعتبار سے زندگی کی مانند جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں رہتا ہے۔ ایک اور فرسودہ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اقبالؔ کی شاعری میں ہندستانی عنصر نہیں ہے۔ معترض کو یہ نہیں معلوم کہ اقبالؔ نے ہندوستان کے غیر مسلم ائمہ و اکابر نیز مناظر و مظاہر فطرت کے حسن کا ذکر جس عقیدت اور لطف سے کیا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے مسلمان شاعر نے کیا ہو۔ ایک بار پھر اس حقیقت کا اعادہ کرنا پڑتا ہے کہ شاعر بڑی بات سے متاثر ہوتا ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو، کہیں واقع ہوئی ہو اور کسی کو پیش آئی ہو۔ قطع نظر اس سے کہ شاعر ہندو ہو یا مسلمان، روسی ہو یا امریکی۔ ایسا نہیں ہے تو وہ بڑا شاعر نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ اور بھی نہ ہو یا کسی شاعر کے کسی مخصوص مذہب یا مسلک سے تعلق رکھنے کی بنا پر اس کے بلند درجے سے گرانا یا محروم کر دینا بڑی نا منصفی ہے۔ بڑا شاعر کبھی متعصب اور تنگ نظر نہیں ہوسکتا۔

اردو شاعری کو نیا مقصد و منہاج دینے کا امتیاز ہمارے جن بڑے شعرا کو حاصل ہے ان میں اقبالؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہی تشبیہ و استعارے، تلمیحات، صنائع و بدائع اور روایات شعر و ادب جو بے اثر اور کم عیار ہو چکی تھیں، اقبالؔ کے تصرف سے اور ان کے کلام میں جگہ پا کر اس درجہ دل کش جاندار اور معنی خیز ہوگئیں جیسے ان کا جوہر اب کھلا ہو! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنان و شمشیر ہو یا شعر و شاعری بغیر مردِ مجاہد اور شاعر رنگیں نوا کے دونوں بے اعتبار و بے سوار! کتنی تعمیری انقلابی اور حیرت انگیز یہ اصلاح تھی جو اقبالؔ کے حصہ میں آئی۔ اقبالؔ نے اردو کو اپنے کلام سے جو حسن توانائی وزن اور ہمہ گیری بخشی اس سے وہ جدید ہندستانی زبانوں کے زمرے سے نکل کر کلاسیکی زبانوں کی صف میں داخل ہوگئی۔ اقبالؔ کا یہ کارنامہ بھی کتنا عجیب اور عظیم ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں جس طور پر احکامِ الٰہی، فرموداتِ نبوی اور دوسرے امور ملت کو اپنے مخصوص اور نا قابلِ تقلید انداز سے پیش کیا اس سے ان احکام اور فرمودات کی تاکید

اور تاثیر دونوں بے حساب بڑھ گئی۔ ایسا جیسے کہ وہ نئے سرے سے ہی ہمارے سامنے آئے ہوں۔ امورِ دین کو شاعری کے دل کش پیرائے میں اس طرح موثر و مقبول بنانا کہ ہر ذوق، ذہن، یا مسلک و مشرب کا شخص ان کی صداقت پر ایمان لائے اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اقبالؔ کا ایسا بیش بہا کارنامہ ہے جس میں ان کا شریک یا حریف بہت کم ملے گا۔ بالخصوص اس بے پناہ سائنسی مشینی دور میں جس سے ہم گزر رہے ہیں شاعر کا یہ درجہ اس کو پیغمبر سے کس درجہ نزدیک کر دیتا ہے! بذاتِ خود میں اقبال کے کلام کو اس صدی کا بے مثل علمِ کلام سمجھتا ہوں۔

اقبالؔ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہمارے بعض علما کا خیال ہے کہ کچھ خیالات اسلامی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتے یا متغائر ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ خطبات تصنیف نہ کرتے تو بہتر تھا۔ اس موضوع پر علمائے کرام اور اقبالؔ کے درمیان تفصیلی محاکمہ کرنے کی نہ مجھ میں صلاحیت ہے نہ یہاں اس کی ضرورت ہے، یوں بھی ایسے مشاغل میں جی نہیں لگتا۔ البتہ ایک لکھے پڑھے عام آدمی کی سوجھ بوجھ کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان سخت ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ خطبات ایسے نہیں ہیں کہ ان کا شائع کرنا عبث یا نامناسب تصور کیا جائے۔ اقبالؔ ایک اچھے اور دانش مند مسلمان، اعلیٰ درجے کے شاعر، قانون کے ماہر، فلسفہ کے جید عالم اور رسولِ اکرمؐ کے غیر معمولی شیدائیوں میں تھے۔ ان صفات اور ذمہ داریوں کا حامل ہوتے ہوئے وہ کئی ایسی بات کہنا کس طرح گوارا کر سکتے تھے جو اسلام کے بنیادی عقائد کے منافی ہو۔ اس کے علاوہ مسلمان شاعر مفکر اور فلسفی ہونے کی حیثیت سے ان کے لیے قدرتی امر تھا کہ وہ حقیقت کو پہچانتے اور پہچنوانے کے لیے حسبِ موقع اور ضرورت ان فضیلتوں سے کام لیتے۔ چنانچہ بعض امور میں بعض اوقات وہ اپنی ان صفات کو پیشِ نظر رکھتے اور ان میں سے کسی ایک یا اس سے زائد کی پیروی کرتے۔ اقبالؔ کے کلام میں اس کے شواہد ملتے ہیں کہ کون سی بات انھوں نے کس تقاضے کی رو سے کی ہے کسی مستند عالم یا فن کار کو اس طرح عمل کرنے کا حق اور اختیار ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہر زمانے میں موقع اور محل کے تقاضوں کے مطابق اربابِ فکر و نظر کے سوچنے سمجھنے اور سمجھانے کا طریقہ ہوتا ہے۔ حالات و حوادث سے دوچار ہو کر سوچنا اور کہنا ممنوع ہو جائے تو

زندگی یا اقبالؔ کی زبان میں 'زندہ رود' کی روش اور روانی بند ہو جائے اور یہ انسان اور اس کی ہزاروں سال کی لائی ہوئی تہذیبی زندگی کا خاتمہ ہوگا۔ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مذہب میں تحفظات ملتے ہیں۔ ہر زمانہ اپنا مجدد، مجتہد و مصلح اور رومیؔ و رازیؔ اور سرسید و اقبالؔ ساتھ لاتا ہے جو مذہب اور زندگی میں توافق و توازن قائم رکھنے کا کارِ عظیم انجام دیتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ آخری دین ہے اور آخری دن تک حرکی اور تازہ کار رہے گا۔ اس لیے 'كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ' کی بشارت کی رو سے اس کا اپنے آپ کو حالات و حوادث میں ڈھلتے یا ان کو اپنے میں ڈھالتے رہنا اسی بشارت کے عین مطابق ہے نہ کہ مخالف، البتہ نہایت احتیاط اور دانش مندی سے برابر دیکھنا اور دیکھتے رہنا چاہیے کہ مجدد، مجتہد، مصلح مذہب کی مشین یا جسم کو دھچکے سے بچانے اور دھچکے کو جذب کرنے (Shock Absorber) کا فریضہ انجام دیتا ہے یا اس کو صدمہ پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے۔

اور اے عزیزو! کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہم اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور اپنی تقدیر کی پہنائیوں کی جب کبھی سیر کریں گے تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری تخیل جذبہ اور فکر نے ان چہارگانہ عوامل سے جو بالیدگی اور بلندی اختیار کی ہے ان کے اظہار ابلاغ اور بازیافت میں ہم ان اشعار، فقرے، ترکیبوں، تلمیح، تشبیہ، استعاروں، اشاروں اور مفاہیم سے کام لیے بغیر نہیں رہ سکتے جو اقبالؔ نے وضع کر دیے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عظیم جینیس (Genius) کس کس منبع و مہبط سے کس کس طرح متاثر اور مستنیر ہے کہ اس کی دی ہوئی روشنی میں ہم اپنے فرائض اور اقدار عالیہ کا آسانی اور صحت کے ساتھ احساس کرتے ہیں۔ اس کا اظہار خوبی اور خوب صورتی سے کر سکتے ہیں اور ان کو بجا لانے کی توفیق پاتے ہیں۔

اقبالؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے اور خود ان کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ انھوں نے تمام عمر مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزاری ہے۔ اس مطالعہ نے ان کے سوچنے اور کہنے کو کس طرح متاثر کیا۔ اس پر یہاں بحث مقصود نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اقبالؔ نے ہمارے جذبہ، تخیل اور فکر کو جس خوبی سے غیر معمولی حد تک متاثر اور متحرک کیا وہ ان کا فلسفہ نہیں ان کا معجزۂ شاعری ہے۔ ان کی شاعری مذہب اور فلسفہ میں جہاں کہیں تضاد ملتا ہے وہ اسی شاعری (حسنِ خیال و

حسنِ اظہار) کی کرشمہ کاری یا فیضان ہے۔ آپ عزیزوں کو میرا یہ کہنا یا محسوس کرنا پسند نہ آئے کہ اقبال بحیثیت مجموعی شاعر پہلے ہیں اور سب کچھ بعد میں۔ فلسفہ ہو، مذہب ہو یا کچھ اور، اس کے اظہار میں وہ شعر و شاعری کے آداب اور تقاضوں کو حتی الوسع دوسرے تقاضوں پر مقدم رکھتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں پر اقبال کی گرفت کا بڑا سبب یہی ہے۔ یوں بھی تنوع یا تضاد شاعری کا حسن یا مزاج ہے، اور فلسفہ کا نقص یا نارسائی۔ اقبال نے شاعری کو فلسفہ کا منافی نہیں بتایا ہے بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کی محرمی اور مشاطگی پر مامور کیا ہے۔ مذہب، فلسفہ یا دوسرے علوم حتیٰ کہ مذہب کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن زندگی کی کرشمہ کاری میں ان کو گوارا و وقیع اور فعال شاعر اور اس کی شاعری بناتی ہے۔

کروچے[1] مذہب کو علم الاصنام سے تعبیر کرتا ہے، لیکن یہ تعبیر ان قدیم اور قدیم تر مذاہب پر صادق آتی ہے جو بیش تر دیوی دیوتاؤں کو کارفرمائی اور کارناموں سے مملو و مزیّن ہیں۔ جہاں بقول اقبال ''خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر'' ان مذاہب پر صادق نہیں آتی جہاں 'ان دیکھے' خدا کو مانتے ہیں۔ البتہ[2] سنتیانا کے اس قول کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب شاعری کی ایک صنف بھی ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو یا نہیں اس میں شک نہیں کہ دورِ جاہلیت کے عرب پہلی بار کلامِ الٰہی کی زد میں آئے تو اس کے اصلاحی و اخلاقی احکام سے اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنا اس کے اسلوب، آہنگ اور فصاحت و بلاغت سے مرعوب ہوئے اور بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ شاعری نہیں ساحری ہے! مذہب کی اہمیت و عظمت کا اعتراف کرتا ہوں اور شاعری یا شعرا سے متعلق کلامِ پاک میں جو آیا ہے اس سے بھی ناواقف نہیں ہوں۔ بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب اور شاعری کا آغاز بیک وقت ہوا ہے اور ان کی شانِ نزول ایک ہے۔ اوّلین باشعور انسان نے فطرت کے جلال و جمال سے متاثر ہو کر جس طرح اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا ہوگا وہ عبادت اور شاعری دونوں کا ایک ساتھ اعتراف و اعلان تھا۔ صحائف سماوی یا نیم صحائف سماوی کے معمول کے مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ اپنے وقت کے

---

1. Benedatta Crose (1856-1962) Italian Philosopher Historian and Critic.

2. George Santayan (1863-1952) American Philosoper.

بہترین نمونۂ کلام سے ہیں، چاہے ان کا مصنف کوئی رہا ہو۔ مذہب کے اوامر ونواہی کو جس طرح صلحا اور اتقیا اپنے عمل سے تعمیل کی ترغیب دیتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہاں تک خیال آتا ہے کہ ہمارے لکھے پڑھے طبقہ پر عام طور سے آج مذہب کا جو اثر ہے بالخصوص ان پر جو مذہب کو اعتقاد وعمل سے نہیں جتنا عقل سے دیکھنے اور پرکھنے کے شائق ہیں وہ براہ راست اتنا مذہبی تصانیف کا نہیں ہے جتنا اقبال کے اس کلام کا ہے جن میں مذہب، اخلاق اور تاریخ کے تقاضوں کی طرف رہبری ملتی ہے۔ یہاں تک کہ علمائے جدید بھی 'قبولِ خاطر' کے لیے آیات و احادیث کے بعد جس خوش اعتقادی اور خوش اعتمادی کے ساتھ اقبال کے کلام کا سہارا لیتے ہیں اتنا کسی اور فارسی یا اردو کے شاعر کے کلام کا نہیں۔

اقبال کے اشعار میں موسیقی کے جتنے 'تازہ بہ تازہ تو بہ تو' نمونے ملتے ہیں وہ اردو کے دوسرے شعرا کے کلام میں شاید نہ ملیں۔ اقبال غالباً اس کا التزام بھی رکھتے تھے۔ الفاظ اور فقروں کے انتخاب، ان کی ترکیب وترنم، موقع ومحل، معنی ومفہوم میں اس کے شواہد ملتے ہیں۔ لیکن اس التزام میں آورد کا شائبہ نہ ملے گا یا آورد آمد معلوم ہوگی جو انشا پردازی کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نہیں خود شعر اس اہتمام کا متقاضی تھا۔ یہ معمولی درجے کے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس صدی کے شروع میں جب ہمارے بیش تر شعرا شاعری میں تکلفات بے جا کو اتنا شاعری کا نہیں جتنا اپنا کارنامہ سمجھتے تھے اور اسی طرح کے بندھے ٹکے سامعین سے داد حاصل کرتے۔ اقبال کی یہ آواز اور انداز بہت مفید ثابت ہوا۔

موسیقی آواز کی تنظیم ہے۔ اشعار کی دروبست (اوزان) موسیقی کی دین ہے۔ شاعر کے لیے موزوں فریم وساز موسیقی ہی فراہم کرتی ہے۔ موسیقی کو جو تب وتاب اور تاثیر آلاتِ موسیقی سے ملتی ہے اس سے کچھ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ شاعری سے ملتی ہے۔ موسیقی موزوں اور مقررہ آواز ہے اور آواز کی زبان شاعری، موسیقی اور شاعری کا قران السعدین اور دونوں علاحدہ علاحدہ بھی انسان کے بخشے ہوئے وہ کارنامے اور کرامات ہیں جن کی طرف اقبال نے اپنی مشہور ومایۂ ناز نظم 'محاورہ مابین خدا اور انسان' میں اشارہ کیا ہے۔ طوالت کا مطلق خیال نہ کرتے ہوئے آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے وہ مختصر نظم پیش کروں گا۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ سنگِ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہرِ نوشینہ سازم

اس نظم میں اقبال نے جو باتیں جس طرح جس سطح سے، جس مراتب اور مواقف کو ملحوظ رکھ کر کہی ہیں وہ انسان اور شاعر دونوں کے شایانِ شان ہیں۔ اس موقع و موضوع پر اگر جدید مکتبِ فکر اور مسلک شاعری کے کسی شاعر کو کچھ کہنا پڑتا تو وہ کس طرح کہتے اور کیا کہتے، ظاہر ہے کیا کہتے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اعلیٰ شاعری کے لیے کون صلاحیتیں مفید اور مبارک ہوتی ہیں اور کون نہیں۔

ربط و تسلسل کے اعتبار سے اقبال نے غزل کو نظم سے اور نظم کو غزل سے قریب سے قریب تر کر دیا اس طرح غزل کے خلاف ایک بڑے الزام کو دور کر دیا کہ اس میں خیالات و جذبات کا انتشار ملتا ہے جو میرے نزدیک اتنا الزام نہیں تھا جتنا غلط فہمی۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غلط فہمیاں الزام سے زیادہ سخت جان اور صبر آزما ہوتی ہیں۔ اس لیے اس منزل سے آسان گزرنا معمولی درجے کے شاعر کی طاقت و توفیق سے باہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے یا محسوس کرے کہ موسیقی کو اردو شاعری سے اور اردو شاعری کو موسیقی سے ہم کنار کرنے اور دونوں کو ہم ردیف بنانے میں اقبال کا بڑا قیمتی حصہ ہے تو اس سے جھگڑنا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ ہمارے بیش تر اردو شعرا نے بالعموم خانقاہوں، مشاعروں اور نشید و نشاط کی محفلوں کے لیے غزل کا انتخاب کیا جو نسبتاً آسان اور جلد مقبول عام ہو جاتی ہے۔ اقبال نے زندگی کے سنگین اور صبر آزما حقائق و حوادث کے چیلنج کو قبول کرنے کی دعوت دی اور حوصلہ بخشا۔ اس کے لیے اقبال نے براہ راست نظم اور غزل دونوں سے اس فن کارانہ مہارت، شاعرانہ لمس و لطافت اور عارفانہ بصیرت سے کام لیا جو ان کے وسیع اور بے لاگ مطالعہ اور غور و فکر کے علاوہ دوسری گوناں گوں خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ تھیں۔ اس سے اردو شاعری کے وزن و وقعت میں بڑا مفید مبارک اور مقبول عام اضافہ ہوا۔

غالبؔ نے اردو کو فارسی سے ترکیب دے کر اردو کے حسب ونسب کو بہت اونچا کر دیا، لیکن وہ فارسی کو اردو سے اس طرح ممزوج اور ہم آہنگ نہ کر سکے جس طرح مفہوم ومعنی اور صوت وصورت کے اعتبار سے اقبالؔ نے اپنی فارسی سے کیا۔ اقبالؔ کی فارسی ایران یا غالبؔ کی فارسی کے مقابلے میں کیسی ہی رہی ہو، اقبالؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فارسی یا فارسی رنگ وآہنگ کلام سے فارسی کو ہندوستان میں زیادہ مستحکم ودل کش اور مقبول عام کر دیا۔ کبھی کبھی ایک آوارہ پرند کی مانند دل میں یہ خیال بھی گزرا ہے کہ علی گڑھ اور اقبالؔ کو ہم اپنی علمی وتہذیبی زندگی سے حذف کر کے دیکھیں تو ہماری آپ کی شبیہ کیا اور کیسی ہوگی۔ شبیہ چاہے جیسی ہو نفسِ مضمون سے میرے بہک جانے کی مثالوں میں سے ایک یہ بھی ہے جسے حسبِ معمول آپ کو معاف کرنا ہے! انیسؔ کے مانند اردو کے پلہ کو 'گراں' اور 'زمینِ سخن' کو 'آسماں' کر دینے میں ہماری نظر بے اختیار اقبالؔ پر بھی پڑتی ہے اور کس اعتماد وافتخار سے پڑتی ہے۔

میں موسیقی کے میزان ومقام سے واقف نہیں ہوں۔ اگر پہلے سے سن نہ چکا ہوتا کہ موسیقی سے جانور تک متاثر ہوتے ہیں تو شاید اس کا اقرار کر لیتا کہ موسیقی سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اکثر اچھے اشعار سن کر ذہن موسیقی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اچھی موسیقی سن کر اقبالؔ کے اشعار یاد آنے لگتے ہیں۔ اپنے دیار کی موسیقی سن کر ہمارا ذہن اردو کے کس شاعر کے کلام کی طرف بے اختیار مائل ہوتا ہے، اس امر کا پتہ لگانے میں معین ہوسکتا ہے کہ وہ شاعر اور اس کی شاعری کس پائے کی ہے۔ ضمناً وہ گانا اور گانے والا بھی۔ شاعری اور موسیقی کا امتزاج حافظؔ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ حافظؔ تمام تر غزل کے شاعر ہیں جس میں موسیقی کا عمل دخل آسانی سے ہو جاتا ہے۔ موسیقی کی جو ہمدمی غزل کو حاصل ہے شاید کسی اور صنف سخن کو نہیں ہے۔ حافظؔ اپنے بیان کے مطابق 'حکایتِ مہر ووفا' کے شاعر ہیں۔ حافظؔ اور اقبالؔ نے موسیقی اور شاعری کو باہم دگر کرنے اور رکھنے کے جیسے نغز ونادر نمونے پیش کیے ہیں وہ فارسی اور اردو کے دوسرے شعرا کے یہاں شاید دستیاب نہ ہوں۔ تصوف کے تصرف نے حافظؔ کو ساز سے قریب اور ستیز سے دور رکھا ہے۔ کہیں کہیں زمانہ اور زندگی سے پنجہ آزمائی کی بھی آواز سنائی دے جاتی ہے لیکن یہ آواز جتنی رسمی اور روایتی ہے اتنی اقبال کی مانند، 'من وگرز ومیدان

وافراسیاب' کی نہیں ہے۔ اقبالؔ اور حافظ دونوں نے قلندری کو اپنایا ہے لیکن اقبالؔ کا قلندر جنگ وجہد کا ہے۔ حافظؔ کا خانقاہ کا اقبالؔ کا حرکی ہے۔ حافظؔ کا سکوتی، حافظ کے یہاں ناسازگار حالات کے خلاف برہمی یا بغاوت نہ ملے گی۔ 'چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند' کا مقام ملے گا۔ اقبالؔ کے یہاں 'برہم زن' کی دعوت ہے۔

حافظؔ کا دور سیاسی شکست و ریخت، سماجی ابتری اور عام درماندگی کا تھا۔ بایں ہمہ ان کی شاعری میں زیریں لہر اتنی دل گرفتگی کی نہیں ہے جتنی دل آسانی و دل افروزی کی۔ اقبال کا نعرہ 'یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے' تھا۔ قوم اور ملک کو طرح طرح کے آلام و آزمائش کا سامنا تھا۔ اس لیے اقبالؔ کی شاعری مجبوری و مایوسی کی نہیں ہوسکتی تھی۔ بڑے اور عالمی شاعر ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ کسی حال میں نہ خود مایوس وملول ہوگا نہ اپنے سامعین کو ہونے دے گا۔ بڑا شاعر باغی بھی نہیں ہوتا مجاہد ہوتا ہے۔ حافظؔ اپنے کردار اور شاعری دونوں اعتبار سے صوفی تھے۔ اقبالؔ اور غالبؔ کے کلام میں جہاں تہاں تصوف کی آواز سنائی دے جاتی ہے لیکن کردار کے اعتبار سے ان میں کوئی بھی صوفی نہ تھا۔ اس لیے ان کا بیش تر کلام تصوف کے رنگ و آہنگ سے خالی ہے۔ البتہ یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ اقبالؔ کے یہاں تصوف کا روپ اور رنگ وہیں ملتا ہے جہاں اس کے بغیر راستہ اور رہبری نہیں مل سکتی تھی۔ دانائے راز ہونے کے لیے آشنائے تصوف ہونا ضروری ہے۔ خیال ہے کہ جب تک کوئی شاعر اقبالؔ اور رومیؔ کے پائے کا نہ ہو اس کو تصوف کی وادی میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ماورائیت کا لحاظ و احترام ہر بڑی شاعری، مذہب اور اخلاق میں کیا گیا ہے خواہ وہ شاعری یا مذہب و اخلاق کسی عہد، قوم اور ملک کا ہو۔ اردو شاعری میں شعرا کی جیسی کثرت ہے اس کے حساب سے صوفی شعرا کی تعداد کم اور بہت کم ہے۔ ایسا تو نہیں کہ تصوف شاید اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لیے شعرا اس طرف کم مائل ہوئے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تصوف کے تقاضوں کو شاید ہمارے بیش تر شعرا پورا کرنے کا حوصلہ بھی نہ کرسکتے ہوں۔

اقبالؔ اور حافظؔ دونوں کے کلام میں خدا اور عورت کے بارے میں کوئی ناسزا کلمہ یا اشارہ کنایہ نہ ملے گا۔ بڑے شعر و ادب میں خدا اور عورت کا احترام خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جیسے ان کے ساتھ بے باک ہونا متفقہ طور پر ممنوعات میں قرار دیا گیا ہو۔ اس سے کبھی کبھی اس طرف بھی خیال جاتا ہے کہ کس درجہ کم سواد اور معاشرے کے لیے تو خطرناک وہ شاعر اور فن کار ہوتا ہے جو خدا اور عورت کو اپنے ہفوات کا ہدف بنائے بغیر نہ اپنی شاعری کو شہرت دے سکتا ہے نہ اپنے ساتھیوں سے داد پا سکتا ہے۔ ایسے شاعر اور سامعین بھی کیا کریں جو حفظِ مراتب ملحوظ رکھنے کی بڑائی کے احساس سے محروم ہوں۔ جہاں اعلیٰ اور عظیم کا تصور مختلف یا معدوم ہو، وہاں کون کسی سے کیا کہے۔

اردو شاعری کو ہندوستان ہی نہیں دوسرے بالخصوص مسلم ممالک کے شعر و ادب کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کرنا اقبالؔ کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ اب تک ہم نے عربی اور فارسی جیسی کلاسیکی زبانوں کو ہندوستان میں مقبول بنایا تھا۔ اقبالؔ نے اپنے کلام سے اردو جیسی کم عمر اور کم معلوم زبان کو عربی فارسی زبانوں کے دیار میں متعارف کیا۔ جس طرح ہندستانی زبانوں میں مہارشی ٹیگور نے بنگالی کو یورپ کی بڑی زبانوں سے آشنا کرایا تھا۔ اقبالؔ اور ٹیگور کی شاعری میں یہ فرق ہے کہ موخر الذکر کی شاعری زیادہ تر عبادت و معرفت حمد و مناجات اور ماورائیت کی ہے جس کے اظہار میں اعلیٰ موسیقی کو خاص دخل ہے۔ ٹیگور کے یہاں ارضی اور ہمہ وقت بدلنے والے عالمی مسائل و مشکلات، مثلاً:

بیک لحظہ، بیک ساعت، بیک دم
دگرگوں می شود احوالِ عالم

کی نشان دہی اور ان سے مقابلہ کرنے کی تلقین و تائید نہیں ملتی۔ اس لیے کہ ٹیگور کا مزاج دراصل امن و آشتی اور انسانیت دوستی کا تھا، طاقت و تشدد کا نہیں۔ ماورائیت اور موسیقیت کا یہ پیغمبر اس رول کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن دراصل کہنے یہ جا رہا تھا کہ اقبالؔ نے نعت گوئی کو میلاد ناموں اور میلاد خوانوں کی گرفت سے آزاد کر کے کلاسیکی درجہ پر فائز کر دیا۔ عشق رسولؐ اقبالؔ کے کلام و پیام اور خود ان کے وجودِ شعری کی روح ہے۔ عربی، فارسی اور اردو شاعری میں جتنے قابلِ لحاظ شعرا گزرے ہیں اپنی اپنی بساط کے مطابق بارگاہِ رسالتؐ میں عقیدت و ارادت کے نذرانے پیش کیے ہیں۔ نعت ہمارے شعر و ادب کی قابلِ قدر روایت بن گئی ہے، ایسی روایت جو شاعری میں عبادت کے

سازوبرگ کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔نعت کو شاید کسی اور مذہب وملت میں وہ اہمیت حاصل نہ ہو جو ہمارے شعروادب میں ہے۔نعت قدیم کو نعت جدید سے قریب لانے ،اس کو مقصد دینے، متحرک کرنے اور رکھنے کی ابتدا حالؔی نے کی، جسے اقبالؔ نے اس درجہ تک پہنچا دیا جس سے آگے پہنچانا اب کسی دوسرے ہی اقبالؔ کا کارنامہ ہوگا، اور مستقبل بعید تک کسی دوسرے اقبالؔ کا ظہور پانا آسان نہیں معلوم ہوتا۔

اس صدی میں آج تک ہم جن آزمائشوں سے گزرے ہیں اور شاید گزرتے رہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اقبالؔ کے کلام سے جو تقویت اور تسکین ملتی رہتی ہے وہ اس صدی کے کسی اور شاعر اور اس کی شاعری میں نہیں ملتی ۔ یہ کیوں اور کیوں کر؟ اس کا نہایت مختصر لیکن کعبہ آثار اور عرفات اساس جواب عشق رسولؐ ہے۔جس سے ہماری روح روشن اور حوصلے زیادہ رہے ہیں۔خواہ ہم کہیں اور کسی حال میں ہوں، اقبالؔ نے ہمارے لیے سرورِ دوعالمؐ کی عظیم، جلیل اور رحمتِ عالم ہونے کی 'بازیافت' کی ہے جو شاعر اس کی شاعری اور ہمارے شعائر کو ہمیشہ انفرادی واجتماعی اور سماجی امتیازات سے برگزیدہ، بلند و مفتخر رکھے گی۔ایسی بروقت 'بازیافت' ہماری تاریخ میں مجھے تو اب تک نظر نہ آئی۔

آپ نوجوانوں کی رفعت ورفاہ کے لیے اقبالؔ کے کرب اور کراہ کی آواز جابجا ان کے کلام میں سنائی دے جاتی ہے۔مثلاً جہاں انھوں نے ہم کو آپ کو 'سید پاک کی اولاد' کہہ کر پکارا ہے اور اپنی نشان دہی' آبا مرے لاتی ومناتی' سے کی ہے۔ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اپنی روح کی گہرائیوں سے ہم کو یاد دلا رہے ہوں یا واسطہ دلا رہے ہوں کہ مجھے دیکھو کہ لاتی و مناتی ہونے کے باوجود آپ کو سیدِ پاک ہونے کی ذمہ داری اور شرف کی یاد دلاتا ہوں اور گڑگڑاتا ہوں کہ آپ نے توجہ نہ کی تو آپ تمام دنیا کے لاتیوں ومناتیوں کی اولاد کو کس طرح منہ دکھائیں گے۔سید پاک کی اولاد کو اپنے لاتی ومناتی ہونے کی تصویر دکھا کر اقبالؔ نے یہاں تاثیر کا جو اعجاز دکھایا ہے اس کی مثال کہیں کم ملے گی۔نشیب کی بلندی' آبا مرے لاتی ومناتی' اور فراز کی پستی' تو سید پاک کی ہے اولاد' کو اقبالؔ نے جس عقیدت اور بلاغت سے واضح کیا ہے وہ انھیں کے بس کی بات تھی۔

عزیزانِ گرامی!

اکبر کے فن اور شخصیت کے بارے میں اقبالؔ کے یہ اشعار آپ کے ذہن میں ہوں گے۔

سر ذروۂ طورِ معنی کلیمے ——— بہ بُت خانۂ دورِ حاضر خلیلے

گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے ——— گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''اسلامی ادیبوں میں شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کی ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔''[1]

اوپر کے چار مصرعوں میں اقبالؔ نے اکبر کے فن، شاعری اور شخصیت کی وضاحت ہی نہیں کی ہے بلکہ طنز وظرافت کا صحیفۂ شریعت بھی پیش کر دیا ہے۔ زمانہ اور زندگی کے بُت خانہ کا خلیل اور طورِ معنی کا یہ کلیم اردو کے طنز وظرافت کے فن، اخلاق اور مقصد پر اب تک حرفِ آخر ہے۔ اس فن کی فسوں گری دیکھنے اور اقبالؔ کا حسنِ بیان کہ شاعر کا خندہ تیغِ اصیل کا کام دے اور اس کا گریہ ابر بہاری کا سماں پیش کرے۔ شعر وادب اور تہذیب وثقافت کا وہ کیسا تصور اور کیسی تصویر ہوگی جہاں طنز وظرافت کا ایسا سخت لیکن حسین اور بلند معیار ہوگا۔ گفتگو کی ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ غالبؔ، حالیؔ، اکبر، اور اقبالؔ کو پورے طور پر سمجھے بغیر ہم نہ اپنی تاریخ کو پہچان سکتے ہیں نہ اپنی تقدیر وتہذیب کو نہ ان کی بازیافت کر سکتے ہیں۔ ان گرامی شعرا نے اردو کے بیش تر اصنافِ سخن کے معیار ہی کو نہیں بدلا اور بلند کیا بلکہ ان کے وسیلے سے ہمارے فکر وعمل کو نئی روشنی، نئی جہت، نئی رفعت اور نئی آرزو بخشی۔ یہ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ کبھی کبھی اس کا تصور بھی کر لیا کیجیے اور جب اس تہذیب کی تفہیم وتکریم پر اصرار کروں کہ آپ ان کا مطالعہ دل لگا کر کریں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر کام نہ چلے گا۔ میں اس پر اگر اصرار کروں تو مجھ سے اُکتانے کے بجائے ایک نظر اپنے دانش کدہ پر ڈال لیں جس میں اس مبارک ومعتبر تہذیب کی نمائندگی ملتی ہے جو ہندوستان

---

[1] انوارِ اقبال، ص:196-197، ادبی دنیا، اکتوبر 1967ء

نے علی گڑھ کو اور علی گڑھ نے ہندوستان کو دی ہے اور جس کو وزن و وقعت دینے میں ان شعرا کا حصہ معمولی نہیں ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے بچپن کا زمانہ تھا۔ مئی جون کی گرمیوں میں گھر کے کاموں اور کھانے پینے سے فارغ ہو کر کسی ٹھنڈی نیم تاریک کوٹھری میں کھرّی چار پائیوں پر گھر کی ساری عورتیں اور بچے بیٹھے یا لیٹے ہوتے۔ خاندان کی دادی یا نانی اماں اپنے سلسلے کی بے شمار دادی اور نانی اماؤں سے سنے سنائے قصے سناتیں کہ دشمن کو ہلاک کر ڈالنے کے لیے جادو کی کیسی کیسی ہانڈیاں یا بان (تیر) اڑائے اور مارے جاتے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ جادو یا اس طرح کی عملیات کے شائق اندھیری آدھی رات، اور ڈراؤنے سنسان مرگھٹوں میں جا کر مقررہ منتر پڑھتے۔ اس دوران میں طرح طرح کے سائے اور پرچھائیاں ان کو خوف ناک آوازوں سے ڈراتی دھمکاتیں۔ اگر عمل پڑھنے والا ڈر کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتا تو وہ اپنے جادو کا خود شکار ہو جاتا یا باؤلا ہو کر گلی کوچوں میں مارا مارا پھرنے لگتا۔ اسی طرح یہ بوڑھیاں بتاتیں کہ ایک شاہ زادی پہاڑ کی چوٹی پر رہتی تھی، جو لوگ اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس مہم پر پہاڑ کا سفر شروع کر دیتے تو راستے میں ڈراؤنی آوازیں اور شکلیں طرح طرح سے غراتیں اور جھپٹتی معلوم ہوتی، اگر مہم باز جو بالعموم شاہ زادہ ہوتا ڈر کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتا تو پتھر کا ہو جاتا ورنہ چوٹی پر پہنچ کر شاہ زادی کو حاصل کر لیتا۔ بعض لوگ جلالی وظائف کا چلّہ کھینچتے اس میں عامل کبھی کسی اونچ نیچ کا شکار ہو جاتا تو کہیں کا نہ رہتا۔ محلّے میں کوئی بکتا جھکتا، نیم برہنہ، چیتھڑے لگائے ہوئے طرح طرح کی حرکتیں کرتا فقیر نظر آ جاتا تو کہتیں ان سے ڈرنا، بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جلالی وظیفہ کا عمل کر رہے تھے اس میں کہیں چُوک ہو گئی تو اس حال کو پہنچ گئے، قریب مت جانا دور سے سلام کر لینا اور اپنا مطلب سنا دینا۔ اگر گالی دے دیں تو سمجھنا کام بن گیا۔ عالم گیر لڑائیوں کے زمانے میں آسمان پر کبھی اڑتی ہوئی طشتریوں کی خبر آتی تو لوگوں کا ذہن اکثر اوقات شاہ زادوں کی طرف جاتا۔

بات میں بات نکلتی ہے جسے بیان کر دینا چاہتا ہوں، چاہے وہ آداب انشا پردازی کے خلاف ہو چاہے آدابِ محفل کے۔ خاندان میں بڑی بوڑھیوں کا یہ رول بظاہر کارِ فضول معلوم ہوتا ہے جب کہ بچوں کو تعلیم دینے کے لیے بے شمار طریقے نکل آئے ہیں۔ اتنے طریقے کہ ان

میں بہت سے ہم بوڑھوں کے لیے بچ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے بچوں ہی نہیں آپ سب کی بھی تعلیم کے جتنے طریقے نافذ کیے گئے ہیں، اتنا ہی تربیت کا انتظام ناقص اور خطرناک ہے۔ تعلیم کا انصرام معلم پر اور تربیت کا طالب علم پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس زمانے میں معلم اور طالب علم کا جو رشتہ ہے اس سے آپ اور میں دونوں واقف ہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ اور ہم دونوں سے زیادہ ملک کا نظم ونسق، طالب علم کی اس سے بڑی کوئی اور توہین نہیں ہو سکتی! ہاں تو اس زمانے میں قصہ سنتے سنتے بچے سو جاتے اور کہتے کہتے بوڑھیوں پر بھی غنودگی طاری ہو جاتی۔ دن ڈھل جاتا تو بوڑھیاں اٹھ کر وضو نماز اور گھر کے کاموں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جائیں وقت پر بچے اٹھتے یا اٹھائے جاتے۔ اس طرح وہ موسم اور دوپہر میں باہر مارے مارے پھرنے کی گزند سے محفوظ رہتے۔ جاڑے کی طویل راتوں کا بھی کم وبیش یہی پروگرام ہوتا۔

اس طرح بوڑھیوں کی محبت ونگرانی اور گھر کی اچھی روایات سے بچے پورے طور پر متاثر ہو جاتے۔ بڑے ہونے پر بچپن میں سنی اور دیکھی ہوئی یہ باتیں وقت کے تقاضوں اور مسائل ومصائب کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے میں مدد پہنچاتیں۔ بوڑھیوں کی یہ خدمت گھر باہر کے سارے ذاتی سماجی اور اخلاقی بندھنوں کو مضبوط رکھتی اور کسی حال میں نہ ٹوٹنے نہ باہر ہونے دیتی۔ آج جب کہ نوجوانوں کو مدہوش اور بے غیرت رکھنے اور اپنی ذمہ داریوں سے مجرمانہ حد تک بچنے کے لیے ہم ان کے حق میں جو یقیناً ہماری امانت میں ہیں ہر شقاوت اور خباثت کو مباح کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بوڑھیوں کے اس رول اور روایت کو کون قابلِ التفات سمجھے گا! بداعمالی کو ہر شخص کا پیدائشی حق قرار دینا اور اسی بداعمالی کے نتائج پر واویلا کرنا مزید اور طرفہ تر بداعمالی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس بڑے راز کا انکشاف کرنے والے بزرگوں کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ افراد کے ایسے ہی پیدائشی حق یا حقوق کا انسداد کرنا اور ان کو مناسب اور مقررہ حدود میں رکھنا اب تک تہذیبِ انسانی کا اوّلین فرض اور بہترین کارنامہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ پیدائشی حقوق کو متعین اور نافذ کرنے میں اس کا لحاظ رکھنا لازمی ہے کہ کون سے پیدائشی حقوق میں ڈھیل انسان کو جنگل اور جانور کی طرف لے جائے گی اور کون سی ان کو انسان اور انسانیت سے وابستہ رکھے گی!

دیس دیہات کی یہ کہانیاں کیسی انوکھی، کتنی دلچسپ اور کیسی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان کے حسبِ حال ہونے میں آج تک کسی نے شک نہیں کیا۔ یہ کہانیاں نہیں وہ سچائیاں ہیں جن سے بچے لطف اور نوجوان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنی مدت میں کہاں کہاں کے لوگوں اور کن حالتوں سے گزر کر یہ ہم تک پہنچی ہیں اور آئندہ کیسے کیسے بچے، جوان اور بوڑھوں تک پہنچتی رہیں گی۔ اس طرح سے یہ مقامی سے آفاقی بنی ہیں۔ ان کی زبان، ان کا بیان، ان کی کہانی، ان کا لہجہ ایسا ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی آدمی بھی ان کو سمجھ لے۔ پھر یہ کہانیاں کہاوتوں میں تبدیل ہو کر حقیقت کا پیرایہ اختیار کر لیتی ہیں۔ نہ مکان کی پابند نہ زبان کی محتاج، دنیا میں بڑے سے بڑے ارضی یا سماوی صحائف بھی نکتہ چینی سے نہیں بچے، لیکن ان کہاوتوں میں شبہ کرنے والے آج تک کہیں نہیں پائے گئے۔

عزیزو! کوئی مقصد بغیر مقررہ اور مخصوص ریاضت و آزمائش کے روبراہ نہیں ہوا۔ جہاں کہیں اور جب کبھی ان کے تقاضے پورے کرنے میں کوتاہی کی گئی انجام خواری اور نامرادی ہوا۔ سب سے زیادہ ایسے کڑے شرائط شعر و ادب بالخصوص طنز و ظرافت میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص ان کا نشانہ بنتا ہے اس کی عفت و آبروز د میں ہوتی ہے جس کا لحاظ رکھنا شرافت اور فن دونوں کا اوّلین تقاضہ ہے۔ ہنسنے اور ہنسانے کے فن یا تفریح میں دھوکا یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہنس ہی نہیں سکتا بلکہ ہنسا بھی سکتا ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں بعض ایسی اعلیٰ صلاحیتوں کے طلب گار ہوتے ہیں جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ کس پر کب کتنا اور کیسے ہنسنا یا برہم ہونا برمحل ہوگا اس کا جاننا آسان نہیں ہے۔ طنز و ظرافت برمحل بے لاگ اور حفظِ مراتب کے قرین نہ ہو تو عامل خود اپنا شکا ہو جاتا ہے۔ اس میں سب سے بڑی اور سخت شرط حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھنا ہے جس کی طرف فن کاروں کا ذہن بہت کم جاتا ہے۔ ایک ہی انداز اور لب و لہجہ سے معمولی، متوسط اور بڑی شخصیتوں کو طنز و ظرافت کا نشانہ بنانا بد مذاقی اور نارسائی کی علامت ہے۔ طنز و ظرافت کا فن بڑا نازک اور سخت گیر ہے۔ اس کی ترغیب جتنی پُرکشش اور قوی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اس کے وہ مطالبے اور پابندیاں ہوتی ہیں جن کا ہم لحاظ نہیں رکھتے، اور یہ فن اور فن کار دونوں کی محرومی کا باعث ہوتا ہے۔ طنز و ظرافت کی

تیغِ بے زنہار یا پلِ صراط سے آسان اور محفوظ گزر جانا اردو کے بہت کم فن کاروں کے حصے میں آیا ہے۔

طنز وظرافت کا فن یا آئین جن خطرات اور نزاکتوں کی خبر دیتا ہے اس کا ایک دلچسپ لیکن اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے اسلاف عالی نسب نہیں ہیں۔ شاید ہی کسی اور صنفِ کلام کے اب وجداتی احتیاط و احترام کے طلب گار ہوتے ہوں جتنے طنز وظرافت کے۔ سب وشتم فحش، ہجو، ہرزہ، پھکڑ اور دوسری بدعنوانیاں طنز وظرافت کے شجرۂ نسب میں آویزاں ملیں گی۔ کتنے صوم وصلواۃ یا صناعت وریاضت کے بعد ہمارے فن کاروں نے ان کو پاک وصاف اور تاثیر و دل کشی بخشی کہ یہ ہمارے شعروادب کے بڑے کارآمد اور گراں قدر اسالیب تسلیم کیے گئے۔ کسی شعروادب کی حیثیت و اہمیت متعین کرنے میں اربابِ نظر اس کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں کہ اس کی طنز وظرافت کس پایہ کی ہے۔ اقبالؔ نے اکبرؔ کی طنز وظرافت کا جو درجہ یہ کہہ کر متعین کیا ہے کہ 'خندۂ او چو تیغِ اصیلے' اور 'گریہ او چو ابرِ بہارے' وہ اس فن کی بڑی اچھی وضاحت اور وکالت ہے۔ طنز وظرافت کے ایوان میں بار پانے کا شوق اور حوصلہ رکھنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ ان کے کلام میں وہ عناصر کسی حال میں راہ نہ پائیں جو ان اصناف کے اسلاف میں ملتے ہیں جن کی نشان دہی اوپر کی گئی ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے ایسے لکھنے والے طنز وظرافت کے فن کے حاملان آخر کے بجائے اراکین اوّل کے قریب ہو جائیں گے اور ان کی یہ غفلت یا غلط روی کسی حال میں قابلِ درگزر نہ ہوگی۔ یہ اس لیے کہنا پڑا کہ کچھ عرصے سے ہمارے فن کاروں میں پیچھے کی طرف پلٹنے کا میلان یا تحریک بہت قوی ہوتی جارہی ہے اور انسانی تہذیب کی ترقی میں ارتقا و ارتفاع کا عمل رہا ہے اس کو یہ یکسر نظرانداز کرتے جارہے ہیں۔

طنز وظرافت کسی کی آبروریزی یا اپنی نالائقی کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح و ارتفاع کے لیے ہوتی ہے۔ علمائے ادب و اخلاق نے ان کے ضابطے مقرر کردیے ہیں۔ یعنی کیسا شاعر یا ادیب کن حالات میں کس سطح سے کس کو طنز وظرافت کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ ان حربوں کو کام میں لانے کا وہ کہاں تک مجاز ہے۔ خدا، ائمہ دین، عقائد، اقدار اور کسی

کی فطری معذوری کو طنز وظرافت کا نشانہ بنانا ممنوع ہے۔ جن شاعروں نے اس کا لحاظ نہیں کیا ان کو بدذوق اور فرومایہ قرار دیا گیا ہے۔

خدا کی شان میں غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ نے جہاں جس شوخی کا اظہار کیا ہے اس سے آپ تینوں کے ذوق، ظرف اور سطح کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ جس طرح اور جہاں کہیں حرفِ شوخی وشکوہ زبان پر لائے ہیں ان سے خدا، غالبؔ اور اقبالؔ کے بارے میں ہمارا تاثر و تخیل جتنا وقیع اور بلند ہو جاتا ہے اس کے مقابلے میں جوشؔ نے جس کثرت سے جیسے کلمات استعمال کیے ہیں اس سے اتنا ہی مایوس کن اور تکلیف دہ اثر جوشؔ کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں ہوتا ہے۔ گذشتہ کم وبیش چالیس سال کی اردو شاعری کے بارے میں ایسا خیال ہوتا ہے کہ جن شعرا نے مذہب اور عورت کے بارے میں نازیبا کلمات استعمال کیے وہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے گئے۔

خدا اور عورت کے موضوعات پر اگر آپ جدید مسلک شاعری کے مشاہیر، ان کے تابعین اور تبع تابعین کے کلام کے نمونے اکٹھے کر کے ان پر غور فرمائیں تو محسوس ہوگا کہ انھوں نے شاعری، اخلاق اور نوجوان ادیب اور شاعروں کی تعمیری صلاحیتوں کو جس طرح اور جس حد تک بے باک اور بے لگام کیا ہے اس کے دردناک عواقب ہمارے سامنے ہیں۔ بگڑا شاگرد یا مرید بگڑے استاد یا مرشد سے زیادہ خطرناک یا قابلِ رحم ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا، عبرت ناک اور سبق آموز بھی۔ ایسے شعرا کو قابلِ التفات نہیں سمجھنا چاہیے جو اپنے کو ناسازگار حالات کا شکار ہو جانے دیتے ہیں۔ یا قبیلے کے ٹکٹ پر شاعر قرار پاتے ہیں۔ قابلِ تحسین وتکریم وہ ہیں جو انتہائی ناسازگار حالات میں بھی شاعری اور شرافت کی ذمہ داریوں اور ضمیر کے تقاضوں سے انحراف نہیں کرتے۔

طنز وظرافت کی ایک سطح عوامی بھی ہوتی ہے، عامیانہ نہیں۔ جہاں ان کا معیار زیادہ سخت گیر نہیں ہوتا لیکن ایسا بھی نہیں ہوتا کہ فن کار کھل کھیلے، بلکہ ایسے میں وہ اور زیادہ محتاط رہتا ہے۔ اس لیے کہ بات سچی اور پکی کہنی پڑتی ہے۔ خواہ زبان اور لہجہ اردوئے معلیٰ کا نہ ہو لیکن بالکل اردوئے معلیٰ بھی نہ ہو۔ شاعر اور ادیب جس قدر طنز وظرافت میں بے نقاب ہوتا ہے اتنا

کسی اور صنف سخن میں نہیں۔ باستثنا غزل کہ جو اپنے معیار میں شمہ برابر فرق گوارا نہیں کرتی بلکہ بلند سے بلند کی طلب گار رہتی ہے۔ اکبر کا کمال جس میں ان کا نظیر اردو ادب میں مشکل سے ملے گا یہ ہے کہ وہ طنز و ظرافت کا وار ہر سطح اور اس کے دیے ہوئے ہر حربے سے کامیابی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ پچھلا قصہ ذہن میں ہو تو ایسا محسوس ہوگا جیسے طنز و ظرافت کی چلّہ کشی میں طرح طرح کی جن بلیات سے سابقہ پڑتا ہے وہ سب اکبر کو ڈرانے دھمکانے کے بجائے خود اکبر سے ڈر گئے ہوں، اور غیر مشروط طور پر ان کے سامنے سپر ڈال دی ہو۔ اردو ادب میں طنز و ظرافت کی تاریخ کچھ بھی ہو اس کا سلیقہ اور صحیفہ غالبؔ اور اکبرؔ کا دیا ہوا ہے۔ غالبؔ نے جیسی طبیعت پائی تھی وہ طنز و ظرافت کے لیے سازگار ہی نہیں لازمی تھی۔ ایسا ہی مزاج اکبرؔ کا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اکبرؔ غالبؔ سے کہیں زیادہ عوام کے آدمی تھے اور ان کے عمل اور ردّ عمل کے مقیاس کی اہمیت اس اعتبار سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اکبرؔ طبقہ اشراف کی اس قدر و قیمت سے بھی واقف تھے جس کا لحاظ اس عہد کے بزم و بازار دونوں میں کیا جاتا تھا۔

لسان العصر اکبرؔ کا عہد محکومی کا عہد ہوتے ہوئے بھی امن، آسودگی اور اعلیٰ صلاحیتوں کے بیدار اور بالیدہ ہونے کا غیر معمولی سازگار زمانہ تھا۔ ہر فرقہ، جماعت اور مسلک اور ہر گوشۂ ملک سے ایک سے ایک نام ور شخصیتیں، سیاسی، قومی اور تہذیبی زندگی کے اسٹیج پر پے بہ پے نمودار ہوئیں اور رزم و بزم کے تقاضوں اور ذمہ داریوں سے اس طور پر عہد برآ ہوئیں کہ آج ان کا نام کبھی حسرت اور کبھی افتخار سے لیا جاتا ہے۔ کیا معلوم وہ عہد اور قدآور شخصیتیں اپنے کو بتائے جتائے بغیر جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے ہماری قومی زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے میں معین ہو رہی ہوں اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہماری ساکھ انہی کی دی ہوئی روایات پر قائم ہو۔ اسے ستم ظریفی کہیے یا کچھ اور اس دور غلامی یا محکومی میں جیسی اعلیٰ شخصیتیں، تحریکیں اور ادارے جس کثرت سے انگریزی حکومت کی کم و بیش ایک صدی میں بروئے کار آئے اور جیسی دیرپا اور بیش بہا خدمات انھوں نے انجام دیں اس سے پہلے کے ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شخصیتوں سے قطع نظر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی، انڈین نیشنل کانگریس، علی گڑھ تحریک، ہندوستان کے تقریباً تمام مذاہب جو مدتوں سے جمود و زوال کی زد میں

تھے ان میں تجدد اور اصلاح کی تحریکیں ملک کے نظم ونسق میں محکمی ایسی برکتیں تھیں جن کو مدتوں نظر انداز کیا جا سکے گا۔ برطانوی حکومت کو یہ سٹرفکیٹ دینا مجھے خود عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ غدر کے بعد جب ہندوستان کے نظم ونسق کی ذمہ داری کمپنی سے منتقل ہو کر برطانوی حکومت کے ہاتھ میں آئی تو انگلستان نے بڑی دوراندیشی اور دانش مندی سے اپنے بیش تر نمائندے ایسے بھیجے جو اپنے اپنے فکر وفن کی وادی میں امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ سیاسی بالادستی اور تجارتی استحصال سے قطع نظر جس سے کوئی حکومت خالی نہیں ہوتی، جہاں تک تعلیمی ورفاہی، علمی، حفظِ صحت، نظم ونسق اور مذہب ومشرب میں مکمل آزادی کا تعلق ہے کم وبیش سوسال تک بہترین برطانوی اور ہندستانی ذہن ودماغ نے ہندوستان کی ترقی ونام وری میں حصہ لیا۔ اس صدی کے ابتدائی پچاس سال کے شب وروز سے میں بھی گزرا ہوں جب یہ سنا کرتا تھا کہ غیر معمولی ذہن ودماغ انگریزوں اور ہندستانیوں کا ہر جولاں گاہ فکر وعمل میں ایک دوسرے سے سابقہ ہے اور یہ حرف بہ حرف صحیح تھا۔

اسی دور میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے طور پر برطانوی حکومت کے ساتھ اور اس کے سایہ میں ترقی کے خواہاں اور کوشاں رہے۔ اوّل الذکر سیاسی، تجارتی اور صنعتی محاذوں پر حکومت سے اشتراکِ عمل کے خواست گار تھے اور اس میں پورے طور سے کامیاب ہوئے۔ مدتوں حکمراں رہنے کے بعد مسلمان ہمہ گیر اور ہمہ جہتی زوال کی گرفت میں تھے۔ کچھ دنوں حکومت کے انتقام اور عتاب میں مبتلا رہ کر چھوٹی بڑی نوکریوں پر فائز ہونے لگے جس سے کھوئے اقتدار اور روایات تازہ ہوتی تھیں اور ایک حد تک ان کی تلافی ہوتی تھی۔ یہ رجحان اور راستہ جتنا مضر ثابت ہوا وہ آپ جانتے ہوں گے، شاید جھیلتے بھی ہوں۔ نوکری کے نشہ میں انھوں نے ملک کی وسیع اور اہم تر سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیا اور انگریز، انگریزی اور انگریزی حکومت کی مضحکہ خیز نقالی شروع کر دی۔ اکبر نے اس صورت حال کو پہچانا اور اس کو اپنی طنز وظرافت سے بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے قدیم کو جس طرح جانتے اور موجود کو جس طرح پہچانتے تھے ان کے کلام میں اس کی بڑی موثر مصوری ملتی ہے۔ اکبر اور ان سے پہلے حالی نے مسلمانوں کی غفلت اور بے راہ روی پر اپنے اپنے انداز سے کاری ضرب نہ لگائی ہوتی تو

اقبالؔ کے کلام اور پیام کو اتنی جلد اتنی محکم اور اتنی موثر کامیابی نہ حاصل ہوتی۔ اکبرؔ نے سرسید اور علی گڑھ پر بھی بڑی آزادی لیکن خلوص سے تنقید کی ہے، اور مسلسل کی ہے۔ لیکن اس بنا پر نہیں کہ علی گڑھ جدید تھا بلکہ وہ جدید کو زیادہ قیمت دے کر قبول کر رہا تھا۔ وہ قدیم کے حامی اس لیے نہیں تھے کہ وہ قدیم تھا یا جدید کے مخالف تھے کہ وہ جدید تھا۔ وہ دونوں کی خوبیوں کے موافق اور ان کی خامیوں کے مخالف تھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے مذہب اور مشرقیت کی وکالت اور حمایت پر جتنا زورِ قلم صرف کیا ہے اتنا مغربیت کی ترویج یا ترجیح پر نہیں کیا۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں کی خامیوں کو جتنا مضحکہ سمجھتے تھے اتنا ہی ان کی اساسی خوبیوں کے قائل تھے۔

عزیزو!

ہم سب جانتے ہیں کہ اردو کا خمیر کئی زبانوں اور تہذیبوں سے اٹھا ہے۔ ہندوستان کی چھوٹی بڑی زبانوں اور بولیوں کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں۔ زبانیں ہی نہیں ان کی لائی ہوئی تہذیبوں کے صحت مند عناصر بھی اس میں پیوست ہیں۔ اس صورت حال کے ہوتے ہوئے اردو سے کام لینے والوں کے کچھ سیاسی اور سماجی حقوق ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی ذمہ داری بھی ہے کہ تحریر و تقریر نیز عام گفتگو میں ان زبانوں کی ایسی خصوصیات کو ملحوظ رکھیں جس کا اردو کے بنانے، سنوارنے اور مقبول کرانے میں دخل رہا ہے۔ اس کے بغیر اظہار و ابلاغ کے تقاضے پورے ہو سکیں گے نہ وہ دل کشی آئے گی جو ان لوگوں کو بھی گرویدہ کر لیتی ہے جو اردو سے واقف نہیں ہوتے۔ گو اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ایک مکمل اور مستقل زبان ہے اور اس میں ایسی تبدیلیاں گوارا نہیں کی جا سکتیں جو اس کی صورت و معنی کو بدل دینے والی ہوں۔ کچھ دنوں سے اردو لکھنے پڑھنے والے اس نکتے کو ملحوظ نہیں رکھتے جس کے سبب سے ان کی تحریر بے اثر ہوتی ہے۔ تحریر و تقریر کا مقصد و مصرف خیالات کا دوسرے تک پہنچانا ہی نہیں ہے۔ یہ تو جاہل بھی کر لیتے ہیں بلکہ اس طرح پہنچانا ہوتا ہے جیسا پہنچانے کا حق ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ اپنے سے ناخوش دوسروں سے بھی ناخوش۔ نوجوان لکھنے والوں کی تحریر بے اثر ہی نہیں اکثر ان کا لب و لہجہ بھی صبر آزما ہو جاتا ہے۔ ہر مکمل اور مہذب زبان کی مانند اردو ایک مشکل سنگیت یا سمفنی (Symphony) ہے جس کے بے شمار آداب ہیں جن کو

ملحوظ رکھنا آسان نہیں ہے۔ اسی طرح کی دشواریوں کا سامنا رہا ہوگا جب زبان و بیان کے اکبر جیسے رمز آشنا کو کہنا پڑا ہوگا:

ع اکبر پہ رحم فرما اے خالقِ معانی!

ہر بڑا فن کار اپنے عمل (شاہ کار) کی تکمیل و کامیابی کے لیے خالقِ معانی سے دعا مانگتا ہے جسے کسی عظیم تخلیقی طاقت سے توفیق چاہنا کہتے ہیں۔ فن کار جانتا ہے اور جتنا بڑا فن کار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ اسی وقت ظہور پا سکتا ہے جب غیب سے اس کو روشنی اور رہبری ملے۔ کم و بیش اسی طرح کا احساس یا محرکات ہوتے تھے جن کی بنا پر آج سے پہلے ہمارے شعرا اور مصنفین اپنے کلام کا آغاز حمد و نعت اور منقبت سے کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'اگلے وقتوں کے یہ لوگ' اپنے عمل کو 'عصری حسیات' نہیں بلکہ عبادت یا تائیدِ الٰہی کی خواست گاری جانتے تھے، سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ حمد و نعت کی روایت ختم ہوگئی۔ اسی طرح ایک صنف ساقی نامے کی تھی۔ اس کا محرک ایک گونہ وہی ہوتا تھا جو حمد و نعت کا تھا۔ صرف مخاطب اور اندازِ تخاطب بدلا ہوتا، جیسے شاعر ساقی کی بے دریغ بخشی اور اپنے اندر ودیعت کی ہوئی طاقت کو اُبھرنے، بساطِ کہنہ کو درہم برہم اور نظامِ نو کو قائم اور استوار کرنے کی دعوت دے رہا ہو۔ ہمارے شعرا ساقی نامے پر اب بہت کم طبع آزمائی کرتے ہیں۔ حالاں کہ زمانہ اور زندگی جس عالم آشوب فشار سے گزر رہی ہے، اس میں ان کو سب وشتم، بے زاری، بے دلی اور بے غیرتی کا بہانہ کیے اور سہارا لیے بغیر زمانے سے نبرد آزما ہونا چاہیے تھا، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ساقی نامہ لکھنے کے لیے ایمان کی روشنی اور یقین کی محکمی کے علاوہ جس غیر معمولی حسنِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے وہ شعرا میں بہت کم نظر آتی ہے۔ اقبال نے ساقی نامے کا معیار اتنا بلند کر دیا ہے کہ اس کی گونج کبھی کبھی رزمیہ کے دھماکے تک پہنچتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اب تو کوئی غیر معمولی ہی صلاحیتوں کا شاعر ہوگا جو ساقی نامہ کی طرف مائل ہونے کی جرأت کر سکے گا۔ اقبال نے بیش تر اصنافِ شاعری کا معیار اتنا جلد اور اس درجہ بلند کر دیا کہ متوسط درجہ کے شاعر کے لیے اس صنف میں طبع آزمائی تقریباً ناممکن سی ہوگئی ہے۔ اس لیے بعد کا متوسط اور معمولی شاعر جو چاہے کرے اور کرتا رہے۔ عظیم شاعر کے سامعین اس کے بس کے

نہیں۔اس موقع پر ایک بات خاص طور سے محسوس ہوتی ہے کہ یہ شعر:

الفاظ سے نہیں ہے تسکین اس کے دل کو
اکبر پہ رحم فرما اے خالقِ معانی

اکبر نے اس زمانے اور اس سوسائٹی میں کہا کہ جب ان کے اردگرد ایک خاص ڈھرّے کی شاعری بہت مقبول تھی۔ روشنی اور رہبری کے لیے خالقِ معانی سے اکبر کی یہ ساجت اردو شاعر اور شاعری دونوں کے لیے ایک نئی آواز یا دعائے نیم شبی وگریۂ سحری تھی!

اکبر کی چند نظموں کے مطالعہ کی آپ سے خاص طور پر فرمائش کروں گا، مثلاً سدے Southey کی 'آبِ لڈور کی روانی' دہلی دربار میں جس کا ایک مصرعہ ہے۔ ''ہال میں ناچیں لیڈی کرزن''۔ 'برقِ کلیسا' چاہتا ہوں کہ کسی وقت اردگرد کے فساد وفتور سے یکسو ہو کر مذکورہ نظموں کا آپ مطالعہ کریں، خوش ہوں اور فخر کریں کہ اکبر نے زبان و بیان، فن وفکر، تخیل وترصیع اور طنز وظرافت کے کتنے مشکل لیکن دل کش مرقعے پیش کیے ہیں۔ مثلاً 'دہلی دربار' میں آپ دیکھیں گے اکبر نے کس غیر معمولی قدرتِ بیان سے اس وقت کے ہندوستان اور دہلی دربار کی سطوت وشوکت اور اس سے متعلق دور اور نزدیک کے مختلف احوال اور مناظر کو کیسے ترشے ہوئے موزوں ومختصر الفاظ میں پیش کیے ہیں اور کس سحر وصناعت سے دربار کی فضا کو لیڈی کرزن کی رعنائی وزیبائی اور رقص ورنگ کے فانوس میں پیش کیا ہے۔ جو مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں، کون کس حال میں ملتا ہے اور کس پر کیا گزر رہی تھی ان سب کی تصویر وتصور کو نظم کے جس (Rhyme & Rythm) میں ڈھالا ہے اس سے کبھی کبھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے وہاں کا ہر سین اور سماں ہمارے سامنے ہو۔ 'سامان صد ہزار گلستان کیے ہوئے'! ماضی، حال اور مستقبل پر بڑا شاعر اسی طرح حکمرانی کرتا ہے اور ان کو زمان ومکان کی گرفت سے آزاد کر دیتا ہے۔ پھر ان سب سے دامن چھڑا کر اپنی اپنی جادو کی چھڑی یا جادو کی پڑی لے کر اسٹیج سے رخصت ہو جاتا ہے۔ جیسے ہم نے یا اس نے جو کچھ دیکھا وہ خواب اور جو سنا وہ افسانہ تھا۔ یعنی:

سنتے ہیں ہم تو یہ افسانے
جس نے دیکھا ہو وہ جانے

اسی موقع پر اکبر کا یہ لازوال شعر بھی نہیں بھولتا جو اس عالمِ ہست و بود کی ایک ایسی حقیقت کے انکشاف واقرار پر مبنی ہے جس سے آج تک نہ کوئی انکار کر سکا ہے اور نہ اس سے باہر ہو سکا ہے۔ پھر لفظ اور لہجہ کا بے مثل امتزاج و آہنگ ۔

محفل ان کی، ساقی ان کا
آنکھیں میری، باقی ان کا

عزیزو!

اکبر کے آخر کے چار اشعار (تاثیر دکھا تقریر نہ کر) سے کم و بیش نصف صدی پہلے کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ اس کا کہیں اور بھی ذکر کر چکا ہوں، ایک دفعہ اور سہی۔ ایم-اے-او کالج نان کوآپریشن کی زد میں آیا۔ ذاکر صاحب اور میں صاحب باغ میں ساتھ رہتے تھے۔ نان کوآپریشن کی تحریک کے سلسلے میں تقریباً ہر روز یونین میں جلسے ہوا کرتے جس میں ہم دونوں تفریحاً شریک ہوا کرتے۔ صوبہ سرحد کے ایک بھاری بھرکم دوست اور ساتھی تحریک کے حامی تھے۔ ہم سب ان کی فہم و فراست کے اتنے نہیں جتنے ان کے اخلاص اور تن و توش کے معترف تھے۔ ایک بار ہم دونوں کو دیکھ کر فرمایا، آپ کیوں تکلیف فرمایا کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے جواب دیا۔ ''خان صاحب، یوں ہی چلے آیا کرتے ہیں۔ معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے۔'' ذاکر صاحب کی زبان پر آخر عمر تک یہ فقرہ بڑی تازگی اور دل آویزی سے اکثر آیا کرتا تھا۔ اس برجستگی سے جیسے اس موقع پر پہلے پہل استعمال میں آیا ہو۔ رات گئے صاحب باغ واپس آجاتے۔ ڈائننگ ہال کا اتنا ہی اور ویسا ہی کھانا اسی آداب سے کھایا جاتا جس طرح سے شاید آج بھی کھایا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے قدیم الایام اور ناقابلِ انکار اقلیتی کردار کو جن مصالح یا مصطلحات کے الٹ پھیر سے کچھ کا کچھ کر دیا گیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ڈائننگ ہال کے کھانوں کا ذائقہ، مقدار، تاثیر بحیثیت مجموعی اس کے کردار یا کارنامے کو آج تک کوئی طاقت نہیں بدل سکی۔ نمک کا کردار بدلنا یوں بھی آسان نہیں ہے اور کرداروں سے مسلسل محرومی کو دیکھتے ہوئے ڈائننگ ہال کے اس کردار یا کرشمہ کو غنیمت جانیے۔ اپنے اپنے کھانے لے کر ہم خیال دوست بھی آجاتے، انگیٹھی پر روٹی اور سالن گرم ہونے لگتا اور یونین

کے جلسوں کی کارروائیوں پر تبصرہ شروع ہو جاتا۔ پھر دوسرے مشاغل میں مصروف ہو جاتے۔ میں تو جیسا تھا ویسا ہی آج ہوں، اگر بدتر نہیں، ذاکر صاحب کو بھی اس تحریک سے بظاہر کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ مہاتما جی تشریف لاکر واپس جا چکے تھے۔ ہر چیز بظاہر اپنی جگہ پر مستقل معلوم ہوتی تھی۔ رات کو ایک گونہ اطمینان کا سانس لیا جاتا کہ آج کا دن بھی بخیریت گزر گیا۔ لیکن بہر حال اور بالآخر وہ ساعت آئی اور نان کوآپریشن کی تحریک کالج میں غیر معمولی حد تک کامیاب ہوئی۔ مولانا محمد علی کی تقریر ہوئی، اس گونج گرج اور وزن و وقعت سے جس کی ہم توقع کرتے تھے۔ لیکن حاضرین پر وہ اثر نہیں ہوا جس کا خیال تھا۔ مولانا شوکت علی کی باری آئی، تقریر شروع کی، اسی تیور، لب ولہجہ، ہیئت وحلیہ اور دھوم دھاکے سے جو اُن سے مخصوص تھا۔ تقریر ختم ہونے کو آئی اور بے اثر محسوس ہوئی۔ اب مولانا نے اکبر کے مذکورہ آخری چار شعر پڑھے۔ ایک ایک کر کے ایک خاص کیفیت کے ساتھ طرح طرح کی جنبشِ چشم وابرو و آواز کے اتار چڑھاؤ سے جیسے ان اشعار کو متحرک اور متشکل کر دیا ہو۔ تقریباً دس منٹ یہ عمل جاری رہا۔ یہ نشانہ بھی خالی ہوتا نظر آیا تو ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

پڑھتے ہوئے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ تیر بھی خالی گیا ہو۔ ارادہ کیا کہ اُٹھوں اور ذاکر صاحب کے ہمراہ صاحب باغ واپس جاؤں۔ پہلو میں نظر ڈالی تو ذاکر صاحب کی حالت کو متغیر پایا، خاموش آنکھیں پُرنم، گریہ گلوگیر، سناٹے میں آ گیا کہ یہ کیا ہوا۔ آج یہ شعر یاد آئے تو بے اختیار ذاکر صاحب کی شائستگی، شگفتگی، شرافت، دل نوازی، ذہانت و فطانت یاد آ گئی جو ان کی شخصیت تھی اور یہی نہیں چاہتا تھا۔

عزیزو!

جس باطنی اور بیرونی معلوم اور نامعلوم احوال کے طفیل بے اندازہ و بے کراں مدتوں بعد انسان، انسان کہلایا جن کو ترقی دے کر اور ان سے ترغیب و طاقت پا کر کہاں سے کہاں پہنچا، ان سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ تجسّس، تجربہ اور تنظیم کے مسلسل اور غیر منقطع فیضان سے جن

سے غالباً تمام دوسری مخلوقات وموجودات محروم ہیں، ترقی کی کتنی راہیں اور کھلیں گی، کھلتی رہیں گی اور انسان کی نوع بہ نوع فتوحات میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ کتنا عظیم، کتنا بے حساب و بے امان، پُر اسرار، نا قابلِ فہم لیکن اتنا ہی نا قابلِ انکار نظام زمان و مکاں، غیب وشہود، خوب و ناخوب، چون و چرا اور ان سب پر محیط وحاوی وہ اعلیٰ آخری و ابدی قدر و قیمت ہے جس کے احکم الحاکمین ہونے کی شہادت عظیم ترین اور سادہ و معصوم ترین انسان کے دل و نگاہ یکساں طور پر روزِ ازل سے دیتے آئے ہیں اور یوم آخر تک دیتے رہیں گے۔ کیا یہ سب کھلی ہوئی بشارت اس کی نہیں ہے کہ اس بڑے کل یا قدرت کاملہ کا جس کا نہ شمار کیا جا سکتا ہے نہ احاطہ۔ اس کا ایک جز شاید جزو اعظم ہم ہیں۔ اس لیے ہم پر وہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو ہم اس نسبت سے قبول کر چکے ہیں۔ یہ ذمہ داریاں ہم کو وہ فضیلت بخشتی اور اس منزلت پر پہنچاتی ہیں جہاں انسان کے علاوہ شاید اور مخلوق نہیں پہنچ سکی ہے۔

اللہ اور انسان کا جیسا رفیع الشان اور اتنا ہی نا قابلِ بیان تصور دینِ متین نے دیا ہے وہ شاید کہیں اور نہ ملے۔ قرآن حکیم اور رسالت مآب اس کی واضح مثال اور ثبوت ہیں۔ خدا کے صفات وثبوت کے بارے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں اور کہی جاتی رہیں گی۔ لیکن شمہ برابر بھی تبدیلی یا تحریف سے پاک کلامِ الٰہی کا متبع مفسر و منادو گوشت پوست کا انسان اور تاریخ کی مسلم الثبوت شخصیت جس کی دینی و دنیوی دونوں کے زیادہ سے زیادہ واقعات انتہائی چھان بین اور احتیاط کے بعد قلم بند ہی نہیں بلکہ ان پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے والے دنیا کے ہر خطّہ میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور وہ بے مثل و بے چون و چرا ہے۔ ایسے کلام اور اس کے بہترین کردار کا اثر شعروادب اور زندگی وزمانہ پر کیا صحت منداور شان دار رہا ہوگا۔ اس کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر قوم کا شعروادب نظری اور عملی دونوں اعتبار سے اسی قدر و قیمت کا ہوتا ہے جتنا اور جیسا اس کا مذہب و اخلاق۔ کیا آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ کتنی سچی اور سادی یہ باتیں ہیں، لیکن اس سے کتنے بے خبر اور بے پرواہ ہم ہیں۔

یہاں میرا مقصد آپ کو کچھ اس طرح کے مقامات کی سیر کرانا ہے جن سے سالک کو تصوف کے سفر میں سابقہ ہوتا ہے جن کا اظہار 'ہمہ اوست، ہمہ از اوست اور ہمہ باوست' کی

اصطلاحات سے کیا جاتا ہے۔ میں صوفی نہیں ہوں، آپ بھی زیادہ نہ ہوں گے۔ اس لیے تصوف کے حرم میں آسانی سے نہ آپ کا گزر ہو سکتا ہے نہ میرا۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ ہم کو آپ کو حالات وحقائق کا معمولی سے معمولی بھی جو علم دیا گیا ہے اس سے اس کائنات کے بامقصد اور بابرکت ہونے کا احساس دلاتا ہے جس کے صحیح، صالح، عظیم اور وراء الوراہونے کی تصدیق ایسے ہی بے شمار برگزیدہ شخصیتوں نے ابتدائے آفرینش سے آج تک کی ہے اور یقیناً ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ کیسے یقین کرلوں یا آپ کو یقین دلاؤں کہ یہ نفوس قدسیہ کسی منظّم فریب کا شکار ہوتے رہے ہیں یا ہم کو اسی نوع کے منظّم فریب میں مبتلا ہو جانے اور رہنے کی دعوت دے رہے ہوں۔ ہزار پانچ سو سال کی بات نہیں ہے، کم سے کم پانچ ہزار سال سے یہی قصہ چلا آرہا ہے۔ ایک جگہ نہیں دنیا کے ہر متمدن گوشے سے اسی صداقت کی اذان دی گئی اور نماز پڑھی گئی۔ ایسا ہوتے ہوئے مذہب واخلاق اور ان کے دیے ہوئے اعلیٰ اقدار سے انحراف کیوں اور کیسے۔ اسی طرح جس اچھے اور بڑے کام کرنے کی توفیق نہ ہو اس کے استہزا کی جسارت کیوں اور کیسے؟ یہ شخصیتیں سائنس اور ٹیکنالوجی اور دیگر علوم وفنون کے ہر دور اور ان تمام مادی اور ذہنی انقلابات سے گزرتی رہی ہیں جن سے ہم آپ گزر رہے ہیں، لیکن اللہ اور انسانیت کا ان کا جو عقیدہ رہا اس میں سرمو فرق نہیں آیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بیش تر اصحاب فکر ونظر کو کم یا بیش مذہب کا معترف پایا گیا۔ لیکن کسی مسلمہ مذہبی شخصیت کو جلد یا بہ دیر خدا سے منحرف نہیں دیکھا گیا۔ اس لیے کہ انسان کی تشفی انسانیت ہی سے ہو سکتی ہے اور مقصود زندگی بھی انسانیت ہی ہے۔

ان معروضات کو اگر آپ مُلّا اور صوفی کے اوراد وظائف قرار دے کرنا قابلِ التفات سمجھتے ہیں تو عجب نہیں، لیکن حقیقت کا خاصہ یہ ہے کہ ایک سے انکار کیجیے تو دوسری اس سے بھی زیادہ شدت سے سامنے آتی ہے۔ اگر آپ اپنے کو ایک عظیم کل، عظیم جزو سمجھنے پر آمادہ نہیں ہیں یا اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے معذور ہیں تو یہ بتائیے کہ اس دانش کدہ یا ایسے ہی کسی اچھے اور بڑے ادارہ کے موجودہ یا گذشتہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے اپنے کو کس حد تک تعلیم یافتہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ سند یافتہ اور تعلیم یافتہ یا عبادت گزار اور عبادت شعار میں جو فرق ہے اس سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے کا المیہ ہماری آنکھوں کے سامنے

ہے۔ علم کے تقاضوں، ذمہ داریوں اور برکتوں سے ناآشنا یا محروم کو تعلیم یافتہ نہیں کہیں گے۔ ٹھیک اسی طور پر جیسے مقررہ عبادت سے بندھے ٹکے، میکانکی طور پر سبک دوش ہو جانے والے کو عبادت شعار نہیں بلکہ صرف عبادت گزار کہہ سکتے ہیں۔ کوئی عبادت جو خلق کی خدمت سے بالا یا بے بہرہ گزر جائے عبادت نہیں نافہمی یا غلط روی ہے جس میں ہمارے بیش تر ساتھی مبتلا ہیں۔ اس غلط روی کے ہوتے ہوئے معاوضہ یا اجر کی اتنی توقع نہ رکھنی چاہیے جتنی مواخذہ کی۔ اسی طرح ہر تعلیمی ادارے کے فارغ طلبا حکومت اور معاشرے پر ایک خطرناک اور ناقابلِ برداشت بار ہیں۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہونے کی مانی ہوئی اقدار سے بے گانہ یا محروم نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ تعلیم یافتہ کہے جانے کی بڑائی اور ذمہ داری کا پورے طور پر احساس رکھتے ہیں۔ تعلیم یافتہ (Educated) کہا جانا معمولی امتیاز اور ذمہ داری نہیں ہے۔ جس طور پر ایک عظیم کل کا عظیم تر جز سمجھنا اور سمجھا جانا معمولی امتیاز اور ذمہ داری نہیں ہے۔ کتنی عجیب یہ بات معلوم ہوگی اگر کوئی کہے کہ ہم میں بے شمار تعداد ایسوں کی مل جائے گی جو تعلیم پا کر بھی تعلیم یافتہ نہیں کہے جا سکتے۔

عزیزو!

علی گڑھ کی جن حالات میں تاسیس ہوئی، اس کے سامنے جو مقاصد تھے، اس کا اچھا چاہنے والوں نے اس کو جس راستے پر چلایا اور جس طرح پر اس کو رکھا، اس پر جو کچھ گزری، اور جس گزرگاہ پر آج وہ ہے ان کے پیشِ نظر جو کچھ سمجھ میں آیا، اس کو واضح کرنے کی گذشتہ اوراق میں یا جہاں تہاں دوسرے مواقع پر جو کوشش کی گئی وہ موجودہ ناسازگار حالات میں ایسے ہیں جو اس ادارے، اس کے طلبا، اساتذہ اور خیر اندیشوں کی تشویش کا باعث ہو رہے ہیں۔ اس لیے اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ ہم صورت حال پر سنجیدگی سے سوچیں، حقیقت پسندی کو نظرانداز نہ کریں اور حزم وتحمل سے کام لیں۔ جب ایک طرف بددلی اور دوسری طرف بدگمانی پھیلی ہو اس وقت ایسا کرنا آسان نہیں ہے، لیکن اتنا ضروری ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اس طرح بلکہ ان ناسازگار حالات میں ہم نے یا ہمارے اسلاف نے تاریکی کو روشنی سے بے دلی کو آرزومندی سے اور پستی کو سربلندی سے بدل نہ دیا ہو۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ حالات بدلنے اور سدھرنے لگے ہیں۔ البتہ اس نکتے کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف (اقبالؔ)

آج دنیا کے ملکوں میں معاشروں میں خاندانوں اور افراد میں جو عالم گیر ناراضی، ناصبوری اور ناامیدی پھیلی ہوئی ہے اور سزا و ناسزا کا فرق کم سے کم رہ گیا ہے اس سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ اس سے بھی بے خبر نہ ہوں گے کہ امن و آسودگی، عالی ہمتی اور راست بازی کا وہ احساس یا اہمیت باقی نہیں رہی جن کے بغیر زندگی کا کوئی معیار متعین ہوتا ہے، نہ موقف۔ ایسا کیوں ہے؟ اس پر دنیا کے اہلِ فکر اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں، اور کرتے رہتے ہیں۔ میں ان کو نہیں دُہراؤں گا اس لیے کہ ان کا اثر نہیں دیکھتا۔ شاید اس لیے کہ آپ کو ان پر یا خود اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ صورت حال یہ ہے کہ طبیب مریض کی تکالیف کی تشخیص اور اس کا علاج صحیح تجویز کرتا ہے، لیکن مریض کی دیکھ بھال یا نرسنگ جن کے سپرد ہوتی ہے وہ اپنے مصالح اور منافع کو مریض کے فوز و فلاح پر مقدم رکھتے ہیں۔ آپ نوجوانوں کے بہترین مقاصد کا انصرام اب خاندانوں، تعلیم گاہوں اور علم و فضل کے اکابر کے مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی فیضان سے نکل کر سیاسی طالع آزماؤں اور مہم جویوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ کیسی متاع کیسے ہاتھوں میں!

کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آیا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ نے بھی محسوس کیا ہو کہ وہ حکومت اتنی برسرکار و اقتدار نہیں ہوتی جو بظاہر و باضابطہ ہماری آنکھوں کے سامنے (مرئی) ہوتی ہے بلکہ وسیع اور طاقت ور صنعتوں کے وہ اجارہ دار ہوتے ہیں جو دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن دخیل ہر جگہ ہوتے ہیں جیسے وہ حقیقی حکمراں ہوں اور موجودہ و مرئی حکومت ظلّی یا ذیلی (Shadow Govt.) ملک میں چھوٹی بڑی جتنی اور جماعتیں یا ادارے ہوتے ہیں خواہ ان کے اغراض و مقاصد کتنے ہی مختلف و متضاد ہوں ان کی آبیاری یہی سرمایہ دار کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ تمام جماعتوں اور اداروں سے اپنے مقاصد کے لیے یکساں تعاون حاصل کرتے رہتے ہیں جو بجائے خود ایک دوسرے کے ضد ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال ایسی ہے جو حکومت کو صحت مند رہنے دیتی ہے نہ مطمئن و مستحکم، ان ہی میں وہ شیخانِ حرم ہوتے ہیں جن کے بارے میں اقبالؔ نے کہا ہے کہ وہ اپنی غرض کے لیے ''گلیم بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا'' بیچ ڈالنے میں تامل نہیں کرتے!

ملک کی سب سے بڑی، سب سے قیمتی لیکن سب سے جلد متاثر اور مشتعل ہونے والی جماعت آپ نوجوانوں کی ہے۔ یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ گرم گرم سوندھے اخروٹ کسی کے حصے میں آتے ہیں اور بھوبھل سے ہاتھ آپ کے جھلتے بھلتے ہیں۔ حکومت یا نظم ونسق معتبر اور مستحکم نہ ہو تو آپ کا یہ مزاج اور میلان ملک کی سلامتی اور سالمیت کے لیے کوئی معمولی خطرہ نہیں ہے۔ ایسی حکومت یا جماعت ہر قیمت پر ہمہ وقت ہر دشمن یا دوست کی تائید حاصل کرنے کے لیے آمادہ رہتی ہے۔ اس لیے وہ کسی غیر صالح سرگرمی کو روکنے یا دور کرنے کی جرأت کر سکتی ہے نہ سکت رکھتی ہے۔ یہ حکومت عوام کو صحیح اور سیدھے راستہ پر نہ رکھ سکتی ہے نہ لا سکتی ہے۔ اس لیے خود عوام اس کو صحیح اور سیدھے راستے پر نہیں رہنے دیتے۔ معتبر حکومت وہ ہے جو آئین وضوابط کو نہ صرف ایمان داری سے ماننے بلکہ اس میں ایسی صلاحیت اور طاقت ہو کہ وہ ان کو منوا بھی سکے۔ مایوس کن اور خطرناک حالت وہ ہوتی ہے جہاں حکومت اپنے بنائے ہوئے آئین وضوابط کی حفاظت کر سکتی ہے نہ اس سے سرتابی کرنے والے کی سرزنش۔ جہاں حاکم سب ہوں وہاں محکوم کو اشرف المخلوقات ہی کہہ سکتے ہیں۔ اب تک ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ کمزور طاقت ور سے صلح کر کے پناہ پاتا ہے یا اس سے صلح کر کے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جہاں تہاں دیکھنے میں آتا رہتا ہے کہ جنگ ہو یا صلح کمزور ہی خسارہ میں رہتا ہے!

عزیزو!

سیاست نہ میرا مضمون رہا ہے نہ میلان۔ میں نے جو کچھ جانا اور مانا وہ کلیتہً علی گڑھ کی دین ہے۔ اس علی گڑھ کی جس کو جاننے ماننے اور اس پر فخر کرنے والے روز بروز کم اور کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ اس کا ماتم نہیں کرتا جو بھی اور جتنے بھی رہ گئے ہیں اور یہ ہمیشہ رہیں گے وہ اپنی وضع اور وفاداری کے اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ بلند حوصلگی، عزائم اور کارکردگی اعلیٰ کیریکٹر اور روایات کی رو سے علی گڑھ نے عظیم اُمتوں کی تاریخ اور تقدیر میں جگہ پائی ہے۔ لیکن بڑے اندیشہ اور حسرت سے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ کچھ دنوں سے آپ طالب علموں نے اپنے کو جس روپ اور رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے اس سے آپ کا بھلا چاہنے والے مایوس اور مغموم رہنے لگے ہیں۔ یہ حال اپنے ہی دیار کا نہیں، مغربی ممالک کا بھی ہے جو علم وفن، تہذیب و

طاقت، دولت اور ڈسپلن میں یکتائے روزگار مانے جاتے ہیں۔ ہم کو کچھ نہیں میسر ہے اس لیے بیزار ہیں۔ ان کو سب کچھ نصیب ہے لیکن نامرادی اور ناصبوری سے دوچار ہیں۔ نوجوانوں کو اس وباء سے کس طرح بچایا جائے۔ شائستہ دنیا کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ آپ بھی اس صورت حال پر شاید فخر نہ کرتے ہوں، بددل اور بیزار یا تھک ہار کر نوجوانوں کا الم اور اذیت سے لذت گیر ہونا بڑے خطرے کی نشانی ہے۔

یہ روش آپ ایسے نوجوان طالب علموں کی نہیں ہونی چاہیے جن کا ماضی شاندار رہا ہو اور جن کے اسلاف نے انسانیت کی حمایت وحفاظت اور اس کا نام اونچا اور روشن کرنے کے لیے نفس کی ہر طرح کی لذت وترغیب سے منہ موڑ کر زندگی کے تند وتلخ کو دلیری اور خندہ پیشانی سے گوارا کیا تا کہ آنے والی نسلیں اس سے تازگی توانائی اور تقدیس پائیں۔ ذمہ داری کا یہ کتنا نازک اور گراں قدر احساس تھا جو بطور امانت آپ تک پہنچا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہم اپنے طرح طرح کے جن کارناموں، خدمات اور خوبیوں پر فخر کرتے ہیں وہ ہمارے بزرگوں کی کس محن ومشقت ایثار وقناعت اور سخاوت وشجاعت کا نتیجہ ہے۔ آپ نوجوان ان کو بھلانے مٹانے یا داغ دار کرنے کی رسوائی اپنے سر نہ لیں۔ جو قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا سکتی ہے وہ نہ خود کسی کارنامے کے اہل ہوگی نہ کسی اور کی خدمات کی اہمیت اور بڑائی کا احساس کر سکتی ہے اور بالآخر صرف نحوست اور نامرادی کا نشان بن کر رہ جاتی ہے!

طلبا اور اساتذہ باعتبار اسناد، اہلیت اور تعداد، علوم وفنون کے شعبہ جات اور ان کی کارکردگی، عمارات، معمل اور ان کے ساز وسامان کھیل اور تفریح کے سبزہ زار اور خیابان، مباحثہ ومذاکرہ کے لیے یونین کلب اور موخر الذکر دونوں میں آپ کی نام وری ڈائننگ ہال کی مخصوص اہمیت روایت ان سب کو نظر میں رکھتے ہوئے ہماری یونیورسٹی ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں کسی سے کمتر نہیں ہے۔ بیش تر سے بہتر وبرتر ہے۔ اس میں بعض امتیازات ایسے ہیں جن کی بنا پر اس نے اعلیٰ تعلیم گاہوں میں ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان امتیازات سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ وہ لوگ اور زیادہ ہیں جو اس کی مخالفت کو اپنی عبادت سمجھتے ہیں۔

علم و تعلیم کو زیادہ سے زیادہ اہمیت اور اپنے عہد اقبال میں زیر نگیں اور زیر اثر ممالک اور اقوام میں اس کو عام کرنے اور مقبول بنانے میں جو امتیاز مسلمانوں کو رہا ہے اس کی مثال اس عہد اور اس سے ماقبل کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ انھوں نے علم کی روشنی اس عہد میں پھیلائی جو یورپ اور اس کی تاریخ میں دورِ ظلمت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ان کے فاتحانہ عہد کا علمی اور تہذیبی کارنامہ تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد یکسر بدلے اور بگڑے ہوئے حالات میں بھی علی گڑھ نے سرسید کی قیادت میں مسلمانوں کو مغرب کے فکر و فن سے اچھی طرح آشنا کیا اور نئے نظامِ تعلیم و تربیت سے ان کو فائدہ پہنچایا۔ اسی طرح ملک کے ساتھی باشندوں کو اس ادارے سے فیض یاب ہونے کی آزادی ہی نہیں بلکہ ان کو دعوت دی۔ مسلمانوں نے اس ادارے کو جس زمانے اور حالات میں قائم کیا ان سے زیادہ دکھ، دشواری اور دشمنی کی زد میں شاید ہی کوئی اور رہا ہو۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے سوکھے پھیکے گزارے میں ان لوگوں کو بھی شریک کیے رکھا اور آج تک ایسا ہی کرتے رہے ہیں جن کو سب کچھ میسر تھا اور آج بھی ہے۔ علی گڑھ کا یہ اتنا بڑا ایثار ہے جو ملک کے کسی اور ادارے کے حصے میں نہیں آیا۔

اقلیت کے اس ادارے سے اکثریت کے جتنے افراد فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور فائز المرام ہوئے اور برابر ہوتے رہتے ہیں، ان میں کچھ ہی ایسے ہوں گے جو اس ادارے کی ابتلا و آزمائش میں سینہ سپر ہونا تو درکنار اس کے لیے چند کلمات خیر ہی کہہ سکے ہوں۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں تک ڈسپلن سے انحراف کا تعلق ہے چند برسوں سے طلبا کا جارحانہ، اکثر مجرمانہ رویہ جس طرح ملک کے نظم و نسق میں خلل انداز ہوتا رہا اس کے مقابلے میں علی گڑھ نے تعلیمی و تہذیبی روایات کو زیادہ سے زیادہ برقرار رکھنے کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے اس کی داد ہم کو کبھی نہیں ملی۔ ملزمان تربیتی کی حیثیت سے اکثر سرفراز ہوتے رہے۔

عزیزو!

سرسید نے اس ادارے کو جن حالات کے ماتحت قائم کیا اور جس طرح اس ادارے نے ان حالات کو سدھارنے میں مدد پہنچائی اور ہم سب کو امید، حوصلہ، وسیع المشربی اور علم و فن کو فروغ دینے کی زندگی اور ذمہ داری سے ہم کو ہم کنار کیا۔ نیز سرسید کی جیسی عظیم شخصیت تھی اس

کے پیش نظر اس کی جرأت ہوئی کہ آپ کو وقت کی نزاکتوں کا احساس دلاؤں اور کچھ کر دکھانے کی آپ سے درخواست کروں۔ ملک کی تمام چھوٹی بڑی تعلیم گاہوں میں اور ان کے باہر بھی کچھ نوجوانوں بالخصوص طلبا نے جو بدحالی پھیلا رکھی ہے اور اپنے ہی اٹھائے ہوئے طوفانوں کے جس طور پر تھپیڑے کھا رہے ہیں وہ صرف آپ کے تعاون و طرز عمل سے دور کی جاسکتی ہے۔ سو سال پہلے سرسید نے مسلمانوں کو دکھ اور درماندگی میں پاکر جن خطوط اور عزم و ایمان کے ساتھ اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔ آج اس سے زیادہ سنگین آزمائش کا سامنا ہے۔ ہمارے سامنے سوچا سمجھا ہوا کوئی ہمہ جہتی پروگرام یا منصوبہ ہے نہ کوئی محکم و معتبر قیادت میسر ہے۔ ایسے میں ہمارا آپ کا ذہن بے اختیار علی گڑھ کی طرف جاتا ہے کہ یہ مہم علی گڑھ کے دیے ہوئے سایہ اور روشنی میں انجام پاسکتی ہے۔ کام بہت اچھا، بہت بڑا، بہت مشکل اور بہت دنوں تک امید و استقامت سے کرنے کا ہے۔ ایسے کام کل نہیں تھوڑے سے ہی انجام پا جائیں تو اس کو کارنامہ کہیں گے مایوسی و تاریکی دور ہونے لگے گی اور حوصلے بڑھ جائیں گے۔ آپ ہی کے نہیں چھوٹے بڑے ہم سب کے ہر طرف تاریکی چھائی ہو اور فتنے بیدار ہوں اس میں اضافہ کرنا اور ہجوم کے ساتھ ہولینا علی گڑھ کو زیب نہیں دیتا۔ ایسا کریں گے تو آئندہ نسل کو کیا جواب دیں گے۔ اسی طرح جواب دہی کا ہمارا آپ کا مذہبی تصور یوم الحساب ہے! اقبالؔ کا یہ شعر آپ کے ذہن میں ہوگا۔

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

شعر پرانا ہے۔ جب ہم آپ اور ہماری طرح بہت سی دوسری قومیں اور ممالک آزاد نہیں ہوئے تھے اور فیملی پلاننگ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ چنانچہ 'دخترانِ مادرِ ایام' نے افزائش نسل کے جیسے جیسے گل کھلائے ان کے باغ و بہار ملاحظہ ہوں، لوٹ مار، اغوا، خوں ریزی، آتش زنی، زبردست زیردست آزاد حکومتوں کا جدل و جدال اور اقوام و ممالک کا آئے دن زیر و زبر ہوتے رہنا اور سفاکی کے سانحے، ناقابلِ برداشت مہنگائی، بے شمار بچوں، بوڑھوں کا بھوک اور بے بسی سے مرجانا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے روزگاری، املاک کی تباہی، جارحانہ جلوس، ہڑتال، فسادات، عام زندگی کے نظم میں یاس و ہراس کا دخل، طلبا کی شورش، تعلیمی معیار کی پستی،

ذخیرہ اندوزی، کھانے پینے کی اشیا اور دوا داروں میں ملاوٹ، تباہ کن منشیات کا عالمی کاروبار، نوعمر لڑکے لڑکیوں کا ان کا عادی ہوتے جانا، رشوت ستانی، اقربا پروری، بے غیرتی خاص و عام کا اس مواخذہ سے بے فکر اور محاسبہ سے آزاد ہونا، مذہب، اخلاق اور تہذیب سے بے گانگی، ہر ممکن جنسی ترغیب و تشنگی کی ہمہ وقت ہر طرح اور ہر قیمت پر آسودگی، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ اور اقدار عالیہ کی بے حرمتی، نامرادی، نحوست و نجاست کے مارے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی گلی کوچوں میں پھرتی بھٹکتی ہوئی ٹولیاں اور ان سب پر فوق برطانوی پارلیمنٹ اور دوسرے ایسے اداروں کے وہ قوانین جو قبیح جنسی بدکاریوں اور شناعتوں کو سند جواز دیتے رہتے ہیں!

جہاں جایئے جدھر دیکھئے کم و بیش یہی عالم ہے۔ ہر کلفت سے بچنے اور ہر عیش سے لذت یاب ہونے کی جو سہولتیں فراہم ہیں ان پر ہر حال میں قابض ہو جانے کی ہوس اور اس مقصد کے حصول میں دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے میں تمام ممنوعات کو نظر انداز کر دینا جیسے زندگی کا مقصدِ اوّلین قرار پا چکا ہے۔ زندگی کو یکسر فراغت عشرت اور بے غیرتی کا گہوارہ بنانا اور ہر دکھ درد سے منہ موڑ لینا شقاوت ہے۔ اس سے شدید ردِّ عمل کا سامنا ہوتا ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اس طریقِ زندگی سے اس حیرت انگیز اور عظیم توازن میں خلل پڑتا ہے جس کو نظامِ حیات و کائنات کہتے ہیں۔ اس اختلال کو ہر شریعت میں گناہ قرار دیا گیا ہے۔ موجودہ رستا خیز میں اس کے الم ناک شواہد ہر جگہ ملیں گے۔

آج کل امریکہ کے چھپے اور کھلے جبر و جبروت کا جو عالم ہے اس سے کون نہیں واقف ہے۔ محتاجِ ترقی یا ترقی پذیر ممالک اس کے ہاتھوں میں صیدِ زبوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کی سیاسی تنظیم اور بالا دستی حرب و ضرب کی قوت، سامانِ خورد و نوش، عیش و نشاط کی فراوانی، صنعت و حرفت، علم و فن کو فروغ، سائنس اور ٹیکنالوجی کے بے مثل کارنامے، نشر و اشاعت، مواصلات کی حیرت انگیز سہولتیں اور کیا کچھ اور نہیں، ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھنے میں یہی آ رہا ہے کہ امریکہ کے باشندے (اور یورپ کے بھی) زندگی کی طرف سے ہم نیاز مندوں سے کچھ زیادہ ہی بددل اور بیزار ہیں۔ حکومت، معاشرہ اور فرد میں وہ یک جہتی اور ہم انحصاری نہیں ہے جو زندگی کو گوارا، بامقصد اور برگزیدہ بناتی ہے۔ اکثر ایسا محسوس

ہوا ہے جیسے کہ دورِ وحشت ہی کی اپنی بربریت نہ ہوتی ہو بلکہ دورِ تمدن کی بھی اپنی بربریت ہوتی ہو! جو اوّل الذکر سے کہیں زیادہ نامبارک ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ دنیا امریکہ سے بدگمان رہتی ہے۔ خود وہاں کیسے کیسے لرزہ خیز اور انسانیت سوز جرائم شب و روز وقوع میں آتے رہتے ہیں! زندگی میں اس تہلکہ، تلخی اور نامرادی کے اسباب کا اس وقت تجزیہ مقصد نہیں ہے، لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب تک کوئی راستہ کسی اعلیٰ عقیدہ اور عمل کے ماتحت جو افراد، اقوام اور ممالک کے محدود مصالح و مقاصد سے علاحدہ اور بلند ہو کر زندگی کے معظمات کے قیام، استحکام اور نفاذ کے لیے اختیار نہ کیا جائے گا وہ زندگی کی صحت یا معاشرت میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اب آسانی سے کہا یا مانا نہیں جا سکتا کہ مغرب کا طرزِ فکر و عمل بہر گونہ قابلِ اعتبار ہے۔ یہ اندیشہ کسی تعصب کی بنا پر نہیں تجربہ کی بنا پر ہے۔ آج سے بہت پہلے اقبالؔ نے مغرب کو خبردار کر دیا تھا:

عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

عزیزو!

میں اتنا مایوس یا مراقی نہیں ہوں جتنا شاید آپ میری گفتگو یا حلیہ سے اندازہ کرتے ہوں۔ میں امید اور حوصلہ اور صلح و سچائی پر ایمان رکھتا ہوں اس لیے کہ مسلمان ہوں اور علی گڑھ کی فیض بخشیوں سے سرفراز ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ جو ذہن زہرِ آب تیار کرتا ہے وہی ذہن آبِ حیات بھی بناتا ہے۔ اس تضاد کو معتدل و متوازن رکھنے کا عمل انسان کے ذہن اخلاق و معاشرہ کی صحت اور توانائی کی ضمانت ہے۔ اس وقت دنیا کے ہر خطہ میں بگیر و بکش اور مسابقت و منفعت اور نفی اور انکار کی ہلچل ہے جسے ایک اصطلاح میں نفی و انکار یا 'لا' کا مرحلہ یا جملہ کہتے ہیں۔ جن قوتوں کے شدائد سے یہ بلائیں بے زنجیر ہوئی ہیں ان کو زیر کرنے اور تعمیری و تہذیبی سمت و رفتار دینے کے لیے بالکل دوسرے عوامل کو برسرِ کار لانا پڑے گا جن سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ اندیشہ اس کا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تخریبی قوتوں کی مسلسل سرکشی سے وہ صالح عوامل مضمحل ہو جائیں جن سے انسانیت کی حفاظت اور آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح آپ نوجوان نفی و انکار کے فشار کی

تاب نہ لاکر 'لا' کے کسی ویرانے میں سرگرداں یا واماندۂ راہ نہ رہ جائیں۔ 'لا' و 'الا' کے مرحلوں سے نوجوان نسلوں کو لازماً گزرنا پڑتا ہے۔ مبارک ہیں وہ نسلیں جو اس مرحلہ و منزل سے بطریقِ احسن گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد شرف سعادت کی منزلت و معراج ہے۔ معراج نبوی ہر فرد کے لیے اس کی آرزومندی اور سعی پیہم کے اعتبار سے معراج کی بشارت ہے۔ اتنا موقع محل نہیں جتنا بھول جانے کے اندیشہ سے مجبور ہو کر یہاں اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مراقبہ وظائف یا چلّہ کشی سے نجاتِ اخروی حاصل کرنے کا قائل نہیں ہوں جب تک ان مشاغل کو بامقصد اور بابرکت بنانے کے لیے خلق کی خدمت اور خیر خواہی کے لیے ہم اپنے آپ کو وقف نہ رکھیں۔

ہر جگہ طلبا کے موجودہ عام طرزِ عمل کے بارے میں جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہوں اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ جیسے اپنے ہی خاندان اور گوشت پوست کا نوجوان اپنی اور قبیلہ کی ناموس لٹا رہا ہو۔ اس قیمت پر تو کوئی سودا نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ کتنا ہی ضروری بتایا جائے۔ ہر جگہ بیش تر طالب علموں نے غیر ذمہ داری کا جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اکثر ویسا ہی ہوتا ہے جو سوسائٹی میں نامبارک و خطرناک عوامل و عناصر کا ہوتا ہے۔ طلبا نے اپنی تعلیم، تربیت، تہذیب اور روزگار کے مسائل کو 'لا اینڈ آرڈر' (نظم و نسق) کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ یہ رول کسی طرح ان کے شایانِ شان نہیں۔ کبھی کبھی اتفاق سے ایسا ہو جائے تو حرج نہیں۔ لیکن اس کو پیشہ یا پروگرام بنا لینا ثقات کا کیا سوال عجب نہیں عوام بھی اس کو پسندیدہ نہ سمجھتے ہوں۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ طالب علموں کے ماں باپ ثقات ہی نہیں عوام بھی ہوتے ہیں اور شمار میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ میری نظر میں اب تک ایسے والدین نہیں گزرے ہیں خواہ وہ کسی طبقہ یا پیشہ سے تعلق رکھتے ہوں جو اپنی اولاد کی بھلائی اور بڑائی کے لیے یکساں طور پر خلوص و خشیت سے دعا نہ مانگتے ہوں۔ ذمہ داریوں سے منہ موڑنا بڑی بے غیرتی ہے۔ یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ پرانی باتوں کا اب چلن نہیں رہا۔ اس لیے کہ وہ موجودہ تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رہیں، لیکن اس سے یہ کیوں کر ثابت ہوا کہ نئے اوضاع و اطوار بہرگونہ پسندیدہ اور 'واجب الاذعان' ہیں۔ آپ کی پسند یا ناپسند سے کام نہیں بنتا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ کس طریقِ عمل سے زندگی میں بہتری اور برتری آئی اور کس سے ادبار و

انتشار، اوّل الذکر ہی کو اختیار کرنا پڑے گا خواہ اس کا کہنے والا یا اس پر عمل کرنے والا دنیا میں اکیلا ہی کیوں نہ ہو!

لیکن کیا کہیے جب دیکھنے میں یہ آرہا ہو کہ آپ نوجوانوں کے ہم بزرگ اور قوم اور ملک کے سربراہ اپنے ناروا اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر آپ سے ہر سودا ہر قیمت پر ہمہ وقت کرنے کے لیے وہ قطعاً یک طرفہ منتظر اور مشتاق رہتے ہوں۔ مہابھارت کے رزمیہ میں آیا ہے کہ پانچوں پانڈوں نے اپنی بیوی دروپدی کو جوئے کی بازی پر لگا دیا تھا اور ہار گئے تھے۔ آج کی مہابھارت میں بوڑھے اپنی نوجوان اولاد کو ہر داؤں پر لگاتے رہتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ خود جیتتے رہتے ہیں اور اولاد ہارتی رہتی ہے۔ دروپدی کے ناموس کو کرشن جی نے بچایا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ نوجوانوں کی عفت بچانے کے لیے کون سے کرشن کہاں اور کب نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی کا ایک نام اور تعبیر جوانی بھی ہے جو نہ کبھی ہارتی ہے نہ مرتی ہے اور جو نہیں مرتا اس کے مبارک مقدس اور معظم ہونے میں کلام نہیں۔ آپ کی مثال پہاڑی ندی کی ہے جو کوہستانی نشیب و فراز میں شور مچاتی، ہر شے کو جو اس کے راستے میں آتی ہے اس کو توڑتی پھوڑتی میدان میں اترتی ہے تو عقل منداس کی بے پایاں توانائی کو کثیر المقاصد اور کثیر المنفعت منصوبوں میں منتقل کر دیتے ہیں، پھر وہ اتنی مقدس اور اتنی فیض بخش اور فیض رساں ہو جاتی ہے کہ لوگ اس کو دیوی دیوتاؤں کا درجہ دے دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مذہب تہذیب اور انسانیت کا یہ دیدیائی گہوارہ قرار پائیں۔ آپ نوجوانوں کی یہی روش اور روانی اور روایت ہونی چاہیے۔

عزیزو!

آپ جانتے ہوں گے کہ پچھلی صدی میں سوئیڈن کے ایک کیمسٹ مسٹر الفرڈ برنارڈ نوبل (96-1833) نے بارود ایجاد کی۔ اس ایجاد نے تمام دنیا کو جس ہولناک و بے پناہ ہلاکت کی لپیٹ میں لے لیا اس سے نوبل اس درجہ متاثر مضطرب ہوئے کہ اس سے ان کو جو کثیر دولت میسر آئی اس کو انھوں نے انسان اور انسان کے خیر عام کے لیے وقف کر دیا۔ جو شخص علم، شعر و ادب، امن و سلامتی اور دوسرے اچھے اور بڑے کام انجام دیتا ہے اس کو دنیا کا شاید سب سے گراں قدر انعام (نوبل پرائز) بغیر امتیازِ نسل، ملک و ملت ہر سال تفویض کیا جاتا ہے۔ بارود

سے اب بھی بربادی اور مسماری کا کام لیا جاتا ہے، لیکن اس سے رفاہِ خلق کے کاموں میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ اس طرح ایک خطرناک ایجاد سے اچھے لوگوں نے تعمیر وتہذیب کا بھی کام لیا ہے اور لیتے رہتے ہیں۔ ایسا شاید ہی کوئی ہو جو بارود کے تخریبی رول کو اچھی نظر سے دیکھتا ہو۔ خود اس کے موجد کے بارے میں آپ سن چکے ہیں۔

مسٹر نوبل اور ان کے بارود کے ساتھ آسٹریا کے مشہور فلسفی اور دانش ور سگمنڈ فرائیڈ (1856-1939) کے نظریہ جبلت یا جنس (Sex) کو لیجیے جس کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہے کہ انسان کے ہر فعل کی محرک جنسی جبلت ہے۔ اس نظریہ نے انسان کے اخلاقی اقدار اور کردار اور ان کی لائی اور دی ہوئی ہزاروں سال کی برکت و برگزیدگی کو جس طرح مسخ و مسمار اور انسان کی ترقی اور رفتار کی سمت کو جن بداعمالیوں کی طرف موڑ دیا ہے۔ کیسے کہوں کہ اس کا احساس واندازہ آپ کو نہ ہوگا۔ آپ کی اعلیٰ تعمیری اور اخلاقی صلاحیتوں کو مسخ کر کے اس نظریہ نے فنونِ لطیفہ و عالیہ کو جس طرح ماؤف کیا ہے اور ان کے ماؤف ہو جانے سے آپ کی صالح فکر وعمل پر جیسا ہمہ گیر المناک اثر پڑا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ فن اور فن کار دونوں ایک دوسرے کی نامرادی میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اکثر یہ خیال بھی ذہن میں آیا ہے کہ آج فرائیڈ زندہ ہوتے تو اپنے نظریہ کے عالم آشوب کرامات کو دیکھ کر نوبل کی طرح متاثر ہوتے یا کیا!

جدید علوم وفنون کی مسلسل اور حیرت انگیز ترقی پر ہم جتنا فخر کریں بجا ہے، لیکن اس ترقی پر کڑی نظر رکھنا پڑے گی کہ ایسا تو نہیں کہ یہ انسان کی اخلاقی توانائی وترفع میں حائل تو نہیں ہو رہی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جن علوم وفنون کی ترقی پر جتنا خوش ہوتا ہوں اتنا ہی اپنی شامتِ اعمال اور مکافاتِ عمل کی طرف سے فکرمند بھی رہتا ہوں۔ علوم جدیدہ کا کہنا یہ ہے کہ انسان جانور کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ انسان میں جانوروں کے تقریباً تمام خواص کھلے چھپے یا دبے دبائے ملتے ہیں، لیکن علوم نیز مذہب واخلاق کی تعلیم وتربیت سے ان صلاحیتوں کو نہ صرف قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں بلکہ ان کو اس طرح سدھارتے رہتے ہیں کہ جانوروں میں جو عیب تھے وہ انسان میں ہنر بن گئے۔ اس طرح انسان رفتہ رفتہ اخلاقِ فاضلہ کا معاون، محافظ اور منادبن گیا۔ انسان اسی لیے ایسا کہلایا۔

جانور سے علاحدہ اور ممیز و ممتاز کرنے کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انسان کے لیے انسان نے انجام دی ہے۔ اس سے زندگی میں پاکیزگی، برگزیدگی آئی۔ زیادہ سے زیادہ مصائب و محرومیاں دور ہوئیں اور امن و عافیت، صدق و صفا، علم و ہنر، خیر منشی اور عالی حوصلگی آئی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ چوں کہ سائنس نے انسان کو جانور نہاد قرار دیا ہے اور بنیادی طور پر اسے جانور بتایا ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنی اعلیٰ بشری صلاحیتوں اور خوب و ناخوب کے ترک و قبول کرنے کا شعور یا 'تپیدن از تپ ہمسایہ گاں' کے احساس کو نظر انداز کردے اور جانوروں کا وطیرہ اختیار کرنے میں اپنے کو آزاد اور مختار سمجھے تو یہ اس کی بھول اور بے راہ روی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ فرائڈ کے اس نظریہ نے انسان کے مدتوں کے ذرّہ ذرّہ اور قطرہ قطرہ جمع کیے ہوئے کیسے عظیم اور حسین تصورات و تعلیمات کے تاج محل ویران کردیے، کشمیر جھلس دیے اور گنگ و جمن خشک کردیے! رفعت، رفاہ اور تقدیس و تکریم کی جس منزل پر انسان پہنچ چکا ہے اور جن اقدار کی صبر آزما پیروی سے اسے یہ منزلت حاصل ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر کسی بھی ایسے انکشاف کو غیر معمولی حیثیت واہمیت نہیں دی جاسکتی جو فرمانِ الٰہی اور اقدار انسانی کی نفی یا ان کو نظر انداز کرتے ہوں۔

جنس سے متعلق ایک اور رُسوائی بھی بوڑھوں کی بے سود تشویش، لیکن آپ نوجوانوں کی فوری توجہ کی مستحق ہے۔ وہ مسئلہ ہے Obscenity (فحش، گندی بات یا حرکت) کا۔ انگلستان ہی نہیں بڑے بڑے کچھ اور ملکوں کے دانش وروں نے بھی اس کو فطری، بے ضرر اور آزاد معاشرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دے کر جائز قرار دیا ہے۔ ایسا بتانے میں انھوں نے احکامِ الٰہی، ضوابط، اخلاق، فنونِ لطیفہ، رسم و رواج اور آخر میں بہ نظرِ احتیاط دھاندلی اور ڈھٹائی سے بھی کام لیا ہے۔ اس کی تفصیل یا تنقید یہاں ممکن نہیں۔ ان دانش وروں نے جملہ سامانِ عیش و طرب سے مزیّن و مملو عشرت گاہوں کے جن کی سرحد اکثر قحبہ خانوں سے جاملی ہے۔ برقی قمقموں کی تیز اور طلسمی روشنی میں ایسی قبیح حرکتوں کے ارتکاب ہی نہیں اس کی نمائش کو روا رکھا ہے جسے ایک نارمل شخص خلوت کی تاریکی میں کبھی گوارا کرنے میں تامل کرے گا۔ انسان کی طبعی ساخت و پرداخت اور خاصیت کا انکشاف کرکے اس کے اخلاقی فرائض کو زک دینے اور

تہذیبی ثروت کو تاراج کر دینے اور کھل کھیلنے کا جواز مغرب نے دیا اور ہم نے قبول کرلیا۔ اس بنا پر کہ ہم کو مغرب کی تہذیبی 'چھتری' (مروّجہ ایک ملٹری اصطلاح) کی پناہ مل چکی تھی۔ اس کی تیرگی و تعفن جس طرح مغرب کے عام شعروادب، فنون ولطیفہ، معاشرت، اخلاق و کردار، سوچنے اور کرنے کے انداز پر اثر انداز ہوا اس سے کہیں زیادہ اس نے ہمارے یہاں کے شعروادب اور اعمال واخلاق کو متاثر و ماؤف کیا۔

فحاشی کا تصور ہمارے اکثر ذہنوں میں صاف نہیں ہے۔ میرے بھی نہیں ہے، لیکن بعض دوستوں اور دانش وروں کے سمجھانے سے اپنے کو کچھ اسی طرح سمجھا رکھا ہے کہ اس کا اطلاق اتنا عمل پر نہیں ہوتا جتنا محل پر۔ جنس کے مطالبات اکثر بجا ہی نہیں لازم بھی آتے ہیں۔ ان کو پسِ پردہ بجالائیں تو بجا ہیں۔ برملا بجالایا جائے تو Obscene قرار پائیں گے۔ فرق، موقع ومحل اور خلوت وجلوت کا ہے۔ نمائش ہو تو نامناسب، نہ ہو تو مناسب، لیکن یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ مغرب کی اس بے راہ روی یا بے چارگی کا اثر مشرق پر دیرپا نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ مشرق بالخصوص ہندوستان کی زندگی اور زندگی کے تصورات کی بنیاد ہزاروں سال سے مذہب اور اخلاق پر رہی ہے۔ اس لیے وہ عریانی، فحاشی اور لادینی کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں رہ سکتا۔ سماجی معاملات ومشکلات کو مغرب ممنوعات اور مسکرات سے حل کرنے پر جس آسانی سے تیار ہو جاتا ہے اتنا ان کو اخلاقی اصولوں سے روبراہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے جس پرہیز اور پابندی کی ضرورت ہے اس کی شاید اس میں صلاحیت باقی رہی نہ سکت۔ وہ بد کو بدتر سے زیر کرنا اور رکھنا چاہتا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ تہذیب کے آغاز سے اب تک یہ طریق کار ناکامیاب ہی نہیں خطرناک ثابت ہوا ہے۔ جدید مغرب کے طور طریقوں کی بنیاد زیادہ تر اس کی معاشرتی، اقتصادی، صنعتی، حربی، سائنس وٹیکنالوجی کی دی ہوئی تعلیم پر رہی ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا محاذ نہیں ہے جو لمس ولذت یعنی جسم کے نت نئے تقاضوں کے فشار کو برداشت کر سکے۔ دوسری طرف مشرق کا روحانی اور اخلاقی ضابطۂ زندگی ہے جو کتنا ہی پرانا اور ٹکسال باہر کیوں نہ ہو گیا ہو۔ اس میں ایک طرح کی ایسی صلابت لچک اور ناسازگار حالات میں بھی فعال رہنے کی صلاحیت ہے کہ جو اقتصادی اجتماعی اور سیاسی بدحالی کے باوجود زندگی کے عام در و بست کو ڈھیلا یا

ڈانواڈول نہیں کرسکتی۔ ناصبوری و نامرادی کی جس گرداب میں آج مغرب اور وہاں کی تہذیب نظر آرہی ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہم میں جو حضرات ہر مرض کی دوا مغرب میں تلاش کرتے تھے وہ اب شاید ایسا کرنے میں تامل کریں۔

جنس کی تخلیقی مصلحت اور اخلاقی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے جنس کی جس بے لگام ہوس ناکی اور لذت کوشی کا مغرب شکار ہوا اور ہے اس کی ایک قابلِ رحم اور عبرت انگیز مخلوق وہ ہے جو (ہپّی) کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تقریباً ہر شہر کے بارونق حصوں میں اور زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے ملیں گے۔ 'دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو' ان کی ہیئت، کثافت، لباس، مایوس اور مجہول آوارگی دیکھ کر ایسا اندیشہ ہوتا ہے جیسے کسی بددعا یا نامبارک حالات کے اثر سے یہ انسان رہ گئے ہوں نہ غیر انسان۔ مغربی ممالک میں بالعموم اور امریکہ میں بالخصوص یہ خطرہ واضح طور پر محسوس کیا جارہا ہے کہ مشینوں سے جو دُھواں، گیس اور فضلہ خارج ہو کر آب و ہوا کو مسلسل اور وسیع پیمانے پر مسموم کرتے رہتے ہیں اور انسانوں اور بستیوں کی غلاظت اور کوڑا کرکٹ اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس کا خطرناک اثر انسان کی صحت پر تیزی سے پڑ رہا ہے۔ ماہرینِ صحت کا بیان ہے کہ اگر ہوا اور پانی کو ان زہریلے اثرات سے پاک کرنے اور رکھنے کی وسیع پیمانے پر فوری اور موثر تدابیر عمل میں نہ لائی گئیں تو انسان اور حیوان کی نسلوں میں ایسے امراض سرایت کر جائیں گے جو ان کے مستقبل کے لیے نہایت اندوہ ناک ثابت ہوں گے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آب و ہوا کے مسموم ہونے کا اثر انسان کے جسم میں پایا جانے لگا ہے۔ ماحول کی اس سمیّت پر اس عالم گیر ہیجان، بیزاری، خود غرضی اور بے مقصدی کا اضافہ کریں جس میں آپ نوجوان مبتلا ہیں تو کچھ اسی طرح کا وسوسہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ یہ (ہپّی) اسی نسل کا نمونہ ہوں جس کی طرف ماہرینِ صحت نے متنبہ کیا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی جنسی بھوک اور جنس ہی سے اسی طرح کی حد سے بڑھی ہوئی بیزاری دونوں کے کرشمے آج مہذب سے مہذب ملکوں میں دیکھنے میں آرہے ہیں۔ اس صورت حال کا ماتم کیا جائے تو ماتم کرنے والے کو مولوی یا متوفی کیوں کہیے۔

جنس سیکس یا عورت کا تصور اور تذکرہ تہذیب کے شروع سے آج تک ہر قوم، قریہ، مذہب، شعروادب، تاریخ اور معاشرے کا بحیثیت مجموعی بڑا اہم موضوع رہا ہے، اور ہمیشہ

رہے گا۔ مرد اور عورت جس طرح نسلِ انسانی کے قیام و بقا کے ضامن اور لازم ملزوم ہیں اور جنسی روابط میں نا قابلِ تسخیر کشش اور لذت رکھی گئی ہے جس سے کوئی متنفس خالی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روابط ہماری کیسی غیر معمولی احتیاط و احترام کے مستحق ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے ہر مذہب و اخلاق نے ہمیشہ سے ان روابط کو اعتدال پر رکھنے پر زور دیا ہے اور ان پر بڑی سخت پابندیاں عائد کی ہیں۔ جنسی بے اعتدالی کا اثر مرد سے زیادہ عورت پر پڑتا ہے۔ جسمانی اکثر سماجی اعتبار سے بھی وہ کمزور ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے حقوق کو محفوظ و مستحکم کرنے کے لیے تمام مذاہب نے التزام رکھا ہے۔ قطع نظر عہدِ جہالت کے جب ہر رعایت کا مستحق مرد اور ہر پابندی کی سزاوار عورت تھی۔ آج بھی جب کہ عورت کی آزادی کی اتنی دھوم یا دھوکا ہے۔ غالب کے عہد کی بھٹکتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

ع وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے!

عورت کی آزادی یا نجات کا یہ تصور نہ صحیح ہے نہ صالح کہ وہ ہر مرد کے لیے اور ہر مرد اس کے لیے ہر موقع پر مباح ہو جیسا کہ آج کل اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مرد کے لیے عورت کا منجملہ اسباب تفریح و طرب ہونا نہ عورت کے شایانِ شان ہے نہ مرد کے۔ موافق سے موافق حالات میں رہ کر آزادی اور ممکنہ حقوق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی عورت کے فرائض میں ہے کہ وہ اچھی ماں اور اچھی بیوی کا رول ادا کرے۔ شرف و سعادت کا یہ رول صرف اس کے حصے میں آیا ہے۔ اس فریضہ اور ذمہ داری کو بطریق احسن پورا کرنے کی سہولت ہر فرد، جماعت، حکومت اور مذہب کو فراہم کرنا چاہیے۔ عورت اور مرد کے مساوی حقوق اور عورت کی غالباً ہر قید سے آزادی کا کچھ دنوں سے عالم گیر چرچا ہے۔ اس تحریک یا تفریح کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر اس دشواری کو نظر میں رکھنا پڑے گا کہ جب تک عورت کی جنس یا جسمانی معذوریوں کا لحاظ نہ رکھا جائے گا وہ مرد کی امداد یا محافظت سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

کسی قوم، ملک یا معاشرہ، تہذیب اور شعر و ادب کے صالح اور صحت مند ہونے کا اندازہ اسی سلوک اور سطح سے کیا جاتا ہے جیسے وہ اپنی عورتوں کے لیے ملحوظ و محفوظ رکھتا ہے۔ جدید عورت اپنی آزادی اور ترقی کے بارے میں آج چاہے جتنا حسنِ ظن رکھتی ہو، اگر سنجیدگی سے غور

کرے اور زمانے و رفتار کا جائزہ لیتی رہے تو محسوس کرے گی کہ درحقیقت اسے وہ وقعت اور طمانیت خاطر نصیب نہیں ہے وہ چاہتی ہے اور جو اس کا حق بھی ہے۔ موجودہ دور میں جب اس کی منشا کے مطابق اس کو کافی آزادی حاصل ہے اس نے اپنی تقدیر اور تصویر کو بنانے اور سدھارنے میں اتنا پایا نہیں ہے جتنا کھویا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنی آزادی یا آزادروی کو کمزور بنیادوں پر قائم کیا اور رکھا ہے۔ اس کی حیثیت 'گلزارِ نسیم' کی بکاؤلی سے زیادہ نہیں ہے جو بالآخر کس حسرت و اندوہ تاج الملوک سے اعتراف کرتی ہے۔

جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں!

گذشتہ نصف صدی سے عورت جس طرح اپنی ہی شرائط پر اور اپنی ہی مقرر کردہ طرزِ عمل سے رُسوا ہو رہی ہے تہذیب کے گذشتہ دور میں بھی نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ عورت رُسوا ہوگی تو اس کی تقریباً تمام تر ذمہ داری مرد پر عائد ہوگی۔ کتنے درد اور کیسے دکھ کی بات ہے کہ آج جب کہ دنیا کی ہر شے زیادہ سے زیادہ مہنگی ہے۔ عورت جو ہماری سب سے قیمتی متاع یعنی غیرت و ناموس ہے وہ اتنی سستی ہو جتنی کہ وہ ہے۔ میری درخواست ہے اور دعا بھی کہ ہماری لڑکیاں ان حدود سے باہر نہ جائیں اور ان ذمہ داریوں کو نظر انداز نہ کریں جو فطرت نے اپنی بہترین اور وسیع ترین مصلحتوں کے پیش نظر ان کی تخلیق میں مضمر رکھی ہیں، اور اس سیدھے اور سلامتی کے راستے کو نہ چھوڑیں جسے تمام دنیا کے مذہب اور اخلاق نے ان کی بہتری کے لیے مقرر کر دیا ہے اور اس پر زور دیتے آرہے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے اور بہت معمولی بات ہے کہ جو حدود ایک طرف فطرت نے اور دوسری طرف مذہب و اخلاق نے ان کے لیے مقرر کر دی ہیں ان سے باہر رہ کر یا جا کر وہ کس طرح فائز المرام ہوسکتی ہیں۔ رہا یہ کہ وہ مذہب اور اخلاق دونوں سے علاحدہ رہ کر اپنے لیے نجات یا نشاط کا راستہ نکال سکتی ہے تو کچھ کہنا نہیں ہے صرف ان حالات کی طرف اشارہ کر دینا ہے جو اس نے اپنی مرضی سے اپنے لیے پیدا کر لیے ہیں، لیکن بظاہر سازگار معلوم نہیں ہوتے۔

یاد رکھنے کی ایک معمولی اور موٹی بات یہ ہے کہ علومِ عقلیہ میں کس وقت کوئی غلطی دریافت کی جاسکتی ہے جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔ لیکن اب تک شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ مذہب اور اس کے برگزیدہ پیروؤں نے عادات و اخلاق کی استواری اور برگزیدگی کے

بارے میں شروع سے آج تک جو کچھ سکھایا بتایا اور کر دکھایا اس میں کہیں بھی کسی طرح کا نقص دیکھنے میں آیا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب کبھی اور جہاں کہیں ہماری آپ کی بے راہ روی حد سے گزر گئی تو ہر شخص ان ہی راستوں پر پلٹ آنے اور چلنے پر اصرار کرتا ہے جو مذہب و اخلاق کے اکابر نے بتائے اور دکھائے ہیں۔ علوم عقلیہ کے چاہے جتنے طریقے اور راستے ہوں مذہب و اخلاق کی راہِ مستقیم ایک ہی ہے!

عورت نے بہشت سے اکتا کر جس دنیا کو قبول کیا تھا اور ہم کو بھی وہاں سے نکال لائی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس دنیا سے تنگ آکر وہ کہاں جاتی ہے اور ہمارا کیا ہوتا ہے۔ کیا کہیے کہ باوجود ان تمام خوش گمانیوں کے جو وہ اپنے بارے میں رکھتی ہے وہ مرد کی بالواسطہ یا بلاواسطہ اعانت کے بغیر کوئی اہم اور بڑے دنیوی امور انجام نہیں دے سکتی۔ نوجوانوں، شاعروں اور فن کاروں سے کیا کہوں اور کیسے بتاؤں کہ عورت کا درجہ گرانے سے ذوق اور ذہن بالفاظِ دیگر شعر و ادب کی سطح پست ہوتی ہے اور زندگی نیکی اور بڑائی کے راستے سے بھٹک کر ظلم و جہالت کی پستیوں میں جا گرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی ماں عورت نہ رہی ہو اور ماں اپنی اولاد کے لیے محن و محبت اور یاس و امید کے جیسے شب و روز جھیلتی رہتی ہے۔ اس کا صلہ وہ نہیں ہے جو آج کل کے جدید شاعر اور فن کار دیتے ہیں اور فخر کرتے ہیں جن میں بعض مضحکہ خیز بوڑھے بھی جلوس کی خاک پھانکنے اور اس کے طرب و طنطنہ کو چڑانے کی خاطر موجود ہوتے ہیں۔

جنس یا سیکس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس 'دورِ قمر' میں چاہے جو درجہ حاصل ہو۔ زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے میں اس کو وہ درجہ نہیں دینا چاہیے جیسے زندگی سیکس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ زندگی جنس کے تقاضوں سے کہیں زیادہ ارفع وار جمند ہے، اور ان تقاضوں سے بدرجہا زیادہ اہم اور عظیم ذمہ داریوں کے احساس اور ان ذمہ داریوں کے بخشے ہوئے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اچھے اور بڑے لوگ اس رول کو ہمیشہ سے اور ہر حال میں ادا کرتے چلے آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ عورت سے صرف جسم کی لذت مقصود ہو تو یہ تصور بہائم اور وحشیوں کا ہے۔ اس کے ناموس کی حفاظت اور اس کی تقدیس و تکریم انسان اور انسانیت کی روایت یعنی شرف و سعادت ہے۔

دو عالم گیر جنگوں سے قدیم نظمِ جہاں کی جیسی شکست و ریخت ہوئی اس سے شعر و ادب، فنونِ لطیفہ، اقدارِ حیات اور سوچنے کے طور طریقوں میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ اس نے نوجوان اشتعال پذیر طبائع کو سوچنے کا کم اور ہر قیمت پر سب کچھ کر ڈالنے کا جو طریقہ بتایا اور راستہ دکھایا اس سے زندگی شدید بحران میں مبتلا ہوگئی اور کسی طرح روبراہ ہوتے نظر نہیں آتی۔ اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ زندگی اور زمانے کو مادی ترقی اور توازن نصیب ہو یا نہیں شاید ایک مدت تک ان اخلاقی اور تہذیبی اقدار و شعائر کی بازیافت نہ ہو سکے، جن کے ہم منتظر ہیں۔ لیکن جن سے محروم ہیں ظاہر ہے جو شعر و ادب ایک ہیجان سے برآمد اور دوسرے ہیجان کا باعث اور نقیب ہو اور اسی کو زندگی اور ادب کا تصور سمجھتا ہو۔ اس سے فکر انسانی کو سکون اور سیرابی کیسے اور کہاں تک نصیب ہو سکتی ہے۔

نئے شعر و ادب کی ہیئت و آہنگ یا رفتار و رجحان جسے چاہے جن عارضی علمی اور اصلاحی ناموں سے وقتاً فوقتاً موسوم کرتے رہے ہوں اس کے غلبہ سے خود شعر و ادب کے معیار کو وہ درجہ نہیں دیا گیا ہے جس سے ہر انسانی فعل کے خوب اور ناخوب کو پرکھتے ہیں۔ جب اور جہاں شاعری کے تمام لوازم پر ہر شاعر یا شخص کے شخصی و انفرادی پسند یا ناپسند، رسائی یا نارسائی، گفتنی یا ناگفتنی چھوڑ دیے گئے ہوں وہاں معیار کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا، اور جہاں اور جس کام کا کوئی معیار نہ ہو وہ یقیناً کارِ فضول ہے۔ یہ معیار کی طرف سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے کہ شعر و ادب میں عام انتشار پیدا ہو گیا ہے جو اکثر بے اعتدالی کی حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں شعر و ادب اور زندگی کے روابط تنظیم اور توازن میں فرق آ جائے وہاں فن کاروں میں ناصبوری اور آشفتہ سری کا پایا جانا تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے علم و فن، سائنس، ٹیکنالوجی، مذہب و معاشرت یا سیاست کا کوئی شعبہ شاخ، سمت یا سطح ہو ان پر کام کرنے اور ان سے کام لینے والوں کے لیے لازم آتا ہے کہ کسی نہ کسی حد تک وہ شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا احساس و احترام ملحوظ رکھیں۔ اس کے بغیر وہ صفات بروئے کار نہیں آئیں گی جن کے امتزاج و ارتفاع کا نام آدمیت ہے۔ جس کی آج کل کی مسموم فضا اور مخدوش حالات میں بڑی ضرورت ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدنیت کے عروج و زوال اور امتوں کی تقدیر پر شعر و ادب کا کتنا وسیع اور دیرپا (دوامی!) اثر پڑتا ہے۔

اس لیے شعروادب کی تحریم وتکریم کو ہر لحظہ خلوص اور دانش مندی سے نظر میں رکھنا شعروادب کے ہر خیراندیش کا فرض ہے اور کیسا فرض جو اپنا انعام بھی ہو۔

اس اعتراف کے بعد عرض کروں گا کہ دنیا کی تاریخ اور شعروادب کا میرا مطالعہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی ایسی بات کہہ سکوں جس کو مان لینے پر آپ سے اصرار کروں۔ بایں ہمہ محسوس کرتا ہوں کہ شروع دن سے آج تک دنیا میں طرح طرح کے حادثات وانقلابات آتے جاتے رہے ہیں اور زندگی زیروزبر ہوتی رہی ہے لیکن نہ اتنی اور اس طرح کہ جسم وجان ہی نہیں ایمان و اعتقاد بھی متزلزل ہو جائیں۔ کیسے بے کراں اور بے اماں فتنہ وشر کی گرفت میں اس وقت مہذب دنیا آ چکی ہے اس کا ذکر کتابوں میں پڑھا نہ کسی سے سنا نہ کہیں دیکھا جیسے یا تو یومِ مکافات بہت قریب آ گیا یا بہت دور چلا گیا ہو یا اٹھا لیا گیا ہو۔ کچھ ایسا بھی معلوم ہوا جیسے ایں ہمہ نیست از آں کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو ہم اردو والے اکثر کچھ اشعار پڑھ کر حق اللہ اور حق العباد کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اپنی طرف سے بھی خیال ہے کہ اس سے حادثات کے سمجھنے اور ان سے حسب توفیق عہدہ برآ ہونے میں مدد ملتی ہے۔ حسب معمول کچھ اشعار ذہن میں آئے، کیا عجب کبھی کبھی آپ کو بھی یاد آ جایا کریں۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

رنج و راحتِ گیتی مرنجاں شو ہشو خرم
کہ اندازِ جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمت للعالمینے ہم بود

سب سے حیرت انگیز و مضحکہ انگیز وہ ماتم ہے جو تعلیم کے ناخدا نظامِ تعلیم اور امتحان کے ناقص ہونے کا کیا کرتے ہیں۔ بہت دنوں بعد یہ واویلا کم ہوا کہ انگریز نے غلام بنانے اور رکھنے کے لیے ایک خاص طرح کی تعلیم و نصابِ تعلیم نافذ کیا تھا۔ آزادی ملنے کے بعد تعلیم کے جتنے ماہرین، معلمین اور متعلمین کی نسلیں یا نمونے نظر سے گزرے یکے بعد دیگرے طرح طرح کے کمیشن، کمیٹیاں، تصانیف، خطباب، مذاکرے، وزارتیں، تجربے یہاں تک کہ یوتھ فیسٹیول (نوجوان لڑکے لڑکیوں کے تفریحی اجتماع) سامنے آئے۔ ان کے بعد بھی یہی کہا جاتا ہے اور شاید نامعلوم مدت تک یہی کہا جاتا رہے کہ نظامِ تعلیم ناقص ہے اس لیے دوسرا کمیشن قائم کیا جائے۔ یہ کمیشن اپنے پیش رو کی سفارشات کا کھلا چھپا خلاصہ بھی ہوتا ہے اور اس پر کھلے چھپے اعتراضات کا اضافہ بھی۔ یہ مریض کا اتنا چیک اَپ اور معالجہ نہیں ہوتا جتنا مُردے کا پوسٹ مارٹم یا کسی نئی تعلیمی وزارت یا اس کی مہورت!

دراصل نظامِ تعلیم اتنا ناقص نہیں ہوتا جتنی اس کی سفارشات کو نافذ کرنے والوں کی نیت اور صلاحیت مشتبہ ہوتی ہے۔ ناروا اغراض کی کاربرآری کے لیے اجتماعی اور اخلاقی تقاضوں سے روگردانی کرنا، عام طلبا سے، ووٹ دینے والوں سے، مخالف عوامل سے ڈر کر راست بازی اور جرأت سے منہ موڑنا ہماری انفرادی اور قومی سیرت کا جیسے مزاج بن گیا ہو۔ عام طلبا کے حد سے بڑھے ہوئے مطالبات کو جو اس طور سے پیش کیے جائیں جیسے یہ تاوانِ جنگ، بلیک میل یا یرغمال (Ransom) ہو۔ ان کے شایانِ شان نہیں، مطالبات درست ہوں یا نادرست بہت کچھ فرق ان کے پیش کرنے اور منوانے کے انداز میں ہوتا ہے۔ اونچے اور نیچے درجے کے لوگوں میں جو فرق ہوتا ہے اس سے کون نہیں واقف ہے۔ میں درخواست کروں گا کہ خاص خاص امور میں طلبا موخرالذکر سے علاحدہ رہیں تو بہتر ہے۔ خواہ ان کو اس کی قیمت کچھ زیادہ ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ اونچے درجے کے لوگوں کو اعلیٰ اقدار کی حمایت میں ہمیشہ زیادہ ہی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ یہاں عوام سے دور یا نزدیک رہنے کے مسئلہ کو چھیڑنا نہ مقصود ہے نہ مناسب۔ بایں ہمہ یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ عوام آپ سے قریب آنے کی کوشش کریں تو یہ کہیں بہتر ہے بجائے اس کے کہ آپ آنکھ بند کر کے ان میں شامل ہو جائیں۔

ایسا کرنے میں عوام کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ آپ کو نقصان اٹھانا پڑے تو کسی کو تعجب نہ ہوگا۔ شاید ہمدردی بھی نہ ہو۔

عزیزو!

نہایت درجہ اندیش ناک و نامسعود ہر جگہ کے طلبا کی طرف سے یہ تحریک یا مطالبہ ہے جس کو سماج دشمن برابر شہ دیتے رہتے ہیں اور اپنا کام نکالتے ہیں کہ امتحانوں کو مضحکہ خیز حد تک سہل کر دیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔ تعجب اس کا ہے کہ آپ سب کے اس مطالبے کی تائید ایسے ذمہ دار اشخاص کرتے ہیں جن کو آپ سب کی تقدیر بنانے کے فریضے عائد کیے گئے ہیں۔ اچھے برے قطع نظر سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے آپ نوجوانوں سے کام لینا اور برملا یہ کہنا کہ آپ پڑھنا لکھنا ترک کر کے اپنی عمر کا بہترین حصہ اعلیٰ عادات اور خصائل کے اکتساب کے بجائے سیاست کے مزبلے میں جا گریں۔ کیسے نہ کہوں کہ بڑی شقاوت ہے جس کی مکافات سے ڈرنا اور ڈرتے رہنا چاہیے۔

آپ جانتے ہیں امتحانات اور معیار ایک دوسرے کی ضمانت ہوتے ہیں۔ ان ہی سے آپ کی کارکردگی متعین اور ساکھ قائم ہوتی ہے۔ امتحان اور معیار کو بے وقعت کر دیا جائے گا تو معاشرہ کس طرح سالم، سلامت وصحت مندر ہے گا۔ بین الاقوامی ساکھ کا کیا حشر ہوگا جس پر ہر ملک کی خوش حالی اور نیک نامی کا مدار ہے۔ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ملک و معاشرے کو نفع پہنچانے اور اس کا مناسب صلہ پانے کے لیے آپ نے کتنی اور کیسی لیاقت بہم پہنچائی ہے۔ کیا پڑھا یا سیکھا۔ کس نے اور کہاں آپ کو علم وفن سے آشنا کرایا اور بحیثیت مجموعی آپ کا اکتساب علم و فن کس پائے کا ہے۔ ان امور کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر آپ کو کسی کاروبار کی ذمہ داری کس طرح سپرد کی جا سکے گی۔ تعلیم برائے گفتن، امتحان برائے نام، اسناد بے سود، تربیت و تہذیب مفقود، سوچئے تو اس سلوگن (اعلانیۂ کلمۃ الحق) سے آپ کیا پائیں گے اور ہم کو کیا دیں گے۔ معیار اور میزان سے منہ موڑنا مسلمان پر حرام ہے اسے بھی نہ بھولیے!

اپنے ذاتی اور سیاسی اغراض کی خاطر اور آپ کو ہر قیمت پر راضی رکھنے کے لیے تعلیم کے ماہروں یا مالکوں نے جو سستا لیکن حد درجہ ناروا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے وہ کوئی راز نہیں ہے۔

مثلاً ہم کو آپ کو مشورہ دیا جائے گا کہ انگریزی کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ ترک کی نذر کرو۔ حروفِ تہجی سے لے کر نیوکلیر مدارج تک تعلیم سستے سے سستے، کس مفحز اور کسم پرُسی اداروں یا دارالقیامیٰ میں حاصل کرو۔ دوسری طرف اپنے بچوں کو ہر اعتبار سے مکمل اور معیاری اور گراں سے گراں تر انگلش پبلک اسکولوں یا ان کے نمونے پر قائم کیے ہوئے مدارس میں بھیجیں گے۔ نیتاؤں یا نیم نیتاؤں کے معیارِ انصاف اور اخلاق کے مطابق ہو تو ہو، کسی اور کے نہیں ہے۔ ظاہر ہے مقابلے کے امتحانوں میں ''چابک سوار اں یک طرف مسکیں گدایاں یک طرف'' کے سین اور سانحہ پر یہ ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے سوا اور کیا کہوں کہ تعلیم علم وفن ہو یا تربیتِ مذہب واخلاق ان سے کامراں ہونے کے لیے لازمی ہے کہ ان کے معیار کڑے سے کڑے رکھے جائیں نہ یہ کہ ان کو متاعِ کاسد کا درجہ دیا جائے۔ میری دعا ہے اور آپ سے درخواست کہ تعلیم، تربیت اور ڈسپلن کو بازیچۂ اطفال نہ بنایئے نہ بننے دیجیے۔ ایسا کیجیے گا تو کل جب بوڑھے ملک کے نظم ونسق سے کنارہ کش ہوں گے اور اس بارِ گراں کو سنبھالنے اور سنوارنے کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی جائے گی تو آپ کے مشیر ومعاون کس قدر و قیمت کے ہوں گے۔ آپ نے اس کا بھی کچھ احساس کیا ہے؟

اس قصے یا قضیے کا تقاضا ہے کہ آپ کو بار بار اس کی طرف سے خبردار رکھا جائے اس اندیشہ کے باوجود کہ اس سے مجھ پر بدحواسی یا بدمذاقی کا اطلاق ہوتا ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ ملک کی تعلیمی تہذیبی اور تعمیری سرگرمیوں کے معیار کو گرانا یا اس کی طرف سے غفلت برتنا بڑی نادانی اور بدشگونی ہے۔ کوئی قریہ و دیار ایسا نہیں ہے جو مذہب اور ترقی پذیر خطوں سے علاحدہ رہے یا رکھا جاسکے۔ میں نے اونچے درجہ کے ایک آدھ ہی علوم کے صرف قواعد بغدادی پڑھے ہیں وہ بھی گردشِ روزگار سے اور سن وسال کے اعتبار سے قابلِ اعتبار نہیں رہے۔ متعلقہ علوم کے شاہنامہ اور گلستاں، بوستاں میں ان علوم کے فردوسیؔ اور سعدیؔ سے پڑھ لیجیے تو میرا کہا اتنا بے سروپا نہ معلوم ہوگا جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ حکومت، فوج، عدلیہ، انتظامیہ، تہذیب، تعلیم، تجارت، مواصلات، معالجہ، ادویات ریسرچ، ناپ تول، اشیائے خورد ونوش، غرض زندگی کی تمام این وآں کا کیا حشر ہوگا اگر اس کا انصرام ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے تو تمام دنیا کے مانے ہوئے معیار

اور میزان سے بے خبر یا بے پرواہوں گے۔ کیسے کیسے حادثات ہر وقت ہر جگہ ہونے لگیں گے۔ کھوٹے کھرے کا پتہ کیسے لگایا جاسکے گا اور زندگی کتنی بے اعتبار اور نا قابلِ برداشت ہو جائے گی۔ شعر وادب کا معیار گرادینے اور مسلمہ اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دینے سے ہم میں خود ہی پراگندگی، شوریدہ سری، ذوق وظرف کی پستی اور غیر ذمہ داری کی سرگرمیوں کی طرف بڑھتا ہوا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے زندگی میں نہ کوئی لذت باقی رکھی نہ وہ برتری جس کے لیے تمام مخلوق میں اشرف مانے جاتے ہیں۔ آپ نے حال کو جو حیثیت دے رکھی ہے کیا وہ ماضی اور مستقبل کی عدالتوں میں اپنی وکالت یا جواب دہی کر سکتا ہے اور نہیں کر سکتا تو دنیا کے سامنے آپ کی شبیہ کیا ہوگی؟ نوجوان یا 'قبیلہ کی آنکھ کا تارہ' وہی ہے جو زمانے کی ناسازگاری کا نہ شکار ہو نہ شاکی۔ اس کو پاک اور بلند کرنے اور رکھنے میں کسی خطرے کو خاطر میں نہ لائے۔

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے
کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

اس شعر میں جو دعوت ملتی ہے کبھی اس کی طرف خیال جاتا ہے۔

عزیزو!

انسان ایک اخلاقی وجود ہے۔ اسی محور پر اس کی تقدیر گردش کرتی ہے۔ ان تمام فرائض اور سرگرمیوں کا احساس اور ان کی بجا آوری جن کو انسان نے اپنائے ان کو اخلاقی سمت و سطح پر رکھنا اس کی تخلیق کے تقاضے ہیں جن کو مذہب کی اصطلاح میں منشا الٰہی کہتے ہیں ان سے روگردانی نہ کرنی چاہیے۔ یہ بات اتنی اہم نہ ہوتی اگر انسان اخلاقی وجود ہونے کے ساتھ حیوانی وجود بھی نہ ہوتا۔ اضداد کا یہ مرکب منشا الٰہی اور توفیقِ انسانی کا بڑا حیرت خیز اور فکر انگیز کرشمہ ہے۔ انسان نے ابتدا سے اب تک جو ترقی کی ہے اس میں اس کے وجود کے حیوانی اور روحانی صلاحیتوں میں مسلسل ساز و ستیز ہوتی رہی ہے۔ یہ عمل تا یوم الآخر قائم رہے گا۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی لیکن اس کو درجہ دیا گیا ہے اشرف المخلوقات کا۔ اس سے آپ احکام الٰہی اور اپنے طرزِ عمل کی اہمیت اور نزاکت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس ساز و ستیز میں بحیثیت مجموعی واضح طور پر خیر کو شر، یا انسان کو جانور پر غلبہ حاصل رہا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو انسان اس شرف وسعادت پر فائز نہ

ہوسکتا جس کی بنا پر وہ ان تمام مخلوقات سے افضل سمجھا اور سمجھایا گیا ہے جن کا ہم کو علم ہے۔ کوئی جانا اور مانا ہوا مذہب یا مسلک نہیں ہے جس میں خیر و شر کا یہ تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو اور خیر کو ابھارنے اور شر کو دبانے کی ہدایت نہ ملتی ہو۔ آپ بھی یقیناً محسوس کرتے ہوں گے کہ انسان کا کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا جس میں کہ کشاکش پیہم موجود نہ ہو جو انسان جہاں تک اس ترک و اختیار کے فشار سے عہدہ برآ ہوتا ہے وہیں تک اس کی بڑائی متعین ہوتی ہے!!۔

اس عقیدے کے مطابق تمام عمر اپنے اور آپ کے اس علی گڑھ کی جامع مسجد، اسٹریچی ہال، یونین کلب، کرکٹ فیلڈ، ڈائننگ ہال اور کچی بارک کے سائے اور شب و روز میں اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر بہتر سے بہتر ذوق اور ذہن کے دوستوں، عالموں اور بزرگوں کے ساتھ زندگی، شعر و ادب اور تمام علم و فن کو سمجھنے سمجھانے اور صحت و سلیقہ سے رہنے اور رکھنے کے آداب سیکھے اور برتے۔ اسے عقیدت عبادت یا عادت کا تصرف کہیے یا کچھ اور۔ میرا خیال ہے کہ گذشتہ تیس چالیس سال سے فرد، سماج، ادارے، مذہب، حکومت، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ اور اقدارِ عالیہ میں ایسا عالم گیر ہیجان، فساد اور فتور آیا ہے کہ اب تک کوئی طاقت یا تحریک اس کو صحت اور اعتدال پر لانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ امید افزا آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یہ سب کیوں اور کیسے؟ اس کے اسباب میں ایک یہ ہوسکتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ کو قرآن سے انسانی جسم کی پتھالوجی (علم امراض-مرضیات) اور اس کے نتائج کو انسانی اور اخلاقی آئین اور اصول سے علاحدہ اور آزاد رکھ کر دیکھنے اور ان پر عمل کرنے کا غلط سستا، پُر لذت اور ہیجان انگیز طریقہ اور ان پر عمل کرنے کی ترغیب و تبلیغ۔ انسان کا جسم مرکب ہے، طرح طرح کے اجزا و استعداد سے جن کو رہتی دنیا تک معلوم نہیں کتنے ڈارون اور فرائڈ دریافت کرتے رہیں گے اور انسان کی حیوانی خصلتوں کا انکشاف ہوتا رہے گا اور ہم انسانی خصائل کو حیوانی خصائل کی چاکری میں دیتے رہیں گے۔ اس عالم گیر اور شاید نا قابلِ تسخیر المیہ سے ہم دوچار ہیں۔

عزیزو!

اس گفتگو کی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا کے عاقلوں اور دردمندوں نے ایسے رجحانات اور خصائل قابو میں رکھنے کی اور ان کو مفید اور مبارک کاموں میں لگانے کی تاکید

کی ہے جو انسان کو نقصان کی طرف لے جاتی ہے۔ دوسری طرف ان قوتوں کو برسرکار لانے پر زور دیا ہے جو شر کو دباتی اور خیر کو اُبھارتی ہیں۔ سائنس کا کام تجربہ اور تجزیہ کے عمل سے فطرت کی پوشیدہ طاقتوں کو دریافت کرنا اور ان کو قابو میں لاکر انسان کے لیے کار آمد بنانا اور رکھنا ہے۔ اس کا یہ منصب کبھی نہ رہا نہ ہونا چاہیے کہ وہ اخلاق و مذہب اور معاشرہ کے دیے ہوئے اقدار اعلیٰ یا زندگی کے معظمات کی قلم رو میں دخل انداز ہو، اور دست درازی کرے۔ دونوں کی مملکت قطعاً جداگانہ ہے۔ موجودہ عالم گیر انتشار اور اختلال کا سبب یہ ہے کہ ہم نے مذہب و اخلاق کی دی ہوئی شریعت کو حیوانیات اور حیاتیات کے طبعی اور ناگزیر قوانین کے مقابلے میں ناقابلِ التفات اور ناقابلِ عمل قرار دے دیا ہے۔ حالاں کہ بھلائی، راستی اور حسن اور ان کی دی ہوئی برکتیں تمام تر فیضان ہیں۔ مذہب اور اخلاق کے بتائے ہوئے اوامر اور نواہی کی تعمیل کی۔

انسانیت کے اعلیٰ اقدار پر نفس کے ادنیٰ تقاضوں کے غلبہ پالینے سے ہمارے اخلاق، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ اور خوب و ناخوب کے تصور یا معیار میں جو ابتری آئی ہے اس نے زندگی کو طرح طرح کی مناہی اور محرومی میں مبتلا کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ہماری معذوری یا عیاری یہ ہے کہ ہم عقل اور ضمیر کی روشنی میں قانون بناتے اور قبول کرتے ہیں لیکن اس کی تعبیر یا تنکیر نفس کے ناروا تقاضوں سے بے قابو ہو کر کرتے ہیں۔ اس ستم ظریفی یا المیہ کی طرف ہمارا ذہن بہت کم جاتا ہے کہ ہم جتنی فکر و فرزانگی اور دولت و اقتدار کو غلط صحیح جتاتے اور منوانے پر صرف کرتے ہیں۔ اس کا کم سے کم حصہ بھی صحیح و صالح بتانے اور منوانے پر صرف نہیں کرتے۔

پچھلے تیس چالیس سال سے دنیا جن آلام میں گرفتار ہے اس سے وہ تمام لوازم و نعائم جن پر صحت مند، مسرت بخش اور ترقی پذیر معاشرے کا دار و مدار تھا زیروزبر ہو گئے۔ یہ سب اتنی تیزی سے آئے، اس شدت سے ہوئے اور اس درجہ سخت گیر اور دیرپا ثابت ہوئے کہ وہ مصنفین، فن کار اور دانش ور جو مستند اور محترم مانے جاتے تھے وہ بھی اس کے شکار ہو گئے۔ اگر عوام اور کم سمجھ گمراہی میں مبتلا ہو جائیں تو حیرت کی بات نہیں۔ اس لیے کہ وہ بالعموم کم سمجھ یا ناسمجھ ہوتے ہیں۔ آلامِ روزگار کے شکار ہوتے ہیں۔ سیاست کے عیار نہیں ہوتے، اس لیے وہ غلط تحریک کے اوّلین شکار ہوتے ہیں، وہ سستی لذت کے محتاج، منتظر ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ہیجان

انگیز افسانے، کاواک شاعری، الزام و شنام کی تنقید، سامعہ خراش موسیقی، مصوری اور قبیلے کے عام رنگ ڈھنگ میں مبتلا ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن خواص کا اس سے متاثر ہو جانا اور مسخ یا معدوم کے پیچھے ہو لینا بڑا تشویش ناک حادثہ ہے۔ جہالت کے زمانے میں فاتح جان و مال لوٹ کر تسکین پا جاتے تھے لیکن تہذیب کے فاتح جب تک مفتوح کے مذہب و اخلاق، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ اور اقدارِ عالیہ کو مجروح و مسخ اور معدوم نہیں کر لیتے تسکین نہیں پاتے!

وبا زیادہ تر سلم (گندی گنجان فلاکت زدہ آبادی اور نواح) سے نکلتی اور پھیلتی ہے اس کا شکار سب سے پہلے کمزور صحت کے درماندہ حال ہوتے ہیں جو وہاں رہتے بستے ہیں۔ یہی وبا زور پکڑتی اور عام ہو جاتی ہے تو صحت مند اور آسودہ حال بھی اس میں گرفتار ہونے لگتے ہیں۔ جس شعر و ادب کا ذکر آ چکا ہے اس نے یہی کیا اور جب کہ یہ آشوب عالم گیر ہو چکا ہے اور اصلاح و اعتدال شاید خود اس کے بس کا نہیں رہ گیا تو کہتے ہیں کہ یہی صحت اور یہی صحت مند ادب ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ناقص لٹریچر تعلیم و تربیت اور تبلیغ کا اثر عام ذہنوں بالخصوص بچوں اور نوجوانوں پر کتنا جلد کتنا خطرناک اور کتنا گہرا پڑتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ان دنوں مشینوں اور آدمیوں سے طرح طرح کی کثافت زمین پانی اور ہوا میں کثرت سے پھیل کر صحت انسانی کے۔لیے ایک ناقابل تسخیر خطرہ بن گئی ہے اور اس کے اثرات جسمِ انسانی میں سرایت کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک صورت وہ لٹریچر اور اس کے متعلقات پیدا کر رہے ہیں اور کر چکے ہیں جسے عام طور سے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نے عام ذہنوں کو ماؤف کر دیا ہے جس کے مناظر، مظاہر اور مظاہرے طرح طرح کے جرائم اور فحاشی میں پیش آ رہے ہیں۔

عزیزانِ گرامی!

تھوڑی دیر کے لیے آپ سے گھریلو باتیں کرنا چاہتا ہوں، یعنی علی گڑھ کا ہونے کے سبب سے آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور کب اور کہاں تک آپ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔ خواہ آپ کیسی ہی اور کتنی ہی طاقت ور اور سرکش سیاسی جماعت کے قائد یا قیدی ہوں۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ ملک کے خیر خواہی اور بڑائی چاہنے والوں میں تمام اعلیٰ اقدار کے اعتبار سے کسی طرح کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اگر آگے نہیں، اس بنا پر ہم اس دانش گاہ

کے دیرینہ اعلیٰ روایات، خدمات اور ذمہ داریوں کو مضمحل، مجروح یا معطل دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔

عربی کا ایک قول ہے کہ آدمی لباس سے پہچانا جاتا ہے۔ مہذب معاشرے میں ہر موقع اور محل کے نئے لباس کی وضع قطع اور اس کے آداب مقرر ہیں، کچھ دنوں سے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں جو پوشاک عام ہے اس پر گفتگو کی یوں گنجائش نہیں کہ فیشن کا جواز ہر عدم جواز پر قابلِ ترجیح قرار پا چکا ہے۔ لیکن فیشن کے اہلِ ایمان یہ بھی جانتے ہوں گے کہ فیشن سے زیادہ گریزپا اور پا در ہوا کوئی اور چیز نہیں۔ اس لیے ایسے کرشمے کو سیرت وشخصیت کی پرداخت وپختگی میں حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔

اسپین کا ایک پرانا مقبول لیکن وحشیانہ کھیل ہے جس میں ایک شخص جسے مٹاڈور کہتے ہیں غضب ناک سانڈ سے یک وتنہا مقابلہ کرتا ہے۔ انتہائی تیزی کے ساتھ پینترے بدلتا جانور کے حملہ کو خالی دیتا اور موقع پا کر اپنے نیزے سے سانڈ کو زخمی کرتا رہتا ہے، اور بالآخر اس کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ مٹاڈور کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا ایک کپڑا ہوتا ہے جسے وہ جانور کو دکھا دکھا کر زیادہ سے زیادہ مشتعل کرتا رہتا ہے۔ انگریزی کی ایک مثل ہے، سانڈ کو سرخ کپڑے دکھانا۔ یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی کو مشتعل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ مٹاڈور کا لباس انتہائی چست ہوتا ہے، اتنا جیسے جسم کی جلد لباس پر منڈھ دی گئی ہو نہ کہ لباس جسم پر۔ آج کل نوجوان طالب علموں بالخصوص لڑکیوں کا لباس چُست مختصر اور شوخ سے شوخ تر رنگ ہونے کے اعتبار سے مٹاڈور کے لباس کو بھی زک پہنچاتا ہوا نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ آج تک کوئی خاتون مٹاڈور نہ دیکھنے میں آئیں نہ سننے میں۔ نوجوان لڑکیوں کے لباس کا ایک انداز جو رائج ہو گیا ہے وہ مردانے وضع قطع کے لباس کا ہے۔ یہ بڑے ناپسندیدہ رجحانات کی غمازی کرتا ہے جو ہمارے معاشرے میں داخل ہو گئے ہیں جس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہے لڑکیوں پر نہیں۔ اس لیے کہ باوجود اس ادعا کے کہ خواتین مردوں کی دست نگری اور دست گیری کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ قدم قدم پر اپنی حفاظت، عافیت، آسودگی اور عزّتِ نفس کے لیے مردوں کی محتاج ہیں۔ اس کو کیا کیا جائے کہ عورتوں کی تخلیق میں خدا نے بھی مردوں کی پاسداری کی ہے۔

ہمارے بڑے بوڑھوں اور اسی طرح ہماری بوڑھی تہذیب نے ہم کو یہ بتایا ہے کہ لباس کے بنیادی مقاصد یہی دو چار ہیں۔ مثلاً جسم کی حفاظت، ستر پوشی، خوش نمائی اور سنجیدگی

جس قماش کے لباسوں کا ذکر اوپر آیا ہے ان کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان چہارگانہ صفات کو یکسر نظر انداز کر دینے کے بعد اب اس کا مقصد کچھ بھی ہو، ستر پوشی کا احترام والتزام نہیں رہ گیا ہے۔ آپ اکثر نوجوان چیختے چلچلاتے رنگ کے بدزیب لباس میں بدنما سر کے بال مضحکہ خیز گل مچھوں اور تڑی مڑی مونچھوں کے ساتھ تجریدی ہیئت وحلیہ بنائے ہوئے غیر ذمہ دارانہ انداز سے شارع عام یا گلی کوچوں میں جس طرح گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ آپ ہی بتائیں کیا آپ کے خاندانوں کے افراد کے طور طریقوں سے مطابقت رکھتا ہے یا اس ادارے کے شایانِ شان ہے جس کی حرمت پر ہم میں کتنے دیوانے ہر وقت ہر متاع نثار کر دینے کے لیے تیار رہتے ہیں! کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ کی اسی خرافات پر آپ کے ماں باپ کو کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں اور آپ اپنی تعلیم سے غافل اور اپنی تعلیم گاہ کی بے حرمتی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یاد رکھیے اس مجرمانہ غفلت کا آپ کو کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی، اور یقیناً وہ وقت بڑا سخت ہوگا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ یا وہ باتیں ہم نے مغرب سے قبول کی ہیں اس لیے درست اور قابلِ قبول ہیں۔ اس خوش گمانی کو خود مغرب نے ہم سے دور کر دیا ہے۔ مغرب کی سائنسی میکانیکی اور دوسرے علومِ جدیدہ میں ترقی کا کون قائل نہ ہوگا، لیکن مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی ترقی کے میدانوں میں پچھلے چالیس پچاس برسوں میں وہ ہم سے بہت پیچھے نہیں ہو گیا ہے بلکہ ہم اپنے نقطۂ نگاہ سے اس کو گم کردہ سمجھتے ہیں اور ٹھیک سمجھتے ہیں۔

لباس کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ جو شخص جس قوم کا لباس اختیار کرے گا اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔ عجب نہیں اس قول میں لباس کے طور طریقہ کا مفہوم مضمر ہو۔ یہ ہدایت ایک ایسے صحیفۂ اخلاق کی دی ہوئی ہے جس میں اوڑھنے، پہننے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھے، رہنے سہنے، کہنے سننے اور زندگی کی دوسری پابندیوں سے عہدہ برآ ہونے کے آداب مقرر کر دیے گئے ہیں اور ہم آپ ان کو پورا کرنے کے پابند قرار دیے گئے ہیں جن سے انحراف کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ستر عورت، طہارت، حرام وحلال مستحب وغیر مستحب کی جو پابندی ہم پر عائد کر دی گئی ہے وہ شاید ہی کسی اور امت پر اب تک لازم کی گئی ہو۔ یہ پابندی اور ذمہ داری معاشرے کو صحت مند، خوش گوار اور روبہ ترقی رکھتی ہے۔

آج کل زندگی میں جیسی شدت اور سفا کی آ گئی ہے اور جیسے ناگزیر اس کے تقاضے ہیں ان کے مطابق موقع اور محل کے اعتبار سے لباس اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ تبدیلی ایسی اور اتنی ہی ہونی چاہیے جو شخصیت اور شناخت پر غلبہ نہ پا سکے۔ موقع محل کے تقاضے اور ہوتے ہیں، تفنن اور تمسخر کے اور ان میں جو فرق ہے اس کا بہر حال لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں انگریزی عہد کے ایک فوجی آئین یا ڈسپلن کا ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ وہ یہ تھا کہ کنٹونمنٹ کی حدود سے باہر فوج کا کوئی سپاہی یا افسر اپنی فوجی وردی (یونی فارم) میں نظر آئے تو وہ کسی ایسی حرکت کا مجاز نہیں ہو سکتا تھا جس میں فوجی یونی فارم کی حرمت پر حرف آتا ہو۔ اسی طرح کوئی شخص اس کا مجاز نہ تھا کہ سپاہی یا افسر سے بے تکلفی یا بے تمیزی سے پیش آئے۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس پر کوئی ہاتھ ڈال سکے۔ یونی فارم کی توہین پوری برٹش افواج اور برٹش حکومت کی توہین متصور ہوتی جس کی پاداش معمولی نہ تھی۔

ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں یونی فارم کا مقصد یہی تھا کہ ہر طالب علم پہچانا جا سکے۔ یونی فارم کی یہ قید طالب علم، کالج اور پوری قوم کے وقار و وقعت کی نشانی بھی تھی اور ضامن بھی۔ آج جب کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں دونوں یکساں طور پر تعلیمی اور زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ لڑکوں کے لباس سے کہیں زیادہ لڑکیوں کا لباس اور وضع قطع ہماری توجہ اور تشویش کا موجب بنا ہوا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اگر وہ اپنی پوشاک اور وضع قطع میں احتیاط، اعتدال اور عام رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھیں گے تو طالبات ان سے زیادہ احتیاط اور اعتدال اور وقار ملحوظ رکھیں گی۔ اس طور پر لباس کی اصلاح اتنی ہی آسان ہو جائے گی جتنی اب ناگفتہ بہ معلوم ہوتی ہے۔ لباس کو صاف ستھرا خوش نما، آرام دہ اور بہترین اور موسم و موقع کے لحاظ سے موزوں ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو جس سے کوئی نازیبا نمائش مقصود ہو یا دوسرے بے تکلف یا جری ہونے کی جرأت کر سکیں۔ بتایا گیا ہے کہ بیوی اور شوہر کا وہی رشتہ ہونا چاہیے جو جسم و جان کے لیے موزوں و مناسب لباس کا ہوتا ہے۔ زن و شو کے تعلقات پر ایسا جامع فارمولا شاید ہی کبھی وضع کیا گیا ہو۔ طلبا اور تعلیم گاہوں کو سیاسی اور فلستانی آب و ہوا سے محفوظ رکھنا ملک کے خیر خواہوں کے سامنے بڑا سنگین مسئلہ ہے۔

مناسب لباس کی مانند تقریبوں میں کھانے پینے کے بھی مقررہ آداب ملحوظ رکھنے کی اہمیت ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہم ہوں یا آپ اعلیٰ وادنیٰ غریب وامیر خواتین و حضرات ایسے ہوتے ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں بالخصوص بوفے جہاں گنجائش قلیل اور مہمان کثیر ہونے کے سبب سے لوگ پلیٹ اور اشیائے خوردونوش ہاتھ میں لے کر کھڑے کھڑے یا چلتے پھرتے کھاتے پیتے ہیں۔ جیسے زندگی میں ان کو اچھا کھانا مفت کھانے کا نہ پہلے کبھی اتفاق ہوا تھا نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ کیسے کیسے لوگوں کو کس ندیدے پن سے چپڑ چپڑ کھاتے اور اسی دوران میں گنواروں کی مانند شور مچاتے سستے بھونڈے مذاق کرتے ہانپتے کانپتے دوسروں کے سامنے سے مزید کھانے کی چیزیں جھپٹتے بٹورتے دیکھا ہے کہ کسی ایسی تقریب میں جانے سے کراہت ہوتی ہے۔ شاید وہ دن بھی دور نہ ہو جب ایسی تقریبوں میں لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ سے نوالہ چھین کر کھانے لگیں۔ 1947ء کے کشت وخون میں دہلی میں لوگوں نے پرانے قلعہ کے پناہ گزینوں میں دیکھا کہ باپ بیٹے کے ہاتھ سے روٹی چھین کر کھا جاتا تھا۔ عجب نہیں جب آج کل کی مہنگائی اور بدتمیزی کی شدت اس حد کو پہنچ جائے کہ ہر تقریب پرانے قلعہ کے پناہ گزینوں کی یاد دلانے لگے!

ایک دوست نے ملٹری دعوت کی تقریبوں میں کھانے کے بعد آداب بیان کیے۔ اس سے بڑی خوشی اور حیرت ہوئی اور اس سے اندازہ ہوا کہ فوج میں ڈسپلن کا کیا تصور ہے اور کس کو کہاں تک برتتے ہیں۔ کہتے تھے کہ ہر شخص کا یونی فارم میں ہونا لازمی ہے جس طرح کسی زمانے میں ہمارے یہاں ڈائننگ ہال اور کلاس روم میں اور شارع عام پر ہر ایک کا یونی فارم میں ہونا لازم آتا تھا۔ فوج میں دسترخوان کا آئین یہ تھا کہ جب تک افسر اپنی جگہ پر بیٹھ نہ جائے کوئی اپنی نشست پر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ کھانے کا یہ کہ سب سے پہلے افسر کے سامنے پیش کیا جائے گا اس کے بعد دوسروں کی باری آئے گی۔ کم سے کم حصہ لینا ہوتا ہے۔ اس کھانے کا دوسرا کورس لینا تقریباً ممنوع ہوتا ہے۔ اس لیے سبھی احتراز کرتے ہیں، کوئی شخص ایک دوسرے سے نہ گفتگو کرسکتا ہے نہ سرگوشی یا ہنسی مذاق۔ سب کو افسر کی طرف متوجہ رہنا پڑتا ہے۔ گفتگو کا مجاز وہی شخص ہوگا جس کو افسر کمانڈنگ (صدر دسترخوان) مخاطب کرے۔ ایسی حالت میں مخاطب نہ اپنی پلیٹ سے لقمہ

لے سکتا نہ کسی اور طرف مائل ہو سکتا ہے۔ آخر میں کہتے تھے کہ ہر شخص کیمپ یا بارک میں آ کر مزید کھانے سے معدے کے تقاضے پورے کرتا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ تقریبوں میں شائستگی کے ساتھ لطف و لذت اٹھانے کے بجائے فوجی ڈسپلن کی پابندی کی جائے۔ البتہ اتنا ضرور یاد رکھیں کہ کھانے پینے کی تقاریب میں آدمی کے بے نقاب ہو جانے کا بڑا اندیشہ رہتا ہے۔ اس ملٹری ڈسپلن کے ساتھ میڈیکل ڈسپلن کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے جو ایک ایٹ ہوم میں دیکھنے میں آیا۔ عام طور پر ہمارے میزبان دعوتوں میں ہر طرح کا انتظام بڑی فراخ دلی اور احتیاط سے کرتے ہیں۔ سو امکھیوں کے انسداد کے ایٹ ہوم میں کھانے پینے کی چیزوں میں وہی بڑوں کی قاب تھی جس پر بڑی کثرت سے مکھیوں کی پورچھڑکی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر مکھیوں سے قطعاً بے نیاز و بے خبر ہو کر یا ان کے علی الرغم دہی بڑے سے بے اختیار شوق فرما رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا کہ ڈاکٹر ہو کر وہ اس بے احتیاطی سے کام لے رہی ہیں تو شغل جاری رکھتے ہوئے اُکتا کر فرمایا کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں رسک (Risk) لینا ہی پڑتا ہے۔ ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ مریض کی جان بچانے کی خاطر ڈاکٹر کو آپریشن تھیٹر میں اس کی جان کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے لیکن ایسا شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو کہ کسی ایٹ ہوم میں ایک لیڈی ڈاکٹر کو دہی بڑے اور مکھیوں کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑا ہو۔

ان امور سے قطع نظر کہنا یہ ہے کہ میزبان دعوت میں مہمانوں کو اقربا، یتامیٰ، مسکین اور ابن السبیل ہونے کی حیثیت سے خیرات دینے یا ثواب کمانے کی خاطر نہیں مدد کرتا بلکہ اپنے احساسِ مسرت و یگانگت میں مہمان کے احساسِ مسرت و یگانگت کو شریک کر کے خوش وقت ہونا چاہتا ہے یا کسی اہم مسئلہ میں میزبان اور مہمان ایک دوسرے کی دانش اور دوستی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کھانے پینے کی اچھی اور میسر چیزیں اسی احساسِ دوستی اور ضمناً کام و دہن کی لذت کے لیے فراہم کی جاتی ہیں یہ مل بیٹھنا پیٹ کے دھندے اور پیٹ کے بندے کے لیے نہیں ہوتا۔ اکثر یہاں تک دیکھنے میں آیا ہے کہ خود آپ صاحبان کے لیے اور آپ صاحبان کی طرف سے جو تقریب منعقد کی جاتی ہے اور آپ ہی میزبان ہوتے ہیں اور مہمان اس میں سب سے زیادہ بدنظمی پائی جاتی ہے یعنی خورد و نوش کے باضابطہ اور مقررہ وقت سے پہلے ہی آپ کے کچھ منچلے دسترخوان

صاف کر دیتے ہیں اور بقیہ محروم و مایوس و بے زار گھر واپس ہوتے ہیں۔ آپ نے حافظ کا مشہور مصرعہ سنا ہوگا جو اس صورت حال کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور تصویر کشی بھی!

ع چناں بروند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغمارا!

جہاں مدعو ہوں وہاں مقررہ وقت پر صاف ستھرے مناسب ہیئت ولباس میں سادگی سلیقہ اور خوش دلی کے ساتھ پہنچنا چاہیے۔ گفتگو اور کھانے پینے کے دوران اس امتیاز کا بھی در پردہ لطف وسلیقہ سے اعتراف واظہار کرتے رہنا چاہیے جو اس تقریب میں شرکت کرنے سے آپ کے حصہ میں آیا، نہ یہ کہ حرص وحماقت کے غلبہ سے کھانے پینے کی اشیا حاضرین کی عافیت اور میزبان کی آبرو پر مسلط ہو جائیں۔ کسی تقریب میں بن بلائے چھوٹے بڑوں (بچوں اور نوکرانیوں) کو لے کر پہنچنا اور ان کی مدارات میں دسترخوان تاراج کرنے لگنا بہت بڑا عیب ہے جس سے ہر حال میں بچنا چاہیے۔ اس بے اعتدالی یا بدسلیقگی کا ایک سبب بوفے ہے۔ بالخصوص جہاں لوگ دسترخوان کے مقررہ آداب سے بے گانہ اور ندیدہ پن کا شکار ہوں۔ شاید ہی کوئی مہمان اور میزبان ایسا ہوتا ہو جو بوفے میں شرکا کے طرزِ عمل سے بدحظ یا لطف اندوز نہ ہوتا ہو جو بدحظ ہونے سے کہیں زیادہ توہین انگیز ہے۔

کسی کے گھر عمداً ایسے وقت نہ پہنچنا چاہیے جو چائے یا کھانے کا وقت ہو۔ تاکہ بادنیٰ عذر شریکِ ماحضر ہو جائیں یا دیر تک بیٹھے رہنا کہ کھانے کا وقت آجائے اور میزبان کو مدعو کیے بغیر چارہ نہ رہ جائے بڑی بے غیرتی ہے۔ کچھ اور نہیں تو اس لیے کہ میزبان نے معلوم نہیں کس مجبوری سے کیا سوکھا پھیکا کھانے کے لیے رکھ چھوڑا ہو اور اس میں کسی اجنبی کو شریک کرنے میں شرم آتی ہو، کھانے پینے پہننے اوڑھنے رہنے سہنے حاضر باشی رسوخ ورسائی میں آدمی کو خودداری اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ان امور میں محتاط بالعموم مستغنی رہنا اعلیٰ ظرفی، بہ صورت دیگر بے غیرتی ہے۔ جس طرح آزادرائے دہندگی کے لیے لازم ہے کہ جمہوریت کے تقاضے اور ذمہ داریوں کا پورے طور پر احساس ہو۔ اس سے کچھ زیادہ ہی آداب چھوٹی بڑی دعوتوں میں لازم آتے ہیں۔ آدمی کے تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے میں دو وقتوں پر آسانی سے پتہ لگ جاتا ہے۔ ایک دعوت اور دسترخوان پر، دوسرے کسی کے ساتھ طویل ریلوے سفر میں!

عزیزانِ گرامی!

قدامت پرست یا سلف شعار ہونے کے سبب سے کبھی کبھی اس کا احساس ہوا ہے کہ گذشتہ چند نسلوں سے تقریباً پانچ سال سے پندرہ سال تک کے بچوں کو جان بوجھ کر جس خالص دنیوی انداز کی تعلیم دی جانے لگی ہے جس میں وظائف جنسی سے بھی آشنا کرانے کی تجویز زیر بحث رہا کرتی ہے۔ دوسری طرف ان کو اخلاق، اعتقاد اور مذہب سے آشنا اور اعلیٰ منشی اور اعلیٰ کردار معلمین کے بجائے روشن خیال اور حفظِ مراتب سے بیگانہ والدین اور معلموں کے زیر سایہ رہنے کا اتفاق ہوتا ہے اس سے ان بچوں اور بالآخر نوجوانوں میں ترک وقبول کی وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو آئندہ زندگی کے بہت سے مضر ومنفی رجحانات واثرات سے ان کو محفوظ رکھتی ہے اور بے غیرتی اور بے راہ روی سے بچاتی رہتی ہے۔ ہمارے اسکول اور کالجوں میں بوائے اسکاؤٹ اور انجمن صلیب احمر (Red Cross) یا روٹری کلب کی شاخیں ان کے نمونے پر ادارے قائم کیے جائیں تو ان سے نوجوانوں میں وہ ڈسپلن اور حفظِ مراتب کا احساس پیدا ہوگا جو ملک اور معاشرے کی صحت وسلامتی کا ضامن اور آپ نوجوانوں کو روز روز کی سیاسی خلفشار اور مکروہات سے محفوظ رکھے گا۔ یونیورسٹی ٹریننگ کی تحریک ایک زمانے میں بہت مقبول تھی، لیکن کچھ دنوں سے اس کا پتہ یا پرتو قواعد اور پریڈ کے میدانوں سے باہر کم ہی نظر آتا ہے اور اس کی وہ اہمیت اور احترام بظاہر باقی نہیں رہا جو پہلے کبھی تھا۔ اب اس کی ہیئت وحیثیت مصارف زندگی کی تربیت گاہ کی اتنی نظر نہیں آتی جتنی دفتر محکمہ یا زیارت گاہ کی۔ اعلیٰ اداروں کے محکموں، دفتروں اور روضوں یا زیارت گاہوں کی حیثیت اختیار کر لینا ان اداروں کے زوال کی علامت ہے۔

درخواست کرتا ہوں کہ آپ پابندی اور طالب علمانہ زندگی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ کلاس ٹٹوریل سمینار اور لائبریری میں حاضری دیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ استاد جو کچھ بتائے اور پڑھائے اس کے علاوہ اور کبھی کبھی اس سے زیادہ طور پر اپنی تربیت و تہذیب کا احترام کریں اور رکھیں۔ کلاس سے باہر بے شمار ایسے صحت مند مشاغل ہیں جن سے دل کی کشاد ہوتی ہے۔ ان سے استفادہ آپ کی مرضی پر نہیں منحصر ہے بلکہ آپ کے فرائض میں ہے۔ مثلاً یونین کلب، ڈائننگ ہال، کھیل کے میدان، بزمِ احباب اور اقامتی زندگی کی وہ صالح

تفریحی سرگرمیاں جن کے لیے علی گڑھ، ملک اور ملک سے باہر مشہور اور نیک نام رہا ہے۔اس کی بازیافت آپ کی اوّلین ذمہ داریوں میں ہے۔زندگی اور زمانے کا نقشہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے سالک کی طرح آپ طالب علموں کو بھی مشکل مقامات سے بالضرور گزرنا پڑے گا۔آپ کی سہل نگاری یا بے راہ روی سے آپ کو معظمات زندگی سے سرفراز ہونے کے فرائض و آداب سے مستثنٰی یا معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں علی گڑھ اور علی گڑھ میں ہندوستان کی منزلت پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کو ڈھالے بغیر کام نہیں چلے گا۔

کلاس، ٹیوٹوریل، لائبریری، یونین کلب، ڈائننگ ہال، کھیل کے میدان، اقامتی کردار کی صالح اور صحت مند سرگرمیاں اور یونیورسٹی ٹریننگ کور، اس ادارے کے ایسے عوامل تھے جن کے فیضان سے علی گڑھ کو وہ امتیاز اور ناموری ہوئی جن پر سرفراز ہونے کے لیے آج ہم متمنی اور مضطرب ہیں، عزّت اور اعتبار جن اقدار کی پیروی سے آتی ہے ان کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوتی۔ یہ ایسی متاع ہیں جو بادنیٰ غفلت رخصت ہو جاتی ہیں لیکن واپس ہوتی ہیں تو بہت بھاری تاوان لے کر! بدلے ہوئے حالات میں یہ کہنا کہ ''ستارے اور بنیں گے اب آسماں کے لیے'' صحیح نہیں ہے۔آسمان اور ستارے چاہے جہاں جیسے بنتے رہیں ان کی ترکیب، ہیئت، آرائش اور مقصد ان ہی اقدار کا محتاج رہے گا جو انسانیت کی ترقی اور تحفظ میں اب تک معین رہے ہیں اور معتبر مانے گئے ہیں۔جن عوامل کے نام اوپر لیے گئے ہیں ان کی طرف پہلے کبھی سب سے زیادہ توجہ تھی۔آپ کی نظروں میں آج ان کی وقعت نہیں رہی ایسا تو نہیں اس کا سبب یہ ہو کہ آپ زندگی کی ہلچل کو قابلیت، محنت اور خلوص سے ہموار کرنے کی بجائے زندگی سے سستا سودا کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں۔ایسا تو نہیں کہ آپ میں وہ عینیت (آئیڈیلزم) ساتھ ہی ساتھ حقیقت پسندی اور اچھے کاموں میں حصہ لینے کا حوصلہ یا توفیق نہیں رہی۔جن کے بغیر زندگی کا سوچا سمجھا کوئی مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا ہے نہ اس کو بروئے کار لانے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

عزیزو!

طالب علمانہ زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں جن معمولی باتوں کی طرف آپ کی توجہ مائل کرائی گئی ہے یا آئندہ کرتا رہوں گا۔وہ مہمل اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہوں تو عجب نہیں۔ان

کے ساتھ یہ خاکسار بھی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں یونیورسٹی کے ذہین اور ذکی نوجوانوں اور اسکول کے سادہ اور معصوم بچوں کی مختلف سطحوں میں فرق نہیں کرسکتا۔ میری مشکل یعنی عبادت اور عادت دونوں یہ ہیں کہ جہاں عقل اور خیر خواہی کی باتیں کہنی ہوتی ہیں وہاں بچے، نوجوان اور بوڑھے میں فرق نہیں کرتا۔ یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ آپ میں ماشاءاللہ کافی تعداد ایسوں کی نظر آتی ہے جن کی عمر اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس سے آپ کو انکار نہیں ہوسکتا کہ سچی اور اچھی باتیں بڑی سادی اور کثرت سے آس پاس بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ قصور ان کا نہیں ہے جو ان کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان کا ہے جو بزدل یا خودغرضی کے سبب سے ان کا سامنا کرسکتے ہیں نہ ان پر عمل کرسکتے ہیں۔ ان اچھی باتوں کے اختیار کرنے اور ان کا پھل پانے میں دیر لگتی ہے۔ اس لیے امید وصبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی اس میں عمریں گزر جاتی ہیں لیکن ان کی بخشی ہوئی سعادت اور خیر و برکت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ زمانے کے ساتھ بات کہنے کا اسلوب، موقع محل اور مخاطب بھی بدل جاتے ہیں۔ اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔

یہ جو بہت سی معمولی باتیں مثلاً کلاس روم، یونین، کھیل کے میدان اور ڈائننگ ہال وغیرہ کی۔ آپ کو بتائیں اور سنائیں، وہ موجودہ عہد میں یقیناً آپ کو بے مزہ، اور دور از کار معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نہ بھلایئے کہ بغیر اس ڈسپلن یا جنتر سے نکلے ہوئے آپ کی وہ کمزوریاں ہرگز دور نہ ہوں گی جو آپ کو تخریبی تحریکوں میں حصہ لینے پر اُکساتی ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہاں میں نے جن معمولات سے گزرنے پر زور دیا ہے وہ معمولی ہونے کے سبب سے قابلِ التفات نہیں ہیں۔ معمول اور معمولی سے گزرے بغیر آج تک کسی کو معراج نصیب نہیں ہوتی ہے۔

عزیزو!

یہ جو ایک عام لیکن غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ انگریزی عہد سے آج تک ہمارا نظامِ تعلیم ناقص ہے اور اس بنا پر معلوم نہیں کتنے طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوئے اور انہوں نے سفارشات کے انبار چھوڑے ان سے ہر شخص واقف ہے۔ تعلیم کا کوئی نصاب اور نظام ناقص نہیں ہوتا۔ خرابی بالعموم یہ ہوتی ہے کہ طالب علم پڑھنا نہیں چاہتے اور معلم پڑھانے پر مائل نہیں ہوتے

اور دونوں غیر تعلیمی سرگرمیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کیسے اعلیٰ اور عالمانہ نظامِ تعلیم جن پر بے انتہا روپے اور وقت صَرف ہو چکا ہوتا ہے، آئے دن بروئے کار آتے رہتے ہیں اور بے کار اور بے ثمر ثابت رہتے ہیں۔

ایک زمانے میں یونین کلب اور کھیل کے میدان بالخصوص کرکٹ فیلڈ آپ طلبا کی تفریح، تربیت اور تندرستی کے بڑے مقبول اور معقول وسائل اور مراکز تھے۔ ان کے علاوہ روزانہ کی دلچسپی اور ہماہمی کے باعث ڈائننگ ہال کی حاضری اور وہاں کے آداب اور روایات تھیں۔ کیسی بھوک ہوتی تھی اور اس کو فرو کرنے کے لیے کیا اور کتنا کھانا ملتا تھا جیسے وہ کھانا بھوک کو کم یا دور کرنے میں بلکہ مہمیز کرتا ہو۔ معدے کا معتوب کوئی لکھ پتی ہماری بھوک کو اپنے لیے گراں سے گراں قیمت پر خریدنے کے لیے آمادہ ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف کوئی بھی فاقہ زدہ اس کھانے اور اتنے ہی کھانے کو کھا کر روزی رساں کا شکر گزار نہیں ہوسکتا تھا۔ اس ناشدنی بھوک اور ناگفتنی کھانے کی تلافی اس کباب اور فیرینی سے کی جاتی جو خوانچہ والے ڈائننگ ہال سے باہر لیے بیٹھے ہوتے تھے۔ کیا کباب اور کیسی فیرینی! کالج کے اس زمانے کی کھانے پینے کی چیزوں میں بیماری پیدا کرنے والے جراثیم ناپید ہوتے۔ صرف بھوک بڑھانے والے جراثیم کی افراط ہوتی۔ بعضوں کا یہاں تک خیال تھا کہ اس کھانے اور بھوک سے امراض پیدا کرنے والے جراثیم خود ہلاک ہو جاتے، وہ زمانہ ختم نہیں ہوا ہے۔ آج بھی ہے اور کبھی ختم نہ ہوگا۔ صرف ان سے لطف اٹھانے والے نئے پرانے ہوتے رہیں گے۔ یا پھر خدا نہ کرے وہ ایسا وقت آجائے جب ناسازگار حالات کو خوش طبعی سے انگیز کرنے کی ہم میں صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔

معلوم نہیں ڈائننگ ہال کا کیسا نقشہ ہے۔ سنتا ہوں وُہی نقشہ ہے و لے آباد نہیں، ممکن ہے پہلے کی طرح وہ کڑی پابندیاں باقی نہ ہوں جن کو خندہ پیشانی انگیز کر کے آپ کے پیش رو زندہ دلی کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ اس سے ان کی سیرت میں پختگی اور دل نوازی آتی تھی۔ آزادی کے بعد طالب علموں کا شعار اور طالب علموں کا دور اتنا تعلیمی، علمی اور تہذیبی نہیں رہا جتنا بے زاری، بدامنی، سینما اور ریستوران یا بحیثیت مجموعی غیر ذمہ داری کا۔ ان کی سیرت میں ان عوامل کا بڑا واضح عمل دخل ملتا ہے۔ اس ماتم میں شریک ہونے کی دعوت دینے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا، جب آپ

طلبا تعلیم و تربیت کو کسبِ معاش کے لیے ضروری سمجھتے ہوں نہ اخلاقی برگزیدگی اور جمالیاتی پاکیزگی کے لیے۔ آپ کہیں گے زمانہ بدل گیا! لیکن بدلنا بگڑنا بھی تو ہوسکتا ہے۔ آپ اس کے بگڑنے سے متاثر اور مغلوب ہونے کے بجائے جیسا کہ عوام ہوتے ہیں اس کو سدھارنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جیسا کہ مردانِ حق آگاہ کا شیوہ وشعار رہا ہے۔ علی گڑھ کے اس رول پر زور دینا میری عمر بھر کی دعا اور دوا دوش رہی ہے۔ کیا کروں، عادت اور عمر بھر کی عادت!

عزیزو!

یونین کی عمارت (رام پور حامد ہال) جو کبھی آپ کی اعلیٰ طالب علمانہ زندگی کا محور تھی۔ ایک مدت سے سنسان اور بے رونق ہے جس کی ویرانی میں وہ قبر عبرت کا بھی اضافہ کرتی ہے جو عمارت سے متصل معلوم نہیں کس کی ہے اور کب سے ہے اور اپنی تنہائی اور اداسی کو بہلانے اور بھلانے کے لیے یونین کی ویرانی سے تسکین حاصل کرتی رہتی ہے۔ یونین کی تاریخ اور اس کی نامور شخصیتیں اور کارنامے علی گڑھ کی زندگی میں اسی احترام وافتخار سے دیکھے گئے جن سے برطانی پارلیمنٹ کی روایات اور اس کی تاریخ آفریں شخصیتیں دنیا کی ہر مہذب حکومت اور معاشرے میں دیکھے جاتے ہیں۔ اس بارے میں اکثر کچھ نہ کچھ کہتا رہا ہوں۔ اب بھی کہنے سے نہیں تھکا ہوں۔ اس لیے کہ اس پر یقین رکھتا ہوں کہ جب کبھی آپ کو کسی اچھے، بڑے اور مشکل کام کی دعوت دوں گا تو یونین کی اعلیٰ روایات کی یاد دلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یونین میں سب سے پہلے اور قیمتی تعلیم یہ ملتی تھی کہ آزادی سے کہو اور تحمل سے سنو۔ فتح وشکست کے خیال سے دور علاحدہ اور بلند ہو کر تعمیری کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ قضیہ کا تصفیہ باہمی منصفانہ اور ہمدردانہ گفتگو سے ہونا چاہیے۔ تشدد، تمرد اور تہتک سے تنازعے طے نہیں ہوتے طوالت پکڑتے ہیں۔

یہاں اور اس وقت اس تلخ اعتراف سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس بارۂ خاص میں آپ کا رویہ پرانے علی گڑھ کی روش سے ہٹا ہوا ہے۔ میں رزم و بزم کے تقاضوں کو مانتا ہوں۔ ان کے آداب بجالانے کی تائید میں ہوں۔ صرف آپ کو بازاری انداز واطوار سے دور بہت دور رکھنا چاہتا ہوں۔ اس انداز واطوار کی ابتدا آج سے پہلے کی ہے جب ملک میں تقسیم کا عمل اور ردِّ عمل شروع ہو گیا تھا جو اب فرو ہونے کے بجائے قابو سے باہر ہو چکا ہے، بے محل نہ ہوگا اگر ظفر کا

پیغام آپ تک پہنچادوں جہاں انھوں نے بتایا ہے کہ کوئی کتنا ہی صاحبِ فہم وذکا کیوں نہ ہوا سے آدمی نہ جانیے جو عیش میں خدا کو بھول جائے اور عیش میں خدا کا خوف نہ کرے۔ ظفر آپ کے شاعر تھے۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے کیا عجب آپ ہی کے لیے اور آپ ہی کے دور کا تصور کر کے کہا ہو۔ اس لیے اگر عیش وطیش میں خدا کو نظر انداز کر دیں تو ممکن ہے دوسروں کا کچھ نہ بگڑے لیکن آپ سے چُوک ہوگئی تو آپ کا خدا اور آپ کے خداوند بھی آپ سے بازپُرس کرنے میں تامل نہ کریں گے۔ میں طالب علموں کی انجمن اتحاد (یونین کلب) کا سوفی صدی موئد ہوں لیکن یہ کسی حال میں گوارا نہیں کرسکتا کہ متذکرہ صدر یونین بالخصوص اپنی یونیورسٹی یونین اور مزدور یونین یا اس طرح کی دوسری یونینوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہ جائے اور یقین رکھتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے اتفاق ہوگا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آپ کی یونین کے سالانہ الیکشن میں تمام اُمیدواروں کے مجموعی اخراجات کم وبیش پندرہ بیس ہزار ہوجاتے ہیں۔ آپ کے بیش تر سرپرست اور والدین کیسی کیسی سختیاں جھیل کر خاندان کی اشد ضرورتوں سے منہ موڑ کر اور دوسرے بچوں اور تنگ دست عزیزوں کا حق کاٹ کر آپ کے اس مشغلہ یا تفریح کے لیے روپیہ فراہم کرتے ہوں گے۔ کیوں کر اس کا احساس آپ کو نہ ہوگا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت آپ طلبا کے ذمے یونیورسٹی کے خاصے روپے واجب الادا ہیں۔ جس کی وصول یابی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ روپے گھروں سے آتے ہیں لیکن آپ ان کو یونیورسٹی کے واجبات کی ادائیگی پر صَرف کرنے کے بجائے تفریحی مشاغل میں صَرف کر دیتے ہیں۔ یہ تو کھلی خیانت ہے جو کسی کو زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ وہ مسلمان ہو اور اس ہادیِ برحق کی امت جو رسالت پر فائز ہونے سے پہلے عرب جیسے بے باک وسفاک قوم میں امین کے لقب سے یاد کیا گیا۔

چاہتا ہوں کہ آپ یونین کے محراب ومنبر اور رزم وبزم کی دیرینہ اعلیٰ روایات کو ازسرنو تازہ کریں۔ خودغرضی اور خود بینی کی بنا پر نہیں خدمت اور عبادت کے تقاضوں کی خاطر۔ جب کبھی کسی ادارے یا معاشرے کا ڈھانچہ ڈھیلا ہونے لگتا ہے یا ہو جاتا ہے تو اس میں سماج دشمن عناصر بڑی تیزی سے راہ پانے لگتے ہیں۔ یہ عناصر وعوامل بیرونی بھی ہوتے ہیں اور اندرونی بھی۔ موخرالذکر زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہمارے اردگرد اور ہمارے اندر پھیلے اور

چھپے ہوتے ہیں۔ یہ ہماری اعلیٰ صلاحیتوں اور قوتِ عمل کو مسلسل اور مستقل طور پر کمزور کرتے رہتے ہیں۔ یہ صورت حال نارمل حالات میں بھی اندیشہ ناک ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ ایسے دور میں جب ہر طرح کی دشواریاں اور ذمہ داریوں کا سامنا ہو۔ اس مشق و محنت میں آپ کی وہ خوبیاں سامنے آئیں گی جن کے لیے آپ کے اسلاف مشہور ہیں۔ خود اپنے آپ کو اچھا مسلمان، اچھا شخص اور اچھا شہری ثابت کیجیے۔ اس کے بعد اس بشارت پر یقین رکھیے جہاں کہا گیا ہے خوف نہ کرو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

عزیزو!

ہر طرف سے آنکھ بند کر کے ہجوم کے ساتھ ہو حق کرنے لگنا تعلیم و تربیت سے بے گانہ عوام کا شیوہ ہے، ہمیشہ سے ہے اور شاید ہمیشہ رہے۔ تعجب اس کا ہے اور شکایت بھی اسی کی ہے کہ آپ جن اعلیٰ روایات کے بانی اور نمائندہ رہے ہیں ان کے ہوتے ہوئے آپ بھیڑ کے ساتھ ہو جائیں۔ ایسا تو کبھی یا کہیں دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا ہندوستان گیر قبیلہ (طلبا کا) جو کہے گا یا کرے گا اس کی پابندی آپ پر لازم آئے گی۔ ورنہ گاؤں والوں کی زبان میں آپ کا 'حقہ پانی' بند کر دیا جائے گا، اور آپ 'ٹاٹ باہر' کر دیے جائیں گے۔ یہ عذر آپ کے شایانِ شان نہیں، ہوا کے رُخ پر چلنا آسان ہے اور غلط بھی نہیں۔ لیکن ہوا کے رُخ کو بدل دینے میں بھی ایک شان ہے۔ علی گڑھ کی بھلائی، بڑائی اور نام وری کو بے داغ رکھنے اور اس کو آگے بڑھاتے رہنے کا خواہاں اور کوشاں رہنا تقاضائے وقت ہے جس سے بہر حال ہم کو آپ کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ کوئی ایسا قدم جو اس ادارے کے موقف سے انحراف کا باعث ہو خواہ اس کے پیچھے کسی کے کنبے قبیلے کا ہجوم کیوں نہ ہو۔ اس کی مخالفت اور اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اس ادارے کا ہر خیر اندیش آپ کو یہ مشورہ دے گا کہ آپ وہ کریں جو تعلیم تہذیب اور اخلاق کا تقاضا ہو اور وہ نہ کریں جس کا مطالبہ سوجھ بوجھ سے بے گانہ جمِ غفیر کرتا ہو۔ سیاسی نیز تہذیبی و اخلاقی مسائل کے پیش نظر ہماری بعض ایسی دشواریاں ہیں جن کی بنا پر ہم اس پر مجبور ہیں کہ آپ کو ان راستوں پر چلنے سے باز رکھیں، جو ہمارے بنیادی اغراض و مقاصد کے حق میں مضر ہوں اور اس راستے پر چلنے کی ترغیب دیں جو راستی اور سلامتی کی طرف لے جاتا ہو۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہم

اپنے لیے جو چاہتے ہیں وہ ہمارے ملک اور اس میں رہنے اور بسنے والوں کے حق میں بھی مفید و مبارک ہوگا۔ معمولی عقل کی بات ہے کہ جو بات انصاف و اخلاق کے اعتبار سے ایک کے لیے درست ہوگی وہ دوسرے کے لیے نادرست کیسے ہوسکتی ہے۔ اپنے ایک بڑے محترم مرحوم اولڈ بوائے کی بشارت اور پیغام یاد رکھیے کہ آپ حق پر ہوں گے تو آج تنہا جو کچھ کہیں گے اور کریں گے کل تمام دنیا ایک زبان ہوکر اس کی تصدیق اور تائید کرے گی۔

عزیزو!

اس ادارے کی اساسی خصوصیات کو بروئے کار لانے میں جہاں تک سرسید کی عالی حوصلگی وسیع المشربی اور حقیقت پسندی کو دخل ہے وہاں ان عوامل کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے جو بیش تر مغرب کی دین تھے۔ ان میں وہ مردانہ اجتماعی کھیل تھے جو ایک طرف مقابلہ و مسابقت کے صحت مند اور تفریحی سامان بہم پہنچاتے تھے۔ دوسری طرف نوجوانوں کے لیے ایک اعلیٰ اور ہمہ گیر ڈسپلن سے بہرہ مند ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ یعنی زندگی کی تعمیری جدوجہد میں فتح و شکست کے خیال سے علاحدہ اور بلند ہوکر حصہ لینا اور جریدہ عالم پر اپنی خدمات کی قدر و قیمت کو ثبت کرنا۔ ایم۔اے۔او۔ کالج کی شہرت اور کامیابی میں مغربی اندازِ فکر و عمل کے علاوہ جو ہمارے ذہنوں پر ہر سمت سے سایہ فگن تھے۔ اس عہد کا بیش تر اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذب اور خیراندیش یورپین اسٹاف کم و بیش اسی انداز کے حاکم و حکمران ایک عظیم ورثہ اور روایات کے ساختہ پرداختہ طلبا اور ان سب پر چھائی ہوئی ہمارے اکابر کی عظیم شخصیتیں تھیں۔ اس فضا کی دی ہوئی باضابطگی یا ڈسپلن مجبوری و محکومی کی دی ہوئی نہیں تھی بلکہ بہتری اور برتری کی اُمید و یقین پر مبنی تھی۔ امید اور یقین کی یہ نرمی اور گرمی ہماری شبانہ روز کی زندگی میں جاری و ساری تھی۔ اس صورت حال سے اس بنا پر انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی کے موجودہ آزار و کارزار میں عہد گذشتہ کے امن و آسودگی یا صبر و شکر کے شب و روز کی جگہ نہیں رہی۔ ہمارے سوچنے اور عمل کرنے کا اصول و اسلوب یہ ہونا چاہیے کہ زندگی کے کارواں کو ہر قیمت پر راستی اور آرزومندی کے راستہ پر رکھنا اور چلانا اور ہلچل اور ہراس سے نجات دلانا اور رکھنا ہے۔ بقول اقبالؔ زندگی کے مصاف میں مرگ باشرف مقصود ہونا چاہیے نہ کہ حیات بے شرف۔

اس ادارے کے ابتدائی پچاس سال کی زندگی میں بحیثیت مجموعی انگلش یونیورسٹیوں وانگلش کرکٹ اور پارلیمنٹ کی روش و روایت کے مطابق تھی۔ علی گڑھ کا مزید امتیاز یہ تھا کہ وہ ہمارے مذہبی شعائر اور تہذیبی روایات کا بھی نمونہ تھا۔ کریکٹ سے ہم میں اسپورٹس مین شپ آئی۔ یہ ہمہ وقت اور ہر حال میں ہم کو ہمارے فرائض اور مخالف کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھنے پر آمادہ رکھتی ہے، ہمارے ادارے کی نام وری کا مدار اسی اسپورٹس مین شپ پر تھا جو آس پاس میں نہیں دور دراز کے کسی ایسے ادارے کو نصیب نہ تھی جو علی گڑھ سے ہم دوش وہم عناں ہونے کا دعوے دار تھا۔ چاہتا ہوں کہ آپ پرانے علی گڑھ کی اس روایت کو اس طرح تازہ کریں کہ وہ ہماری زندگی کا اسلوب بن جائے۔ یہاں ایک تردّد کا بھی اظہار کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب سے کھیلوں کی تعداد بڑھی اور یہ کاروبار عالم گیر پیمانے پر تمام ملکوں کی ہم طرحی و خیر سگالی پروگرام کا جز بنا، تعلیم گاہوں سے نکل کر بازاروں میں داخل ہوا اور مقابلہ و مسابقت کا میدان وسیع سے وسیع تر ہوا اور ہوتا رہتا ہے۔ کھیلوں کا معیار ضرور اونچا ہو گیا ہے، لیکن ان کی اصلاحی اور تہذیبی حیثیت بالکل وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک زمانے میں کھیلوں کے نگراں براہِ راست اساتذہ کرام ہوتے تھے جو کھیل اور کھلاڑی دونوں کو علم و اخلاق کی سطح پر رکھتے تھے۔ ویسا ہی اس کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اب عموماً پیشہ ور ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ گیمس اور اسپورٹس کے جتنے سرکاری کلب اور ادارے قائم ہیں ان میں جیسی ابتری ملتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں ارسٹوکریسی (اشرافیہ) کے طبقے سے تعلق نہیں رکھتا لیکن ایسا عوامی اور جمہوری بھی نہیں جس کی سلطانی سے گذشتہ عہد کے سلاطین خواہ وہ کسی عالم میں ہوں دم بخود ہوں گے۔ اشرافیہ سے میری مراد زیادہ تر یونان قدیم کے اشرافیہ سے ہے جو اپنی شجاعت و سخاوت اور دل کش صحت و شباہت کی رو سے دنیوی ہوتے ہوئے دیوتاؤں میں شمار ہوتے تھے۔ اسپورٹس مین شپ اور وہ دوسری صفاتِ عالیہ جو اس سے بہرہ مند ہیں اور برآمد ہوتی ہیں اسی اشرافیہ نے بڑے ریاض اور آزمائش سے گزر کر ہم تک پہنچائی ہیں۔ یہ نہیں کہتا کہ کھیلوں کو پیشہ نہ بنایا جائے۔ بعض اسباب کی بنا پر ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا ہے، لیکن اس نوع کی فضا کو تعلیم گاہوں سے علاحدہ اور دور رکھنا بہتر ہوگا، جہاں کھیل اتنا مقصد نہیں بلکہ وسیلہ ہوتا

ہے۔ اعلیٰ اقدار اور مقاصد کے حصول کا۔ اسپورٹس مین شپ کا تصور اتنا ہنر پیشگی کا نہیں جتنا کرکٹ مشربی کا ہے۔

عزیزو!

سائنسی انکشافات اور میکانکی کرامات ہمیشہ سامنے آتے رہیں گے۔ آئندہ اور بھی تیزی و تواتر سے، طبعی قوانین اور قوتیں چھپی ہوتی ہیں۔ ان علوم وفنون کے ماہرین کے فرائض میں ہے کہ وہ ایسی قوتوں کا انکشاف کرتے اور برسرکار لاتے رہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قوانین بنائے اور بتائے جا چکے ہیں۔ ان میں اضافہ یا ردّوبدل کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ ہمارا کام ان کا انکشاف نہیں ان کی تعمیل ہے۔ یہ قوانین شروع تہذیب سے آج تک مقدس کتابوں اور خدا کے ایک سے ایک برگزیدہ بندوں کے ذریعہ ہم تک پہنچتے رہے ہیں اور ہم ان کی برکتوں سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ ان کے سچّے پکّے اور لازوال ہونے کی سب سے محکم دلیل یہ ہے کہ جب کبھی زندگی میں خلل آیا ہے، ہر قوم، ملک، جماعت یا افراد نے کسی نہ کسی پیرائے میں ان ہی مذہبی اور اخلاقی قوانین کا سہارا پکڑ لیا ہے۔ تاریخ اور تہذیب دونوں اس پر گواہ ہیں۔ دانش مندوں کا اس پر اتفاق ہے کہ طبعی انکشافات کے اعتبار سے انسان کتنی ہی ترقی کر جائے طمانیتِ قلب اور احساسِ منزلت اسی وقت حاصل ہوگا جب اس کو مذہب و اخلاق کے دیے ہوئے اوامر ونواہی پر عمل کرنے کی توفیق ہوگی۔ طبعی قوانین کے سمجھنے اور برتنے میں غلطی کے راہ پا جانے کا امکان ہے جیسا کہ کبھی کبھی دیکھا گیا ہے۔ اخلاقی اور مذہبی امور میں ایسا نہیں ہوتا۔

(عزیزانِ علی گڑھ، مرتبین: ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی، لطیف الزماں خاں، بیکن بکس، گلگشت، ملتان 1990ء)

●●●

نیا شعر و ادب

حضرات! اب میں تھوڑی دیر کے لیے اُن دوستوں سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں جو اُردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ ہماری زبان، ہمارے ادب اور ہماری روایات کے محافظ ہی نہیں، اس کی پرورش کرنے والے اور پروان چڑھانے والے ہیں۔ آئندہ نسلوں کی ذہنی پرداخت میں ان کا بڑا حصہ ہوگا۔ یہ کام بہت بڑا اور بڑی ذمہ داری کا ہے۔ اس لیے کہ شعر و ادب ہمارے جذبات کا ذمہ دار ہی نہیں ہوتا اس کا محرک بھی ہوتا ہے۔ لیکن اُردو شاعری اور اردو ادب کا جو رنگ ڈھنگ عام طور پر آج نظر آ رہا ہے وہ پُر معنی بھی ہے اور اندیشہ ناک بھی۔ پُر معنی اس اعتبار سے کہ اس میں زمانہ کا رنگ جھلک رہا ہے اور اندیشہ ناک یوں کہ ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز ۔۔۔ گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست

جو لوگ کبھی خیالی دنیا میں تصورات سے کھیلتے یا ان میں گم رہتے تھے، آج واقعات کی دنیا میں ''سیل بے پناہ'' سے دوچار ہیں۔ ''غمِ روزگار'' نے اب ''غمِ عشق'' کی جگہ لے لی ہے۔ اور ''غمِ جاناں'' اب ''آلامِ روزگار'' کو آسان بنانے سے قاصر ہے۔ زندگی کے نت نئے مسائل نے نئی واماندگیاں پیدا کر دی ہیں۔ زندگی کے آشوب سے دوچار ہونے کی ہمت یا صلاحیت باقی نہیں رہتی تو انسان اپنی درماندگی ہی کو حاصلِ حیات سمجھنے لگتا ہے۔ اسی نوعیت کے آشوب نے ایران

کی شاعری میں تصوف کا عنصر داخل کر دیا تھا۔ اس وقت تک مذہب کا عمل دخل کافی تھا اس لیے مذہب اپنے مقام سے اُترا تو تصوف پر آ کر تھما۔ ہندوستان میں خالص اسلام کا عمل دخل برائے نام ہی تھا، اور جو کچھ تھا وہ بھی ایک طرح کے مخلوط تصوف کے پیرایہ میں۔ اور یہ تصوف عملاً مذہبی اپاہجوں کی جائے پناہ یا ایک مقدس معذرت بن کر رہ گیا تھا۔ جنگ عظیم کے کچھ عرصہ پہلے سے زندگی کی ہر جہت میں مادیت وعقلیت کی بہت کچھ کارفرمائی نظر آنے لگی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو نئی زندگی کا آشوب آیا تو اس نے تصوف، مادیت اور عقلیت سب کا شیرازہ بکھیر دیا، اور اس کی جگہ فسق وفحاشی نے لے لی۔ فسق وفحاشی دراصل رذائل نفس کی غلبہ زائی ہوتی ہے۔

حضرات! ہمارے دوستوں کو ''طعنہ نایافت'' سننے کی تاب نہ رہی تو اپنے کو کھو دینا ہی اپنا کارنامہ قرار دینے لگے۔ بندھنوں سے آزاد ہونا اچھی بات ہے لیکن ہر چیز کو ہر بندھن سے آزاد کرنا آزادی نہیں بداعمالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کل کی بیش تر شاعری اور انسانوں میں زندگی کے جن ڈراؤنے یا گھناؤنے پہلوؤں کو مزے لے لے کر اور وجد میں آ آ کر پیش کیا جا رہا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جن بے باک اور شرمناک اصول اور طریقوں کی تبلیغ کی جا رہی ہے وہ کسی کے لیے باعث فخر نہیں ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہماری زندگی میں یہ ڈراؤنے اور گھناؤنے واقعات ملتے ہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ شاعر اور ادیب ان چیزوں سے متاثر بھی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس کا بھی قائل ہوں کہ علم الامراض کے ماہر اور معمل اور شاعر و شاعری یا پیغمبر اور اس کی کتاب میں فرق مراتب بھی ہے۔ ہمارے شعرا اور ادیب معائب و مصائب کو نہ معقول طور سے پیش کرتے ہیں نہ ان کی صحیح چارہ سازی کرتے ہیں۔ شدید اور مزمّن امراض کا علاج سستی مسکرات سے صرف عطائی ہی کرے گا اور اپنی کوڑھ اور غلاظت کو اُچھالنے والا کوڑھی اور اگھوری کہلائے گا۔ تو کیا اب شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کوڑھی یا اگھوری ہی ہونے پر اکتفا کریں گے اور اسی پر فخر کریں گے، یا شاعر وادیب اور آرٹسٹ کے مقامات کچھ اور بھی ہیں۔ یہاں میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس شاعر اور آرٹسٹ کے سامنے سرخم کرنے کے لیے تیار ہوں جو کوڑھ یا غلاظت کی صحیح اور مکمل تصویر کھینچے۔ میں تو اس شاعر اور آرٹسٹ سے پناہ مانگتا ہوں جو اپنی نہاد اور اپنے عمل کے اعتبار سے کوڑھی یا غلیظ ہو، یا کوڑھ اور غلاظت میں لذّت محسوس کرے۔

حضرات! کمیونزم یا اشتراکیت کی تقلید یا تبلیغ اب اس درجہ عام اور مقبول ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہنا جہالت، قدامت پرستی اور دولت دوستی کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ میں اشتراکیت کا قائل نہیں ہوں قطع نظر اور باتوں کے میں نے اس کا جو کچھ مظاہرہ اردو شعروادب میں دیکھا ہے اس سے مجھے زندگی سے زیادہ کمیونزم گھناؤنی معلوم ہونے لگی ہے۔ کمیونزم نے خدا، عورت اور دولت کی طرف خاص توجہ کی ہے اور ان تینوں کے بارے میں جو کچھ تعلیم ہے اس سے عام طور پر ہم اور آپ کم وبیش واقف ہیں۔ بیش تر اسی کی کارفرمائی ہمارے جدید شعروادب میں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر خدا یا اس کا تصور ماننے جانے کے لائق نہیں ہے تو مذاق اُڑانے کے لیے بھی موزوں نہیں ہے، اور عورت کو مظلوم و مجبور نہ ہونا چاہیے تو اس کو شاعر، آرٹسٹ یا مزدور کے شہوانی جذبات کی تسکین کا وسیلہ بھی نہ سمجھنا چاہیے اور افلاس کا تنہا علاج قتل وغارت گری بھی نہیں ہے۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ خدا کے تصور ہی سے کوئی شخص انحراف کرے۔ اگر ایسا ہے تو پھر زندگی کی اعلیٰ قدریں کوئی بنیادی حیثیت یا منزلت نہیں رکھتیں۔ عورت کا مصرف اگر صرف تسکین شہوت ہے جیسا کہ میں جدید ادب میں دیکھتا ہوں تو میرے خیال میں عورت سے زیادہ لغو تصور نصف سے زیادہ اشرف المخلوقات کا نہیں ہے۔ دولت اور افلاس دونوں کی فراوانی بُری، لیکن قتل وغارت گری کی تبلیغ بھی کوئی مبارک فعل نہیں ہے۔

دراصل ابھی ہمارے شعروادب کو وہ اونچا درجہ نصیب نہیں ہوا جو مغربی شعروادب کو صدیوں پہلے سے حاصل ہے۔ یہاں لکھنے والوں میں مقابلہ و مسابقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آج تفریحاً لکھنے لگے، کل یقیناً مشہور ہو گئے اور آج ہی جیل خانے بھیج دیے گئے تو پھر نورٌ علیٰ نور رات گزرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ شاعر السمٰوات یا ادیب الدہر اور خدا جانے اور کیا کیا کہلائے جانے لگے۔ جہاں شہرت اتنی سستی اور سہل الحصول ہو وہاں خون پانی ایک کرنے کی ضرورت ہی کیا۔ یہ ہماری بے توجہی اور کم نصیبی ہے کہ مختلف اصناف شعروادب کے اعلیٰ نمونے نہ لکھنے والوں کے سامنے ہیں نہ پڑھنے والوں کے سامنے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں لکھنے پڑھنے یا عجیب وغریب خطاب دینے یا اختیار کرنے والوں کا مذاق شعروادب کیا ہوگا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس نے جس سے بڑھ کر ''فسق وفواحش'' لکھ دیا وہی ہمارا سب سے

محبوب اور مقبول شاعر اور ادیب بن گیا۔ فسق وفواحش یوں کہ یہ موضوع سستے اور سنسنی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں اور ادنیٰ استعداد یا معمولی فکر وفرزانگی کے لوگوں کے بس کے ہی نہیں بلکہ ان کے لیے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ اور قابل لحاظ ہے۔ ہماری سرزمین میں ''تہلکہ انگیز'' حادثات کم پیش آتے اور پیش بھی آتے ہیں تو طویل وقفوں کے بعد۔ وسیع زراعتی ملک ہے، لوگ پڑھے لکھے کم، تن بہ تقدیر زیادہ۔ حکومت میں عوام کو بہت کم دخل اور عوام سے حکومت بے نیاز، جو کچھ پیدا کیا اس میں پیداوار کم اور لاگت زیادہ حصہ میں آئی۔ عام زندگی کا رنگ وآہنگ کچھ اس قسم کا رہا۔

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے　　　　کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

اور اتفاق سے اکا دُکا ہمارے آپ جیسے نکل آئے تو ان کا تیور یہ رہا۔

کپڑے کے عوض بدلتے تھے رنگ

یہ رزق شرعی عشق طبی، جیے تو استغفر اللہ مرے تو الحمد للہ۔ غرض یہاں..... مختلف ہم سایہ اقوام کو ایک دوسرے سے چوکنا اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ معاشرت کی وہ نفسیاتی گتھیاں اور تقدیر انسانی کی وہ نازک اور آزمائشی گھڑیاں جو یورپ والوں کو ہمیشہ و ہر لحظہ پیش آتی رہتی ہیں اور مردانہ وار ان سے عہدہ برآ ہوتے رہتے ہیں، ہم ہندستانیوں کو کبھی پیش نہ آئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا ذہن و دماغ اور ہمارا شعر و ادب نفسیاتی گہرائی اور فنی شعور دونوں سے بے بہرہ رہے۔ جب کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات یا وہ انداز ہم میں یا ہمارے شعر وادب میں مغرب سے آیا ہے تو اس سے... اتنا سمجھنا چاہیے کہ یہ باتیں ہم میں مغربی کتابوں یا اخباروں سے یا یورپ سے آئے ہوئے... بے شمار لوگوں کے توسل سے یہاں پہنچی ہیں۔ ہمارے مصنفین یا شعرا کو کبھی براہ راست نہیں پیش آئیں۔ یہی سبب ہے کہ یورپ کے شعر وادب کا جو انداز ہمارے لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے روح نہیں۔ روح تو اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ سارے واقعات وحادثات ہمارے سر سے گزرے ہوں۔ نظر برآں انقلابیت، نازیت، یا اشتراکیت وغیرہ کا رنگ ڈھنگ جو ہمارے لکھنے والوں میں بالعموم نظر آتا ہے وہ کلیتہً سطحی اور بے جان ہے! اس رمز کو ہمارے نوجوان دوست نہیں سمجھتے اور جو کچھ دل میں

آتا ہے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ نہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اور نہ شعروادب کا مقام سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی مبارک فعل نہیں ہے۔ اس وقت تو وہ اس سے جس طرح چاہیں فائدہ اُٹھائیں لیکن وہ آئندہ نسل کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اخلاف اسلاف سے شاکی ہوں گے، اور شعروادب جو قوموں کا ضمیر ہوتا ہے اور نسلوں کا حافظہ بھی دوسری ترقی یافتہ اور گراں منزلت ادبیات کے مقابلہ میں فرومایہ نظر آتا ہے۔ اس وقت تاریخ لکھنے اور تنقید کرنے والا یہ فیصلہ دے گا کہ اس شعروادب کو وجود میں لانے والے اس عہد کے وہ لوگ تھے جو اس طرح کے سرمایۂ ذہنی ودماغی کو پسند کرتے تھے اور فخر کرتے تھے...اور یہ فیصلہ کوئی قابلِ رشک فیصلہ نہ ہوگا۔

حضرات! اگر میں شعروادب کے ضمیر میں نہیں اُتر سکا ہوں تو اپنے ضمیر میں اسے جگہ دے سکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ شعروادب کی وادی میں کہاں کہاں دوزخ جنت سے ڈھکی ہوئی ہے اور کہاں بہشت دوزخ کے آغوش میں ہے۔ میں ہی نہیں، آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آج کل شعروادب ہی نہیں، مذہب واخلاق کی بھی آڑ پکڑ کر یا اس کے سایہ میں ہمارے نوجوان اور بوڑھے شعرا اور ادیب، کس کس طرح ''لذّت کام ودہن'' میں مصروف ومگن ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ لکھنے کا فن بھی خاص خاص اسرار ورموز رکھتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عریاں نگاری اس بنا پر ضروری ہے کہ بغیر اس کے بات ذہن نشیں نہ ہوگی۔ وہ یا تو فن میں ناقص ہیں یا پھر ان کی ذہنیت ہی مریض و ماؤف ہے۔ عریاں طرازی یا فحش سرائی شاعروادیب یا آرٹسٹ کا کمال نہیں کمزوری ہے۔ اگر آپ میری طوالت بیانی سے گھبرا نہ گئے ہوں اور گھبرا بھی گئے ہوں تو مضائقہ نہیں، اگر آپ کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ نہ گیا ہو تو میں اس سلسلہ میں اشارتاً ایک نکتہ اور بیان کردوں۔ جدید شعروادب کے دل دادہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہم ہندستانیوں کو اپنی غلاظتوں کا علم یا احساس نہ ہوگا اس وقت تک ہمارے دل میں غلاظت سے نفرت نہ پیدا ہوگی اور صفائی کی طرف ہمارا ذہن مائل نہ ہوگا۔ اس لیے طرح طرح کی غلاظتوں کو طرح طرح سے پیش کرنا چاہیے اور قوم کے پکے پھوڑے پر اسی طور سے نشتر لگانا چاہیے۔ ''اوّل تو غلاظت کا پیش کرنا، اور غلاظت کا اُچھالنا۔ دو قطعاً مختلف باتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ماہر فن اور مخلص ڈاکٹر جب کبھی آپریشن کرتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مریض کی عام

جسمانی حالت کیا ہے۔ پھر مریض کو مقررہ مکمل طور پر اس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ آپریشن تھیٹر میں کامل صفائی ہوتی ہے، آلات جراحی دواؤں سے دُھلے منجے ہوتے ہیں۔ سرجن خود دیر تک اپنے ہاتھ اور اُنگلیوں کی صفائی کرتا ہے مستزاد یہ کہ وہ اور ان کے رفقا کار اپنے نتھنے اور منہ اور بالوں پر پٹیاں باندھ لیتے ہیں کہ کہیں ان کے مضر جراثیم مریض کے زخموں میں گر کر سرایت نہ کر جائیں۔ اس کے بعد جو ڈاکٹر دوائے بے ہوشی سونگھاتا ہے اس کی اُنگلیاں برابر مریض کی نبض پر رہتی ہیں اور آنکھوں اور نفس پر نظر رکھتا ہے۔ دوران آپریشن میں اگر بے ہوشی سونگھانے والے ڈاکٹر کو یہ معلوم ہو کہ مریض کی حالت دِگرگوں ہے تو وہ فوراً آپریشن رُکوا دے گا۔

ان تمام امور اور ان کے جزئیات کو مدّ نظر رکھیے۔ اس کے بعد دیکھیے کہ زیر نظر شعرا و مصنفین مریض قوم پر کس طرح عمل جراحی کرتے ہیں۔ تفصیل بہت طویل ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ حالات کا موازنہ کر کے صحیح نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں، اور باتوں کے علاوہ آپ یہی دیکھ لیجیے کہ ڈاکٹر اس امر کا بھی کیسا خیال رکھتا ہے کہ اس کی اُنگلیاں آلودگی سے صاف ہوں اور اس کے بال، ناک اور منہ بھی اس طور پر بندھے رہیں کہ خود ان کی آلودگیاں مریض کی ہلاکت کا موجب نہ بنیں۔ پیغمبر بھی جب کسی قوم کے سامنے آتا ہے تو ریاضت اور تزکیۂ نفس کی اعلیٰ منزلیں طے کر چکا ہوتا ہے تاکہ کہیں خود اس کی کمزوریاں اس کے مشن میں راہ نہ پا جائیں۔ پیغمبر کے پاس پیغمبری کا فرمان خدا کا دیا ہوا موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس یونیورسٹی یعنی ماہرین فن کے صداقت نامے ہوتے ہیں۔ تب کہیں جا کر یہ اخلاقی یا جسمانی امراض کی اصلاح کا کام شروع کرتے ہیں یا کرنے پاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان شعرا و مصنفین یا بیش تر لیڈروں کو دیکھیے۔ یہ جو کہتے ہیں اور جس طرح کہتے ہیں اس میں ان کی آلودگیاں کس درجہ سرایت کیے ہوتی ہیں۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی اس منصب کا اہل ہوگا جس پر اس نے اپنے آپ کو فائز کر رکھا ہے!

حضرات! میرے نزدیک عریانی اور فحاشی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ادب کی تکمیل میں لازم آتی ہوں۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیا جائے کہ ان کا عمل دخل بھی ایک حد تک ضروری ہے.......اور بعض لکھنے یا پڑھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کے بغیر زندگی کی مکمل

لذت نہیں محسوس کر سکتے تو پھر میں یہ بھی کہوں گا کہ اس قسم کے لٹریچر کو اس کا مناسب مقام دیا جائے۔ یہ نہ ہونا چاہیے کہ جہاد یا انقلاب کا اعلان مراسی مراستوں کے گالی گانے سے کیا جائے!

اس سلسلہ میں ایک معمولی سی بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اور باتوں کے علاوہ عریانی و فحاشی سے بچنے کے لیے یا اس کو اعتدال پر رکھنے یا اس کو مناسب اور دلچسپ انداز میں پیش کرنے کے لیے ماہرین شعروادب نے صدیوں کے مطالعہ و تجربہ کے بعد صنائع و بدائع اختراع مدوّن کیے، محسنات کلام کی طرح ڈالی اور اس کے بلیغ و دل نشیں نمونے پیش کیے۔ فحاشی اور عریاں نویسی نہ کوئی فن ہے اور نہ کمالِ فن۔ فن کا مقصد اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ خود بھی مستحسن ہو اور نتائج کے اعتبار سے بھی مستحسن ہو۔ ایسا فن جو انسان میں ایسا رجحان پیدا کرے جن سے بحیثیت مجموعی اخلاق وانسانیت کا مقصد نہ پورا ہو یا خطرہ میں پڑ جائے، فن یقیناً نہیں کچھ اور ہو تو ہو۔ فن برائے فن میرے نزدیک بداعمالی نہیں تو فعل عبث ضرور ہے، اور میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا پہلو ایسا نہیں ہے جو اپنی تکمیل کے لیے کسی ایسے فن کا محتاج ہو، جس پر صرف فن برائے فن کا اطلاق ہوتا ہو۔ فن برائے فن میں وہی گمراہی پوشیدہ ہوتی ہے جو تصوف کے اکثر پیرووں میں نظر آتی ہے۔ یعنی عشق تو ہوتا ہے تعزیرات ہند کی زد کا اور رشتہ جوڑیں گے پیمانِ الست کا!

اگر میرے دوستوں سے کوئی یہ کہے کہ عریاں اور فحش باتیں بھی عریاں اور فحش الفاظ و عبارت ہی میں ادا کی جاسکتی ہیں تو میں اس کا قائل نہیں۔ باکمال لکھنے والا فحش سے فحش باتیں اس طور پر کہہ سکتا ہے کہ حسن وشرافت کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ یہی نہیں بلکہ انشاپردازی کا یہ بھی کمال ہے کہ جو بات بظاہر غیر ثقہ یا معمولی اور سپاٹ نظر آتی ہو اس کو انشاپرداز چند الفاظ اور فقروں کے پیرایہ میں نہایت درجہ دل نشیں بلکہ لازوال بنادے۔ اس لیے اگر میرے دوستوں کو فحاشی اور عریاں نگاری سے شغف ہے اور وہ اس عادت کو ترک نہیں کر سکتے تو پھر میں ان کو مشورہ دوں گا کہ وہ لکھنے کی مشق اور سلیقہ پیدا کریں۔ لیکن بطور تنبیہ میں یہ جتا دینا چاہتا ہوں کہ جس شے کا نام سلیقہ ہے وہ صرف مشق سے ہاتھ نہ آئے گا۔ اس کے لیے خلوص ازبس ضروری ہے۔ عدم خلوص زندگی اور معاشرت میں ہی خلل انداز نہیں ہوتا۔ انشاپردازی کو بھی خاک میں ملا دیتا ہے!

حضرات! یہ باتیں میں نے سچائی اور صفائی سے عرض کی ہیں اور یہ بیان واحد نہ بھی ہو تو کم سے کم یہ ضرور ہے کہ یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں جو میں نے بغیر کسی ''ردّوبدل'' کے پیش کر دیے۔ لیکن تصویر کا یہ ایک ہی رُخ تھا۔ دوسرا بھی عرض کر دینے کی اجازت ہی نہیں چاہتا بلکہ اس پر اصرار بھی کروں گا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ نوجوان لکھنے والوں میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے وہ اُمید افزا ہے۔ شعور کا بیدار ہونا مبارک ہوتا ہے۔ ابتدا میں جو ناہمواری اور بے راہ روی پیدا ہوتی ہے وہ آگے چل کر درست ہو جاتی ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اس بات کا پتہ آسانی سے چل جائے کہ اب تک ہمارے شعروادب میں مخصوص سانچوں میں ڈھلی ہوئی مخصوص ہی چیزیں راہ پاتی رہی ہیں۔ جن سے ہم اُکتانے لگے تھے۔ اسلوب اور موضوع دونوں میں اس درجہ یکسانیت اور ''باسی پن'' آ گیا تھا کہ ہم میں سے بعض یہ سمجھنے لگے تھے کہ ''یہی لکھنا اور ''یوں ہی لکھنا'' مقصود بالذات ہے، لیکن نالہ کی طرح زندگی بھی ''پابند نے نہیں'' نئے ادب نے ہم کو بعض بڑی اچھی چیزیں بھی سُجھائی ہیں جن کو اب ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کچھ اور نہیں تو یہ کیا کم ہے کہ ہمارے ادب میں جو ایک کمی نہایت درجہ نمایاں تھی اس کو یہ پورا کر رہا ہے۔ مثلاً اردو میں پریم چند سے پہلے غریبوں کا ادب مفقود تھا۔ حسن ہو، محبت ہو، بہادری ہو، عصمت ہو، سچائی ہو، قابلیت ہو، غرض ہنسنا بولنا، رونا دھونا، مرنا جینا، آداب تسلیمات، تو تو میں میں، سب کے سب طبقہ ادنیٰ یا طبقہ امرا سے متعین ہوتے تھے۔ سب کچھ ''تجمل حسین خاں'' کے لیے تھا۔ غریبوں یا عوام کو اتنا بھی میسّر نہ تھا کہ خاں صاحب کی نظر بد سے محفوظ رہیں۔ پریم چند نے سب سے پہلے اردو ادب میں غریبوں کو جگہ دی، اور وہ بھی اس طور پر کہ ہم کو غریبوں پر ترس ہی نہیں آیا بلکہ ان کے ایسے فضائل ہم پر روشن ہوئے کہ ہم نے اپنے دل میں ان کے لیے محبت اور رفاقت کی معزز جگہ نکالی۔ ہمارے شعرا اور ادیب بھی غریبوں کی طرف مائل ہوئے اور انھیں محسوس ہوا کہ شعروادب میں حسن اور جان امیروں ہی سے نہیں ناکسوں سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ پریم چند کے بعد ہی نئے ادب والوں کا دور آیا۔ انھوں نے غریبوں کو اپنا لیا۔ لیکن یہ اس درجہ شدت اور عجلت کے ساتھ پیش آیا کہ اس کی ''جھونک'' خود نئے ادب والے بھی نہ سنبھال سکے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جب تک نئے ادب میں کوئی پریم چند یا حالی یا دونوں نہ پیدا ہوں گے، نئے ادب میں وہ سنجیدگی، وقار اور وزن نہ آئے گا جس کا وہ یقیناً مستحق ہے اور جس کی اسے بڑی ضرورت ہے۔ ●